الحمدللہ حکومت پاکستان کی جانب سے اوّل
اللہ
رسول
محمد
1
سید الوریٰ ﷺ
اضافہ شدہ نیا ایڈیشن
قاضی عبدالدائم دائم
www.maktabah.org

پروفیسر حفیظ تائب، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰھُمَّ !

صَلِّ وَ سَلِّمْ وَ بَارِکْ عَلیٰ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ
وَّ عَلیٰ اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ وَ سَلَّمْتَ
وَ بَارَکْتَ عَلیٰ سَیِّدِنَا اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلیٰ اٰلِ سَیِّدِنَا
اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ.

تو مہرِ لا زوال سرِ مطلعِ ازل
تو طاقِ جاں میں شمعِ ابد سیّدالوریٰ

حفیظ تائب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکومتِ پاکستان
وزارتِ مذہبی امور

اسلام آباد

سندِ امتیاز

نہایت مسرت سے تصدیق کی جاتی ہے کہ محترم قاضی عبدالدائم دائم

کی تالیف کردہ کتاب سید الوریٰ بزبان اردو مقابلہ کتب سیرت

برائے سال ۱۹۹۸ء میں اول انعام کی مستحق قرار پائی اور مؤلف موصوف کو

حکومتِ پاکستان کی طرف سے مبلغ تیس ہزار روپے بطور انعام دیئے گئے۔

نمبر ۱۲(۲)/اے ڈی آر/۰۰/۹۸

تاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
۷/جولائی ۱۹۹۸ء

سید احمد صوفی
سیکرٹری
وزارتِ مذہبی امور حکومتِ پاکستان
اسلام آباد

سیدِ الوریٰ

(اوّل انعام یافتہ)

(جلد اوّل)

جانِ دو عالم

صلی اللہ علیہ وسلم

کی سیرت مطہرہ

قاضی عبدالدائم دائمؔ

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 7352332' 7232336 فیکس: 7223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

نام کتاب	....	سید الوریٰ ﷺ
مصنف	....	قاضی عبدالدائم دائم
کمپوزنگ	....	محمد بشیر، محمد شبیر، صدریہ کمپیوٹرز، ہری پور
پروف ریڈنگ	....	قاری جاوید اختر، شیخ توحید احمد
نظر ثانی	....	قاضی عابد الدائم عابد
عکاسی	....	قاضی واجد الدائم (بھائی)، اختر، امجد
پبلشر	....	گلفراز احمد، علم وعرفان پبلشرز، لاہور
اہتمام اشاعت	....	محمد طاہر اکرم، گوجرانوالہ
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
اشاعت اول	....	1996ء
اشاعت ششم	....	2012ء
ہدیہ فی جلد	....	-/700 روپے
مکمل سیٹ	....	-/2100 روپے

ملنے کے پتے ....

علم وعرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم وادب

الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

جہانگیر بکس

بوہڑ گیٹ، ملتان

کشمیر بک ڈپو

تلہ گنگ روڈ، چکوال

رائل بک کمپنی

فضل داد پلازہ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

کتاب گھر

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

ویلکم بک پورٹ

اردو بازار، کراچی

رشید نیوز ایجنسی

اخبار مارکیٹ، اردو بازار، کراچی

شمع بک ایجنسی

بھوانہ بازار، فیصل آباد

سعید بک بنک

جناح سپر، اسلام آباد

انتساب

والدِ مکرم ، حضرتِ معظم

قاضی محمد صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ

کے نام!

جن کے فیضانِ نظر نے میرے دل کو درد آشنا کیا اور عشقِ مصطفیٰ سے سرشار کیا

اسی دردِ پنہاں کی تفسیر ہے --- اسی عشقِ سوزاں کی تعبیر ہے

سرمایۂ جاں ہیں شہِ ابرار کی باتیں
کس درجہ سکوں دیتی ہیں سرکار کی باتیں
جی چاہے کہ ہر آن کروں ذکرِ پیمبر
ہوتی رہیں کونین کے سردار کی باتیں
صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

فہرست

پانچواں باب

[غزوۂ بدر]

فہرست حواشی

تعارف

بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی حَبِیۡبِہِ الرَّؤُوۡفِ الرَّحِیۡمِ ط

علامۂ اجل، فاضل بے بدل، عاشقِ سیّد الرسل ﷺ عالی جناب الحاج الحافظ قاضی عبدالدائم دائم صاحب سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ صدریہ ہری پور ہزارہ، سرپرست دارالعلوم ربانیہ و مدیر ماہنامہ جامِ عرفاں کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ جامع شریعت وطریقت، واقفِ رموز حقیقت و معرفت، ایک بے مثال مقرر اور عدیم النظیر صاحب قلم ہیں۔ آپ نے نہایت محققانہ، دلکش، سلیس اور شستہ پیرائے میں سیرۃ النبی ﷺ کا سلسلہ ماہنامہ جامِ عرفاں میں اپریل ۱۹۸۴ء سے شروع فرمایا تھا، جسے قارئینِ جامِ عرفاں نے بہت پسند کیا اور اس کی مقبولیت نے جامِ عرفاں کو چار چاند لگا دیے۔ انہی قسطوں کو اب کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ ایک ایسا مجموعۂ سیرتِ رسول مقبول ﷺ ہے، جو تحقیق وعمیق کے لحاظ سے علماء کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں اور عام فہم تحریر کی وجہ سے عوام کو بھی اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں۔

عشق و محبتِ مصطفیٰ (علیہ التحیۃ والثناء) جو اصل و اساس ایمان ہے، کی خوبی سے یہ مجموعہ لبریز ہے، جو پڑھنے والا خود محسوس کرلے گا

مشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطار بگوید

سیّد الوریٰ بلاشبہ علامہ مذکور مدظلہ العالی کا ایک نادر مرقع ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر طویل مع صحت کاملہ عطا فرمائے تاکہ یہ فیض جاری رہے۔ آمین

بحرمۃ سیّد المرسلین. صلی اللہ علیہ و آلہ و صحبہ اجمعین

سیّد محمود شاہ ترمذی

پشاور

مقدمہ

(محترم جناب محمد شفیع صابر صاحب)

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًاo

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَ سَلِّمْ.

شکر صد شکر کہ مرشدی و مخدومی اعلیٰ حضرت قاضی عبدالدائم دائم مدظلہ العالی علینا بھی فخرِ کون و مکاں، سردارِ دو جہاں، خاتمِ مرسلاں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں کے مقدس گروہ میں شامل ہو گئے --- ان کی سالہا سال کی شب بیداریوں، کوششوں، کاوشوں، عرق ریزیوں اور جاں گدازیوں کا ثمرہ ''سیدالوریٰ'' کی صورت میں اہل دل اور اہل ایمان کے لئے تحفۂ بے بہا ہے اور ایک نعمتِ عظمیٰ۔

جانِ دو عالم ﷺ کی سیرت نگاری کا شرف حاصل کرنا ہر صاحبِ علم مسلمان کی ہمیشہ سے آرزو رہی ہے اور بقول علامہ شبلی --- ''مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے حالات و واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصاء کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے اور نہ آئندہ کے لئے کئے جا سکتے ہیں۔''

مشہور مستشرق شپرنگر کی رائے میں --- ''نہ کوئی قوم دنیا میں گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم ہے...... یہ ساری کاوشیں اس لئے ہوئیں کہ رسول پاک، جانِ دو عالم ﷺ کے صحیح ترین اور مستند ترین حالات کی تدوین ہو سکے۔''

انہیں چھوڑیے، یہ تو انسانی آرا ہیں --- خود اللہ تعالیٰ اپنے رسولِ مقبول ﷺ کو "وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ" کی یقین دہانی کراتا ہے --- اللہ کا آخری کلام قرآن مجید، شروع سے آخر تک حضور سرورِ کائنات، فخرِ موجودات ﷺ کی عظمت و رسالت کی شہادت نہیں تو اور کیا ہے ---؟ حضور ﷺ کے اخلاق کریمانہ کا قصیدہ نہیں تو اور کیا ہے ---؟ قرآن کا اعلان ہے "جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی" --- "ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر" --- "اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہو، تو میری (جانِ دوعالم ﷺ کی) پیروی کرو" --- "جو رسولِ خدا تمہیں دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں، اس سے رک جاؤ" --- "رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔" گویا اللہ ایک اور لاثانی ہے تو جانِ دوعالم ﷺ بھی یکتا اور لاثانی --- نہ اللہ کے بغیر کوئی معبود ہے، نہ رسول اللہ ﷺ جیسا کوئی نبی اور پیغمبرِ خدا۔

حضور ﷺ کے اخلاق و عادات، سیرت و کردار کے بارے میں پوچھا گیا، تو مزاج دانِ نبوت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا ہی جامع اور بلیغ جواب دیا --- کَانَ خُلُقُهٗ اَلْقُرْاٰن --- اہلِ بصیرت نے اس کی وضاحت میں یہاں تک کہہ دیا کہ قرآن دو ہیں۔ ایک وہ مصحفِ مقدس جو کتابی صورت میں اوراق اور صفحات کے اندر محفوظ و مسطور ہے اور ایک قرآنِ ناطق، یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی، جن کی ہر ادا، ہر عمل، ہر بات احکامِ خداوندی کا زندہ نمونہ اور قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے --- اس طرح سیرت النبی ﷺ پر ہر کتاب صرف تاریخ و سوانح حیات یا پند و نصائح پر ہی مبنی نہیں؛ بلکہ اسلام کی حقانیت اور تعلیمات کے فروغ و اشاعت کا ایک ذریعہ بھی ہے۔

سیّد سلیمان ندوی نے ایک خطبہ میں کیا خوب کہا ہے کہ

"خدا کی محبت کا اہل اور اس کے پیار کا مستحق بننے کے لئے ہر مذہب نے ایک ہی تدبیر بتائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس مذہب کے شارع اور طریقہ کے بانی نے جو عمدہ نصیحتیں کی ہیں، ان پر عمل کیا جائے، لیکن اسلام نے اس سے بہتر تدبیر اختیار کی ہے، اُس نے اپنے پیغمبر ﷺ کا عملی مجسمہ سب کے سامنے رکھ دیا اور اس عملی مجسمہ کی پیروی اور اتباع کو خدا کی

محبت کے اہل اور اس کے پیار کے مستحق بننے کا ذریعہ بتایا ہے--- چنانچہ اسلام میں دو چیزیں ہیں--- کتاب اور سُنّت--- کتاب سے مقصود خدا کے احکام ہیں، جو قرآن کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں اور سنت، جس کے لغوی معنی راستہ کے ہیں--- وہ راستہ جس پر انسان پیغمبر اسلام ﷺ کے احکام پر عمل کرتے ہوئے گزرے--- یعنی آپ ﷺ کا عملی نمونہ جس کی تصویر احادیث میں بصورت الفاظ موجود ہے۔ الغرض ایک مسلمان کی کامیابی اور تکمیلِ روحانی کے لئے جو چیز ہے، وہ سنت و سیرت نبوی ہے۔''

''ان افعال کے بعد جن کا تعلق اعضائے بدن سے ہے، وہ افعال ہیں، جن کا تعلق دل و دماغ سے ہے اور جن کی تعبیر ہم اعمالِ قلب یا جذبات اور احساسات سے کرتے ہیں، ہر آن ایک نئے قلبی عمل، جذبہ یا احساس سے متاثر ہوتے ہیں--- ہم کبھی راضی ہیں، کبھی ناراض--- کبھی خوش ہیں، کبھی غمزدہ--- کبھی مصائب سے دوچار ہیں اور کبھی نعمتوں سے مالا مال--- کبھی ناکام ہوتے ہیں اور کبھی کامیاب--- ان سب حالتوں میں ہم مختلف جذبات کے ماتحت ہوتے ہیں--- اخلاقِ فاضلہ کا تمام تر انحصار انہی جذبات اور احساسات کے اعتدال اور باقاعدگی پر ہے--- ان سب کے لئے ہمیں ایک عملی سیرت کی حاجت ہے، جس کے ہاتھ میں ہماری ان اندرونی سرکش اور بے قابو قوتوں کی باگ ہو، جو انہی راستوں پر ہمارے نفس کی غیر معتدل قوتوں کو لے کر چلے، جن پر مدینہ منورہ کا بے نفس انسان ﷺ کبھی گزر چکا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کی جامعیت کا بیان بھی سید سلیمان ندوی سے بہتر انداز میں اور کون کر سکے گا--- وہ بتاتے ہیں کہ

''عزم، استقلال، شجاعت، صبر، شکر، توکل، رضا بتقدیر، مصیبتوں کی برداشت، قربانی، قناعت، استغناء، ایثار، جود، تواضع، خاکساری، مسکنت--- غرض نشیب و فراز، بلند و پست تمام اخلاقی پہلوؤں کے لئے جو مختلف انسانوں کو، مختلف حالتوں میں یا ہر انسان کو مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں، ہم کو عملی ہدایت اور مثال کی ضرورت ہے، مگر وہ کہاں سے مل سکتی ہے؟ صرف مُحمّد رسول اللہ ﷺ کے پاس--- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے

پاس ہمیں سرگرم شجاعانہ قوتوں کا خزانہ مل سکتا ہے، مگر نرم اخلاق کا نہیں---حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاں نرم خوئی کی بہتات ہے، مگر سرگرم اور خون میں حرکت پیدا کرنے والی قوتوں کا وجود نہیں---انسان کو اس دنیا میں ان دونوں قوتوں کی معتدل حالت میں ضرورت ہے اور ان دونوں قوتوں کی جامع اور معتدل مثالیں صرف اور صرف پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سوانح اور سیرت میں مل سکتی ہیں۔''

''حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی کفر کے خلاف غیظ وغضب کا ولولہ پیش کرتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات بت شکنی کا منظر دکھاتی ہے---حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد، شاہانہ نظم ونسق اور اجتماعی دستور وقوانین کی مثال پیش کرتی ہے---حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی صرف خاکساری، تواضع، عفوو درگزر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے---حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے---حضرت ایوب علیہ السلام کی حیات صبر وشکر کا نمونہ ہے---حضرت یونس علیہ السلام کی سیرت ندامت وانابت اور اعتراف کی مثال ہے---حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی قید و بند میں بھی دعوتِ حق اور جوش تبلیغ کا سبق ہے---حضرت داؤد علیہ السلام کی سیرت گریہ وبکاء، حمد وستائش اور دعاء وزاری کا صحیفہ ہے---حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی امید، خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے، لیکن محمد ﷺ کی سیرت مقدسہ کو دیکھو کہ اس میں نوح اور ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ، سلیمان اور داؤد، ایوب اور یونس، یوسف اور یعقوب علیہم السلام سبھی کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ آئی ہیں۔''

''سیدالورٰی'' میں جانِ دو عالم ﷺ کی اسی صفتِ جامعیت پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے اور دین و دنیا میں کامیابی کے متلاشی اور تمنائی پر واضح کیا گیا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت چاہتے ہو تو آؤ اس مینارۂ نور کی طرف، آؤ، اس مشعل ہدایت ﷺ کی طرف، اور آؤ اس ہادیٔ دو جہان ﷺ کی طرف!--- خاتم الانبیاء ﷺ کی سیرت مطہرہ وہ آئینہ ہے، جو انسان کو افراط تفریط سے ہٹا کر اعتدال کے راستے پر لاتا ہے،--- سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ انسان پر یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ زندگی کو مختلف اکائیوں میں

تقسیم نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی مادی، اخلاقی اور روحانی اقدار کے مجموعے کا نام ہے--- زندگی فرار نہیں، جدوجُہد سکھاتی ہے، زندگی کنارِ بحر پر کھڑے ہو کر تماشا کرنے کا نہیں، بلکہ تلاطمِ دریا میں اترنے کا نام ہے، زندگی قنوطیت نہیں، رجائیت کی علمبردار ہے۔

''سید الوریٰ'' کے صفحات میں دیکھئے کہ ہمارے رسول ﷺ یتیم رہے، یسیر رہے، نادار رہے، تاجر رہے، تنگی وعُسرت سے ہمکنار رہے، بادشاہ اور حاکم رہے، مجاہد اور سپہ سالار رہے، بیٹے رہے، باپ بنے، دشمنوں میں گھرے رہے، مسائل سے دوچار رہے---لیکن ہر حال میں ان کا کردار ایک مثالی کردار رہا--- اسلئے ان کی سیرت صرف اہل اسلام کے لئے نہیں؛ بلکہ ہر انسان دوست کے لئے بہترین نمونۂ عمل قرار پائی--- حضور ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا ہر گوشہ ہر اس انسان کے لئے، جو اپنی اور انسانیت کی بھلائی کا خواہاں ہے، ایک روشن اور واضح سبق ہے--- اور سبق یہ ہے کہ انسان کا شرف پاکیزہ سیرت ہے--- جو انسان پاک سیرت نہیں، صورت میں انسان ہو تو ہو، جوہرِ انسانیت سے محروم ہے۔

جانِ دو عالم ﷺ کی سیرت وسوانح لکھنے والوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اور اس میں نام لکھوانا بھی باعثِ فخر وسعادت ہے۔ یہ انہی نیک بخت، ہستیوں کی کاوش کا نتیجہ ہے، کہ آج ہم بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ دنیا کے کسی راہنما، مصلح، قائد اور لیڈر کی زندگی تاریخی اعتبار سے اس قدر محفوظ نہیں، جتنی رسولِ خدا ﷺ کی زندگی ہے--- خاتم النبیین، سید المرسلین ﷺ کی سیرتِ مطہرہ پر یہ نگارشات نہ صرف ہمیں ایک بہتر اور پاکیزہ زندگی گزارنے کے لئے رہنمائی مہیا کرتی ہیں؛ بلکہ حضور ﷺ کی ذات اقدس سے یہ جذباتی وابستگی دلوں کو نورِ نبوت سے منور کرنے کا باعث بھی ہے--- آج دشمنان اسلام کا سارا زور اسی بات پر صرف ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے اذہان وقلوب میں ایسے شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں، جن کے نتیجے میں عشقِ محمدی ﷺ کی چنگاریاں سرد پڑ جائیں اور مسلمان محض خاک کا ڈھیر بن کر رہ جائے۔ اور تو اور خود نام نہاد ''روشن خیال'' اور ترقی پسند مسلمان بھی اپنے اپنے فلسفہ وفن پر نازاں اور اپنی عقل ودانش پر مغرور اس ناپاک مہم میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی معجزوں کے انکار پر بضد ہے تو کوئی پیغمبر اسلام اور اس کے

جاں نثار ساتھیوں کے طرزِ عمل پر تنقید کو باعث فخر گردانتا ہے۔ آج کفار کی ان سپر طاقتوں کی پوری کوشش ہے کہ اسلام پر بہتان تراشیوں کی مہم تیز سے تیز تر ہوتی جائے، مسلمانوں کے جسموں سے ''روحِ محمد'' نکال دی جائے، مسلمان کو مسلمان سے لڑا کر ان میں حریفانہ کشمکش پیدا کی جائے تاکہ ان سادہ دلوں میں ہیجانی کیفیت اور چڑچڑا پن جڑ پکڑ جائے اور وہ امن و سکون سے دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام نہ دے سکیں۔

مسلمان نوجوان کا ذہن مغربی مادہ پرستوں اور نام نہاد مسلمان دانشوروں نے اتنا بے حس اور ماؤف کر دیا ہے کہ روشن خیالی کے نام پر کبھی کوئی رشدی اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو کبھی کوئی منکرِ حدیث اور منکرِ معجزات۔ کبھی اسلامی جہاد کی ''سفاکیوں'' کو اجاگر کیا جاتا ہے تو کبھی اسلامی عبادات اور ذکر و فکر کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کبھی بے پردگی اور فحاشی کے جواز ڈھونڈے جاتے ہیں تو کبھی شرک و الحاد سے اپنے فکری ڈانڈے ملائے جاتے ہیں۔ دشمن کے ان سبھی حملوں کو ناکام بنانے اور مسلمان کے ایمان کو اس ملحدانہ یلغار سے بچانے کے اور ذرائع بھی ضروری ہیں، لیکن سب سے مؤثر اور فوری طریق کار یہ ہے کہ ہر ممکن ذریعہ سے کام لے کر ''حُبِّ رسول'' کے جذبۂ صادقہ کو بیدار کیا جائے اور حضور ﷺ سے گہری جذباتی وابستگی کو شرطِ ایمان سمجھا جائے۔ ذاتِ مصطفوی سے کمال کی حد تک لگاؤ اور والہانہ عشق ہو کہ یہ محبت ہی سرمایہ دین و ایمان ہے۔ قرآنِ کریم ہم سے اسی بات کا خواہاں ہے کہ دین کی محبت میں ڈوب جائیں۔ اللہ کی عبادت کریں تو اس میں ذوق ہو، سرور ہو، وارفتگی ہو، خشوع و خضوع ہو بے غرضی اور بے نفسی ہو--- جانِ دو عالم، محبوبِ خدا ﷺ کا یہ فرمان ہمیشہ پیش نظر اور حرزِ جاں ہو کہ--- ''تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا، جب تک وہ مجھے اپنے والدین سے، اپنی اولاد سے اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ جانے'' --- محبت عقیدے کو پختہ کرتی ہے، محبوب کا ہر حکم آسان لگتا ہے، اس کی ہر ادا پیاری لگتی ہے اور اس کی بے چون و چرا اطاعت میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔

ایک دردمند عالمِ دین (۱) کا پرسوز پیغام آج کے دوراہے پر کھڑے مسلمان

(۱) مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی ''الحق'' جون ۱۹۸۸ء۔

نوجوان کے لئے یہ ہے کہ---''سب سے پہلے تو آپ یہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ (ہمارے ماں باپ اور دل وجاں آپ پر قربان ہوں) کو محبوبیت کا وہ مقامِ محمود عطا فرمایا ہے جو ہزاروں دوسری خصوصیات کی طرح صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ایک عامی مسلمان کے دل میں آنحضرت کے ساتھ عقیدت ومحبت کے ایسے جذبات چھپے ہوتے ہیں، جن کا بعض وقت دوسروں کو تو کیا خود اس شخص کو بھی احساس نہیں ہوتا، جس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی بدبخت شان رسالت میں کوئی گستاخی کرتا ہے تو وہ لوگ بھی جو بظاہر بس نام کے مسلمان نظر آتے ہیں، آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور ناموسِ رسول کے تحفظ کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔''

''سچی بات یہ ہے کہ بے شمار حوصلہ شکن اور مایوس کن علامتوں کے درمیان یہ ایک بات ہے جو امید افزا ہے، جب تک یہ باقی ہے اور جب تک محبوبِ خدا ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ محبت کا یہ نورانی دھاگہ سلامت ہے تب تک گویا ہمارے پاس دلوں کے تالوں کو کھولنے کی ایک چابی موجود ہے۔جس دن، دل اس بچے کھچے سرمایہ سے بھی خالی ہو جائیں گے، اس دن ہم ایک بڑی نعمت سے محروم ہو جائیں گے اور پھر نام کے مسلمانوں کو کام کے مسلمان بنانے کا کام پہلے سے زیادہ مشکل ہو جائے گا۔''

''سیدالورٰی'' کو جو بات سیرت النبی ﷺ کی دوسری کتابوں سے ممیز کرتی ہے، وہ یہی ہے کہ اس میں محض تاریخی واقعات کو صحت وصفائی ہی سے پیش نہیں کیا گیا؛ بلکہ جو کچھ لکھا گیا ہے، محبت میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔ ہر واقعہ عقیدت کا رنگ لئے ہوئے ہے اور ہر تحریر عظمتِ رسول میں اضافہ کرنے کا باعث ہے۔

یوں تو ہر تحریر پر صاحب تحریر کی چھاپ ہوتی ہے، لیکن ''سیدالورٰی'' کے ہر صفحہ سے مؤلفِ علام کی عظیم شخصیت جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے---انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، پرخلوص جذبۂ عقیدت ہی کے تحت لکھا ہے اور جہاں عقیدت آ جائے وہاں مبالغے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔فرطِ جذبات میں قلم اور زبان پر قابو پانا کوئی آسان بات نہیں۔لیکن مؤلفِ والا جاہ اس کٹھن آزمائش میں پورے اترے ہیں، ان کے احساسِ ذمہ داری کا یہ عالم ہے

کہ قارئین کو یہ باور کرانا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ

''آپ یقین کیجئے کہ جو کچھ لکھا ہے، اس احساس کے ساتھ لکھا ہے کہ بروز قیامت اس کے حرف حرف کا جواب دینا ہے۔ اس لئے حتی الوسع پوری کوشش کی ہے کہ ترتیب درست ہو۔''

حقیقت ہے بھی یہی کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی سند بھی دی ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پچھلے تمام دفتر کھنگالے ہیں۔ اور انتہائی مستند کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ سیرت حلبیہ، آثار محمدیہ، البدایہ والنہایہ، طبقاتِ ابن سعد، سیرتِ ابن ہشام، زرقانی، طبری، مستدرک، تاریخ الخمیس اور صحاح ستہ جیسی بلند پایہ کتب کا کوئی گوشہ ان سے چھپا نہیں رہا، نہ متاخرین کی اختلافی تحریروں کو انہوں نے درخور اعتناء سمجھا ہے اور نہ اپنی طرف سے حشو و زوائد کی ضرورت محسوس کی ہے۔ جہاں ایک واقعہ کے بارے میں ایک سے زیادہ آراء ہیں، وہاں فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سبھی پہلوؤں کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے اور جہاں وہ کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے وہاں بھی اعترافِ حقیقت سے پہلو تہی نہیں کی۔

غزوۂ احد کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد اس بات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ

''قارئین کرام! غزوۂ احد کے واقعات بحمد اللہ اختتام پذیر ہوئے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس غزوے کے کسی واقعے کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، جب کہ اس سے پہلے ہر واقعے کا فرداً فرداً حوالہ پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس غزوہ کے واقعات کی ترتیب میں مؤرخین کا بیان مختلف تھا۔ ایک واقعہ کسی مؤرخ نے ایک جگہ ذکر کیا ہے اور کسی نے دوسری جگہ ---فی الاصل اس غزوہ میں ایسی افراتفری مچ گئی تھی کہ کسی واقعے کے وقت کا تعین کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس لئے ہر مؤرخ نے اپنی صوابدید کے مطابق واقعات بیان کئے ہیں۔ میرے پاس کسی ایک مؤرخ کی ترتیب کو ترجیح دینے کی کوئی مثبت وجہ نہ تھی، اس لئے میں نے تمام حالات و واقعات اور ان کی مختلف ترتیبوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے طور پر ان کو مرتب کر کے آپ کے روبرو پیش کیا ہے۔ اس صورت میں ہر واقعہ کا حوالہ ثبت کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہ تھا۔''

اسی طرح غزوۂ بدر کی تفصیل بیان کرتے وقت ''فٹ نوٹ'' میں اس امر کی وضاحت کردی ہے کہ

''کون کس کے مقابل تھا؟ اس میں خاصا اختلاف ہے۔ ہم کوشش کے باوجود کسی رائے کو ترجیح نہیں دے سکے، اس لئے اس سے صرفِ نظر کرلیا ہے۔''

یہ احساس بھی ہر لمحہ اور ہر لحظہ مؤلفِ ذی شان کے ذہن میں انگڑائیاں لیتا رہا ہے کہ وہ اس عظیم ہستی کے بارے میں لکھنے کی جسارت کررہے ہیں جو بعد از خدا بزرگ ترین ہستی ہے، اس لئے نہ صرف انہوں نے خود تمام لوازمات ملحوظ رکھے ہیں اور باوضو اور باادب رہ کر ایک ایک لفظ بصد عقیدت واحترام لکھا ہے؛ بلکہ ''سیدالوریٰ'' کے قارئین سے بھی وہ اسی ادب واحترام کو ملحوظ رکھنے کے متمنی ہیں۔ چنانچہ جن دنوں ''سیدالوریٰ'' ''جامِ عرفاں'' میں قسط وار چھپا کرتی تھی، اس زمانے میں ہر قسط کے آغاز میں لکھا ہوتا تھا کہ

''خوش ذوق قارئین سے التماس ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران باادب بیٹھیں، اور تمباکو نوشی وغیرہ سے پرہیز کریں۔''

آج جب کہ علم التواریخ کو ایک سوشل سائنس (معاشرتی علم) قرار دے دیا گیا ہے، مؤرخ اور سوانح نگار کا کام اور بھی مشکل اور اَدق ہے، آج کے مؤرخ کے لئے صرف واقعات کو سن وسال کی ترتیب سے پیش کردینا ہی کافی نہیں ہوتا؛ بلکہ ان حالات وواقعات کو اس عمدگی سے پیش کرنا ہوتا ہے کہ اُس دور کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجائے، اس لئے کہ واقعات وحوادث بلائے ناگہانی کی طرح آسمان سے نازل نہیں ہوا کرتے، بلکہ ہر واقعہ اپنے اسباب ونتائج لئے ہوئے ہوتا ہے۔ واقعات کے پس منظر میں پورا معاشرہ اپنے رسم و رواج، عقائد وافکار اور اعمال وافعال کے ساتھ جیتا جاگتا اور سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔

''سیدالوریٰ'' میں اس امر کا اہتمام بڑے التزام کے ساتھ موجود ہے اور سیرت رسولِ انام ﷺ کے بیان کے ساتھ ساتھ اُس دور کے عرب معاشرہ، اُس کے مشاہیر، عوام کا رہن سہن، عقائد وعبادات، شعر وادب، معیشت ومعاشرت کی تمام جزئیات سے قارئین کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا گیا ہے اور ''فٹ نوٹوں'' سے اس سلسلے میں بڑا مفید کام لیا گیا ہے۔ اس

اعتبار سے شاید ہی سیرت النبی ﷺ کی کوئی کتاب اتنی جامع اور مکمل ہو۔ مؤلف کی ژرف نگاری اور دِقّتِ نگاہ کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے اُس دور کے عرب معاشرے کی عکاسی کا حق ادا کیا ہے اور اپنی اس کوشش میں وہ ہر طرح کامیاب رہے ہیں۔

''سیدالوریٰ'' ایک اور اعتبار سے بھی تاریخِ اسلام اور سیرت النبی ﷺ پر کتابوں میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کے فاضل مؤلف نے مغربی اہلِ قلم کے ''واویلا'' کا کوئی اثر قبول کیا اور نہ ان کے طمطراق سے ذہنی مرعوبیت کا شکار ہوئے۔ اسلامی جہاد بالسیف کے بارے میں اکثر لکھنے والوں نے معذرت خواہانہ پالیسی اختیار کیے رکھی اور اپنی تحریروں میں اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں نے تمام لڑائیاں محض دفاعی انداز سے لڑیں۔ ان مصلحت اندیشوں کے برعکس ''سیدالوریٰ'' کے فاضل مؤلف نے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے علی الاعلان کہا کہ

''اسلام میں جہاد کی جو اہمیت ہے، وہ ہر صاحبِ علم پر روشن اور واضح ہے، اسی جہاد کی بدولت جانِ دو عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں عرب کا بیشتر حصہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گیا تھا۔ پھر صدیق اکبر ؓ، فاروق اعظم ؓ اور عثمانِ غنی ؓ نے اس سلسلے کو اتنا آگے بڑھایا کہ اس دور کی فتوحات کا حال پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مجاہدین ''ہر مُلک مِلکِ ماست کہ ملکِ خدا ماست'' کے جذبے سے سرشار عرب سے نکلے اور چھوٹی موٹی ریاستوں کا تو ذکر ہی کیا، روم وایران جیسی بظاہر ناقابل تسخیر طاقتیں بھی ان کے سامنے ٹھہر نہ سکیں اور ''صحرا است کہ دریا است تہ بال و پر ما است'' کا منظر آشکارا ہوگیا۔ ہیروں سے مرصع سونے کے تاج توڑ دیے گئے، بلند و بالا تخت پیوندِ زمین کر دیے گئے اور جہاں تک ہو سکا، خدا کی زمین پر خدا کا قانون نافذ کر دیا گیا، رہی سہی کسر نورالدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ نے پوری کر دی اور آخر میں سلطان محمد عثمانی نے قسطنطنیہ فتح کر کے عیسائی اقتدار کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔''

''یورپ کے مؤرخین نے جب اپنی شرمناک تاریخ پر نظر دوڑائی اور اپنے آباء و اجداد کی المناک شکستوں کے حالات پڑھے تو انہیں ماضی کی اس ذلت سے نکلنے کا اس کے

سوا اور کوئی طریقہ نظر نہ آیا کہ وہ اپنی مظلومیت کا رونا روئیں اور مسلمانوں کو دنیا کے سامنے خونخوار اور ظالم قوم کی حیثیت سے پیش کریں۔ چنانچہ انہوں نے مجاہدین اسلام کی ایسی بھیانک تصویر پیش کی کہ ہر پڑھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ان کے نزدیک مجاہدین گویا وحشت و بربریت کے مجسمے اور سفا کی و قہرمانی کے پتلے تھے، جو ہاتھوں میں خون آشام تلواریں لئے آگ اور خون کی ہولی کھیلتے ہوئے اور تہذیب و تمدن کا ہر نقش مٹاتے ہوئے دنیا بھر میں مصروف تاخت و تاراج تھے۔''

''اس بھیانک تصور کا اتنا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ خود مسلمان اپنے تابناک ماضی سے ندامت و شرمندگی محسوس کرنے لگے اور اس طعنے سے گلوخلاصی کی تدبیریں سوچنے لگے۔''

''اس دور کے اہلِ قلم محققین بھی اسی معاشرے کے افراد تھے، اس لئے وہ بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ اسلام کے دامن سے ''جارحیت'' اور ''پیش قدمی'' کا یہ ''داغ'' کس طرح دھویا جائے۔ آخر انہوں نے یہ تدبیر کی کہ تاریخِ اسلام کی تمام جنگوں کو کھینچ تان کر دفاعی جنگیں قرار دینا شروع کر دیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ اسلام تو ایک امن پسند مذہب ہے اس کو جنگ و جدل سے کیا کام---؟ ہاں، جب مسلمانوں پر حملے کیے گئے اور انہیں بار بار ستایا گیا تو مجبوراً انہیں بھی تلوار اٹھانی پڑی--- اور وہ بھی محض اپنے دفاع کے لئے!''

''گویا سارا جھگڑا اسلامی ریاست کی بقاء کا تھا، اگر کسی محدود سے خطۂ زمین پر اسلامی سلطنت سلامت رہتی تو پھر دنیا بھر میں خواہ کچھ بھی ہوتا رہتا مسلمانوں کو اس سے کوئی غرض نہ ہوتی۔ وہ اپنی ریاضت اور عبادت میں مگن رہتے اور اپنی مملکت کی حدود سے ایک انچ آگے نہ سرکتے۔''

''قارئین کرام! تصویر کے یہ دونوں رخ غلط ہیں۔ اسلام نے مجاہدین کے لئے جو ضابطۂ اخلاق مقرر کیا ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی وحشت و بربریت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا--- بہرحال اگر آپ صلح و جنگ کے تفصیلی ضوابط سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' کا مطالعہ کیجئے!''

یہ تو تھا اسلامی نظریہ جہاد، مؤلف ''سیدالوریٰ'' کے نزدیک۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی جمہور دوستی کا تعلق ہے، اسلام پہلا دین اور پہلی تحریک ہے، جس نے عوام الناس کی قدر پہچانی، غلامی اور اونچ نیچ کا خاتمہ کیا، ہر ایک کو قانون کا یکساں پابند بنایا اور تقویٰ کو معیار فضیلت گردانا۔ غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ نے ایک جگہ اپنے قیام کے لئے پسند فرمائی تھی، لیکن اپنے ایک جان نثار حضرت خباب ؓ کے مشورے پر بعد میں دوسری جگہ منتقل ہوگئے۔ اس سلسلے میں فاضل مؤلف مولوی افضل حق کی تالیف ''محبوب خدا'' کا یہ اقتباس پیش کرتے ہیں

''آنحضرت ﷺ آزادیٔ رائے کے بڑے قدردان تھے--- تدبیر کے معاملہ میں مشورہ قبول فرمالیتے تھے۔ سلیم الفطرت صحابہ ؓ، وحی کے حامل پیغمبر ﷺ کے حضور بڑی جرأت سے رائے دیا کرتے تھے اور سرورِ عالم مناسب رائے کو خوشی سے قبول فرمالیا کرتے تھے۔''

رسولِ خدا ﷺ کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھی۔ آپ پوچھا کرتے تھے۔ ''کیا میں نے ایک عمر تمہارے درمیان بسر نہیں کی؟'' ان کا بڑے سے بڑا دشمن بھی ان کی اخلاقی عظمت سے انکار نہ کرسکتا تھا۔ اسی خلقِ عظیم، اسی صداقت، اسی امانت اور انہی فضائل کو دیکھ کر لوگ ان پر ایمان لائے تھے اور جو ایک بار ان کے حلقۂ احباب میں داخل ہوتا، ان کا عاشق جاں نثار بن جاتا۔ حضرت سعد ابن ابی وقاص ؓ بیان فرماتے ہیں کہ

''احد کے دن عبداللہ ابن جحش ؓ نے مجھے کہا کہ آؤ! دونوں مل کر دعا کریں، آپ دعا کریں، میں آمین کہوں گا۔ میں دعا کروں گا، آپ آمین کہئے۔ حضرت سعد ؓ کہتے ہیں۔ میں نے دعا کی---''الٰہی! میرا سامنا کسی مضبوط دشمن سے ہو، وہ مجھ پر بھرپور حملہ کرے اور میں بھی اس پر پورے زور سے حملہ کروں۔ آخر وہ مارا جائے اور مجھے فتح حاصل ہو جائے۔''

عبداللہ ابنِ جحش ؓ نے آمین کہی، پھر عبداللہ نے دعا کی---''الٰہی! میرا مقابلہ بھی کسی طاقتور دشمن سے کرا، وہ مجھ پر زوردار حملہ کرے اور میں اس پر وار کروں، آخر میں تیری راہ میں مارا جاؤں اور میرے ناک کان بھی کاٹ لئے جائیں--- اور جب میں

اس حال میں تیرے روبرو پیش ہوں تو تُو پوچھے ''ابن جحش! تیرے ناک کان کیوں کاٹ لئے گئے تھے؟'' میں جواب دوں ''اے اللہ! وہ تیری اور تیرے رسول کی راہ میں کاٹے گئے تھے'' پھر تو کہے کہ ''سچ کہتے ہو، عبداللہ ابن جحش! واقعی، میری ہی راہ میں کاٹے گئے تھے۔''

اللہ اللہ! کیسے لذت آشنائے درد لوگ تھے

لذتِ رقصِ بسمل شہیدوں سے پوچھ
آ گئے وجد میں سر جو کٹنے لگا''

زندگی ایک بے مقصد اور بے معنی چیز نہیں، کامیاب وہی ہے جس کے سامنے ایک مقصد عالی ہو اور وہ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی ساری توانائیاں وقف کر دے، مقصد سے لگاؤ اور عشق کا راز سیکھنا ہو تو کوئی سیرتِ محمدی سے سیکھے۔ مکہ کی زندگی میں جب قریشِ مکہ جناب ابو طالب پر پورا دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ آنحضرت ﷺ کی حمایت اور اعانت سے ہاتھ اٹھالیں اور چچا ابو طالب کی برداشت بھی دم توڑتی معلوم ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ کس صبر و استقلال سے گویا ہوتے ہیں

''چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں اور پھر مجھ سے مطالبہ کریں کہ میں اعلانِ توحید ترک کر دوں تو میں پھر بھی ان کا مطالبہ مان نہیں سکتا --- اب یہ کام جاری رہے گا۔ یا تو میں کامیاب ہو جاؤں گا، یا اسی راہ میں میری جان چلی جائے گی۔''

''سید الوریٰ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھ ایسا قاری تو ایک عالمِ حیرت و استعجاب میں پہنچ جاتا ہے۔ معلومات کا اتنا ذخیرہ اور پھر اتنی صحت اور احتیاط سے، اتنے سلیقہ اور ترتیب سے ---!! ان کی تدوین وہی کر سکتا ہے جس پر اللہ کی خاص نظر کرم ہو --- کوئی باور نہیں کر سکتا کہ ہری پور ہزارہ جیسے غیر معروف مقام میں رہتے ہوئے کوئی اتنا وقیع دینی اور ادبی کارنامہ انجام دے گا۔ زمان و مکان کے تناظر میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ چالیس برس کی عمر میں، ایک انتہائی مصروف اور انتہائی سادہ وضع قطع اور دیہی طور طریقوں والا مردِ درویش، جانِ دو عالم ﷺ کے سیرت نگاروں اور مدح سراؤں میں اتنا قابلِ رشک مقام

حاصل کرنے میں کامیاب اور کامران ہو سکے گا --- ایک عرصہ سے ان کا گھرانا ملک کے ایک کونے میں چراغِ علم ومعرفت روشن کئے بیٹھا ہے --- یوں تو اس علمی خانوادے کا ہر فرد نور علی نور ہے۔ تاہم مؤلف ''سیدالوریٰ'' اور مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''جامِ عرفاں'' حضرت قاضی عبدالدائم دائمؔ مدظلہ العالی کی شان ہی کچھ اور ہے۔ وہ گدڑی میں چھپے ہوئے لعل ہیں --- کسی یونیورسٹی یا علمی مرکز میں ہوتے تو کسی اونچے مرتبے پر فائز ہوتے، لیکن یہاں تو سادگی اور گوشہ نشینی ہے۔ وہ سجادہ نشین ضرور ہیں لیکن نہ پیروں ایسی سج دھج ہے، نہ کوئی مخصوص وضع قطع۔ نہ ملاقات کا وقت متعین ہے، نہ ارادتمندوں سے رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ --- بات چیت بھی علمیت اور تفاخر سے مبرّا --- علم کا بحر ناپیدا کنار ہیں۔ تعلیم وتدریس، وعظ ونصیحت امامت وخطابت کے ساتھ ساتھ مجاہدہ ومراقبہ، غور وفکر اور عبادت وریاضت کا سلسلہ بھی جاری ہے اور تصنیف وتالیف کا شغلِ لطیف بھی --- انہیں نہ لکھنؤ کے دبستانِ ادب سے مستفید ہونے کا موقع ملا، نہ انہوں نے دہلی کے مکتبِ فکر کی خوشہ چینی کی ہے! تاہم ان کی تحریر میں وہ لطیف چاشنی اور مٹھاس ہے جو بہت ہی کم تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں جو دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا تخاطب عوام الناس سے ہے، اس لئے وہ انہی کی زبان میں بات کرتے ہیں --- علمیت کا اظہار کبھی ان کا مقصود نہیں رہا، نہ علمی اصطلاحات سے انہوں نے کبھی اپنی تحریر کو بوجھل ہونے دیا ہے۔ البتہ یہ احساس ہر وقت انہیں دامن گیر ہے کہ بات کیسے کی جائے، اندازِ بیان کیسا ہو، اس لئے کہ انہیں اسلوبِ بیان کی اہمیت کا اندازہ ہے۔

سیفؔ اندازِ بیاں بات بنا دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

وہ بات کرنے کا ڈھنگ جانتے ہیں اور بات میں دلچسپی پیدا کرنے کے فن سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ اسی لئے اظہارِ بیان میں کبھی بات چیت اور مکالمے کا انتخاب کر لیتے ہیں اور کبھی کوئی شعر ایسا برمحل کہہ دیتے ہیں کہ قاری پورے سیاق وسباق کے ساتھ بات بھی سمجھ جاتا ہے اور اس کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔ جانِ دوعالم ﷺ کے والد ماجد جناب

عبداللہ کے جمالِ بے مثال کو کس حسن وخوبی سے بیان کیا ہے کہ

''دس بیس نہیں، سینکڑوں لڑکیاں ان کی محبت میں گرفتار تھیں اور آس لگائے بیٹھی تھیں کہ ہماری شادی عبداللہ سے ہو جائے گی، مگر جب عبدالمطلب نے سیدہ آمنہ کو بہو منتخب کرلیا تو عشقِ عبداللہ میں وارفتہ لڑکیاں عمر بھر غم محبت کو دل میں بسائے کنواری بیٹھی رہیں اور انہوں نے کہیں بھی شادی نہیں کی کہ ہاں! اگر عبداللہ نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں۔

ہاں مجھے اب اپنی ان تنہائیوں سے پیار ہے
یہ جو میرے ساتھ ہیں تیرے چلے جانے کے بعد''

حضور سرورِ کائنات، فخر موجودات ﷺ کی اس دنیا میں تشریف آوری کا تذکرہ ہر سیرت نگار نے بڑے التزام اور بڑی توجہ سے کیا ہے، تو مصنف ''سیدالوریٰ'' بھی اس سلسلے میں کسی سے پیچھے کیوں رہتے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی ولادت مبارکہ کی تصویر کشی یوں کی ہے

''بالآخر انتظار کا زمانہ کٹ گیا--- فراق کا عرصہ ختم ہوا اور نبوت ورسالت کے آفتاب عالمتاب کے ضیا بار ہونے کا وقت قریب آن لگا--- یہ اپریل کا مہینہ تھا اور موسمِ بہار--- اس سہانے موسم کی ایک ایک چیز پر--- اس کی مہکتی فضاؤں پر، دُربار گھٹاؤں پر، عنبر افشاں ہواؤں پر، مسکراتی کلیوں پر، کھلکھلاتے پھولوں پر، مرغزاروں، شاخساروں پر اور ان میں چہچہاتی گنگناتی چڑیوں پر، ڈالی ڈالی پر رقصاں خوش نما وخوش نوا پرندوں پر، گلوں کو چومتی اور فرطِ مسرت سے جھومتی بلبلوں پر--- غرضیکہ بہار کی ایک ایک ادائے دلنواز پر شاعروں نے کئی کئی غزلیں کہہ ڈالیں، ادیبوں نے فن پارے تخلیق کر دیئے مگر حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔''

اسی موضوع کو آگے چل کر یوں بیان کیا ہے

------اس بہار میں------

☆---وہ گلِ رعنا کھلا، جس کی بوئے دلآویز سے چمنستانِ دہر کا ہر طائر مست و بیخود ہو گیا۔

☆---وہ نسیم سحر چلی، جس کے ہر جھونکے میں گلزارِ ازل کی مہک رچی تھی۔

☆---وہ صبا محوِ خرام ہوئی، جس کی اٹھکیلیوں سے باغِ ابد کی ہر کلی مسکرا پڑی، ہر شگوفہ کھل اٹھا۔

☆---وہ بادِ بہاری چلی جس کی راحت بخش تھپکیوں سے بیقرارانِ عالم کو قرار آ گیا۔

☆---وہ ابرِ نیساں برسا جس کا ہر قطرہ منت کشِ صدف ہوئے بغیر دُرِ شہوار بن گیا۔

☆---وہ شبنم پڑی، جس کا نم گلستانِ عالم کے پتے پتے کے لئے آبِ حیات ثابت ہوا۔

یہ ربیع الاوّل کی بارھویں تاریخ تھی اور سوموار کی رات

اس رات کو

وہ مہر تاباں نور بار ہوا جس کی روپہلی کرنوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ روشنی میں نہا گیا---وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا---اور زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھی۔''

تحریر کے لطف کو دوبالا کرنے کے لئے مؤلف علام نے کبھی کبھی گفتگو کا انداز اور مکالمہ کا طریق اختیار کیا ہے۔ یہ تنوع اور جدت بہت خوب ہے---راہب بحیرہ اور جناب ابوطالب کی بات چیت ملاحظہ کیجئے۔

''یہ بچہ آپ کا کیا ہے؟''

''بیٹا ہے میرا۔'' ابوطالب نے جواب دیا۔

''بیٹا---؟ نہیں، یہ آپ کا بیٹا نہیں ہو سکتا'' راہب بولا ''اس کا باپ زندہ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''ٹھیک ہے---بھتیجا ہے میرا۔'' ابوطالب کو حقیقت بیان کرتے ہی بن پڑی۔

''اس کے باپ کی وفات کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

''وہ تو اسی دوران چل بسا تھا جب یہ شکمِ مادر میں تھا۔''

''اس کی ماں موجود ہے؟''

''نہیں---وہ بھی چند سال پہلے انتقال کر گئی ہے۔''

اپنا اطمینان کر لینے کے بعد راہب گویا ہوا---''بلاشبہ آپ سچ کہہ رہے ہیں اور میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس کو یہودیوں سے بچا کر رکھیے، کیونکہ یہودی حاسد لوگ ہیں

اور اگر انہیں ان علامات کا پتہ چل گیا جو مجھے معلوم ہوئی ہیں تو وہ ضرور اسے قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔''

تصویر کشی اور منظر نگاری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ معجزہ شق الصدر کا بیان ہے۔

''مائی حلیمہ کہتی ہیں---''دوپہر کا وقت تھا--- ہم گھر میں بیٹھے تھے کہ اچانک میرا بیٹا چیختا چلاتا اور شور مچاتا ہوا آیا---''او امی!''---''او ابو! میرے قریشی بھائی کو بچا لیجئے، مجھے ڈر ہے، آپ اسے زندہ نہیں پا سکیں گے۔''

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا---''قصہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم اُدھر کھڑے تھے۔'' اس نے ہانپتے ہوئے وادی کی طرف اشارہ کیا'' کہ اچانک ایک آدمی آیا اور اس کو پکڑ کر پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا، پھر اسے لٹا کر اس کا سینہ چیرنے لگا--- مجھے کچھ پتہ نہیں کہ پھر کیا ہوا؟''

جذبات کی عکاسی کا کیا رنگ اختیار کیا گیا ہے---!

ساری کتاب ہی یہی ادبی شان لئے ہوئے ہے۔ ایک اور تصویر درد ملاحظہ ہو۔

''جب عمار رضی اللہ عنہ، یاسر رضی اللہ عنہ اور سمیہ رضی اللہ عنہا تینوں ہی ایمان لے آئے تو مشرکین کی آتشِ انتقام بھڑک اٹھی اور انہوں نے ان تینوں کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچانا شروع کر دیں۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ تشدد کی تاب نہ لا سکے اور واصل بحق ہو گئے۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو ابوجہل نے اس زور سے برچھی ماری کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر گئیں۔ یہ اسلام کی پہلی شہیدہ تھیں۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ البتہ زندہ رہے اور مدتوں سختیاں جھیلتے رہے۔ کبھی ان کو لوہے کی زرہ پہنا کر سخت دھوپ میں بٹھایا جاتا۔ کبھی ان کے بدن کو آگ سے جلایا جاتا، جب اذیت رسانی کا مرحلہ گزر جاتا تو جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے اور ان کے جلے ہوئے بدن پر اپنا دستِ شفقت پھیرتے ہوئے اس طرح دم کرتے---یَانَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی عَمَّارٍ کَمَا کُنْتِ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ.

(اے آگ! تو عمار کے لئے اس طرح ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا، جس طرح ابراہیم کے لئے بنی تھی۔)

کون جانے کہ اس پیار بھرے انداز سے دم کرنے میں اور اس نورانی ہاتھ کے لمس سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بدن میں کیف و سرور اور برودت و سکون کی کیسی لہریں دوڑ جاتی ہوں گی---!''

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کا حق اسی اہل دل سے ادا ہو سکتا ہے جو کتابی علم میں بھی یکتا ہو اور اسے علم لدنی سے بھی وافر حصہ ملا ہو۔ جو محض گفتار کا دھنی نہ ہو؛ بلکہ صاحب کردار بھی ہو۔ اس لئے کہ ہر شئے سے کہیں زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ کردار ہی نے لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا--- جب آپ تن تنہا تھے، تب بھی اور جب آپ لاکھوں کے محبوب مقتدا تھے، تب بھی معترضوں کو یہی چیلنج تھا---''کیا میں نے ایک عمر آپ کے درمیان نہیں گزاری؟''

مؤلف ''سیدالوریٰ'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کا یہی شفاف آئینہ ہمارے سامنے رکھ کر پوچھتے ہیں کہ کیا ہمارے کردار میں اس ذاتِ والا صفات کے کردار کی کوئی جھلک ہے---؟ کیا ہمارے دل نورِ نبوت سے منور و مستنیر ہیں---؟ کیا ہمارا طرزِ عمل آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار سے کوئی لگا کھاتا ہے---؟ کیا ہمارے دل، جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت کے جذبات سے بھرپور ہیں---؟ کیا ہمارا ضمیر عظمتِ رسالت پر گواہی دیتا ہے---؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن صرف لوگوں کے ظاہر کو بدلنا نہ تھا؛ بلکہ انسانیت کے باطن کو متاثر کرنا تھا۔ پیغمبروں کے نزدیک کامیابی، مالیاتی کا نام نہیں ہوتا، نہ وہ معاشی اور معاشرتی خوشحالی کے حصول تک اپنی مساعی کو محدود رکھتے ہیں؛ بلکہ پیغمبر، دل کی دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے لئے آتے ہیں، اس لئے کہ جب تک دل کی دنیا نہیں بدلتی، باہر کی دنیا بھی اصلاح پذیر نہیں ہوسکتی--- انسانی دل سدھرے گا تو خارجی ماحول بھی سدھرے گا۔ انسانی دل میں بگاڑ آئے گا تو سارے معاشرے میں بگاڑ آجائے گا---اہل ایمان واخلاص کے لئے، شمع محمدی کے پروانوں کے لئے، یہ جان لینا ضروری ہے کہ روحِ محمدی کے بغیر، اتباع سنت کے بغیر، پیروی سیرت جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر ہماری نجات ہے، نہ دنیوی فلاح---کیا بات کہہ گئے ہیں اقبالؔ

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید — وز رسالت درتنِ ما جاں دمید
از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما، آئینِ ما
از رسالت صد ہزار ما یک است — جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
ماز حکمِ نسبتِ او ملتیم — اہلِ عالم راپیامِ رحمتیم
قوتِ قلب و جگر گردد نبی ﷺ — از خدا محبوب تر گردد نبی ﷺ

خالقِ حقیقی شاد و آباد رکھے ساقی ''جامِ عرفاں'' کو، مسند نشین خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ صدریہ ہری پور (ہزارہ) کو، وارثِ امیر شریعت وطریقت، عارف ربانی حضرت معظم علامہ قاضی محمد صدرالدین رحمہ اللہ کو، اور سیرت نگارِ سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کو، جنہوں نے اسوۂ حسنۂ ہادیٔ دو جہاں ﷺ کو اتنی عمدگی، اتنی عقیدت، اتنے خلوص اور اتنی جامعیت سے ''سیدالورٰی'' کی صورت میں ہم عاجزوں اور ہیچمدانوں کی رہبری، رہنمائی اور فلاحِ دارین کے لئے پیش کیا۔

اللہ پاک انہیں جزائے عظیم دے اور ہمیں توفیق بخشے کہ ہم اپنی زندگیوں کو سنت و سیرتِ محمدی کے سانچے میں ڈھال سکیں کہ یہی صراطِ مستقیم ہے اور یہی منزلِ مومن!

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلىٰ خَيْرِ خَلْقِهٖ وَنُوْرِ عَرْشِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

طالبِ دعا
محمد شفیع صابر
۱۵ فورٹ روڈ، پشاور صدر

باب ۱

شرف و نجابت

جانِ دو عالم ﷺ کے دادا جان، ابّا جان امّی جان کے جستہ جستہ حالات

زمانہ جاہلیت کی فحاشی و عریانی کے دوران اپنے کردار کو پاکیزہ رکھنے والوں کے دلچسپ واقعات

کہاں سے کہاں تک--- محمد ﷺ محمد ﷺ

سید انوار ظہوری

ضمیرِ زمیں سے لبِ آسماں تک محمد محمد
اِدھر سے اُدھر تک ، یہاں سے وہاں تک محمد محمد
ہوں اربابِ صحرا کہ ناہید و زہرہ ، سبھی یک زباں ہیں
دیارِ عرب سے دمِ کہکشاں تک محمد محمد
یہی ذکرِ پیہم ، یہی نام ہر دم ، یہی اک وظیفہ
منارِ تخیل سے اقصائے جاں تک محمد محمد
سرِ دشت ، صرصر کی شوریدہ لے میں سلگتی نوا سے
سمندر کی منہ زور موجِ رواں تک محمد محمد
ازل تا ابد ، روح و دل کی فضا میں اِدھر بھی یہ چرچا
اُدھر قبر سے حشر کے امتحاں تک محمد محمد
بتوفیقِ رحماں ، بتعمیلِ قرآں ، بتائیدِ عرفاں
شب و روز ہستی سے اگلے جہاں تک محمد محمد
ورائے قیاس و گماں بھی یقیناً انہیں کی تجلی
بظاہر حدودِ قیاس و گماں تک محمد محمد
فضائے ازل کا وہ پہلا ستارا ، ابد آشکارا
بہ خطِ نظارہ کہاں سے کہاں تک محمد محمد
سرِ لوحِ محفوظ بھی ، وردِ حق بھی ، یہی نامِ نامی
نہیں ہے فقط پنج وقتہ اذاں تک محمد محمد
سبھی اہلِ ایماں ، انہی کے سلامی ، بہ فخرِ غلامی
مری بزم سے بزمِ کروبیاں تک محمد محمد
مدینے میں تحسین فرما لبوں پر ظہوری ظہوری
یہاں بھی دلِ مضطرب سے زباں تک محمد محمد

شجرۂ عالی شان---از---گرامی قدر عدنان---تا---سرورِ کون مکان

نسب نامہ

بعض مؤرخین جانِ دو عالم ﷺ کا پورا نسب نامہ ذکر کرتے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوتا ہوا حضرت آدم علیہ السلام تک جا پہنچتا ہے مگر حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب عدنان تک تو سلسلۂ نسب صحیح طور پر ثابت ہے مگر اس کے بعد نسب بیان کرنے والے غلط بیانی کرتے ہیں۔ اس لئے عدنان تک نسب نامہ پیش خدمت ہے۔ اعراب کے ذریعے ہر نام کا درست تلفظ واضح کر دیا گیا ہے۔

اگلے صفحے پر

كِلَاب
قُصَیْ
عَبْدُ مَنَاف
هَاشِمْ
عَبْدُالْمُطَّلِبْ
حضرت
عَبْدُاللّٰه
زُهْرَه
عَبْدُ مَنَاف
وَهْبْ
سَیِّدَه اٰمِنَه
حضرت
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه
صلی اللہ علیہ وسلم

والدِ ماجد ذبیح اللہ جناب عبداللہ

جانِ دو عالم ﷺ کے والد ماجد کے نامِ نامی کے ساتھ ''ذبیح اللہ'' دیکھ کر آپ حیران تو ہوئے ہوں گے، کیونکہ عام طور پر ذبیح صرف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو سمجھا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح عبداللہ بھی ذبیح ہیں۔۔۔جبھی تو جانِ دو عالم ﷺ اپنی خاندانی عظمت و شرافت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اَنَا ابْنُ الذَّبِیْحَیْنِ'' (میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں۔)(۱)

ذبیح اول حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ذبیح ثانی عبداللہ ہیں۔

ذبحِ عبداللہ کا واقعہ بھی ذبحِ اسمٰعیل علیہ السلام سے کم حیرت انگیز نہیں ہے، لیکن اس کا پس منظر سمجھنے کے لئے تاریخ ماضی کے چند اوراق پلٹنے پڑیں گے۔

زمزم کی گمشدگی

ایک زمانہ تھا جب مکہ مکرمہ پر جرہم قبیلہ کی حکمرانی ہوا کرتی تھی۔ یہ قبیلہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ سے مکہ مکرمہ میں آباد چلا آرہا تھا۔ اپنے کردار و عمل کے لحاظ سے یہ لوگ پہلے تو بہت اچھے رہے لیکن پھر بتدریج بدکاریوں کی طرف راغب ہوتے چلے گئے۔

رئیس قبیلہ عمر بن حارث جرہمی ایک اچھا آدمی تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ لوگ اپنی روش اور طرزِ حیات بدل لیں مگر لوگوں کو تو عیاشیوں کا چسکا پڑ چکا تھا اس لئے اس کی نصیحتوں پر کسی نے بھی کان نہ دھرا۔

اپنی قوم کی مسلسل روبہ زوال اخلاقی حالت دیکھ کر عمر بن حارث کو خیال آیا کہ اگر میری قوم کے یہی شب و روز رہے اور ان کی بے باکی کا یہی عالم رہا تو ایک نہ ایک دن ہم پر عذابِ الٰہی نازل ہو کر رہے گا اس لئے بہتر یہ ہے کہ کعبہ فنڈ میں جمع شدہ سونا اور دیگر قیمتی

---

(۱) تفسیر کشاف، سورہ صٰفّٰت ۷، زیرِ آیہ۔ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ الآیہ۔

سامان کہیں چھپا دیا جائے، تا کہ اگر عذاب الٰہی نازل ہو ہی جائے تو ہم پر جو گزرے گی سو گزرے گی، لیکن کعبہ مکرمہ کا مال تو بہر حال محفوظ رہے گا۔

چنانچہ اس نے کعبہ فنڈ میں جمع شدہ اموال کو جن میں سونے کے بنے ہوئے دو ہرن، کچھ تلواریں اور کچھ زرہیں شامل تھیں، یکجا کیا اور چاہِ زمزم میں دفن کر دیا۔ ان دنوں جرہم کی بداعمالیوں کے سبب زمزم بھی خشک ہو چکا تھا اس لئے اموال کعبہ کو دفن کرنے کے بعد اس نے کنواں بھی بھر دیا۔

آخر وہی ہوا جس کا عمر بن حارث کو ڈر تھا --- جب جرہم کی سیاہ کاریاں حد سے بڑھ گئیں تو خزاعہ نامی قبیلہ کی معدّ ذیلی شاخوں نے مل کر جرہم پر حملہ کر دیا۔ جرہم نے مقابلہ کیا لیکن بری طرح شکست کھائی اور حملہ آور مکہ مکرمہ پر قابض ہو گئے۔

اس لڑائی میں جرہم کے بہت سے افراد مارے گئے اور جو زندہ بچے وہ در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے یمن کی طرف بھاگ گئے۔ (۱)

امتدادِ زمانہ کے باعث رفتہ رفتہ چاہِ زمزم کا نام و نشان تک مٹ گیا اور کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ وہ کہاں ہوا کرتا تھا --- اسی عالم میں پانچ سو سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ (۲)

جب میراثِ ابراہیم و اسمٰعیل کے وارثِ اعظم، باعثِ ایجادِ کعبہ و زمزم ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری کا وقت قریب آیا تو ارادہ الٰہی ہوا کہ اس کنویں کو دوبارہ منظر عام پر لایا جائے اور لوگوں کو پھر سے اس مبارک پانی سے سیراب کیا جائے --- اور یہ عظیم سعادت جانِ دو عالم ﷺ کے دادا جان عبدالمطلب کو حاصل ہوئی کہ ان کے

---

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۱۸۴، ۱۸۵، الاعلام ببیت اللہ الحرام، ص ۴۶، ۴۷، تاریخ ابن جریر طبری، ج ۲، ص ۱۹۸، ۱۹۹۔

مکہ مکرمہ سے بے سروسامانی اور کس مپرسی کے عالم میں فرار ہوتے وقت عمر بن حارث نے ایک دردناک نظم بھی کہی تھی جس کے لفظ لفظ سے غم کا دھواں اٹھتا ہے مگر قارئین کی اکثریت چونکہ عربی سے ناآشنا ہے، اس لئے ہم نے اس کو نقل نہیں کیا۔ (۲) الزرقانی، ج ۱، ص ۱۱۱، السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۳۵۔

ذریعے اللہ تعالیٰ نے صدیوں کے گم گشتہ چاہِ زمزم کو پھر سے جاری فرما دیا۔

عبدالمطّلب (۱) کا خواب

عبدالمطلب نے ایک رات خواب دیکھا، کوئی کہہ رہا تھا ''طَیِّبَہ کھودو!''

''طَیِّبَہ کیا چیز ہے؟'' عبدالمطلب نے پوچھا --- مگر کوئی جواب نہ ملا۔

دوسری رات پھر خواب دیکھا، کہا گیا --- ''بَرَّہ کھودو!''

''بَرَّہ کیا؟'' عبدالمطلب نے پوچھا --- پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔

تیسری رات پھر حکم ملا --- ''مَضْنُوْنَہ کھودو!''

''مَضْنُوْنَہ سے کیا مراد ہے؟'' --- حسبِ سابق جواب میں خاموشی رہی۔

عبدالمطلب اہل زبان تھے، تینوں الفاظ کے معانی (۲) بخوبی جانتے تھے، مگر حیران تھے کہ ان سے مراد کیا ہے؟ پھر ایک رات صراحۃً کہا گیا کہ زمزم کھودو!

اب تو معاملہ صاف ہو گیا --- عبدالمطلب سمجھ گئے کہ طَیِّبَہْ، بَرَّہْ اور مَضْنُوْنَہْ زمزم ہی کے صفاتی نام ہیں۔

صبح آپ نے اپنی قوم سے ذکر کیا کہ مجھے خواب میں زمزم کھودنے کا حکم ملا ہے۔ چونکہ زمزم کو گم ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں اور کسی کو بھی اس کی صحیح جگہ معلوم نہیں تھی، اس لئے لوگوں نے پوچھا --- ''کیا یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زمزم ہے کہاں پر؟''

''نہیں --- یہ تو نہیں بتایا گیا'' عبدالمطلب نے جواب دیا۔

''اگر یہ خواب سچا ہوا'' لوگوں نے کہا ''اور حکم، اللہ کی طرف سے ہوا تو آپ کے

---

(۱) عبدالمطلب کا بچپن یثرب (مدینہ) میں گذرا تھا۔ جب بڑے ہوئے تو ان کے چچا مطلب ان کو وہاں سے لے آئے۔ واپسی پر جب مکہ میں داخل ہوئے تو لوگوں نے سمجھا کہ مطلب کوئی عبد، یعنی غلام ساتھ لے آئے ہیں اسلئے لوگوں نے ان کو عبدالمطلب کہنا شروع کر دیا، یعنی مطلب کا غلام۔ بعد میں مطلب نے بہت کہا کہ یہ میرے بھائی ہاشم کا بیٹا ہے اور میرا بھتیجا ہے نہ کہ غلام، مگر جو نام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ چکا تھا، چڑھا ہی رہا۔ عبدالمطلب کا اصلی نام عامر، لقب شیبہ اور کنیت ابوالحارث ہے۔

(۲) طَیِّبَہْ کا معنی ہے ''عمدہ چیز'' بَرَّہْ کا معنی ہے ''نیکو کار لوگوں کے لئے'' اور مَضْنُوْنَہْ کا معنی ہے ''مخصوص شی''

لئے جگہ کی نشاندہی بھی کردی جائے گی۔''

خواب سچا تھا، اس لئے دوبارہ حکم ہوا۔

اِحْفِرْ زَمْزَم، اِنَّکَ اِنْ حَفَرْتَهَا لَنْ تَنْدَمْ، وَهِیَ مِیْرَاثٌ مِنْ اَبِیْکَ لَاَعْظَمْ، لَا تَنْزِفُ وَلَا تُذَمْ، تَسْقِیْ الْحَجِیْجَ الْاَعْظَمْ.

(زمزم کھودو، اسے کھود کر تمہیں شرمسار نہیں ہونا پڑے گا۔ وہ تمہارے بڑے باپ (حضرت اسمٰعیل علیہ السلام) کی میراث ہے۔ نہ کبھی خشک ہوگا، نہ اس کا پانی کم ہوگا۔ بے شمار حاجیوں کو سیراب کرے گا۔)

عبدالمطلب نے پوچھا ''اَیْنَ هِیَ؟'' (وہ ہے کہاں پر؟)

جواب ملا ''بَیْنَ الْفَرْثِ وَالدَّمِ، عِنْدَ قَرْیَةِ النَّمْلِ حَیْثُ یَنْقُرُ الْغُرَابُ الْاَعْصَمُ.''

(چیونٹیوں کے بل کے پاس، جہاں سفید سینے والا کوا گوبر اور خون میں چونچ مار رہا ہو۔) (۱)

زمزم کی تلاش

عبدالمطلب بیدار ہو کر صبح صبح حرم کی طرف چلے۔ وہاں چیونٹیوں کا بل تو آسانی سے مل گیا، لیکن گوبر اور خون میں چونچ مارتا ہوا کوا کہیں بھی نظر نہ آیا۔

عبدالمطلب حیران و پریشان کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ ناگاہ کہیں قریب سے نیم ذبح شدہ گائے لوگوں کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ عبدالمطلب نے دیکھا کہ گائے دوڑتی دوڑتی آئی اور چیونٹیوں کے بل کے پاس بے دم ہو کر گر پڑی۔ اتنے میں پیچھے سے لوگ بھی آپہنچے۔ انہوں نے وہیں گائے کو ذبح کیا، چمڑا اتارا اور گوشت وغیرہ کاٹا --- اس سارے عمل کے نتیجے میں وہ جگہ گوبر اور خون سے لتھڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد کہیں سے سفید سینے والا کوا اڑتا ہوا آیا اور گوبر اور خون میں چونچ مارنے لگا۔ (۲)

خواب میں بتائی گئی ساری علامتیں پوری ہو گئیں تو عبدالمطلب کو یقین ہو گیا کہ چاہِ زمزم اسی جگہ مستور ہے۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۴۵، ۲۴۶، السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۳۶، سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۹۸۔ (۲) السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۳۷، روض الانف، ج ۱، ص ۹۸۔

زمزم کی کھدائی اور قریش کا جھگڑا

اگلے دن عبدالمطلب نے کدال وغیرہ لی اور اپنے بیٹے حارث کو ساتھ لے کر مقرر کردہ جگہ آ پہنچے۔ کھدائی کا آغاز کرنے ہی لگے تھے کہ قریش نے شور مچا دیا

''خدا کی قسم! جن دو، بتوں کے پاس لا کر ہم اپنی قربانیاں ذبح کرتے ہیں، ان کی درمیانی جگہ میں ہم آپ کو کھدائی کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔''(۱)

مگر عبدالمطلب تو اس کھدائی پر خدا کی طرف سے مامور تھے، اس لئے لوگوں کے شور و غوغا سے متاثر ہوئے بغیر حارث سے کہنے لگے

---

(۱) واضح رہے کہ عبدالمطلب کے لئے جس جگہ کی نشاندہی کی گئی تھی، وہ جگہ اساف اور نائلہ نامی دو، بتوں کے درمیان تھی۔ قریش اپنی قربانیاں انہی دو بتوں کے پاس ذبح کیا کرتے تھے۔

آیئے، اساف و نائلہ کی حقیقت معلوم کر لیجئے، اور اندازہ کیجئے کہ انسان جب شرک کی پستیوں میں گرتا ہے تو کہاں تک گرتا چلا جاتا ہے۔

اساف و نائلہ قبیلہ جرہم کے دو افراد تھے --- مرد اور عورت --- مرد کا نام اساف تھا اور عورت کا نائلہ۔ ان دونوں نے ایسی گھناؤنی حرکت کی تھی کہ ابلیس بھی چیخ اٹھا ہوگا --- انہوں نے عین ایام حج میں جب کعبہ مکرمہ کو تھوڑی دیر کے لئے خالی پایا تو اندر گھس کر زنا کیا اور غضب الٰہی کو دعوت دی۔ اللہ تعالیٰ اس قدر ناراض ہوا کہ دونوں کو مسخ کر کے پتھر بنا دیا۔ لوگوں نے جب انہیں مسخ شدہ حالت میں پایا تو ان کو کعبہ کے قریب نصب کر دیا، تاکہ ہر دیکھنے والا ان کے انجام سے عبرت حاصل کرے۔

کچھ عرصے تک تو یہ سامانِ عبرت بنے رہے، مگر جب طویل مدت گزر گئی اور عرب میں شرک و بت پرستی کا رواج عام ہوگیا تو رفتہ رفتہ ان مسخ شدہ مجسموں پر بھی تقدس کا رنگ چڑھنا شروع ہوگیا اور بالآخر اندھی عقیدت کی بوقلمونیوں نے یہ کرشمہ بھی دکھایا کہ وہ ملعون و مغضوب مجسمے جن پر رہتی دنیا تک لعنت کی جانی چاہئے تھی، اس قدر محترم ہوگئے کہ ان کے پاس لا کر جانوروں کی قربانی دینا قبولیت کی سند ٹھہرا اور ان کے آس پاس کی جگہ بھی اتنی مقدس اور پاکیزہ قرار پائی کہ وہاں عبدالمطلب کا کھدائی کے لئے کدال چلانا سوء ادب شمار کیا جانے لگا۔ فَیَاللعَجَبْ!!! اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِلتَّوْحِیْدِ، مَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ۔

’’بیٹا! جب تک میں کھدائی نہ کرلوں، اس وقت تک ان لوگوں کو مجھ تک پہنچنے سے روکے رکھنا---واللہ! مجھے جس کام کا حکم دیا گیا ہے، اسے بہرصورت کر کے چھوڑوں گا۔‘‘

قریش نے جب عبدالمطلب کے اس عزم واستقلال کو دیکھا تو ٹھنڈے پڑ گئے اور رک گئے۔(۱)

عبدالمطّلب کی عجیب نذر

اس وقت تک عبدالمطلب کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس لئے دل میں خیال پیدا ہوا کہ فی الحال تو یہ لوگ رک گئے اور خاموش ہوگئے ہیں، لیکن اگر یہ اپنی بات پر اڑ جاتے تو میرا ایک ہی بیٹا کس طرح ان کو روک سکتا تھا؟

عدی بن نوفل نے تو آپ کو ’’لاولد‘‘(۲) ہونے کا طعنہ بھی دے دیا، کہا

يَاعَبْدَالْمُطَّلِبْ! تَسْتَطِيْلُ عَلَيْنَا وَاَنْتَ فَذٌّ لَاوَلَدَ لَکَ وَلَا مَالَ لَکَ، وَمَآ اَنْتَ اِلَّا وَاحِدٌ مِّنْ قَوْمِکَ.

(عبدالمطّلب! آپ ہم پر رعب گانٹھتے رہتے ہیں، حالانکہ نہ آپ کی اولاد ہے، نہ آپ کے پاس مال ہے، آپ تو ایک تنہا آدمی ہیں۔)

ایسے میں عبدالمطّلب کو اپنی بے سروسامانی اور تنہائی کا شدت سے احساس ہوا اور یہ عجیب وغریب نذر مان لی۔

لَئِنْ جَآءَ لَهٗ عَشْرُ بَنِيْنَ وَصَارُوْالَهٗ اَعْوَانًا لَيَذْبَحَنَّ اَحَدَهُمْ قُرْبَانًا عِنْدَالْكَعْبَةِ.

(اگر اللہ تعالیٰ نے اسے دس بیٹے دیئے جو جوان ہوکر اس کے دست و بازو بنے تو ان میں سے ایک کو وہ کعبہ کے پاس راہ خدا میں قربان کرے گا۔)(۳)

---

(۱) البدایہ والنہایہ، ج۲،ص۲۴۶، السیرۃ الحلبیہ، ج۱،ص۳۵، سیرت ابن ہشام، ج۱،ص۹۸۔

(۲) واضح رہے کہ عرب معاشرے میں جہاں ہر آدمی کئی کئی شادیاں کرتا تھا اور کثیرالاولاد ہوتا تھا، صرف ایک بیٹے کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

(۳) البدایہ والنہایہ، ج۲،ص۲۴۸، الزرقانی، ج۱،ص۱۱۳، سیرت ابن ہشام، ج۱،ص۱۰۳۔

دوبارہ جھگڑا

بہر حال کھدائی کا کام جاری رہا۔ آخر جب کنویں کے نشانات ظاہر ہونے لگے اور قریش کو یقین ہو گیا کہ عبدالمطلب زمزم دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو انہوں نے پھر جھگڑا کھڑا کر دیا۔ کہنے لگے

''عبدالمطلب! یہ کنواں صرف آپ کی ملکیت نہیں ہوگا؛ بلکہ ہم سب اس میں شریک ہوں گے، کیونکہ دراصل یہ ہم سب کے جدِّ امجد حضرت اسمٰعیلؑ کی میراث ہے، اس لئے ہمارا بھی اس میں حق ہے۔''

''نہیں---!'' عبدالمطلب نے جواب دیا ''یہ کنواں صرف میرا ہوگا۔ میں اس میں کسی کو بھی شریک کرنے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ یہ صرف مجھے عطا کیا گیا ہے اور میرے لئے خاص کیا گیا ہے۔''

بات معقول تھی---حکم صرف عبدالمطلب کو دیا گیا تھا، مگر ہٹ دھرمی کا کیا علاج؟

قریش کہنے لگے---''ہمارے ساتھ انصاف کیجئے، ورنہ ہم آپ کو بھی نہیں کھودنے دیں گے اور جھگڑا بڑھ جائے گا۔''

عبدالمطلب کو چونکہ اپنے موقف کی سچائی کا یقین تھا، اس لئے جواب دیا۔

''تم جسے چاہتے ہو، حَکَم (جج) مقرر کر لو--- ہم اپنا معاملہ اس کے روبرو پیش کریں گے، پھر اس نے جو بھی فیصلہ کیا سب کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

سب نے کہا---''ہم سعد بن ہذیم قبیلہ کی کاہنہ کو اپنا حَکَم مقرر کرتے ہیں۔''

یہ کاہنہ (۱) شام کی رہنے والی تھی، اس لئے عبدالمطلب اور ان کے چند حامی اور

---

(۱) کاہن اور کاہنہ عرب میں ان مردوں اور عورتوں کو کہا جاتا تھا جو مابعد الطبیعاتی علوم (META PHYSICAL) یعنی قیافہ، پامسٹری، جفر، نجوم، علم الاعداد اور سحر وغیرہ، میں گہری دسترس رکھتے تھے اور بعض نے بزعم خویش جنات وغیرہ بھی مسخر کئے ہوتے تھے۔ ان علوم میں مہارت کی وجہ سے ان کی اکثر پیشنگوئیاں درست ثابت ہوتی تھیں، اس لئے لوگ آئندہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے ☜

فریقِ مخالف کے متعدد افراد تیاری کر کے شام کی طرف روانہ ہو گئے۔(۱)

سفرِ شام میں عبد المطّلب کی عظمت کا ظہور

ان دنوں مکہ مکرمہ اور شام کے درمیان بہت سے بے آب و گیاہ صحرا ہوا کرتے تھے جن میں تاحدِ نظر کسی آبادی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی صحرا میں سفر کرتے ہوئے عبد المطلب اور ان کے ساتھیوں کے پاس پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔

پیاس سے جب یہ لوگ بے جان ہو گئے تو مجبوراً فریقِ مخالف سے پانی مانگا۔ ان کے پاس پانی موجود تھا مگر ان سنگ دلوں نے دینا گوارا نہ کیا۔ کہنے لگے

''اگر ہم اپنا پانی تم لوگوں کو پینے کے لئے دے دیں تو پھر ہم کیا پئیں گے---؟ اس طرح تو ہم بھی پیاس سے ہلاک ہو جائیں گے۔''

اس وسیع و عریض تپتے ہوئے جہنم زار میں تاحدِ نظر کوئی آبادی بھی نہ تھی جہاں سے پانی ملنے کا امکان ہوتا۔ جب عبد المطلب ہر طرف سے مایوس ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب زندہ بچ رہنے کی کوئی صورت نہیں، تو انہوں نے سوچا کہ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے

انہی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔

علاوہ ازیں یہ لوگ عموماً پڑھے لکھے اور کافی سوجھ بوجھ کے مالک ہوا کرتے تھے، اس لئے اہلِ عرب اپنے نزاعی اور اختلافی مسائل میں بھی انہی سے تصفیہ کرایا کرتے تھے۔ انگریزی میں ایسے ہی لوگوں کو وچ ڈاکٹرز (WITCH DOCTORS) کہا جاتا ہے۔ یورپ کے اہلِ علم ایک زمانے تک ان علوم کو خرافات اور وہمیات سمجھتے رہے مگر بالآخر انہی میں ایک عظیم محقق ''کیرو'' نے ان علوم پر عبور حاصل کیا اور نہ صرف یہ کہ ان کی حقانیت کو تسلیم کیا؛ بلکہ ان تمام علوم پر نہایت بلند پایہ کتابیں لکھیں۔ آج بھی ان علوم کے شائقین ان کتابوں سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں--- تاہم اس میں شک نہیں کہ یہ تمام علوم ظنی ہوتے ہیں اور ان علوم کے ماہرین کو بھی تمام تر احتیاط و باریک بینی کے باوجود کبھی کبھی شدید غلطی لگ جاتی ہے، اس لئے اسلام نے ان علوم سے حاصل شدہ نتائج پر یقین کرنے سے منع کیا ہے۔

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۴۵، الزرقانی، ج ۱، ص ۱۱۲۔

کیوں نہ یہیں بیٹھ کر موت کا انتظار کیا جائے۔

اپنے ساتھیوں سے پوچھا ''مَاتَرَوْنَ؟'' (تمہاری کیا رائے ہے؟)

''ہم تو آپ کے تابع ہیں'' انہوں نے جواب دیا ''جو رائے آپ کی وہی ہماری۔''

عبدالمطلب نے کہا---''میرا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے لئے گڑھا کھود لے اور اس میں بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کرے---جب کوئی شخص مر جائے تو دوسرے زندہ ساتھی اس پر مٹی ڈال دیں---سب سے آخر میں مرنے والے آدمی کی لاش البتہ کھلے صحرا میں پڑی رہے گی، لیکن سب کے بے گور و کفن پڑے رہنے سے تو یہ صورت بہرحال بہتر ہی ہے۔''

''یہ بہت اچھی رائے ہے'' سب نے کہا ''ہمیں آپ سے مکمل اتفاق ہے۔''

چنانچہ سب گڑھے کھود کر ان میں بیٹھ گئے اور لگے اپنی اپنی موت کا انتظار کرنے۔

فریق مخالف کے لوگ یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے مگر ان کا دل پھر بھی نہ پسیجا۔

کچھ دیر اسی طرح گڑھوں میں بیٹھے رہے، پھر اچانک عبدالمطلب کی رائے بدل گئی اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے۔

''واللہ---یوں اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں جانا انتہا درجے کی کمزوری ہے۔ ہمیں بہرصورت سفر جاری رکھنا چاہئے اور آخری سانس تک جدّ وجُہد کرنا چاہئے۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ ہمیں پانی سے نواز ہی دے۔''

ساتھیوں نے اس رائے کے ساتھ بھی اتفاق کیا اور اٹھ کر اپنی اپنی سواریوں کی طرف چل دیئے۔ عبدالمطلب بھی اپنے اونٹ پر بیٹھ گئے اور اسے اٹھانے لگے۔ جب اونٹ اٹھا تو---اللہ کی قدرت---اس لق ودق صحرا میں اونٹ کے پاؤں کے نیچے سے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ ابل پڑا۔ عبدالمطلب نے بے ساختہ اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور ان کے ساتھیوں نے بھی مسرت سے وارفتہ ہو کر نعرہ ہائے تکبیر بلند کرنے شروع کر دیئے۔

پھر عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا، اپنے جانوروں کو بھی پلایا اور برتن بھی بھر لئے۔

اس کے بعد عبدالمطلب ان لوگوں کے پاس گئے جنہوں نے عبدالمطلب کو اس

وقت بھی پانی نہیں دیا تھا، جب وہ زندگی سے مایوس ہو کر گڑھے میں جا بیٹھے تھے --- اور اندازہ کیجئے فراخ دلی اور عالی ظرفی کا کہ کسی قسم کی طنز و تشنیع کے بغیر ان سے کہنے لگے۔

''اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت عمدہ اور وافر پانی عطا فرما دیا ہے --- تم لوگ بھی آؤ، خود بھی تازہ پانی پیو اور اپنے جانوروں کو بھی پلا لو!''

وہ لوگ بھی آئے اور تازہ پانی کے مزے لوٹنے لگے۔

عبدالمطلب کی یہ عظمت سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے چٹیل صحرا میں چشمہ جاری فرما دیا --- پھر دل ہی دل میں جب اپنی تنگ ظرفی اور عبدالمطلب کی فراخ دلی کا موازنہ کیا تو انتہائی ندامت محسوس کی

کس قدر نادم ہوا ہوں میں، برا کہہ کر اُسے
کیا خبر تھی جاتے جاتے وہ دعا دے جائیگا

سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے

وَاللهِ! لَانُخَاصِمُکَ فِیْ زَمْزَمَ اَبَدًا. اِنَ الَّذِیْ سَقَاکَ الْمَآءَ بِهٰذِهِ الفَلاةِ لَهُوَ الَّذِیْ سَقَاکَ زَمْزَمَ.

(خدا کی قسم! آئندہ ہم آپ کے ساتھ کبھی بھی آبِ زمزم کے بارے میں جھگڑا نہیں کریں گے --- بلاشبہ جس ذات نے آپ کو اس خشک صحرا میں پانی سے نوازا ہے، اُسی نے آپ کو وہاں بھی زمزم سے سرفراز فرمایا ہے۔)

جس جھگڑے کو نمٹانے کے لئے شام کا سفر اختیار کیا تھا، اس کا یہیں پر فیصلہ ہو گیا، اب کسی کاہنہ کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہ رہی، اس لئے سب یہیں سے مکہ مکرمہ واپس لوٹ گئے۔(۱)

---

(۱) البدایہ والنہایہ، ج۲، ص۲۴۵، طبقات ابن سعد، ج۱، ص۵۰، السیرة الحلبیہ، ج۱، ص۳۸، الزرقانی علی المواهب، ج۱، ص۱۱۲۔

دوبارہ کھدائی اور زمزم کی رونمائی

واپسی کے بعد جب عبدالمطلب نے دوبارہ کھدائی شروع کی تو عمر بن حارث کے دفن کردہ سونے کے دو ہرن اور دیگر سامان بھی برآمد ہوا۔ قریش نے اس موقع پر بھی جھگڑا کیا اور برآمد شدہ سامان میں شرکت کے دعویدار بن بیٹھے۔ عبدالمطلب نے قرعہ اندازی کے ذریعہ فیصلہ کرنے کی تجویز پیش کی اور سب نے اس سے اتفاق کیا۔ قرعہ اندازی ہوئی تو سونے کے دو ہرن کعبہ کے نام نکلے، دیگر سامان عبدالمطلب کے نام نکلا، قریش کے نام کچھ نہ نکلا۔

چنانچہ عبدالمطلب نے لوہے کے سامان کو ڈھال کر کعبے کا دروازہ بنا دیا اور سونے کے ہرن پگھلا کر ان کا سونا دروازے پر چڑھا دیا۔ (۱)

اور یوں وہ مقدس کنواں پھر سے جاری ہوگیا جس سے خلق خدا اب تک سیراب ہو رہی ہے اور انشاء اللہ تا قیامت سیراب ہوتی رہے گی۔

آبِ مقدس

چونکہ عبدالمطلب اس پانی کو انتہائی متبرک اور پاکیزہ سمجھتے تھے اس لئے پینے کے علاوہ کسی اور ضرورت میں صرف کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، لیکن عام لوگوں نے اس کے تقدس کو ملحوظ نہ رکھا اور دیگر ضروریات میں بھی استعمال کرنے لگے۔

ایک دن عبدالمطلب نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس پانی سے نہا رہا ہے۔ انہیں بے حد غصہ آیا --- ایسا مبارک پانی اور اسے غسل و طہارت کے کام میں لایا جائے!

دن بھر کڑھتے رہے اور اسی پریشانی کے عالم میں سو گئے --- خواب میں حکم ملا۔

قُلْ اِنِّیْ لَا اُحِلُّهَا لِمُغْتَسِلٍ، وَهِیَ لِشَارِبٍ حِلٌّ وَّبِلٌّ --- ثُمَّ کُفِیْتَهُمْ.

(لوگوں سے کہہ دیجئے کہ "میں اس پانی سے نہانے دھونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ تو صرف پینے والوں کے لئے حلال و مباح ہے۔" --- پھر آپ بے فکر ہو جائیں۔)

---

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۴۶، تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۷۹، طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۵۰۔

عبدالمطلب کی پریشانی دور ہوگئی---انہوں نے حرم شریف میں تمام لوگوں کے سامنے اعلان کیا "اِنِّیْ لَا اُحِلُّهَا لِمُغْتَسِلٍ، وَهِیَ لِشَارِبٍ حِلٌّ وَّبِلٌّ.

یہ ایک خدائی اعلان تھا--- پھر اس کی مخالفت کرنے والوں کو سزا کیوں نہ ملتی؟ نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص بھی اس پانی کی حرمت پائمال کرتا، کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آبِ زمزم کی حرمت و نظافت لوگوں کے ذہن نشین ہوگئی اور انہوں نے دیگر ضرورتوں کے لئے اس کا استعمال ترک کر دیا۔(۱)

ایفائے نذر کا مطالبہ

زمزم جاری ہونے کے بعد تقریباً تیس سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران عبدالمطلب کو اللہ تعالیٰ نے مزید بیٹوں سے نواز دیا۔ اب ان کے دس بیٹے تھے۔

۱ حارث، ۲ زبیر، ۳ حجل، ۴ ضرار، ۵ مقوم، ۶ ابولہب، ۷ عباس، ۸ حمزہ، ۹ ابوطالب، ۱۰ عبداللہ۔(۲)

ایک رات عبدالمطلب سو رہے تھے کہ خواب میں کسی نے کہا

اَوْفِ بِنَذْرِکَ. (اپنی نذر پوری کرو!)

---

(۱) السیرة الحلبیہ، ج۱،ص۳۹۔ عبدالمطلب کا یہ اعلان البدایة والنہایة، ج۲،ص۲۴۷، اور روض الانف، ج۱،ص۱۰۱ پر بھی مذکور ہے۔ مگر اس کا مندرجہ بالا پس منظر علامہ برہان الدین حلبیؒ نے ذکر کیا ہے۔

(۲) عبدالمطلب کے بیٹوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ ابن اسحاق، ابن ہشام اور ابن قتیبہ جیسے ائمہ تاریخ نے صرف انہی دس بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ عبدالمطلب کے تیرہ بیٹے تھے۔ مذکورہ بالا دس کے علاوہ تین یہ ہیں۔ غیداق، عبدالکعبہ اور قثم۔ علامہ سہیلی روض الانف میں لکھتے ہیں

اِنَّ جَمَاعَةً مِنَ الْعُلَمَاءِ قَالُوْا اِنَّ اَعْمَامَهٗ علیہ السلام کَانُوْا اِثْنَیْ عَشَرَ.

(علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کے چچاؤں کی تعداد بارہ ہے) اور تیرھویں آپ کے والد ماجد عبداللہ ہیں۔

ہماری تحقیق کی رو سے یہی بات قرینِ قیاس ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ ضروری ہے کہ

عبدالمطلب نے جو نذر مانی تھی وہ تیس سال پہلے کی بات تھی اور ان کے ذہن سے بالکل ہی نکل چکی تھی اس لئے وہ نہ سمجھ سکے کہ کونسی نذر مراد ہے--- بہرحال احتیاطاً ایک دنبہ راہِ خدا میں قربان کر دیا۔

دوسری رات پھر کہا گیا---''اس سے عمدہ چیز کی قربانی پیش کرو!''

عبدالمطلب نے ایک بیل کی قربانی دے دی۔

تیسری رات پھر حکم ملا---''اس سے بھی بڑھیا شے قربان کرو!''

عبدالمطلب نے ایک اونٹ ذبح کر کے تقسیم کر دیا۔

چوتھی رات پھر کہا گیا---''اونٹ سے بھی اعلیٰ چیز کی قربانی دو!''

اہل عرب کے نزدیک اونٹ سے زیادہ قیمتی شے کوئی نہیں تھی جس کی قربانی دی

ذبح عبداللہ کے وقت عبدالمطلب کے دس بیٹے ہوں، کیونکہ انہوں نے نذر ہی یہ مانی تھی کہ اگر میرے دس بیٹے ہوئے تو ان میں سے ایک کو راہِ خدا میں قربان کروں گا۔ اس لئے جب تک آپ کے بیٹوں کی تعداد دس تک نہ پہنچ جائے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے نذر پوری کرنے کا مطالبہ ناقابل فہم ہے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ حمزہؓ اور عباسؓ واقعۂ ذبح کے بعد پیدا ہوئے ہیں، کیونکہ حمزہؓ کی والدہ کا نام ہالہ ہے اور ہالہ کے ساتھ عبدالمطلب کی شادی ہی اس واقعہ کے بعد ہوئی ہے۔

رہے عباسؓ ---تو وہ حمزہؓ سے بھی چھوٹے ہیں اور ذبح عبداللہ کے وقت جب حمزہ کا موجود ہونا ہی ناممکن ہے تو ان سے بھی چھوٹے عباسؓ کا موجود ہونا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟

علاوہ ازیں ابن اسحاق کا بیان ہے کہ واقعۂ ذبح کے وقت موجود بیٹوں میں عبداللہ سب سے چھوٹے تھے۔ وَكَانَ اَصْغَرَ بَنِيْ اَبِيْهِ. لیکن اگر حمزہؓ و عباسؓ کو اس وقت موجود مانا جائے تو یہ بات غلط ہو جاتی ہے، کیونکہ عبداللہ، حمزہ و عباس سے بالاتفاق بڑے ہیں۔

ان وجوہات کی بناء پر ہمیں ان علماء کی رائے ہی صحیح معلوم ہوتی ہے جو عبدالمطلب کے تیرہ بیٹے قرار دیتے ہیں، جن میں سے دس یا گیارہ، واقعۂ ذبح کے وقت موجود تھے اور حمزہؓ و عباسؓ بعد میں پیدا ہوئے---اور اس وقت موجود بیٹوں میں عبداللہ سب سے چھوٹے تھے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ.

جا سکتی، اس لئے عبدالمطّلب نے حیرت سے پوچھا---''اونٹ سے بہتر کونسی چیز ہے؟

خواب میں ہی جواب ملا۔

قَرِّبْ اَحَدَ اَوْلَادِکَ الَّذِیْ نَذَرْتَ ذَبْحَہ۔

(اپنے ایک بیٹے کی قربانی پیش کرو، جسے ذبح کرنے کی تم نے نذر مانی تھی۔)(۱)

تب عبدالمطّلب کو اپنی تیس سال پرانی نذر یاد آئی۔

''اگر مجھے خدا نے دس بیٹے دیئے جو بڑے ہو کر میرے دست و بازو بنے تو ان میں سے ایک کو کعبہ کے پاس اللہ کی راہ میں قربان کروں گا۔''

عبدالمطّلب کی استقامت اور ذبح کے لئے قرعہ اندازی

عبدالمطّلب کوئی پیغمبر نہ تھے، خلیل اللہ نہ تھے، مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس موقع پر انہوں نے جس کردار کا مظاہرہ کیا، اس سے ان کے جدّ امجد ابراہیم خلیل اللہ کی یاد تازہ ہو گئی---انہوں نے اپنے تمام بیٹوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے زمزم کی کھدائی کے وقت اپنی نذر کا قصہ بیان کیا۔ یہ بھی بتایا کہ اب مجھے اس نذر کو پورا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ بیٹوں نے بھی باپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حق ادا کر دیا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا

اِنَّا نُطِیْعُکَ، فَمَنْ تَذْبَحُ مِنَّا ؟ (ہم آپ کی مکمل اطاعت کریں گے---آپ ہم میں سے کسے ذبح کرنا چاہتے ہیں؟)

عبدالمطّلب نے کہا---''تم سب ایک ایک تیر لو، اس پر اپنا اپنا نام لکھو، پھر ان سب تیروں کو میرے پاس لے آؤ!''

جب سب نے تیروں پر اپنا اپنا نام لکھ لیا تو عبدالمطّلب اپنے سب بیٹوں کو ساتھ لے کر کعبہ مکرمہ گئے۔

کعبہ میں ایک شخص ہُبَل نامی بت کا مجاور تھا، وہی قرعہ اندازی بھی کیا کرتا تھا۔ عبدالمطّلب نے اس کو قرعہ اندازی کے لئے وہی دس تیر دیئے جن پر ان کے بیٹوں کے نام

---

(۱) الزرقانی علی المواہب، ج۱، ص۱۱۳، السیرۃ الحلبیہ، ج۱، ص۳۹۔

لکھے تھے اور خود دعا کی۔

اَللّٰھُمَّ! اِنِّیۡ نَذَرۡتُ نَحۡرَ اَحَدِ ھِمۡ وَاِنِّیۡ اَقۡرَعُ بَیۡنَھُمۡ فَاصِبۡ بِذٰلِکَ مَنۡ شِئۡتَ.

(الٰہی! میں نے دس میں سے کسی ایک کی قربانی پیش کرنے کی نذر مانی تھی اس لئے قرعہ اندازی کرنے لگا ہوں، اب ان میں سے قربانی کے لئے جو تجھے پسند ہو اس کا نام نکل آئے۔)

عبدالمطلب دعا سے فارغ ہوئے تو مجاور نے قرعہ اندازی کا آغاز کیا---سب نہایت بے تابی سے منتظر کھڑے تھے---جس کے نام کا تیر نکلتا، اسے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کرنا تھا---بالآخر مجاور نے تیر نکالا اور سب نے دیکھا کہ اس پر عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے اور سب سے لاڈلے بیٹے عبداللہ کا نام لکھا ہوا تھا۔

عبدالمطلب نے ایک لمحہ توقف کئے بغیر ایک ہاتھ میں عبداللہ کا ہاتھ پکڑا، دوسرے ہاتھ میں چھری لی اور مذبح کی طرف چل دیئے۔(۱)

ذبح کی کوشش، لوگوں کی مزاحمت

جب عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے زمین پر لٹایا تو ہر طرف سے لوگ دوڑ پڑے اور حیرت سے پوچھنے لگے

''آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''اُوۡفِیۡ بِنَذۡرِیۡ'' (میں اپنی نذر پوری کرنا چاہتا ہوں) عبدالمطلب نے جواب دیا

''نہیں عبدالمطلب!---واللہ ایسا نہ کیجئے'' سردارانِ قریش نے کہا ''پہلے فلاں کاہنہ سے پوچھ لیجئے، ممکن ہے وہ اس سے بہتر کوئی صورت تجویز کر دے---اس طرح تو اپنی اولاد کی قربانی کی رسم چل نکلے گی---ہاں، اگر کاہنہ نے کہا کہ متبادل صورت کوئی نہیں

(۱) تاریخ الامم والملوک، طبری، ج ۲، ص ۱۷۳، البدایۃ والنہایۃ، ج ۲، ص ۲۴۸۔ الزرقانی، ج ۱، ص ۱۱۵، ''محمد رسول اللہ'' ص ۸۔

ہے تو پھر آپ بے شک ذبح کر دیجئے۔"

بعض سرداروں نے پیش کش کی کہ اگر عبداللہ کو چھوڑ دیا جائے اور اس کے فدیہ میں راہِ خدا میں کچھ مال دے دیا جائے تو اس سلسلہ میں ہم ہر ممکن تعاون کریں گے۔ اِنْ کَانَ فِدَاءُ ہٗ بِاَمْوَالِنَا فَدَیْنَاہُ۔

عبدالمطلب کے دیگر بیٹے بھی اپنے بھائی کو یوں ذبح ہوتے نہ دیکھ سکے اور قریش کی اس رائے کے ساتھ متفق ہو گئے کہ پہلے کاہنہ سے مشورہ کر لینا چاہئے۔ قریش کے مسلسل اصرار پر اور اپنے بیٹوں کے کہنے سننے پر بالآخر عبدالمطلب کاہنہ کے پاس جانے کے لئے رضامند ہو گئے۔(۱)

کاهنه کی حیرت انگیز تجویز

اس کاہنہ کا نام قُطْبَہ تھا--- بعض نے سَجَاح بھی لکھا ہے--- ان دنوں خیبر میں مقیم تھی، اس لئے عبدالمطلب اور ان کے بہت سے رشتہ دار اس کے پاس خیبر گئے اور ساری صورت حال بیان کی۔ اس نے کہا

"ایک جن میرا تابع ہے، میں آج اس کے ساتھ اس سلسلے میں مشورہ کروں گی اور تم لوگوں کو کل جواب دوں گی۔"

دوسرے دن اس نے جو تجویز ان کے سامنے رکھی وہ بلاشبہ فہم و دانش اور عقل و خرد کا شہکار تھی۔

اس نے ان لوگوں سے پوچھا--- "تمہارے ہاں ایک جان کی دیت (خون بہا) کتنی ہوتی ہے؟"

"دس اونٹ۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تم اس طرح کرو" کاہنہ نے بتایا "کہ دس اونٹ اور عبداللہ پر قرعہ اندازی کرو، اگر قرعہ دس اونٹ پر نکلے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ عبداللہ کے عوض دس اونٹ

---

(۱) الزرقانی، ج۱، ص۱۱۶، البدایۃ والنہایۃ، ج۲، ص۲۴۷، محمد رسول اللہ، ص۸۔

کی قربانی قبول فرمالے گا۔ اگر قرعہ عبداللہ کے نام کا نکلے تو پھر بیس اونٹ اور عبداللہ پر قرعہ ڈالو، اگر پھر بھی عبداللہ کا نام نکلے تو پھر تیس اونٹ اور عبداللہ پر قرعہ اندازی کرو--- اسی طرح ہر مرتبہ دس دس اونٹ بڑھاتے جاؤ، یہاں تک کہ قرعہ عبداللہ کی بجائے اونٹوں پر نکل آئے۔ اونٹوں کی جتنی تعداد پر قرعہ برآمد ہو، اتنے اونٹ اللہ کی راہ میں قربان کر دیئے جائیں اور عبداللہ کو چھوڑ دیا جائے --- اس طرح تمہارا رب بھی راضی ہو جائے گا اور عبداللہ بھی بچ جائے گا۔''

اس عمدہ تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور واپس آ گئے۔ (۱)

قرعہ اندازی

مکہ مکرمہ واپس پہنچ کر کاہنہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر قرعہ اندازی کی گئی۔

دس اونٹوں اور عبداللہ پر قرعہ ڈالا گیا، تو عبداللہ کا نام نکلا، بیس اونٹوں کی قرعہ اندازی پر بھی عبداللہ کا نام نکلا۔ اسی طرح ہر دفعہ دس اونٹ بڑھتے رہے اور ہر مرتبہ عبداللہ کا نام ہی نکلتا رہا۔ بالآخر جب سو اونٹ اور عبداللہ پر قرعہ اندازی ہوئی تو سو اونٹوں پر قرعہ نکل آیا--- حاضرین کے پژمردہ چہروں پر تازگی دوڑ گئی، سب خوشی سے چلائے۔

قَدِ انْتَهٰى رِضَاءُ رَبِّكَ يَاعَبْدَالْمُطَّلِبِ.

(عبدالمطلب! آپ کے رب کی رضا معلوم ہو گئی)

عبداللہ کی گلو خلاصی پر سب سے زیادہ مسرت عبدالمطلب کو ہی ہو سکتی تھی کیونکہ عبداللہ ان کے سب سے پیارے بیٹے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی احتیاط پسندی ملاحظہ ہو۔ کہنے لگے

''صرف ایک دفعہ اونٹوں پر قرعہ نکلنا کافی نہیں ہے--- جب تک مسلسل تین دفعہ اونٹوں پر قرعہ نہیں نکلے گا، مجھے یقین نہیں آئے گا۔''

دوبارہ سو اونٹوں اور عبداللہ پر قرعہ ڈالا گیا اور دوبارہ سو اونٹوں پر نکلا۔ پھر جب

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۴۸، تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۷۴، السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۴۰۔

سو بارہ بھی اونٹوں پر ہی قرعہ نکلا، تب کہیں عبدالمطلب کو یقین آیا کہ اللہ تعالیٰ نے عبداللہ کے عوض سو اونٹوں کا فدیہ قبول فرما لیا ہے۔

چنانچہ عبدالمطلب نے سو اونٹ ذبح کئے اور کھلی اجازت دی کہ جس کا جی چاہے، جتنا جی چاہے گوشت لے جائے --- گوشت اتنی وافر مقدار میں تھا کہ انسانوں کے علاوہ گوشت خور پرندوں اور درندوں نے بھی خوب سیر ہو کر کھایا۔ (۱)

قارئین کرام ---! یہ ہیں وہ حالات و واقعات جن کی بنا پر مؤرخین حضرت عبداللہ کو بھی ذبیح قرار دیتے ہیں اور جانِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں اَنَا اِبْنُ الذَّبِیْحَیْن. (میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں۔)

والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ

جانِ دو عالم ﷺ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ کا تعلق قریش ہی کی ایک شاخ بنی زہرہ سے ہے۔ یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں --- ایک تو یہ کہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کی شادی کے لئے بنی زہرہ کا انتخاب کیوں کیا ---؟ دوسرا یہ کہ بنی زہرہ میں سے سیدہ آمنہ کا انتخاب کس بنا پر کیا ---؟ کیا دونوں باتیں محض اتفاقی ہیں یا کچھ مخصوص پس منظر رکھتی ہیں؟

جواباً عرض ہے کہ دونوں باتوں کے نہایت دلچسپ اسباب ہیں۔

بنی زہرہ کا انتخاب

جہاں تک بنی زہرہ کے انتخاب کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عبدالمطلب ایک دفعہ یمن گئے تو وہاں ایک یہودی قیافہ شناس سے ملاقات ہو گئی۔ (۲) وہ آپ کی غیر معمولی

---

(۱) تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۷۴، البدایہ و النہایہ، ج ۲، ص ۲۴۸، ۲۴۹، محمد رسول اللہ، ص ۹۔

(۲) علم قیافہ بھی پامسٹری جیسا ایک علم ہے --- فرق یہ ہے کہ پامسٹری کا موضوع صرف انسانی ہاتھ ہے؛ جبکہ قیافہ کا تعلق پورے انسانی جسم سے ہے۔ اس علم کے جاننے والے جسم کے مختلف حصوں پر نظر آنے والی علامات اور نشانیاں دیکھ کر مستقبل کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں --- ایک اچھے قیافہ شناس کا تجزیہ عموماً بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے۔

وجاہت دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ یہ کوئی عظیم شخصیت ہیں۔ مزید تحقیق کے لئے ان سے پوچھنے لگا

عرب میں یہ علم عام تھا اور اس پر عربوں کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی مسئلے میں قیافہ شناس کا فیصلہ حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو بہت مسرور تھے۔ مجھ سے فرمانے لگے ---''عائشہ! کیا تجھے معلوم ہے کہ آج زید اور اسامہ اس طرح چادر اوڑھے لیٹے تھے کہ ان کے چہرے چادر میں چھپے ہوئے تھے اور پاؤں باہر نکلے ہوئے تھے۔ اسی دوران مُجَزِّز مُدْلَجِی' ان کے قریب آیا اور جب اس کی نظر ان دونوں کے پاؤں پر پڑی تو پکار اٹھا۔

اِنَّ هٰذِهِ الْاَقْدَامَ بَعْضُهَا مِنْ' بَعْض.

(بلاشبہ یہ پاؤں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔)

(بخاری، ج ۲، ص ۱۰۰۱، مسلم، ج ۱، ص ۴۷۱، ابو داؤد، ص ۳۰۹)

اس حدیث کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر سے آگاہی ضروری ہے۔

(۱) --- حضرت زیدؓ، جانِ دو عالم ﷺ کو اتنے پیارے تھے کہ آپ نے انہیں اپنا بیٹا (متبنّیٰ) بنا رکھا تھا۔

(۲) --- جب زیدؓ کے ہاں اسامہؓ پیدا ہوئے، تو اتفاق سے ان کا رنگ کالا تھا، جب کہ زیدؓ گورے چٹے تھے۔

(۳) --- اتنی سی بات کو بنیاد بنا کر منافقین نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ چونکہ اسامہ کا رنگ روپ زید سے مشابہت نہیں رکھتا، اس لئے یہ زید کا نہیں، کسی اور کا بیٹا ہے۔

(۴) --- جانِ دو عالم ﷺ اس بے ہودہ الزام تراشی پر بے حد رنجیدہ اور آزردہ خاطر تھے۔

(۵) --- مجزز عرب کا ایک مشہور قیافہ شناس تھا، اس کا یہ کہنا کہ ''یہ پاؤں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔'' بہتان تراشیوں کا سدباب کرنے اور منافقین کا منہ بند کرنے کے لئے کافی تھا، کیونکہ قیافہ شناس کی بات پتھر پر لکیر سمجھی جاتی تھی۔

اس بنا پر جانِ دو عالم ﷺ کو مجزز کے اس اعلان سے بے پناہ مسرت حاصل ہوئی۔

''آپ کا تعلق کس قبیلے سے ہے؟''

''قریش سے۔'' عبدالمطلب نے جواب دیا۔

''قریش کی کون سی شاخ سے؟''

''بنی ہاشم سے۔''

''کیا میں آپ کے جسم کے بعض حصوں کا معائنہ کرسکتا ہوں؟'' قیافہ شناس نے اجازت چاہی۔

''ہاں!---مگر شرط یہ ہے کہ وہ حصہ ایسا نہ ہو جس کا ستر ضروری ہے۔'' عبدالمطلب

مردوں کے علاوہ بعض عورتوں کو بھی اس علم میں کمال حاصل ہوا ہے۔ حضرت معاویہؓ کی اہلیہ میسون کا شمار بھی ایسی ہی عورتوں میں ہوتا ہے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب حضرت معاویہؓ نے ایک کلبیہ عورت کے ساتھ شادی کی تو اس کے پاس جانے سے قبل اپنی پہلی بیوی میسون سے کہنے لگے---''کیا تم نے اس عورت کو دیکھا ہے---؟ اگر نہیں دیکھا تو اب جا کر دیکھ آؤ!''

میسون نے جا کر اس عورت کا مکمل جائزہ لیا اور واپس آ کر جو کچھ بیان کیا وہ بے حد حیرت انگیز تھا---اس نے کہا

''وہ بے مثال حسینہ ہے۔ اتنی خوبصورت عورت میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی لیکن اس کی ناف کے نیچے ایک ایسا خال ہے جو اس چیز کی علامت ہے کہ اس کا خاوند قتل کیا جائے گا اور اس کا سر لا کر اس کی جھولی میں ڈالا جائے گا۔''

حضرت معاویہؓ کو میسون کی فراست پر مکمل اعتماد تھا۔ انہوں نے اسی وقت نئی نویلی دلہن کو طلاق دے دی۔

میسون کا یہ قیافہ بالکل درست ثابت ہوا---اس عورت کے ساتھ بعد میں نعمان بن بشیرؓ نے شادی کی---نعمانؓ قتل کئے گئے اور قاتلوں نے ان کا سر لا کر اس عورت کی گود میں ڈال دیا۔

(الاستیعاب ج ۲، ص ۵۵۴، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۴۹)

نے اس موقعہ پر بھی احتیاط کا دامن نہ چھوڑا۔

اس نے آپ کے جسم پر پائی جانے والی نشانیوں کا تفصیل سے جائزہ لیا، پھر آپ کی ناک اوپر اٹھائی اور بہت غور سے نتھنوں کا معائنہ کیا۔ علم قیافہ کی رو سے تمام علامات ایک ہی اشارہ دے رہی تھیں--- قیافہ شناس پکار اٹھا۔

''اَشْهَدُ اَنَّ فِیْ اِحْدٰی یَدَیْکَ مُلْکًا وَّفِی الْاُخْرٰی نُبُوَّۃٌ.''

(میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے ایک ہاتھ میں بادشاہی ہے اور دوسرے میں نبوت۔)

پھر کہنے لگا--- ''مگر اس بادشاہی اور نبوت کا تعلق بنی زہرہ سے بھی ہے--- کیا آپ نے بنی زہرہ کی کسی خاتون سے شادی کر رکھی ہے؟''

''نہیں'' عبدالمطلب نے جواب دیا ''ابھی تک تو بنی زہرہ کی کوئی عورت میرے عقد میں نہیں ہے۔''

''تو آپ ایسا کیجئے'' قیافہ شناس نے مشورہ دیا ''کہ اب جا کر بنی زہرہ میں شادی کر لیجئے!''

چنانچہ اس بناء پر آپ نے خود بھی بنی زہرہ کی ایک خاتون ہالہ سے شادی کی اور اپنے پیارے بیٹے کے لئے نظر انتخاب بھی بنی زہرہ پر پڑی۔ (۱)

سیدہ آمنہ کا انتخاب

یہ تو تھی بنی زہرہ کو ترجیح دینے کی وجہ--- اور بنی زہرہ میں سے سیدہ آمنہ کو پسند کرنے کا سبب یہ ہے کہ قریش کی ایک مشہور کاہنہ سودہ (۲) ایک دفعہ بنی زہرہ کی عورتوں

---

(۱) البدایہ والنہایہ، ج۲، ص۲۵۱، الزرقانی علی المواہب، ج۱، ص۱۴۴، السیرۃ الحلبیہ، ج۱، ص۴۷۔

(۲) یہ کاہنہ پیدائشی طور پر نادیدہ اور پراسرار طاقتوں کی منظور نظر تھی۔ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ جب یہ پیدا ہوئی تو اس کا رنگ کالا اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اہل عرب تو یوں بھی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، پھر ایسی لڑکی کو تو کچھ زیادہ ہی منحوس سمجھتے تھے، اس لئے اس کے باپ نے اسی وقت

سے کہنے لگی ---"تمہارے درمیان ایک ایسی لڑکی ہے جو یا تو خود لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرانے والی ہوگی یا اس کا بیٹا یہ کام کرے گا، اس لئے تم اپنی تمام لڑکیاں میرے روبرو پیش کرو تاکہ میں اسے پہچان لوں۔"

چنانچہ یکے بعد دیگرے اس کے سامنے لڑکیاں لائی جاتی رہیں اور وہ ہر ایک کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتاتی گئی۔ جب سیدہ آمنہ اس کے روبرو آئیں تو انہیں دیکھتے ہی کہنے لگی

هٰذِهِ النَّذِيْرَةُ اَوْتَلِدُ نَذِيْرًا لَهٗ شَاْنٌ وَّبُرْهَانٌ مُّنِيْرٌ.

(یہ ہے وہ لڑکی جو یا تو خود "نذیرہ" ہوگی، یا اس کا بیٹا نذیر (عذابِ الٰہی سے

اس بچی کو ایک شخص کے حوالے کیا کہ اسے لے جا کر صحرا میں دفن کر دو۔ اس شخص نے صحرا میں گڑھا کھود کر جب اسے دفن کرنا چاہا تو آواز آئی۔

لَاتَئِدِ الصَّبِيَّةَ وَخَلِّهَا الْبَرِيَّةَ.

(اس بچی کو مت دفن کرو! اسے اسی طرح صحرا میں چھوڑ دو!)

اس شخص نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کسی آدمی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس نے آواز کو اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ دفن کرنا چاہا تو دوبارہ غیبی آواز آئی "اس بچی کو مت دفن کرو، مت دفن کرو۔"

وہ شخص خوفزدہ ہو کر لڑکی کے باپ کے پاس دوڑا گیا اور جو کچھ پیش آیا تھا، بیان کیا۔ باپ سمجھ گیا کہ یہ کوئی غیر معمولی لڑکی ہے اور اسے دفن کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

یہی بچی بڑی ہو کر بہت اونچے درجے کی کاہنہ بنی۔ (السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۵۰)

مؤرخین کہتے ہیں کہ بنی زہرہ کی لڑکیوں کے بارے میں اس نے جتنی بھی پیشگوئیاں کی تھیں وہ اسی طرح وقوع پذیر ہوئیں۔

فَقَالَتْ فِيْ كُلِّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ قَوْلًا ظَهَرَ بَعْدَ حِيْنٍ.

ہمیں اور لڑکیوں کے بارے میں تو کچھ پتہ نہیں --- لیکن تاریخ شاہد ہے کہ سیدہ آمنہ کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا وہ حرف بحرف درست ثابت ہوا۔

فَسُبْحَانَ الْعَلِيْمِ الْخَبِيْرِ، يُعَلِّمُ مَنْ يَّشَآءُ مَايَشَآءُ.

ڈرانے والا) ہوگا، جو بڑی شان والا اور واضح دلیل والا ہوگا۔)(۱)

کاہنہ کی اس پیشینگوئی کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سیدہ آمنہ کے والد وہب، بنی زہرہ کی سب سے ممتاز شخصیت تھے۔

وَهُوَ يَوْمَئِذٍ سَيِّدُ بَنِي زُهْرَةَ نَسَبًا وَّشَرَفًا.

(وہ اپنی عالی نسبی اور شرافت کی وجہ سے بنی زہرہ کے سردار تھے)

اوران کی بیٹی سیدہ آمنہ بھی قریش کی سب سے بہترین لڑکی تھیں۔

وَهِيَ يَوْمَئِذٍ اَفْضَلُ اِمْرَأَةٍ فِيْ قُرَيْشٍ نَسَبًا وَّمَوْضِعًا (۲)

جس لڑکی کے بطن سے بڑی شان والے اور واضح دلیل والے نذیر کے جلوہ افروز ہونے کی بشارت دی جا چکی ہو، جس کا باپ شریف اور عالی نسب سردار ہو اور جو خود سارے قبیلۂ قریش میں سب سے بہتر اور افضل ہو، اس سے زیادہ موزوں لڑکی اور کون سی ہوسکتی تھی جس پر عبدالمطلب کی نظر انتخاب پڑتی؟

غرضیکہ مندرجہ بالا اسباب کی بناء پر عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کے لئے سیدہ آمنہ بنت وہب کو منتخب کیا۔

وہب کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ تو خود اس رشتے کی تمنا رکھتے تھے؛ بلکہ بعض روایات کے مطابق تو عام دستور کے برعکس اس سلسلے میں انہوں نے پہل کی تھی اور اپنی بیوی کو عبدالمطلب کے گھر اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ عبداللہ کے لئے آمنہ کا رشتہ قبول کرلیں۔

وہب کی بے تابی کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے عبداللہ کی ایک انوکھی عظمت کا بچشمِ خود نظارہ کرلیا تھا۔

حفاظتِ الٰہیہ

ایک دن عبداللہ شکارگاہ میں شکار کھیل رہے تھے۔ اتفاقاً وہب بھی پھرتے پھراتے

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ، ج۱، ص۵۰، الآثار المحمدیہ، ج۱، ص۴۰۔

(۲) الزرقانی علی المواہب، ج۱، ص۱۲۴، الآثار المحمدیہ، ج۱، ص۳۸۔

اُدھر جا نکلے۔ عبداللہ بے فکری سے شکار میں مشغول تھے کہ اچانک جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ستر، اسی یہودی تلواریں لہراتے ہوئے باہر نکل آئے اور عبداللہ کو گھیر لیا۔ وہب نے یہ صورت حال دیکھی تو عبداللہ کی امداد کے لئے دوڑ پڑے مگر اکیلے وہب اتنے سارے شمشیر بکف دشمنوں سے عبداللہ کو کب بچا سکتے تھے؟

ناگاہ سفید گھوڑوں پر سوار بہت سے افراد کہیں سے نمودار ہو گئے۔ یہ لوگ دنیا کے عام لوگوں کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی یہودیوں پر حملہ کر دیا اور چند لمحوں میں انہیں مار بھگایا۔ (۱)

حفاظت الٰہیہ کا یہ کرشمہ دیکھتے ہی وہب نے دل میں طے کر لیا

لَنْ یَّسْتَقِیْمَ لِابْنَتِیْ اٰمِنَةَ زَوْجٌ غَیْرُ هٰذَا. (۲)

(میری بیٹی آمنہ کے لئے اس سے زیادہ موزوں شوہر کوئی نہیں ہو سکتا)

ظاہر ہے، جس نوجوان کی حفاظت کے لئے کارخانہ قدرت کی نادیدہ اور مخفی قوتیں مصروف عمل ہوں، اس سے بہتر داماد وہب کو کہاں مل سکتا تھا؟

پہل عبدالمطلب کی طرف سے ہوئی ہو یا وہب کی طرف سے، بہر حال فریقین کی بے تابانہ رضامندی سے یہ رشتہ طے ہو گیا اور پھر ایک دن عبدالمطلب اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر بغرضِ شادی وہب کے گھر کی طرف چل پڑے۔

---

(۱) دراصل یہودی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ آخری نبی، بنی اسرائیل میں سے ہو گا مگر آخری نبی کے والد کی جو علامات انہیں اپنی سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایات کے ذریعہ معلوم ہوئی تھیں، وہ کسی اسرائیلی میں نہیں؛ بلکہ ایک اسمٰعیلی (عبداللہ) میں پائی جا رہی تھیں اور بنی اسمٰعیل کے ساتھ حسد و رقابت کی وجہ سے یہ بات انہیں کسی طرح گوارا نہ تھی کہ نبوت و رسالت کا عظیم اعزاز کسی اسمٰعیلی کو حاصل ہو۔ اس لئے انہوں نے عبداللہ کو مار ڈالنے کی کوشش کی تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری، مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟

(۲) تاریخ الخمیس، ج ۱، ص ۱۸۳، شواهد النبوة، مترجم ص ۴۹۔

دولھا کی ایک جھلک

قارئین کرام! آیئے، ذرا شادی سے پہلے اس دولہا کی ایک جھلک دیکھ لیں جس کی خوبصورتی کا اوراقِ تاریخ میں بڑا چرچا ہے۔

جس طرح مصر کی خواتین حضرت یوسف علیہ السلام کے شہکارِ حسن کو دیکھ کر مدہوش ہوگئی تھیں، اسی طرح عرب کی عورتیں قریش کے اس جوانِ رعنا کے جمالِ بے مثال پر فریفتہ تھیں اور ہوش و خرد سے بے گانہ ہو چلی تھیں۔

وَكَانَ اَجْمَلَهُمْ فَشَغَفَتْ بِهٖ نِسَآءُ قُرَيْشٍ وَكِدْنَ اَنْ تَذْهَبَ عُقُوْلُهُنَّ. (۱)

(وہ حسین ترین انسان تھے، قریش کی عورتیں ان کی محبت میں پاگل اور دیوانی ہوئی جاتی تھیں۔)

دس، بیس نہیں، سینکڑوں لڑکیاں ان کی محبت میں گرفتار تھیں اور آس لگائے بیٹھی تھیں کہ ہماری شادی عبداللہ سے ہو جائے گی، مگر جب عبدالمطلب نے سیدہ آمنہ کو منتخب کرلیا تو عشقِ عبداللہ میں وارفتہ دیگر لڑکیاں، عمر بھر غمِ محبت کو دل میں بسائے کنواری بیٹھی رہیں اور انہوں نے کہیں بھی شادی نہیں کی --- کہ اگر عبداللہ نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں۔

ہاں! مجھے اب اپنی ان تنہائیوں سے پیار ہے
یہ جو میرے ساتھ ہیں تیرے چلے جانے کے بعد

چنانچہ حضرت عباسؓ فرماتے ہیں۔

لَمَّا بَنٰى عَبْدُاللّٰهِ بِاٰمِنَةَ اَحْصَوْا مِائَتَىْ اِمْرَأَةٍ مِّنْ بَنِىْ مَخْزُوْمٍ وَبَنِىْ عَبْدِمُنَافٍ مُتْنَ وَلَمْ يَتَزَوَّجْنَ اَسَفًا عَلٰى مَا فَاتَهُنَّ مِنْ عَبْدِاللّٰهِ. (۲)

(جب عبداللہ کی شادی آمنہ سے ہوئی تو بنی مخزوم اور بنی عبد مناف کی دو سو لڑکیاں شمار کی گئیں، جنہوں نے عبداللہ کو نہ پاسکنے کے غم میں مرتے دم تک شادی نہیں کی۔)

کیا تاریخ عالم میں کوئی ایسا البیلا آپ کی نظروں سے گزرا ہے، جس کے غمِ فراق

---

(۱) الزرقانی علی المواهب، ج۱،ص۱۳۳، الآثار المحمدية، ج۱،ص۳۸۔

(۲) الزرقانی علی المواهب، ج۱،ص۱۳۴، تاریخ الخمیس، ج۱،ص۱۸۳،۱۸۴۔

میں دو سو لڑکیوں نے شادی سے انکار کر دیا ہو؟ --- نہیں --- ! ہرگز نہیں۔

اصل بات یہ ہے قارئینِ کرام --- ! کہ ذاتی طور پر کوئی شخص اتنا حسین ہو ہی نہیں سکتا --- جناب عبداللہ کے جمالِ بے محابا کا اصل راز یہ تھا کہ آپ نورِ نبوت کے حامل تھے، نورِ مصطفیٰ کے امین تھے۔ اسی نور کے جھلکنے کی بناء پر آپ کا چہرہ غیر معمولی طور پر تاباں و درخشاں تھا۔ سیرت نگاروں نے لکھا ہے۔

وَكَانَ نُوْرُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم يُرٰى فِيْ وَجْهِهٖ كَالْكَوْكَبِ الدُّرِّيِّ. (۱)

(ان کے روئے انور پر نورِ مصطفیٰ یوں جھلکتا تھا جیسے چمکتا ہوا تارا)

نورِ نبوت کا حامل یہ بانکا سجیلا اٹھارہ سالہ نوجوان جب بن سنور کر دولہا بنا ہوگا تو اس کی سج دھج کا کیا عالم رہا ہوگا --- !!!

جناب عبداللہ کی پاک دامانی

پڑھی لکھی عورتیں جانتی تھیں کہ عبداللہ کے چہرے پر دمکنے والا نور جس عورت کی طرف منتقل ہوگا، وہ روئے زمین کی سب سے زیادہ خوش قسمت عورت ہوگی، اس لئے وہ اپنا سب کچھ وار دینے پر تیار ہو جاتیں کہ شاید وہ نور ہماری طرف منتقل ہو جائے۔

چنانچہ جب آپ دولہا بنے اپنے ابا جان کے ساتھ جا رہے تھے تو فاطمہ نامی (۲) ایک مالدار حسینہ نے آپ کے چہرے پر نورِ نبوت کو تاباں دیکھ کر یہ پیشکش کی

يَافَتٰى! هَلْ لَكَ اَنْ تَقَعَ عَلَيَّ الْاٰنَ وَاُعْطِيَكَ مِائَةً مِنَ الْاِبِلِ.

(نوجوان! اگر تم مجھے اس گھڑی وصل سے شادکام کر دو تو اس کے عوض میں تمہیں سو اونٹ دوں گی۔)

وصل کے چند لمحات کے عوض سو اونٹ کی پیشکش --- اور وہ بھی صنفِ مخالف کی

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ، ج۱، ص۴۳، الآثار المحمدیہ، ج۱، ص۳۸۔

(۲) اس عورت کے نام میں اختلاف ہے۔ بعض نے قتیلہ، بعض نے رقیقۃ اور بعض نے لیلیٰ لکھا ہے۔ اس نے سابقہ کتابوں میں آخری نبی کے والد کی علامات پڑھی ہوئی تھیں۔

جانب سے --- اتنی پرکشش ہے کہ ''زاہدانِ پارسا'' کے قدم بھی ڈگمگا جائیں، مگر حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں --- جب حلال وحرام کی تمیز ہی اٹھ چکی تھی --- حضرت عبداللہ نے فی البدیہہ یہ ایمان افروز قطعہ کہا

اَمَّا الْحَرَامُ فَالْمَمَاتُ دُوْنَه' وَالْحِلُّ لَا حِلَّ فَاسْتَبِيْنَه'
يَحْمِیْ الْكَرِيْمُ عِرْضَه' وَ دِيْنَه' فَكَيْفَ بِالْاَمْرِ الَّذِیْ تَبْغِيْنَه'

(حرام کام کرنے سے تو یہ بہتر ہے کہ اس سے پہلے میری موت آ جائے اور جس کام کا تم کہہ رہی ہو، وہ حلال تو ہے نہیں کہ میں اس پر آمادہ ہو جاؤں۔
ہر شریف آدمی اپنی عزت اور اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے، پھر جس چیز کا تم تقاضا کر رہی ہو، وہ کس طرح پوری کی جا سکتی ہے؟) (۱)

خاندانی نجابت

یہ ہے کردار کی عظمت اور دامن کی پاکیزگی، جو جانِ دو عالم ﷺ کے تمام آباء واجداد کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ اپنے اس عظیم خاندانی شرف کو خود بیان فرماتے ہیں۔

لَمْ يَلْتَقِ اَبَوَایَ قَطُّ عَلٰی سَفَاحٍ. لَمْ يَزَلِ اللّٰهُ يَنْقُلُنِیْ مِنَ الْاَصْلَابِ الطَّيِّبَةِ اِلَی الْاَرْحَامِ الطَّاهِرَةِ مُصَفًّی مُهَذَّبًا (۲)

---

(۱) البدایة والنهایة، ج ۲، ص ۲۵۰، تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۷۵، روض الانف، ص ۱۰۴۔

(۲) اس مضمون کی بہت سی روایتیں کتب حدیث میں وارد ہیں۔ علامہ زرقانیؒ نے شرح مواہب میں ص ۸۰ سے ص ۸۴ تک ان تمام احادیث پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اسی طرح امام ابن کثیرؒ نے بھی ان روایات کو ذکر کیا ہے اور ان پر جرح کی ہے، لیکن آخر میں علامہ بیہقیؒ کا یہ فیصلہ درج کیا ہے۔

وَهٰذِهِ الْاَحَادِيْثُ وَاِنْ كَانَ فِیْ رُوَاتِهَا مَنْ لَا يُحْتَجُّ بِهٖ فَبَعْضُهَا يُؤَكِّدُ بَعْضًا.
(البدایہ والنهایہ، ج ۲، ص ۲۵۷)

(ان احادیث کے راویوں میں اگرچہ بعض راوی ایسے بھی ہیں جو قابل استناد نہیں ہیں، تاہم اس مضمون کی حامل بہت سی حدیثیں ہیں، جو ایک دوسرے کو قوی کر دیتی ہیں۔)

(میرے ماں باپ کسی بھی مرحلہ میں زنا کے مرتکب نہیں ہوئے۔ مجھے اللہ تعالیٰ ہمیشہ اصلابِ طیبہ سے ارحامِ طاہرہ کی طرف منتقل کرتا رہا --- صاف ستھرا۔)

شادی

بہرحال حضرت عبداللہ اپنے دامن کو ہر قسم کی آلودگی سے بچاتے ہوئے وہب کے گھر پہنچ گئے اور سیدہ آمنہ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

اہل عرب کا عموماً یہ دستور تھا کہ دولہا شبِ زفاف سسرال میں ہی بسر کرتا تھا اور تین دن تک وہیں مقیم رہتا تھا۔ حضرت عبداللہ بھی تین روز تک وہب کے گھر قیام پذیر رہے اور اسی قیام کے دوران وہ نور جو روئے عبداللہ پر جگمگاتا تھا، سیدہ آمنہ کی طرف منتقل ہو گیا۔(۱)

نورِ نبوت کی آرزو مند

تین دن بعد جب حضرت عبداللہ واپس اپنے گھر جا رہے تھے تو راستے میں پھر فاطمہ نامی اسی عورت کے ساتھ ملاقات ہو گئی جو آپ کو چند ساعات وصال کے عوض سو اونٹ دینے پر آمادہ تھی، مگر آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس عورت نے آپ کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی --- بات ہی حیرانی کی تھی --- جو عورت آج سے صرف تین دن پہلے اپنا سب کچھ لٹا دینے پر آمادہ تھی، وہ اب یوں بے رخی برت رہی تھی جیسے آشنا ہی نہ ہو۔ آخر حضرت عبداللہ سے نہ رہا گیا اور اس سے پوچھ ہی لیا۔

مَالَکِ لَا تَعْرِضِیْنَ عَلَیَّ الْیَوْمَ مَاعَرَضْتِ عَلَیَّ؟

(کیا بات ہے --- آج تم وہ پہلے والی پیش کش نہیں کر رہی ہو؟)

اس نے جواب دیا۔

فَارَقَکَ النُّوْرُ الَّذِیْ کَانَ مَعَکَ فَلَیْسَ لِیْ بِکَ الْیَوْمَ حَاجَۃٌ.

(پہلے جو نور تمہارے پاس تھا، وہ اب تم سے جدا ہو چکا ہے۔ اب مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔)

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ، ج۱، ص۱۴۴، الآثار المحمدیہ، ج۱، ص۳۹۔

اس موقع پر اس عورت نے ایک فی البدیہہ نظم بھی کہی تھی، جس کا آخری شعر یہ ہے

لِلّٰهِ مَا زُهْرِيَّةٌ سَلَبَتْ

مِنْكَ الَّذِىْ اسْتُلِبَتْ وَمَا تَدْرِىْ

(اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ایک زہری عورت نے تم سے کتنی بڑی نعمت لوٹ لی ہے اور تمہیں (یا اسے) پتہ ہی نہیں۔(۱)

حمل سیدہ آمنہ

سیدہ آمنہ کی یہی خوش بختی کیا کم تھی کہ انہیں حضرت عبداللہ جیسا مثالی شوہر ملا تھا کہ اس پر مزید سعادت یہ حاصل ہوگئی کہ ان کا بطنِ اطہر قرارگاہِ نورِ مصطفےٰ بن گیا۔ یہ حمل اس طرح کا حمل نہ تھا جیسے عموماً ہوتا ہے؛ بلکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیا کا سب سے انوکھا اور منفرد حمل تھا۔

سیدہ آمنہ خود بیان فرماتی ہیں

مَاشَعَرْتُ بِاَنِّىْ حَمَلْتُ بِهٖ وَلَا وَجَدْتُ لَهٗ ثِقْلاً وَ لَا وَحْمًا كَمَا تَجِدُ النِّسَآءُ........وَّاَتَانِىْ اٰتٍ وَّاَنَا بَيْنَ النَّائِمَةِ وَالْيَقْظَانَةِ فَقَالَ: هَلْ شَعَرْتِ بِاَنَّكِ قَدْ حَمَلْتِ بِسَيِّدِ الْاَنَامِ؟ (۲)

(مجھے اپنے حاملہ ہونے کا پتہ ہی نہ چلا، کیونکہ نہ تو مجھے کسی قسم کا بوجھ محسوس ہوا اور نہ ہی مجھے دیگر حاملہ عورتوں کی مانند کھٹی میٹھی چیزوں کی خواہش پیدا ہوئی --- پھر ایک دن میں سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت میں تھی کہ مجھے ایک غیبی ہستی نے یہ بشارت دی
"آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ تمام مخلوقات کے سردار کے ساتھ حاملہ ہوگئی ہیں۔")

سَنَةُ الْفَتْحِ وَالْاِبْتِهَاجِ

اس درِ شہوار کا صدفِ آمنہ میں قرار، اتنی خوشیوں اور راحتوں کا پیش خیمہ ثابت

---

(۱) الزرقانی، ج ۱، ص ۱۲۳، ۱۲۴، البدایة والنهایة، ج ۲، ص ۲۴۹، ۲۵۰، تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۷۵۔ (۲) الزرقانی، ج ۱، ص ۱۲۸، السیرة الحلبیه، ج ۱، ص ۵۱، طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۶۰۔

ہوا کہ اس سال کا نام ہی "سَنَۃُ الْفَتْحِ وَالْاِبْتِهَاجِ" (کامرانی اور شادمانی کا سال) پڑ گیا۔

وَكَانَتْ تِلْكَ السَّنَةُ الَّتِیْ حَمَلَتْ فِيْهَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يُقَالُ لَهَا سَنَةُ الْفَتْحِ وَالْاِبْتِهَاجِ، فَاِنَّ قُرَيْشًا كَانَتْ قَبْلَ ذٰلِكَ فِیْ جُدْبٍ وَّضِيْقٍ عَظِيْمٍ، فَاخْضَرَّتِ الْاَرْضُ وَحَمَلَتِ الْاَشْجَارُ وَاَتَاهُمُ الرَّغَدُ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ فِیْ تِلْكَ السَّنَةِ. (۱)

(جس سال سیدہ آمنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حاملہ ہوئیں، اس سال کو "سنۃ الفتح والا بتہاج" کہا جاتا تھا، کیونکہ اس سے پہلے قریش قحط سالی اور شدید تنگ دستی سے دوچار تھے مگر اس سال زمین سرسبز ہوگئی، درختوں کے ساتھ پھل لگ گئے اور قریش پر ہر طرف سے خوشحالی ٹوٹ پڑی۔)

وفاتِ حضرت عبداللہ

جانِ دو عالم ﷺ کے دنیا میں جلوہ افروز ہونے سے چند ماہ پہلے حضرت عبداللہ قریش کے ایک قافلے کے ہمراہ تجارت کے لئے شام گئے۔ واپس آتے ہوئے راستے میں طبیعت کچھ ناساز ہوگئی۔ جب قافلہ مدینہ کے قریب سے گزرا تو حضرت عبداللہ میں مزید سفر کی طاقت نہ رہی اس لئے قافلہ والوں سے کہا کہ تم لوگ اپنا سفر جاری رکھو۔ میں یہاں مدینہ میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں چند روز قیام اور آرام کروں گا۔

چنانچہ قافلہ والے انہیں مدینہ میں چھوڑ کر خود مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

حضرت عبداللہ کا خیال تھا کہ چند روزہ آرام سے افاقہ ہو جائے گا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور مرض دن بدن بڑھتا ہی گیا۔

ادھر جب قافلہ مکہ مکرمہ پہنچا تو عبدالمطلب نے ان سے اپنے بیٹے عبداللہ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ علالت کی وجہ سے مدینہ میں ٹھہر گئے تھے۔

عبدالمطلب نے اسی وقت اپنے سب سے بڑے بیٹے حارث کو ان کی خبر گیری کے

---

(۱) السیرۃ الحلبیۃ، ج ۱، ص ۵۳، الزرقانی، ج ۱، ص ۱۲۷۔

لئے بھیجا مگر شاید قدرت کو دو بھائیوں کی ملاقات منظور نہ تھی۔ حارث عین اس وقت پہنچے، جب عبداللہ اس دنیا سے منہ موڑ چکے تھے۔(۱)

کتنی حسرت ناک تھی یہ موت---!! غریب الوطنی میں دور دراز کے رشتہ داروں کے ہاں---دمِ نزع نہ پاس ماں تھی، نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن، نہ اپنی چہیتی بیوی اور نہ ہی کوئی اور قریبی رشتہ دار---اور عمر صرف اٹھارہ سال! فَیَا حَسْرَتَا

سیدہ آمنہ کا غم

جب اس جواں مرگ کی المناک وفات کی اطلاع مکہ مکرمہ پہنچی تو ایک کہرام بپا ہوگیا۔ ماں باپ اور بھائیوں بہنوں پر جو گزری سو گزری، لیکن سیدہ آمنہ کا غم غالباً سب سے فزوں تر تھا۔

❁ ---جس عورت کی خوشیاں عین عالم شباب میں لٹ گئی ہوں۔

❁ ---جو شادی سے صرف چند ماہ بعد بیوہ ہوگئی ہو۔

❁ ---جسے عبداللہ جیسا مثالی شوہر---جو سینکڑوں دلوں کی دھڑکن تھا---داغِ مفارقت دے گیا ہو۔

❁ ---جسے اپنے محبوب سرتاج کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہو سکا ہو۔

❁ ---جس کے پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ اپنی پیدائش سے پہلے ہی یتیم ہوگیا ہو۔

اس عورت کے غم واندوہ کا کون اندازہ کر سکتا ہے اور اس کے دکھ درد کو کون جان سکتا ہے؟

ہاں!---جب دل کی آگ سے الفاظ کا دھواں اٹھتا ہے تو کچھ کچھ آگ کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سیدہ آمنہ کے دردناک الفاظ پڑھئے اور ان کے کرب کو محسوس کیجئے!

یہ ایک مختصر سا مرثیہ ہے جس میں صرف چار شعر ہیں مگر حق یہ ہے کہ سیدہ آمنہ نے عربی ادب کا شہکار تخلیق کیا ہے اور مرثیہ گوئی کا حق ادا کر دیا ہے۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۶۳۔ الزرقانی، ج ۱، ص ۱۳۲۔ محمد رسول اللہ، ص ۱۰۔ طبقاتِ ابن سعد، ج ۱، ص ۶۱۔

مرثیہ

حضرت عبداللہ کی وفات سے سیدہ آمنہ کی نگاہوں میں جہاں تاریک ہوگیا---
انہیں چارسو ویرانیاں اور بربادیاں نظر آنے لگیں اور اپنے ہاشمی جیون ساتھی کے بچھڑنے سے ارضِ مکہ آلِ ہاشم سے خالی معلوم ہونے لگی۔

سنیئے---! سیدہ آمنہ کس دردناک لے میں کہہ رہی ہیں۔

عَفَا جَانِبُ الْبَطْحَاءِ مِنْ الِ هَاشِمٍ
وَجَاوَرَ لَحَدًا خَارِجًا فِي الْغَمَاغِمِ

(وادیٔ بطحاء کے اطراف و جوانب آلِ ہاشم سے خالی ہوگئے اور میرا سرتاج کفن میں لپٹا ہوا لحد میں جالیٹا۔)

حضرت عبداللہ کی موت اچانک ہی آ گئی تھی۔ مہینہ بھر بیمار رہے اور چل بسے۔ وہ ہر لحاظ سے بے مثال انسان تھے۔ ان کی رحلت کے بعد اب ان جیسا کون تھا؟

سیدہ آمنہ نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

دَعَتْهُ الْمَنَايَا بَغْتَةً فَاجَابَهَا
وَمَا تَرَكَتْ فِي النَّاسِ مِثْلَ ابْنِ هَاشِمٍ

(انہیں موت نے اچانک پکارا اور وہ اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس کی جانب چل دیئے۔ اب دنیا میں ہاشم کے اس بیٹے جیسا کوئی بھی باقی نہیں رہا۔)

اس کے بعد جنازہ اٹھنے کی منظر کشی کی ہے۔ یہ منظر آپ نے خود تو نہیں دیکھا تھا۔ شاید اپنے جیٹھ حارث کی زبانی سنا ہوگا۔

عَشِيَّةَ رَاحُوْا يَحْمِلُوْنَ سَرِيْرَه‘
تَعَاوَرَه‘ اَصْحَابُه‘ فِي التَّزَاحُمِ

(جب رات کے وقت لوگ ان کا جنازہ اٹھا کر چلے تو ازدحام کے باوجود ان کی چارپائی کو کندھا دینے کے لئے کبھی ایک آگے بڑھتا تھا، کبھی دوسرا۔)

حضرت عبداللہ کی مرگِ ناگہاں پر ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر دل سوگوار تھا۔

سیدہ آمنہ کہتی ہیں کہ ایسے فیاض اور رحمدل انسان کی جدائی پر سب نے غمگین تو ہونا ہی تھا۔

فَاِنْ تَکُ غَالَتْهُ الْمَنُوْنَ وَ رَیْبُهَا

فَقَدْ کَانَ مِعْطَاءً کَثِیْرَ التَّرَاحُمِ

(اب اگرچہ انہیں موت اور حوادثات نے ہم سے چھین لیا ہے؛ تاہم زندگی بھر وہ بے حد سخی اور انتہائی رحمدل رہے۔) (۱)

ملائکہ کا غم

حضرت عبداللہ کی وفات کا زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ جانِ دو عالم ﷺ اپنی ولادت سے پہلے ہی یتیم ہوگئے تھے۔ عام لوگوں کو تو بطنِ آمنہ میں پرورش پانے والی ہستی کی عظمت کا صحیح علم نہ تھا مگر کارکنانِ قضا و قدر ملائکہ تو جانتے تھے، اسلئے انہوں نے اس غم کو شدت سے محسوس کیا اور دربارِ الٰہی میں عرض کی

یَا اِلٰھَنَا وَسَیِّدَنَا! صَارَ نَبِیُّکَ بِلَا اَبٍ فَبَقِیَ مِنْ غَیْرِ حَافِظٍ وَّمُرَبٍّ.

(اے ہمارے الٰہ اور ہمارے آقا! تیرا نبی تو یتیم رہ گیا ہے۔ اس کی تربیت اور حفاظت کرنے والا باپ تو چل بسا۔)

اور دربارِ الٰہی سے جو جواب ملا، وہ عظمتِ مصطفیٰ کے نئے پہلو اجاگر کرگیا۔

فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ: اَنَا وَلِیُّه' وَحَافِظُه' وَحَامِیْهِ وَ رَبُّه' وَعَوْنُه' وَ رَازِقُه' فَصَلُّوْا عَلَیْهِ وَتَبَرَّکُوْا بِاسْمِهٖ. (۲)

(اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "میں اس کا دوست ہوں، میں اس کا نگہبان ہوں، میں اس کا حامی ہوں، میں اس کی تربیت کا ذمہ دار ہوں، میں اس کا مددگار رہوں اور میں اس کا رازق ہوں ---فرشتو! تم اس پر درود پڑھو اور اس کے نامِ نامی سے برکت حاصل کرو!")

صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ.

---

(۱) محمد رسول اللہ، ص ۱۰، الزرقانی، ج ۱، ص ۱۳۳، الآثار المحمدیہ، ج ۱، ص ۴۱، طبقات ابنِ سعد، ج ۱، ص ۶۲۔

(۲) الزرقانی، ج ۱، ص ۱۳۳، الآثار المحمدیہ، ج ۱، ص ۴۱۔

''مُبتدا'' تم ہو

اسعد اللہ خان اسعد، سہارن پوری

مجھے کیا علم کیا تم ہو، خدا جانے کہ کیا تم ہو
بس اتنا جانتا ہوں، محترم بعد از خدا تم ہو

زمانہ جانتا ہے صاحبِ لَوْ لَا لَمَا تم ہو
جہاں کی ابتدا تم ہو، جہاں کی انتہا تم ہو

کسی کی آرزو کچھ ہو، کسی کا مُدّعا کچھ ہو
ہماری آرزو تم ہو، ہمارا مُدّعا تم ہو

نہ یہ قدرت زباں میں ہے، نہ یہ طاقت بیاں میں ہے
بتاؤں کیا کہ کیا تم ہو، سناؤں کیا کہ کیا تم ہو

رسالت کو شرف ہے ذاتِ اقدس کے تعلق سے
نبوّت ناز کرتی ہے کہ ختم الانبیا تم ہو

کہاں ممکن تمہاری نعت حضرتؐ! مختصر یہ ہے
دو عالم مل کے جو کچھ بھی کہیں اس سے سوا تم ہو

گروہ راز دانِ ''نظمِ فطرت'' پر نہیں مخفی
یہ سب ہنگامۂ دنیا ''خبر'' ہے، ''مبتدا'' تم ہو

فصاحت کو تحیّر ہے، بلاغت کو پریشانی
کہ لفظوں سے بہت بالا جنابِ مصطفٰے تم ہو

گنہ گارانِ اُمّت کا سہارا، ذاتِ والا ہے
خوشا قسمت کہ حضرتؐ! شافعِ روزِ جزا تم ہو

یہ ربطِ باہمی اُمّت کو وجہِ صد تفاخر ہے
تمہارا ہے خدا محبوب، محبوبِ خدا تم ہو

تمہارے واسطے اسعد! کہیں بہتر ہے شاہی سے
کہ اِک ادنیٰ غُلامِ بارگاہِ مصطفٰے تم ہو

❀❀❀

باب ۲

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
اس دل افروز ساعت پہ لاکھوں سلام

صُبحِ مسرّت

از
ولادت با سعادت

تا
اعزازِ رسالت

جشنِ عیدِمیلادُالنّبی

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

قاضی عبدالدائم دائم

مبارک ہو ، مبارک ، عید میلادالنبی آئی
ہوئے جس دم شہِ کونین پیدا ، وہ گھڑی آئی

مبارک ہو، مبارک ہو، کہ آیا ہے وہ دن جس میں
چھٹیں تاریکیاں باطل کی ، حق کی روشنی آئی

کِھلے غنچے ، چمن مہکے ، طیُور گلِستاں چہکے
فضا میں رَچ گئی خوشبو ، ہوا میں تازگی آئی

بنی ہیں آمنہ بی بی حبیبِ کبریا کی ماں
سعادت ان کے حصے میں یہ کتنی ہی بڑی آئی

ملے سب دائیوں کو لاڈلے ماں باپ کے لیکن
حلیمہ تُو تو رب کا لاڈلا لے کر چلی آئی

علامت جانی پہچانی ہے یہ اہلِ محبت کی
سنی جونہی نبی کی نعت ، آنکھوں میں نمی آئی

عبادت رائگاں جائے گی ساری زاہدا ! تیری
اگر عشقِ محمد میں ذرا سی بھی کمی آئی

ہوا بے قابو دل دائمؔ کا ، ٹوٹے ضبط کے بندھن
نظر جب سامنے اُس کو مدینے کی گلی آئی

پیمانِ ازل

عالمِ ارواح میں ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ ایک لاکھ سے زائد انبیاء کرام اور رُسل عظام کی ارواح جمع تھیں --- چونکہ کائنات کا خالق و مالک اس دن بنفس نفیس ایک اہم اعلان کرنے والا تھا اس لئے سب ہمہ تن گوش تھے --- بالآخر شہنشاہ مطلق کی پر عظمت و جلال آواز گونجی --- وہ گروہ انبیاء سے مخاطب تھا۔

﴿لَمَا اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتَابٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ ط﴾

(جب میں تم لوگوں کو فریضۂ نبوت و رسالت ادا کرنے کے لئے دنیا میں بھیجوں گا تو تمہیں کتاب بھی دوں گا اور حکمت سے بھی نوازوں گا، لیکن اگر اسی دوران وہ رسول آ گیا جو تمہاری کتابوں کی تصدیق والا ہوگا تو (تمہاری نبوت و رسالت کی ذمہ داریاں ختم ہو جائیں گی، تمہاری کتابیں منسوخ ہو جائیں گی اور) تمہیں اس رسول پر ایمان لانا پڑے گا اور اس کے ساتھ امداد و تعاون کرنا ہوگا۔)

یہ فرمان ہی کافی تھا --- جن ہستیوں کو مخاطب کر کے یہ فرمان جاری کیا جا رہا تھا، ان سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ کسی مرحلے میں اس سے سرتابی کریں --- لیکن اس کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر حاضرین کا زبانی اقرار بھی ضروری سمجھا گیا اور ان سے پوچھا گیا

- ءَاَقْرَرْتُمْ؟ (کیا تم اقرار کرتے ہو؟)

پھر اس فرمان کو اپنا عہد قرار دے کر اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کیا گیا۔

وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ؟ (اور اس پر میرا عہد لیتے ہو؟)

انکار کی مجال ہی کسے تھی ---؟ سب نے کہا

اَقْرَرْنَا (ہم اقرار کرتے ہیں)

تعجب ہے کہ انبیاء کرام کی پاکیزہ ارواح کے اس اقرار پر بھی اکتفا نہیں کیا گیا؛ بلکہ اس پر باقاعدہ گواہیاں ڈالی گئیں ---اور گواہ کون بنے ---؟ انبیاء کی پوری جماعت اور خود رب العلمین۔

قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○

(رب نے کہا ''تم سب اس پر گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں شامل ہوں۔'')

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس پیمان کی اہمیت کا جس کے گواہوں کے زمرہ میں بادشاہِ حقیقی کا اپنا نام بھی درج ہو؟

رب کریم جانتا تھا کہ انبیاء تو میرے کسی بھی حکم سے انحراف نہیں کریں گے لیکن انبیاء کی امتوں میں ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو اس عہد سے پھر جائیں گے، اس لئے اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اس پیمان سے انحراف کا انجام بھی بیان کردیا جائے۔ چنانچہ مزید ارشاد ہوا

﴿فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ○﴾ (۱)

(اگر اس کے بعد کسی نے اس میثاق سے روگردانی اختیار کی تو اس کا شمار فاسقوں میں ہوگا۔)

قرآنِ کریم میں شاید ہی کسی شے کے لئے اتنی تاکید و اہتمام کیا گیا ہو جتنا اس مِیثَاقُ النَّبِیّٖنَ کے لئے کیا گیا۔

حکمت میثاق

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تاکید و اہتمام کی، اس قول و قرار کی، اس عہد و پیمان کی، ان گواہیوں کی اور اس میثاق سے روگردانی کا ہولناک انجام بیان کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی ---جب کہ نبیوں، رسولوں کو بھیجنے والا بادشاہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس رسول

(۱) قرآن مجید، سورہ ۳، آیات ۸۱، ۸۲.

نے ان میں سے کسی کے دور میں بھی نہیں آنا --- اس نے تو سب سے آخر میں خَاتَمَ النَّبِیِّیْن بن کر آنا ہے؟

درحقیقت یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تاکہ ان عظیم الشان اور جلیل القدر ہستیوں کے دل میں اس آنے والے کی عظمت نقش ہو جائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کی نبوت اور ان کی کتابوں کی اس رسول کی نبوت اور کتاب سے وہی نسبت ہے جو تاروں کو آفتابِ عالمتاب سے ہوتی ہے --- خاورِ مشرق کے ضوفشاں ہوتے ہی ستاروں کی تابانی ازخود معدوم ہو جاتی ہے۔ علامہ بوصیری کہتے ہیں

فَاِنَّہٗ شَمْسُ فَضْلٍ ھُمْ کَوَاکِبُھَا
یُظْھِرْنَ اَنْوَارَھَا لِلنَّاسِ فِی الظُّلَمِ

(بلاشبہ رسول اللہ ﷺ فضل و کمال کے سورج ہیں اور باقی انبیاء ستارے، جو اپنے اپنے وقت میں اندھیروں میں روشنیاں بکھیرتے رہے۔)

خود جانِ دو عالم ﷺ نے اس حقیقتِ کبریٰ کو یوں بیان فرمایا

لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا بَیْنَ اَظْھُرِکُمْ مَا حَلَّ لَہٗ اِلَّا اَنْ یَّتَّبِعَنِیْ. (۱)

(اگر موسیٰ تمہارے درمیان زندہ موجود ہوتے تو انہیں بھی میرا ہی اتباع کرنا پڑتا۔)

امام ابن کثیرؒ اپنی شہرہ آفاق تفسیر میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں

فَالرَّسُوْلُ مُحَمَّدٌ ﷺ خَاتَمُ الْاَنْبِیَآءِ---صَلَوَاتُ اللہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِ دَائِمًا اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ---ھُوَ الْاِمَامُ الْاَعْظَمُ الَّذِیْ لَوْ وُجِدَ فِیْ اَیِّ عَصْرٍ وُجِدَ لَکَانَ ھُوَ الْوَاجِبَ الطَّاعَۃِ الْمُتَقَدِّمَ عَلَی الْاَنْبِیَآءِ کُلِّھِمْ.

(وہ رسول جن کا نام محمد ﷺ ہے اور جو خاتم الانبیاء ہیں---ان پر قیامت تک درود و سلام ہو---وہی سب سے عظیم امام ہیں۔ وہ خواہ کسی زمانے میں بھی موجود ہوتے، سب پر انہی کی اطاعت و فرماں برداری واجب ہوتی اور وہی تمام انبیاء سے برتر و مقدم ہوتے۔) (۲)

(۱)، (۲) تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۲۷۸۔

دعائے خلیل

پھر اس رسول کے لئے کبھی خلیل اللہؑ صحنِ حرم میں یوں دست بدعا نظر آتے ہیں۔

﴿ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝﴾ (۱)

(اے ہمارے رب! ان لوگوں کے لئے انہی میں سے ایک رسول بھیجنا جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور انہیں باطنی طور پر پاک و صاف کرے۔ بلاشبہ تو زبردست ہے اور حکمت والا۔)

بشارتِ کلیم

کبھی کلیم اللہؑ بنی اسرائیل کو یوں خوشخبری سناتے دکھائی دیتے ہیں۔

''اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ (۲)

ظاہر ہے کہ اس بشارت کا مصداق کوئی اسرائیلی نبی نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہاں جس نبی کی بشارت دی جارہی ہے، وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہوگا --- بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسمٰعیل ہیں اور بنی اسمٰعیل میں جانِ دوعالم ﷺ کے سوا اور کون ہوا ہے، جس کے منہ میں خداوند نے اپنا کلام ڈالا ہو؟

نویدِ مسیحا

کبھی روح اللہؑ یہ نویدِ جاں فزا سنا کر سامعین کے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔

وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ ؕ (۳)

---

(۱) قرآن مجید، سورہ ۲، آیۃ ۱۲۹۔ (۲) توریت، استثناء، باب ۱۸، آیات ۱۷، ۱۸، ۱۹۔ (۳) قرآن مجید، سورہ ۶۱، آیت ۲۶۔

(میں اس رسول کی آمد کی بشارت دینے آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا اسمِ گرامی اَحْمَدُ ہوگا۔)

نہ صرف بشارت دیتے ہیں؛ بلکہ اسے دنیا کا سردار قرار دیتے ہیں اور اس کی عظمت کا یوں اعتراف کرتے ہیں۔

''اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔''(۱)

ہمیں اس نبی کا امتی ہونے پر کیوں نہ ناز ہو جس کی جوتی کے تسمے باندھنا عیسیٰؑ کے لئے عظیم اعزاز ہو؟

یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں--- نہ مجھے اس کی جرأت ہو سکتی ہے --- یہ تو حضرت عیسیٰ کا اپنا ارشادِ گرامی ہے۔ وہ فرماتے ہیں

''کیسا مبارک وقت ہوگا جب وہ دنیا میں آئے گا---! یقین جانو میں نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے، جس طرح ہر نبی نے اس کو دیکھا ہے--- اس کی روح کو دیکھنے ہی سے خدا نے ان کو نبوت دی اور جب میں نے اس کو دیکھا تو میری روح سکینت سے بھر گئی، یہ کہتے ہوئے کہ اے محمد! خدا تمہارے ساتھ ہو اور وہ مجھے تمہاری جوتی کے تسمے باندھنے کے قابل بنا دے، کیونکہ یہ مرتبہ بھی پالوں تو میں ایک بڑا نبی اور خدا کی ایک مقدس ہستی ہو جاؤنگا۔''(۲)

---

(۱) انجیل یوحنا، باب ۱۴، آیت ۳۰۔

(۲) انجیل برنا باس، باب ۴۴، حضرت عیسیٰؑ کی زبانی اس طرح کا اعترافِ عظمتِ مصطفیٰ ﷺ انجیل برناباس میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے اور اسی ''جرم'' کی بنا پر یہ کتاب عیسائی دنیا میں معتوب ٹھہری اور اس کو غائب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

سولہویں صدی عیسوی میں اس کا ایک نسخہ پوپ سکسٹس کی لائبریری میں موجود تھا مگر اسے پڑھنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ایک منچلا جان پولینڈ اسے پوپ کی ☜

پڑھئے---! بار بار پڑھئے---! ایک ایک لفظ پر غور کیجئے اور پھر سلاموں کی ڈالی نذر گزاریئے اس روح اللہ کے حضور جس نے بارگاہ حبیب اللہ میں صدیوں پہلے یہ شہکار نذرانۂ عقیدت پیش کیا---عَلَیْهِ وَعَلٰی نَبِیِّنَا اَلْفُ اَلْفُ سَلَامٍ وَّتَحِیَّة.

قرآن کریم نے جان دوعالم ﷺ کی ایک یہ صفت بھی بیان فرمائی ہے۔

﴿یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ.﴾ (۱)

(اس نبی کو وہ توریت وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔)

توریت وانجیل مدتوں سے ربیوں، کاہنوں اور پادریوں کی من مانی تحریفات کا تختۂ مشق بنی ہوئی ہیں، لیکن بے شمار تبدیلیوں کے باوجود آج بھی جانِ دوعالم ﷺ کی

لائبریری سے لے اڑا۔ پھرتے پھراتے اور مختلف ہاتھوں سے گزرتے ہوئے بالآخر یہ نسخہ ویانا کی امپیریل لائبریری جا پہنچا۔ یہ نسخہ اطالوی زبان میں تھا، اگر اسی زبان میں رہتا تو بہت کم لوگوں کو اس کے مندرجات کا علم ہوتا، کیونکہ اطالوی زبان عام نہیں ہے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے عظمت مصطفےٰ ﷺ کو اجاگر کرنا تھا، اس لئے آکسفورڈ والوں کو اس کے ترجمہ کا شوق چرایا اور انہوں نے ۱۹۰۷ء میں اس کا انگریزی ترجمہ چھاپ دیا۔ انگریزی جیسی بین الاقوامی زبان میں منتقل ہونے کے بعد بہت سے اہل علم اس کے مندرجات سے آگاہ ہو گئے۔

عیسائیوں نے جب دیکھا کہ اس انجیل کے بیان کردہ حقائق عیسائیت کی عمارت کو ہی ڈھائے دے رہے ہیں تو انہوں نے اسے چھپانے کی کوشش شروع کر دی اور کسی تدبیر سے اس کے مطبوعہ نسخے غائب کر دیئے گئے۔ پھر آج تک اس کی دوبارہ اشاعت نہ ہو سکی۔ مگر کچھ نسخے لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچ چکے تھے، اس لئے جب فوٹو اسٹیٹ مشین کا رواج عام ہوا تو اس کے فوٹو اسٹیٹ دنیا بھر میں پھیل گئے اور یوں اسے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی تمام کوششوں پر پانی پھر گیا---وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ o

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ برناباس کون تھا؟ کس زمانے میں تھا؟ اس کی مرتب کردہ انجیل کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ انجیل باقی چار انجیلوں سے زیادہ مصدقہ کس بناء پر ہے؟ تفہیم القرآن ج ۵، ص ۴۶۱ تا ۴۷۶ کا مطالعہ کیجئے۔

(۱) قرآن مجید، سورہ ۷، آیت ۱۵۷

پیشنگوئیاں پوری آب وتاب سے صفحات بائبل پر موتیوں کی طرح بکھری پڑی ہیں اور یَجِدُوْنَه' مَکْتُوْبًا کی صداقت پر گواہی دے رہی ہیں۔۔۔حقیقت پھر حقیقت ہے، نمایاں ہو ہی جاتی ہے۔

آرزوئے کعب

حضرت عیسٰیؑ اور جانِ دو عالم ﷺ کے درمیانی عرصے میں کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا مگر انبیاء کرام آنے والے رسول کی اتنی صفات وعلامات بیان کر گئے تھے کہ اہل کتاب تو اس کے منتظر تھے ہی، عرب کے باکمال لوگ بھی چشم براہ تھے۔ چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ کے ایک جدِ امجد کعب کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں۔

فَکَانَتْ قُرَیْشٌ تَجْتَمِعُ اِلٰی کَعْبٍ فَیَعِظُھُمْ وَیُذَکِّرُھُمْ بِمَبْعَثِ النَّبِیِّ ﷺ وَیُعَلِّمُھُمْ بِاَنَّه' مِنْ وُّلْدِهٖ وَیَاْمُرُھُمْ بِاتِّبَاعِهٖ وَیَقُوْلُ سَیَاتِیْ لِحَرَمِکُمْ نَبَاءٌ عَظِیْمٌ وَّ یَخْرُجُ مِنْهُ نَبِیٌّ کَرِیْمٌ. (۱)

(کعب کے پاس قریش اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ وہ انہیں وعظ ونصیحت کیا کرتے تھے اور نبی ﷺ کی آمد کی یاددہانی کراتے ہوئے انہیں بتایا کرتے تھے کہ وہ میری اولاد میں سے ہوگا اور حکم دیا کرتے تھے کہ جب وہ نبی آئے گا تو تم اس کی پیروی کرنا۔ وہ اکثر قریش سے کہا کرتے تھے کہ عنقریب تمہارے اس حرم میں ایک بڑی خبر ظاہر ہوگی اور یہاں سے ایک نبی کریم مبعوث ہوگا۔)

جانِ دو عالم ﷺ کی ولادت سے تقریباً پانچ سو ساٹھ سال پہلے ہی کعب نے اس نبی کریم کی شان میں قصیدے کہنے شروع کر دیئے تھے۔ ان کے ایک قصیدے کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے!

عَلٰی غَفْلَةٍ یَاْتِیْ النَّبِیُّ مُحَمَّدٌ
فَیُخْبِرُ اَخْبَارًا صَدُوْقٌ خَبِیْرُھَا (۲)

---

(۱) روض الانف، ج۱،ص۶، تاریخ الخمیس، ج۱،ص۱۵۲، الزرقانی، ج۱،ص۹۰، ۹۱۔

(۲) البدایة والنہایة ج۲،ص۲۴۴، السیرة الحلبیة، ج۱،ص۱۷۔

(جب لوگ یادالٰہی سے غافل ہو جائیں گے تو وہ نبی آئے گا جس کا نام محمد ہوگا، وہ لوگوں کو بہت سی خبریں سنائے گا۔ سچا ہوگا اور باخبر۔)

کبھی اپنی حسرت وآرزو کا یوں اظہار کیا کرتے۔

یَالَیۡتَنِیۡ شَاھِدٌ فَحۡوَآءَ دَعۡوَتِہٖ

حِیۡنَ الۡعَشِیۡرَۃِ تَبۡغِیۡ الۡحَقَّ خُذۡلَانًا

(کاش! میں اس وقت تک زندہ رہوں جب وہ لوگوں کو حق کی دعوت دیں گے اور ان کے قبیلہ والے اس حق کو رسوا کرنے کے درپے ہوں گے۔) (۱)

رویائے عبدالمطلب

پہلے باب میں عبدالمطلب کے جو متعدد خواب ذکر کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت ہر موقع پر سچے خوابوں کے ذریعہ ان کی رہنمائی کر دیا کرتی تھی --- جانِ دو عالم ﷺ کی آمد کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہوا اور عبدالمطلب کو خواب کے ذریعہ بشارت دے دی گئی۔ عجیب وغریب خواب اور اس کی تعبیر کا واقعہ عبدالمطلب کی زبانی سنئے!

''میں نے ایک رات ایسا خواب دیکھا جس سے میں خوفزدہ ہوگیا۔ اس کی تعبیر معلوم کرنے کے لئے صبح صبح ایک کاہنہ کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ میں نے آج رات خواب میں ایک نورانی درخت کو اُگتے دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی چوٹی آسمان تک جا پہنچی اور اس کی ڈالیاں اور شاخیں مشرق ومغرب تک پھیل گئیں۔ وہ درخت اتنا نورانی تھا کہ میں نے اس سے پہلے اتنی منور شئے کوئی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی روشنی سورج کی روشنی سے بھی ستر گنا زائد تھی۔ اس کے سامنے عرب اور عجم سب سجدے میں پڑے تھے۔ اس درخت کی بڑائی، نورانیت اور اونچائی لحہ بہ لحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کبھی وہ میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا، کبھی دکھائی دینے لگتا۔

میں نے قریش کے کچھ لوگوں کو اس کی ٹہنیوں سے لٹکتے ہوئے دیکھا اور کچھ

---

(۱) البدایة والنہایة، ج ۲، ص ۲۴۴، روض الانف، ج ۱، ص ۶۔

افراد کو دیکھا کہ وہ اسے کاٹنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچتے ہیں تو ایک خوبصورت جوان اچانک آگے بڑھتا ہے اور انہیں مار مار کر ان کی کمریں توڑ دیتا ہے اور آنکھیں پھوڑ دیتا ہے۔ وہ جوان ایسا حسین وجمیل تھا کہ اس طرح کا حسین میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس کے جسم سے ایسی خوشبو پھوٹتی تھی کہ اتنی عمدہ مہک میں نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔

میں بھی اس درخت کے ساتھ لٹکنے کے لئے آگے بڑھا مگر مجھے روک دیا گیا۔ میں نے پوچھا---''لِمَنِ النَّصِیْبُ؟'' (یہ سعادت کن لوگوں کو نصیب ہوتی ہے؟)

جواب ملا---''یہ صرف انہی لوگوں کا مقدر ہے جو پہلے سے اس کے ساتھ لٹکے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔''

جب کاہنہ نے یہ خواب سنا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا--- کہنے لگی۔

لَئِنْ صَدَقَتْ رُؤْیَاکَ لَیَخْرُجَنَّ مِنْ صُلْبِکَ رَجُلٌ یَمْلِکُ الْمَشْرِقَ وَالْمَغْرِبَ وَتَدِیْنُ لَهٗ النَّاسُ.

(اگر آپ کا یہ خواب سچا ثابت ہوا تو آپ کی صُلب سے ایک ایسا عظیم الشان انسان پیدا ہوگا جو مشرق ومغرب کا مالک ہوگا اور دنیا اس کے سامنے جھک جائے گی) (۱)

مشاہدۂ آمنہ

اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں اور مطلعِ کائنات پر مہر رسالت ضیا بار ہونے والا ہے---سیدہ آمنہ کو جس غیبی ہستی نے حمل کے وقت یہ خوشخبری سنائی تھی کہ ''آپ سید الانام کے ساتھ حاملہ ہوگئی ہیں۔'' وہی ہستی ایک بار پھر نمودار ہوئی اور یہ ہدایت دی

''قُوْلِیْ اِذَا وَضَعْتِهٖ ، اُعِیْذُهٗ بِالْوَاحِدِ مِنْ شَرِّ کُلِّ حَاسِدٍ ---ثُمَّ سَمِّیْهِ مُحَمَّدًا.''

(جب اس بچے کی ولادت ہو تو آپ یوں کہئے---''میں اسے ہر حاسد کے شر

(۱) السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۸۹، الآثار المحمدیہ، ج ۱، ص ۳۶.

سے خدائے وحدہٗ لاشریک کی پناہ میں دیتی ہوں'' --- پھر اس کا نام مُحَمَّدْ رکھیے۔''(۱)

وجۂ تسمیہ

مُحَمَّدْ کا معنی ہے ''باربار تعریف کیا گیا'' یا ''بہت زیادہ تعریف کیا گیا''

یہ نام انتہائی دلکش اور آسان ہونے کے ساتھ ساتھ نیا اور انوکھا بھی تھا۔(۲) خصوصاً خاندان بنی ہاشم میں تو اس نام کا سرے سے کوئی آدمی نہیں گزرا تھا، اس لئے غیبی ہستی نے یہ بھی بتا دیا کہ اس انوکھے نام کے انتخاب کی وجہ کیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ آنے والی ہستی وہی ہے جس کا نام سابقہ الہامی کتابوں میں اَحْمَدْ ہے۔

فَاِنَّ اسْمَهٗ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ اَحْمَدُ یَحْمَدُهٗ اَهْلُ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ.

(اس ہستی کا نام توریت وانجیل میں ''اَحْمَدْ'' ہے اور اس نام کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعریف میں اہل زمین وآسمان رطب اللساں ہوں گے)(۳)

بہارِ جاوداں --- لیلِ ضوفشاں

بالآخر انتظار کا زمانہ کٹ گیا، فراق کا عرصہ ختم ہوا اور نبوت ورسالت کے آفتابِ عالمتاب کے ضیابار ہونے کا وقت قریب آ لگا۔

❀❀❀

---

(۱) سیرت ابن ھشام، ج ۱، ص ۱۰۵، طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۶۰، البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۶۳.

(۲) جانِ دوعالم ﷺ کے ظہور قدسی سے پہلے عرب کی پوری تاریخ میں صرف چند آدمی اس نام کے گزرے ہیں اور ان کے ماں باپ نے بھی اپنے بیٹوں کے لئے یہ نام اس لئے پسند کیا تھا کہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ آخری نبی کا نام مُحَمَّدْ ہوگا --- انہوں نے اس توقع پر اپنے بیٹوں کا یہ نام رکھا تھا کہ شاید یہ اعزاز ہماری اولاد کو حاصل ہو جائے مگر صرف نام رکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔

(۳) البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۹۳، السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۹۱.

---یہ اپریل کا مہینہ تھا اور موسم بہار ہے---

بہار کی رنگینیوں، رعنائیوں اور شادابیوں کی اگر کوئی شخص عکاسی کرنا چاہے تو اس کے لئے الفاظ کہاں سے لائے؟

اس سہانے موسم کی اِک اِک چیز پر---اس کی مہکتی فضاؤں پر، دُربار گھٹاؤں پر، عنبریں ہواؤں پر، مسکراتی کلیوں پر، کھلکھلاتے پھولوں پر، مرغزاروں شاخساروں پر اور ان میں چہچہاتی گنگناتی چڑیوں پر، ڈالی ڈالی پہ رقصاں خوشنما وخوش نوا پرندوں پر، گلوں کو چومتی اور فرطِ مسرت سے جھومتی بلبلوں پر---غرضیکہ بہار کی ایک ایک ادائے دلنواز پر شاعروں نے کئی کئی غزلیں کہہ ڈالیں، ادیبوں نے مہ پارے تخلیق کر دیئے، مگر

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

محدود اور معدود الفاظ کے ساتھ، جوبن پر آئے ہوئے فطرت کے حسنِ لامحدود کی عکاسی ہو بھی کیسے سکتی ہے!

مگر افسوس! کہ حسن و جمال کے خزانے لٹانے والی یہ بہار عارضی ہوتی ہے، فانی ہوتی ہے---خزاں کے بے رحم ہاتھ جب مصروفِ تاخت و تاراج ہوتے ہیں تو یہ سب رعنائیاں چند ہی دنوں میں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں اور چمن زار میں صرف چند ٹُنڈ مُنڈ درخت اپنی حالتِ زار پر نوحہ کناں باقی رہ جاتے ہیں۔ چمن کا یہ حشر دیکھ کر باغباں کے دل سے اِک ہوک اٹھتی ہے اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔

چمن کے تخت پر جس دم شہِ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی، اک شور تھا، غل تھا
جب آئے دن خزاں کے کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو، یہاں غنچہ، یہاں گل تھا

ایسے حسرتناک انجام سے دوچار ہو جانے والی بہار کس کام کی؟

آیئے!---اس بہار کی بات کریں جس کی ہر مسرت لافانی ہے، ہر خوشی لازوال ہے اور ہر فرحت جاوداں ہے۔

---اس بہار کا آغاز ۲۲ر اپریل ۵۷۱ء سے ہوا---

اس بہار میں

- ---دستِ قدرت کا وہ شہکار غنچہ چٹکا، جس کی نکہت وشادابی اور رنگ روپ دیکھ کر چشم نظارہ بیں ورطۂ حیرت میں ڈوب گئی۔
- ---وہ گلِ رعنا کھلا، جس کی بوئے دلآویز سے چمنستانِ دہر کا ہر طائر مست و بے خود ہو گیا۔
- ---وہ نسیمِ سحر چلی، جس کے ہر جھونکے میں گلزارِ ازل کی مہک رچی تھی۔
- ---وہ صبا محوِ خرام ہوئی، جس کی اٹکھیلیوں سے باغِ ابد کی ہر کلی مسکرا پڑی، ہر شگوفہ کھل اٹھا۔
- ---وہ بادِ بہاری چلی، جس کی راحت بخش تھپکیوں سے بے قرارانِ عالم کو قرار آ گیا۔
- ---وہ کرم کی گھٹا اٹھی، جس سے ہر کشتِ ویراں سیراب وشاداب ہو گئی۔
- ---وہ ابرِ نیساں برسا، جس کا ہر قطرہ منت کش صدف ہوئے بغیر درِ شہوار بن گیا۔
- ---وہ شبنم پڑی جس کا نم گلستانِ حیات کے پتے پتے کے لئے آبِ حیات ثابت ہوا۔

---یہ ربیع الاول کی بارھویں تاریخ (۱) تھی اور سوموار کی رات---

یوں تو رات اپنے جلو میں ظلمت وتاریکی لئے ہوئے آتی ہے مگر یہ رات اپنے دامن

---

(۱) جانِ دوعالم ﷺ کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔ ابنِ حزمؒ، حمیدیؒ اور چند دیگر مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت ۹ر ربیع الاول ہے۔ ایک ترکی ماہر فلکیات محمود پاشا فلکی نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور تقویمی حساب سے ثابت کیا ہے کہ ۹ر ربیع الاول ہی صحیح ہے۔

بعد میں سیرت پر جو بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں---مثلاً قاضی سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین، شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی، ابوالکلام آزاد کی رسول رحمت---ان کے مصنفین نے محمود پاشا کی تحقیقات پر اعتماد کرتے ہوئے ۹ر ربیع الاول کو ہی ترجیح دی ہے، لیکن مفتی محمد شفیع صاحب نے ''اوجز السیر'' میں تقویمی حساب پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ۱۲ر ربیع الاول کو درست قرار دیا ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اُمت کا تعامل اسی پر چلا آرہا ہے---ابتداء سے لے کر آج تک دنیا بھر میں جہاں ☜

میں اتنے ہمہ نوع انوار سمیٹے ہوئے آئی کہ ان کی چمک سے محفلِ وجود کا گوشہ گوشہ دمک اُٹھا۔

اس رات کو

❁---وہ سراجِ منیر روشن ہوا، جس کی ضیا پاشی کے سامنے بزمِ امکاں کی ہر روشنی ماند پڑ گئی، ہر چراغ بے نور ہو گیا۔

❁---وہ شمعِ ابد فروزاں ہوئی، جس پر نثار ہونے والا ہر پروانہ امینِ حیاتِ دوام ہو گیا۔

❁---وہ نجمِ درخشاں طلوع ہوا، جسے دیکھ کر دشتِ ضلالت میں گم گشتہ کائنات کو رہِ منزل کا سراغ مل گیا۔

کہیں عید میلاد النبی منائی جاتی ہے، ۱۲ ربیع الاوّل کو ہی منائی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں مؤرخین کی اکثریت بھی اسی کی قائل ہے۔ محقق ابن جوزیؒ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ۱۲ ربیع الاوّل پر اجماع ہے۔

اجماع کی بات تو خیر صحیح نہیں ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مؤرخین کی واضح اکثریت ۱۲ ربیع الاوّل کو ہی آپ ﷺ کا یومِ ولادت قرار دیتی ہے۔

اس صورت میں محض تقویمی حسابات کی بنیاد پر اکثریت کی رائے کو مسترد کر دینا ناقابلِ فہم سی بات ہے کیونکہ تقویمی حساب کوئی مصدقہ شئے نہیں ہے۔ دورِ حاضر میں جدید ترین فلکیاتی رصدگاہوں میں تمام آلاتِ بصارت مہیا ہونے کے باوجود ہر ملک کی قمری تقویم جداگانہ ہوتی ہے۔ سعودی عرب والے ہم سے کبھی ایک دن پہلے، کبھی دو دن پہلے روزہ رکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح عیدین بھی ہم سے ایک یا دو دن پہلے کرتے ہیں۔ یہی حال دیگر اسلامی ممالک کا ہے۔

جب اس دور میں تمام وسائل موجود ہونے کے باوجود رمضان، شوال اور ذوالحجہ کی ایک تاریخ معین نہیں کی جا سکتی، تو صدیوں پہلے گزرنے والے واقعۂ ولادت کی تاریخ، اکثر مؤرخین کی رائے کو رد کرتے ہوئے، محض تقویمی فارمولے سے طے کر لینا اور اُمت کے مسلسل تعامل کو نظر انداز کر دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے---! وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

❁---وہ ماہِ تمام ضوفشاں ہوا، جس کی چاندنی نے زیست کے تپتے صحرا کے اک اک مسافر کو ٹھنڈک، راحت اور سکون کی لذتوں سے سرشار کردیا۔

❁---وہ بجلی کا کوندا لپکا، جس کی لہر لہر روشنی، طوفانِ نیم شب میں گھرے کاروانوں کی رہنما بن گئی۔

❁---وہ سپیدۂ سحر نمودار ہوا، جس کی نمود کھی انسانیت کو رنج وغم اور درد والم کی طویل رات کٹ جانے کی نوید سناگئی۔

❁---وہ صبحِ سیمیں ہویدا ہوئی، جس کے اجالے سے شبستانِ ہستی کی ہولناک تاریکیاں سیماب پا ہوگئیں۔

❁---وہ مہرِ تاباں نور بار ہوا، جس کی روپہلی کرنوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ روشنی میں نہا گیا---وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا---اور زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھی۔

-----❁ یَعْنِیْ ❁-----

سَیِّدُ الْمُرْسَلِیْنَ --- خَاتَمُ النَّبِیِّیْن --- شَفِیْعُ الْمُذْنِبِیْن

اَنِیْسُ الْغَرِیْبِیْنَ --- رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِیْنَ --- رَاحَةُ الْعَاشِقِیْنَ

مُرَادُ الْمُشْتَاقِیْنَ --- شَمْسُ الْعَارِفِیْنَ --- سِرَاجُ السَّالِکِیْنَ

مِصْبَاحُ الْمُقَرَّبِیْنَ --- مُحِبُّ الْفُقَرَآءِ وَالْغُرَبَاءِ وَالْمَسَاکِیْنِ (۱)

---

(۱) یہ تمام تراکیب درود تاج سے ماخوذ ہیں۔

مُحَمَّدٌ بْنُ عَبْدِاللّٰہِ

صلی اللہ علیہ وسلم

بصد عزّت و احترام---------بہزار شوکت و احتشام

بوقت طلوعِ فجر رونق افروز بزمِ عالم ہو گئے

اور

خشک ہونٹوں پر ترانے آ گئے
شادمانی کے زمانے آ گئے

آسمانوں سے تمام اربابِ نور
بزمِ امکاں کو سجانے آ گئے

غنچہ و گل نے بھرا محفل میں رنگ
چاند، تارے جگمگانے آ گئے

گل کدے میں طائرانِ خوش نوا
رقص کرنے، گنگنانے آ گئے

نو بہ نو نظارہ ہائے مست مست
دیدہ و دل میں سمانے آ گئے

صبح کے جلوے حریمِ فرش پر
نور کی چادر بچھانے آ گئے

انبیاء و قدسیانِ سر بلند
اپنا اپنا سر، جھکانے آ گئے

دی صدا روح الامیں نے دفعتہً
''شاہِ دیں جلوہ دکھانے آ گئے''

نعرۂ صَلِّ عَلٰی کی گونج سے
وجد میں خود شادیانے آ گئے

مژدہ اے اُمت! کہ ختم المرسلین
بختِ خوابیدہ جگانے آ گئے

نورِ ایماں بن کے از سر تا بہ پا
کفر کی ظلمت مٹانے آ گئے

بزمِ کثرت میں یقیں کے ساز پر
نغمۂ وحدت سنانے آ گئے

جان و دل صدقے، بہرِ نقشِ قدم
دہر کو جنت بنانے آ گئے

بے کسوں کو پوچھتا ہی کون تھا؟
بے کسوں کے ناز اُٹھانے آ گئے

زحمتِ بے جا و ظلم و جور سے
ناتوانوں کو بچانے آ گئے

اللہ اللہ! خسروِ کون و مکاں
راہرو کے بوجھ اُٹھانے آ گئے

مختلف اربابِ رنگ و نسل کو
ایک ہی مرکز پہ لانے آ گئے

دل کی ہر دھڑکن یہ کہتی ہے شکیلؔ
''شادمانی کے زمانے آ گئے''

شکیلؔ بدایونی

هجومِ انوار

جس سہانی اور دل افروز ساعت میں طیبہ کا چاند چمکا اس وقت ایسی روشنی پھیلی کہ سیدہ آمنہ کے گھر کا گوشہ گوشہ جگمگ جگمگ کرنے لگا۔

عثمان بن العاص کی والدہ فاطمہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں شب ولادت سیدہ آمنہ کے پاس تھی۔ فَمَا شَیئٌ اَنْظُرُہٗ فِی الْبَیْتِ اِلَّا نُوْرٌ. (۱) تو میں نے گھر میں جس طرف بھی نظر دوڑائی مجھے نور ہی نور نظر آیا۔

صرف گھر پر ہی کیا موقوف---اس گھڑی تو ساری زمین بقعۂ نور بنی ہوئی تھی اور مشرق ومغرب دمک رہے تھے۔

شفاء بنت عوفؓ جو شب ولادت سیدہ آمنہ کے پاس تھیں، کہتی ہیں

وَاَضَآءَ لِیْ مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ. (۲)

(میرے لئے مشرق ومغرب روشن ہوگئے۔)

خود سیدہ آمنہ فرماتی ہیں

فَلَمَّا فَصَلَ مِنِّیْ خَرَجَ مَعَہٗ نُوْرٌ اَضَآءَ بِہٖ مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ. (۳)

(جب وہ مجھ سے منفصل ہوا تو اس کے ساتھ ایک ایسا نور ظاہر ہوا جس سے مشرق ومغرب روشن ہوگئے۔)

انوار کی فراوانی سے سیدہ آمنہ کا مشاہدہ اس قدر وسیع ہوا کہ انہیں شام کے محلات نظر آنے لگے، وہ فرماتی ہیں

رَاَیْتُ لَیْلَۃَ وَضْعِہٖ نُوْرًا اَضَآءَ تْ لَہٗ قُصُوْرُ الشَّامِ حَتّٰی رَاَیْتُھَا. (۴)

---

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۶۴. تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۲۶.
(۲) الزرقانی، ج ۱، ص ۱۴۴. تاریخ الخمیس، ج ۱، ص ۲۰۳.
(۳) طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۶۳. البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۶۴.
(۴) الزرقانی، ج ۱، ص ۱۴۱. السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۶۲. سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۱.

جائے ولادت جانِ دو عالم ﷺ
مكتبة مكة المكرمة
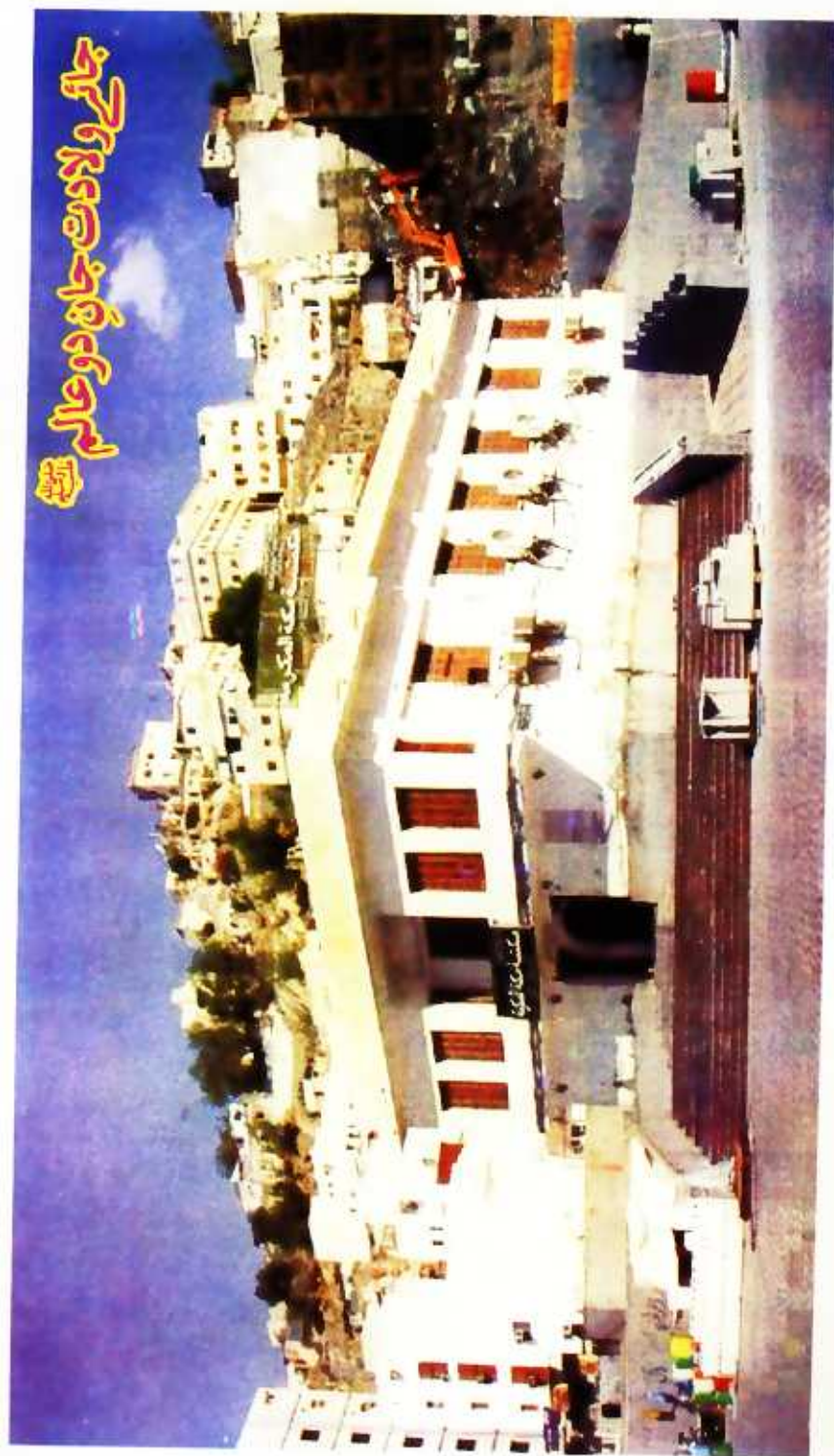
(میں نے اس کی ولادت کی رات کو ایسا نور دیکھا کہ اس کی وجہ سے شام کے محلات روشن ہو گئے اور میں نے انہیں دیکھ لیا۔)

یہ تمام انوار تو جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ ساتھ آئے تھے۔اس کے علاوہ آسمان سے بھی نور کی بارش ہو رہی تھی---اس پر کیف منظر کو فاطمہؓ یوں بیان کرتی ہیں

وَرَأَيْتُ النُّجُوْمَ تَدْنُوْ حَتّٰى ظَنَنْتُ أَنَّهَا سَتَقَعُ عَلَيَّ. (۱)

---

(۱) البدایه والنهایه، ج ۲، ص ۲۶۴. روض الانف، ج ۱، ص ۱۰۵. تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۲۶.

دراصل آسمان سے نور کی برسات ہو رہی تھی اور فاطمہؓ کو یوں لگ رہا تھا کہ ستارے جھک آئے ہیں اور گرنے لگے ہیں۔

زمین و آسمان اور مشرق و مغرب کے منور ہو جانے میں اگر الجھن محسوس ہو کہ یہ انوار سیدہ آمنہ، فاطمہ اور شفاء کے علاوہ دُنیا بھر میں کسی اور کو کیوں نظر نہ آئے تو اس کا حل یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ صرف مخصوص لوگوں کو دکھانا چاہے وہ تمام اشیاء حقیقتاً موجود ہونے کے باوجود عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔

قرآن کریم سے ثابت ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر اہل ایمان کی امداد کے لئے ہزاروں فرشتے نازل ہوئے۔

﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ﴾

(تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری امداد فرمائے گا۔)

اور احادیث سے ثابت ہے کہ یہ فرشتے حقیقتاً و عملاً شریک جہاد اور مصروف قتال تھے۔

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں ایک مسلمان ایک مشرک کے تعاقب میں لگا ہوا تھا کہ ناگاہ اسے کوڑا برسنے کی آواز آئی، ساتھ ہی کسی کو یہ کہتے سنا۔

''أَقْدِمْ حَيْزُوْم'' (حیزوم! (فرشتے کے گھوڑے کا نام) آگے بڑھ!)

اب جو اس شخص نے اس مشرک کی طرف نظر دوڑائی جس کا تعاقب کر رہا تھا تو اسے ☜

(میں نے ستاروں کو دیکھا کہ وہ جھکے پڑتے تھے اور مجھے یوں لگتا تھا کہ مجھ پر گر پڑیں گے۔)

چاروں شانے چت زمین پر پڑا پایا---کوڑے کی شدید ضرب سے اس کی ناک کچلی گئی تھی، چہرہ پھٹ گیا تھا اور جسم نیلا پڑ چکا تھا۔

بعد میں اس شخص نے یہ واقعہ رسول اکرم ﷺ کو سنایا تو آپ نے فرمایا

صَدَقْتَ---ذٰلِکَ مِنْ مَدَدِ السَّمَاءِ الثَّالِثَۃِ. (تو سچ کہتا ہے---یہ امداد تیسرے آسمان سے نازل ہوئی تھی۔) مسلم، ج ۲، ص ۹۳.

غرضیکہ ہزاروں فرشتے شریکِ جنگ تھے اور مشرکین پہ کوڑے برسا رہے تھے مگر وہ نظر صرف نبی ﷺ اور چند صحابہ کو آئے---ان کے علاوہ نہ انہیں مشرکین نے دیکھا، نہ دیگر صحابہ نے---اسی طرح شبِ ولادت واقعۃً آسمان سے بھی نور برس رہا تھا اور زمین پر بھی نور چھایا ہوا تھا مگر حجابات صرف سیدہ آمنہ، فاطمہ اور شفاء کی نگاہوں سے ہٹائے گئے تھے اس لئے انہوں نے انوار دیکھ لئے کوئی اور نہ دیکھ سکا۔

مولانا بدر عالم میرٹھیؒ نے ترجمان السنۃ میں بوقتِ ولادت ظاہر ہونے والے غیر معمولی واقعات کے لئے مستقل باب باندھا ہے اور ان کا انکار کرنے والوں کو---بلکہ تاویل کرنے والوں کو بھی---معتزلہ (ایک گمراہ فرقہ) کے خیالات کی طرف جھکاؤ رکھنے والا اور جدیدیت زدہ قرار دیا ہے---باب کا عنوان یہ ہے۔

اَلْاَحَادِیْثُ الَّتِیْ قَدْ تَصَدّٰی اِلٰی تَاوِیْلِھَا اَوْ اِنْکَارِھَا بَعْضُ مَنْ لَہٗ جُنُوْحٌ اِلَی الْاِعْتِزَالِ اَوْ غَلَبَتْ عَلٰی عُقُوْلِھِمُ التَّحْقِیْقَاتُ الْحَدِیْثَۃُ.

(ان احادیث کا بیان جن کے انکار اور تاویل کے درپے بعض وہ لوگ ہوئے ہیں جن کا طبعی میلان معتزلہ کی جانب ہے یا ان کے دماغوں پر ''جدید تحقیقات'' کی دہشت چھا چکی ہے۔)

اس باب میں مولانا نے ظہورِ نور کی جس حدیث کو مکمل اسانید کے ساتھ بیان کیا ہے اس میں یہ تصریح بھی ہے کہ اس طرح کے مشاہدات ہر نبی کی والدہ کو ہوتے ہیں۔ وَکَذٰلِکَ اُمَّھَاتُ الْاَنْبِیَاءِ یَرَیْنَ---اس کے ذیل میں مولانا لکھتے ہیں☜

پاکیزہ ولادت

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو طرح طرح کی گندگیوں اور آلائشوں سے لتھڑا ہوتا ہے مگر جانِ دو عالم ﷺ پیدا ہوئے تو مکمل طور پر پاک وصاف تھے۔

سیدہ آمنہ فرماتی ہیں فَوَلَدْتُہٗ نَظِیْفًا ---- مَابِہٖ قَذَرٌ. (۱)

(میں نے اسے پاک وصاف جنا --- اس کے ساتھ ذرا سی بھی آلودگی نہ تھی۔)

روئے زمین پر غالب

''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' --- اقبال منداور خوش نصیب بچے کی علامتیں شروع ہی سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔

جانِ دو عالم ﷺ کی دنیا میں آمد ہی ایسے انداز سے ہوئی کہ قیامت کی نظر رکھنے والوں نے اسی وقت بہت کچھ تاڑ لیا تھا --- سیدہ آمنہ کیفیتِ ولادت یوں بیان کرتی ہیں۔

ثُمَّ وَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ مُعْتَمِدًا عَلٰى يَدَيْهِ ثُمَّ اَخَذَ قَبْضَةً مِّنْ تُرَابٍ فَقَبَضَهَا وَ رَفَعَ رَأْسَهٗ اِلَى السَّمَآءِ --- وَ قَالَ بَعْضُهُمْ جَاثِيًا عَلٰى رُكْبَتَيْهِ. (۲)

(جب وہ زمین پر وارد ہوا تو دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکے ہوئے تھا۔ پھر زمین پر ہاتھ مار کر مٹھی میں مٹی بھری اور سر آسمان کی طرف اُٹھا دیا --- بعض روایات میں گھٹنے ٹیکنے کا بھی ذکر ہے۔)

''حدیث مذکور سے ایک جدید بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ یہ نظارہ نہ صرف آپ کی والدہ کو نظر آیا؛ بلکہ اس میں دیگر انبیاء کی والدات کو بھی شرکت نصیب تھی اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا --- ہر نبی کی شخصیت کوئی معمولی نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان کی ولادت پر ان کی والدات اگر کچھ عجائبات کا نظارہ کر لیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں؛ بلکہ ان کا نظارہ نہ کرنا عجیب ہے۔'' ترجمان السنة، ج ۴، ص ۱۱۴، ۱۱۵.

(۱) طبقاتِ ابنِ سعد، ج ۱، ص ۶۳.

(۲) طبقاتِ ابنِ سعد، ج ۱، ص ۶۳. البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۶۳.

اس انداز سے آپ کی ولادت کی خبر جب پھیلی تو قبیلہ بنی لہب سے تعلق رکھنے والے ایک ماہر فال نے کہا

لَئِنْ صَدَقَ هٰذَا الْفَالُ لَيَغْلِبَنَّ هٰذَا الْمَوْلُوْدُ الْاَرْضَ. (۱)

(اگر یہ فال سچی ثابت ہوئی تو نومولود روئے زمین پر غالب ہو جائے گا۔)

نافِ بُریدہ، ختنہ شدہ

پیدائش کے بعد پہلا مرحلہ بچے کی ناف کاٹنے کا ہوتا ہے، علاوہ ازیں عرب میں ختنہ کرانے کا بھی رواج تھا کیونکہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی سُنّت تھی اور اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام میں بھی مروج تھا مگر جانِ دو عالم ﷺ پیدا ہوئے تو ان کی ناف کاٹنے کی ضرورت پڑی، نہ ختنہ کرانے کی---وہ پیدائشی طور پر ناف بریدہ اور ختنہ شدہ تھے---حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

وُلِدَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَسْرُوْرًا مَخْتُوْنًا. (۲)

(رسول اللہ بوقتِ ولادت ہی ناف بریدہ اور ختنہ شدہ تھے۔)

کلامِ اوّلین

تاریخ عالم میں چند ایسے غیر معمولی بچے بھی گزرے ہیں جنہیں قادرِ مطلق نے بول چال کے زمانے سے پہلے ہی قوتِ گویائی عطا فرما دی تھی۔ (۳) پھر جانِ دو عالم ﷺ

---

(۱) الآثار المحمديه، ج ۱، ص ۴۲. السيرة الحلبية، ج ۱، ص ۶۱.

(۲) روض الانف، ج ۱، ص ۱۰۵. تاريخ الخميس، ج ۱، ص ۲۰۴. طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۶۳.

(۳) ایسے بچے مجموعی طور پر گیارہ ہوئے ہیں، علامہ سیوطیؒ نے اس نظم میں سب کو اکٹھا کر دیا ہے۔

تَكَلَّمَ فِي الْمَهْدِ النَّبِيُّ مُحَمَّدٌ ۔۔۔ وَ يَحْيٰ وَ عِيْسٰى وَ الْخَلِيْلُ وَ مَرْيَمُ

وَ مُبْرِئُ جُرَيْجٍ ثُمَّ شَاهِدُ يُوْسُفَ ۔۔۔ وَ طِفْلٌ لَدَى الْاُخْدُوْدِ يَرْوِيْهِ مُسْلِمُ

وَ طِفْلٌ عَلَيْهِ مُرَّ بِالْاَمَةِ الَّتِيْ ۔۔۔ يُقَالُ لَهَا تَزْنِيْ وَ لَا تَتَكَلَّمُ

وَ مَا شِطَةٌ فِيْ عَهْدِ فِرْعَوْنَ طِفْلُهَا ۔۔۔ وَ فِيْ زَمَنِ الْهَادِيِ الْمُبَارَكُ يَخْتِمُ

اس شرف سے کیسے محروم رہ جاتے---؟ آپ نے بھی دنیا میں قدم رکھتے ہی اپنی زبانِ حق ترجمان سے یہ الفاظ ادا کر کے توحید کا ڈنکا بجا دیا۔

جَلَالُ رَبِّیَ الرَّفِیْعِ. اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا. (۱)

ھانڈی شق ھو گئی

اگر بچہ رات کو پیدا ہوتا تو عربوں کے رواج کے مطابق اس پر مٹی کی بنی ہوئی بڑی

(جھولے میں گفتگو کی--- (۱) محمد ﷺ، (۲) یحیٰ، (۳) عیسیٰ (۴) ابراہیم اور (۵) مریم نے (علیہم السلام)

(۶) اور جریج کو بری کرنے والے (بچے) نے (۷) یوسفؑ کے گواہ نے اور (۸) گڑھوں کے پاس ایک بچے نے، جسے مسلم نے ذکر کیا ہے۔

(۹) اور اس بچے نے جس کے پاس سے ایسی لونڈی گزاری گئی جسے زانیہ کہا جاتا تھا اور وہ خاموش رہتی تھی۔

(۱۰) اور عہدِ فرعون کی ایک مشاطہ کے بچے نے---اور نبی ﷺ کے عہد میں (۱۱) مبارک الیمامہ پر یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے۔

ان گیارہ میں سے حضرت عیسیٰ" کا تذکرہ تو پوری تفصیل سے قرآن کریم کے سورہ مریم میں مذکور ہے۔ نمبر ۶ اور نمبر ۹ کا ذکر بخاری، ج۱، ص ۴۸۹ پر موجود ہے۔ نمبر ۸ مسلم، ج ۲، ص ۴۱۵ پر مذکور ہے اور باقی سات، حدیث و تاریخ کی دیگر کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں۔

تفصیل کے لئے متعلقہ کتب اور ان کی شروح کا مطالعہ کیا جائے۔

ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ بول چال کے زمانے سے پہلے قوتِ گویائی مل جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔

(۱) السيرة الحلبية، ج ۱، ص ۸۵. الآثار المحمديه، ج ۱ ص ۴۳. الزرقاني، ص ۱۲۸.

سی ہانڈی الٹ دی جاتی تا کہ صبح ہونے سے پہلے بچے پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ اس عمل کا پسِ منظر کیا تھا---؟ اس سلسلے میں مؤرخین خاموش ہیں؛ تاہم یہ ٹونا مروج ضرور تھا۔

جب جانِ دو عالم ﷺ کی ولادت ہوئی تو آپ پر بھی ہانڈی اوندھی کر دی گئی مگر حق تعالیٰ کو کب گوارا ہو سکتا تھا کہ جو ہستی مشرکانہ اوہام پر مبنی جاہلانہ رسوم کو دنیا سے مٹانے کے لئے آئے، اس کی اپنی زندگی کا آغاز کسی وہم پر مبنی ٹونے سے ہو؟

صبحدم جب دیکھا تو ہانڈی شق ہو کر دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور جانِ دو عالم ﷺ کی نگاہ آسمان کی جانب اُٹھی ہوئی تھی۔ (۱)

نعتِ اوّلین

جانِ دو عالم ﷺ کی پیدائش کے وقت عبدالمطلب طوافِ کعبہ میں مصروف تھے۔ سیدہ آمنہ نے پوتے کی ولادت کی اطلاع بھیجی تو یہ خوشخبری سُن کر وہ اسی وقت گھر چلے آئے۔ سیدہ آمنہ انہیں دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

''یَا اَبَاالْحَارِثِ ! وُلِدَلَکَ مَوْلُوْدٌ عَجِیْبٌ.''

(حارث (۲) کے ابا! آپ کے گھر عجیب سا بچہ پیدا ہوا ہے۔)

عبدالمطلب سمجھے کہ شاید عجیب الخلقت بچہ پیدا ہو گیا ہے اس لئے خوفزدہ سے ہو کر پوچھنے لگے

اَلَیْسَ بَشَرًا سَوِیًّا؟ (کیا صحیح سالم نہیں ہے؟)

سیدہ آمنہ نے کہا کہ نہیں، یہ بات نہیں ہے؛ بلکہ اس کی ولادت کا انداز تعجب خیز ہے اور بوقتِ ولادت جو کچھ پیش آیا تھا وہ بیان کر دیا۔ (۳)

---

(۱) طبقات ابنِ سعد، ج ۱، ص ۶۳. الآثار المحمدیہ، ج ۱، ص ۴۴. تاریخ الخمیس، ج ۱، ص ۲۰۴.

(۲) عبدالمطلب کے بڑے بیٹے کا نام حارث تھا۔

(۳) السیرة الحلبیہ، ج ۱، ۷۵. الآثار المحمدیہ، ج ۱، ص ۴۴.

عبدالمطلب نے پوتے کو اُٹھا کر سینے سے لگایا اور اللہ کے گھر میں حاضر ہو کر مندرجہ ذیل اشعار پڑھے جو حمد، نعت اور تعوذ پر مشتمل ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَعْطَانِیْ ۔۔۔ هٰذَا الْغُلَامَ الطَّیِّبَ الْاَرْدَانِ

قَدْ سَادَ فِیْ الْمَهْدِ عَلَی الْغِلْمَانِ ۔۔۔ اُعِیْذُهٗ بِالْبَیْتِ ذِیْ الْاَرْکَانِ

حَتّٰی اَرَاهُ بَالِغَ الْبُنْیَانِ ۔۔۔ اُعِیْذُهٗ مِنْ شَرِّ ذِیْ شُنَانِ

مِنْ حَاسِدٍ مُضْطَرِبِ الْعِنَانِ

(سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے پاک دامن بیٹا عنایت فرمایا جو جھولا جھولنے کے زمانے سے ہی تمام بچوں کا سردار لگتا ہے۔ میں اس کو ارکان والے گھر (کعبہ) کی پناہ میں دیتا ہوں، یہاں تک کہ میں اسے جوانی تک پہنچتا ہوا دیکھ لوں--- میں اس کے لئے پناہ مانگتا ہوں، ہر بغض رکھنے والے سے اور ہر چلبلے حاسد سے۔) (۱)

یہ پہلی نعت تھی جو جانِ دوعالم ﷺ کے دنیا میں جلوہ آرا ہونے کے بعد کہی گئی۔

تزلزل در ایوان کسرٰی فتاد

جانِ دوعالم ﷺ کا دنیا میں آنا تھا کہ کفر و شرک کے ایوانوں میں تہلکہ مچ گیا--- قصرِ کسرٰی (۲) کے چودہ کنگرے ٹوٹ کر گر پڑے--- بحیرہ طبریہ کا پانی گھٹ گیا--- شام کی وادی ساوہ کا پانی رُک گیا--- قم کے پاس بہنے والے دریائے ساوہ کا پانی زمین میں دھنس گیا--- ہزار سال سے روشن وہ ''مقدس آگ'' جس کی ایرانی پوجا کیا

---

(۱) طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۶۴۔ تاریخ الخمیس، ج ۱، ص ۲۰۴۔ البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۶۴۔ روض الانف، ج ۱، ص ۱۰۶--- موخر الذکر دو کتابوں میں چند اور اشعار بھی مذکور ہیں مگر غور کرنے پر بعد کا اضافہ معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) کسرٰی کسی ایک شخص کا نام نہ تھا؛ بلکہ ایران کے ہر حکمران کو کسرٰی کہا جاتا تھا جس طرح روم کے ہر بادشاہ کو قیصر اور مصر کے ہر تاجدار کو فرعون کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ جس کسرٰی کے دور میں یہ واقعات پیش آئے تھے، اس کا نام نوشیروان تھا۔

کرتے تھے، یکلخت بجھ گئی ---اور متعدد بتکدوں میں نصب، صنعتِ آزری کے شہکار تھرتھرا کر گر پڑے۔

یہ اندھی عقیدت کے جوش میں گھڑے گئے دیو مالائی افسانے نہیں؛ بلکہ تاریخ اسلام کے مصدقہ واقعات ہیں جن کے بیان کرنے میں مؤرخین اسلام اور سیرت نگار ہم زبان ہیں۔

انتہائی مضبوط اور مستحکم محل کا ڈگمگا جانا اور اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے والے بائیس کنگروں میں سے چودہ کا گر پڑنا، ایسا واقعہ تھا جس نے کسریٰ کو دہلا کر رکھ دیا۔ پہلے تو اس نے کوشش کی کہ اس خبر کو پوشیدہ رکھا جائے اور کسی سے تذکرہ ہی نہ کیا جائے مگر پھر اسے خیال آیا کہ ایسی باتیں چھپائے نہیں چھپا کرتیں، اس لئے اپنے وزیروں، جرنیلوں اور مملکت کے دیگر عہدہ داروں کا اجتماع منعقد کیا، جب سب لوگ جمع ہو گئے تو کسریٰ نے ان سے پوچھا

''تمہیں پتہ ہے آج یہ اجتماع کس سلسلے میں ہو رہا ہے؟''

''نہیں حضور!'' انہوں نے جواب دیا ''شہنشاہ عالی جاہ کے بتائے بنا ہم کیسے جان سکتے ہیں؟''

چنانچہ کسریٰ نے انہیں محل کے ڈگمگانے اور کنگروں کے سقوط کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔

اسی دوران اطلاع آئی کہ عظیم آتشکدہ میں روشن آگ --- جو ہزار سال کے طویل عرصے میں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بجھی تھی --- بُجھ گئی ہے۔

ایلیا سے آئے ہوئے قاصد نے اطلاع دی کہ دریائے ساوہ خشک ہو گیا ہے۔

شام سے اطلاع آئی کہ وادیٔ سماوہ کا پانی بند ہو گیا ہے۔

طبریہ سے خبر آئی کہ بحیرہ طبریہ خشک ہو گیا ہے۔

یکے بعد دیگرے پہنچنے والی ان ہولناک اطلاعات نے کسریٰ کو لرزا دیا۔

موبذان (بڑا پجاری) بھی دربار میں موجود تھا۔ رہی سہی کسر اس نے پوری کر دی۔ کہنے لگا --- ''یزداں بادشاہ کو سلامت رکھے --- میں نے بھی آج رات ایک عجیب

خواب دیکھا ہے۔''

''کیا خواب دیکھا ہے آپ نے؟'' کسریٰ نے پوچھا۔

''میں نے توانا اونٹ دیکھے جن کے پیچھے پیچھے خالص عربی گھوڑے چلے آ رہے تھے۔ میں نے انہیں دریائے دجلہ عبور کرتے اور آس پاس کے شہروں میں پھیلتے دیکھا ہے۔''

''مقدس موبذان! پے در پے رونما ہونے والے ان عجیب وغریب حالات کی آخر وجہ کیا ہے---؟'' کسریٰ نے بے تابی سے پوچھا۔

''میرا علم اس سلسلے میں محدود ہے۔'' موبذان نے جواب دیا ''میں صرف اتنا ہی جان سکا ہوں کہ عرب کی جانب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے---اگر آپ تفصیلات جاننے کے خواہشمند ہوں تو غسان سے کسی بڑے عالم کو بلا لیجیے، وہ ایسے امور کی تعبیر میں ماہر ہیں۔''

کسریٰ نے اسی وقت غسان کے حاکم نعمان بن منذر کو لکھا کہ میری طرف ایک بلند پایہ عالم بھیجو---ایسا عالم جو میرے سوالات کا تشفی بخش جواب دے سکے۔

نعمان نے ایک بڑے عالم عبدالمسیح کو بھیج دیا۔

عبدالمسیح جب کسریٰ کے روبرو پیش ہوا تو کسریٰ نے پوچھا۔

''کیا آپ میرے تمام سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکیں گے؟''

''آپ سوالات کیجیے، اگر مجھے ان کے جوابات معلوم ہوئے تو عرض کر دوں گا، ورنہ کسی دوسرے بڑے عالم کا پتہ بتا دوں گا۔''

اس پر کسریٰ نے موبذان کا خواب اور اب تک پیش آنے والے دیگر واقعات بلاکم وکاست بیان کر دیئے۔

عبدالمسیح چند لمحے غور کرتا رہا، پھر کہنے لگا

''یہ واقعات اتنے تحیّر خیز ہیں کہ ان کی صحیح توجیہہ بیان کرنے سے میں بھی قاصر ہوں؛ البتہ شام میں میرے ایک ماموں سطیح رہائش پذیر ہیں جو بہت بڑے علامہ ہیں، اگر ان سے رابطہ قائم کیا جائے تو وہ ہر واقعہ کی صحیح توجیہہ بیان کر دیں گے۔''

کسریٰ نے کہا۔۔۔ ''بہتر یہی ہے کہ آپ خود شام جائیے اور اپنے ماموں سے مل کر ان واقعات کی صحیح تعبیر معلوم کر کے مجھے مطلع کیجئے۔''

عبدالمسیح جب طویل سفر کر کے سطیح تک پہنچا، اس وقت سطیح آخری سانسوں پر تھا، عبدالمسیح نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

عبدالمسیح اپنے ماموں کا مزاج شناس تھا۔۔۔ جانتا تھا کہ عمدہ اشعار ماموں کی کمزوری ہیں، چنانچہ اس نے فی البدیہہ ایک نہایت عمدہ نظم کہی، جس میں اپنے سفرِ شام کی تفصیلات و کیفیات انتہائی خوبصورت پیرائے میں بیان کیں۔

نظم سن کر سطیح کے چہرے پر رونق آ گئی اور عبدالمسیح کے کچھ بتانے سے پہلے ہی اپنے مخصوص انداز میں بولنے لگ گیا۔

عَبْدُالْمَسِيْح، عَلٰى جَمَلٍ مَشِيْح، اَتٰى سَطِيْح، وَ قَدْ اَوْفٰى عَلَى الضَّرِيْح.

(عبدالمسیح ایک تیز رفتار اونٹ پر سوار ہو کر سطیح کے پاس ایسے وقت میں پہنچا، جب سطیح گور کنارے لگ چکا ہے۔)

بَعَثَكَ مَلِكُ سَاسَان، لِارْتِجَاسِ الْاِيْوَان، وَخُمُوْدِالنِّيْرَان، وَ رُؤْيَا الْمُوْبِذَان.

(تجھے ساسانی بادشاہ نے محل کے زلزلے، آگ کے بجھنے اور موبذان کے خواب کی توجیہہ و تعبیر معلوم کرنے کے لئے بھیجا ہے۔)

سطیح کی وسعت علمی کی انتہا یہ ہے کہ موبذان کے خواب کی تمام تفصیلات بھی اس نے خود ہی بیان کر دیں، پھر چودہ کنگرے گرنے کی یہ توجیہہ بیان کی۔

يَمْلِكُ مِنْهُمْ مُلُوْكٌ وَّ مَلَكَاتٌ، عَلٰى عَدَدِ الشُّرُفَاتْ، وَ كُلُّ مَا هُوَاٰتٍ آت.

(ان میں چودہ بادشاہ اور ملکائیں ہوں گی۔۔۔ کنگروں کی تعداد کے مطابق اور جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ بہر حال پیش آ کر رہے گا۔)

یعنی مملکت ایران پر چودہ حکمران یکے بعد دیگرے حکمرانی کریں گے، اس کے بعد ایرانیوں کی حکومت کا دور ختم ہو جائے گا۔۔۔ یہ تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے۔

ہزار سالہ آگ کے بجھ جانے اور متعدد دریاؤں کا پانی خشک ہو جانے کے بارے

میں اس نے بتایا کہ یہ صَاحِبُ الْهِرَاوَةِ (۱) کے ظہور کی علامات ہیں اور جب یہ علامات ظاہر ہوں تو سمجھ لو کہ ایرانی حکومت کا خاتمہ قریب ہے۔

موبذان کے خواب کی صراحۃ اس نے کوئی تعبیر بیان نہیں کی لیکن اس کے مندرجہ بالا کلام کے بعد اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ جب عربوں کے ہاتھوں ایرانی سلطنت کا خاتمہ ہوتا تو وہی منظر پیش آنا تھا جو موبذان نے خواب میں دیکھا تھا۔

بہر حال اتنا کچھ بیان کرنے کے بعد سطیح وفات پا گیا۔

عبدالمسیح نے واپس جا کر شاہِ ایران کو ان تفصیلات سے آگاہ کیا تو اس کا غم کافی حد تک دور ہو گیا کیونکہ تاج وتخت کو فوری طور پر کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا --- ابھی تو مزید تیرہ فرمانرواؤں نے بادشاہی کرنی تھی، اس لئے کہنے لگا

"جب تک چودہ تاجدار حکومت کریں گے، اس وقت تک نہ جانے کیا کچھ ہو چکا ہوگا۔"

بادشاہ کو مطمئن دیکھ کر عبدالمسیح نے اجازت لی اور اپنے وطن کو واپس لوٹ گیا۔

چودہ حکمرانوں والی بات بالکل سچی ثابت ہوئی۔ عہد فاروقی میں عساکر اسلامیہ نے سلطنت ساسانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ان کا آخری فرمانروا یزدگر تھا، جسے مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد سلطنت ساسانیہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا --- اور نوشیروان سمیت یزدگر تک چودہ حکمران ہوئے ہیں۔ (۲)

---

(۱) هِرَاوَة چھوٹے عصا کو کہتے ہیں۔ جانِ دو عالم ﷺ اپنے دست مبارک میں عموماً عصا رکھا کرتے تھے جس سے اور کام لینے کے علاوہ بوقتِ نماز سامنے گاڑ لیا کرتے تھے تاکہ سُتْرَہ بن جائے اور آگے سے گزرنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ اس بنا پر آپ کا ایک لقب صَاحِبُ الْهِرَاوَةِ بھی ہے۔

(۲) اس واقعہ کو اکثر مؤرخین نے نہایت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ہم نے طوالت کے خوف سے تفصیلات حذف کر دی ہیں۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے، تاریخ طبری ج ۲، ص ۱۳۱، ۱۳۲۔ البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۶۸، ۲۶۹۔ روض الانف ج ۱، ص ۱۹، ۲۰۔ تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۲۰۰، ۲۰۱۔ السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۸۱، ۸۲۔

شرک وکفر کے گڑھ --- ایران --- اور اس کی ذیلی ریاستوں میں ان واقعات کا رونما ہونا دراصل علامت تھی اس بات کی کہ اب بزم باطل درہم برہم ہونے کو ہے اور دیویوں دیوتاؤں کا راج ختم ہونے والا ہے۔ چنانچہ جس طرح آتش کدۂ فارس میں اگنی دیوی کی شرر افشانی ماند پڑ گئی، اسی طرح کئی خود ساختہ دیوتاؤں پر بھی مصیبت ٹوٹ پڑی۔

اربابِ سیرت نے لکھا ہے کہ قریش کے کچھ لوگ --- جن میں ورقہ ابن نوفل، زید بن عمرو اور عبداللہ بن جحش جیسے ممتاز افراد بھی شامل تھے --- ہر رات ایک بت کے پاس جایا کرتے تھے۔ جس شب جانِ دو عالم ﷺ کی ولادت ہوئی، اس رات بھی یہ لوگ حسب معمول دیوتا کے چرنوں میں حاضری دینے کے لئے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دیوتا حضور منہ کے بل گرے پڑے ہیں۔ دیوتا کی یہ حالت دیکھ کر سب نہایت افسردہ ہوئے اور اسے اٹھا کر دوبارہ اپنی جگہ پر کھڑا کیا مگر وہ پھر دھڑام سے زمین پر آرہا۔ جب تیسری دفعہ بھی یہی صورت پیش آئی تو ایک شخص نے جھنجلا کر دیوتا سے کہا

''تمہیں آج کیا ہوگیا ہے --- ؟ بار بار گرے پڑتے ہو؟''

دیوتا کے اندر سے غیبی آواز آئی۔

تَرَدّٰی لِمَوْلُوْدٍ اَضَاءَتْ بِنُوْرِہٖ
جَمِیْعُ فِجَاجِ الْاَرْضِ بِالشَّرْقِ وَالْغَرْبِ

(یہ اس نومولود کی ولادت کی وجہ سے گر رہا ہے جس کے نور سے شرق وغرب میں زمین کے تمام راستے جگمگا اٹھے ہیں۔) (۱)

آسمانی علامت

ولادتِ جانِ دو عالم ﷺ کی نشانیوں کا ظہور زمین پر ہی منحصر نہ تھا، آسمان پر بھی ایک نمایاں علامت نمودار ہوئی اور ستاروں کا علم رکھنے والے اہل کتاب نے اسی وقت کہہ دیا کہ آج نبی منتظر پیدا ہوگیا ہے۔

---

(۱) السیرة الحلبیہ ج ۱، ص ۷۹، الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۴۷۔

شاعر دربارِ نبوت حسان بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ لڑکپن کے زمانے میں ایک دن میں نے ایک یہودی کو دیکھا جو یثرب کے ایک بلند ٹیلے پر کھڑا چیخ رہا تھا۔

یَامَعْشَرَ یَهُوْد! یَامَعْشَرَ یَهُوْد! (اے یہودیو!، اے یہودیو!)

اس کی چیخ و پکار پر بہت سے یہودی اکٹھے ہوگئے اور اس سے پوچھنے لگے۔

وَیْلَکَ، مَالَکَ؟ (تیرا بیڑا غرق، تجھے ہُوا کیا ہے؟)

''بات یہ ہے'' یہودی نے بتایا'' کہ آج رات وہ ستارہ طلوع ہوگیا ہے جو ظہور احمد کی علامت ہے۔'' (۱)

یہودی کی پریشانی کا سبب اس کا اندرونی حسد تھا---اسے یہ بات کسی طرح بھی گوارا نہ تھی کہ نبوت بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل میں چلی جائے---اور یہ پریشانی کچھ اسی کے ساتھ خاص نہ تھی، عرب کے دیگر باخبر یہودی بھی افسردہ و حزیں تھے۔

اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ مکہ میں ایک یہودی تاجر رہا کرتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تو اس نے قریش سے پوچھا۔

''هَلْ وُلِدَ فِيْكُمُ اللَّيْلَةَ مَوْلُوْدٌ؟'' (کیا آج رات تمہارے ہاں کوئی بچہ پیدا ہُوا ہے؟)

''ہمیں تو اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔'' حاضرین نے جواب دیا۔

''تم لوگ تحقیق کرو!'' یہودی بولا'' کسی نہ کسی گھر میں ولادت ضرور ہوئی ہوگی، کیونکہ آج رات آخری اُمّت کا نبی پیدا ہو چکا ہے---اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس کے کندھوں کے درمیان مہین بالوں کا ایک گچھا سا ہوگا۔'' (۲)

معلومات حاصل کرنے پر پتہ چلا کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کا بیٹا پیدا ہُوا ہے۔ چنانچہ یہودی سمیت سب لوگ سیدہ آمنہ کے گھر گئے اور مطالبہ کیا کہ بچہ ذرا باہر

---

(۱) سیرتِ ابن هشام ج ۱، ص ۱۰۷، الزرقانی ج ۱، ص ۱۴۵.

(۲) بالوں کا یہ گچھا دراصل مہرِ نبوت ہے، جس کی تفصیل انشاء اللہ جلد سوم، باب شمائل نبویہ میں آئے گی۔

بھیجیں --- کچھ لوگ دیکھنے آئے ہیں۔

بچہ باہر لایا گیا تو یہودی نے اس کی پشت سے قمیص کو ہٹایا اور جب اس کی نظر بالوں کے گچھے پر پڑی تو صدمے سے بیہوش ہو کر گر پڑا --- خاصی دیر بعد جب ہوش میں آیا تو سب نے پوچھا --- "وَيْلَکَ، مَالَکَ؟" (تو ہلاک ہو جائے --- تجھے کیا ہو گیا تھا؟)

یہودی بصد حسرت و یاس بولا "ذَهَبَتْ وَاللهِ النُّبُوَّةُ مِنْ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ.
(اللہ کی قسم! نبوت بنی اسرائیل سے چلی گئی۔)

پھر قریش کو مسرور و شادماں دیکھ کر کہنے لگا --- "تم خوش ہو رہے ہو؟! خدا کی قسم! تمہارے ساتھ بھی ایسا معاملہ کرے گا کہ اس کی خبریں مشرق و مغرب تک پھیل جائیں گی۔"(۱)

منصفانہ روّیہ

اگرچہ یہودیوں کا روّیہ انتہائی حاسدانہ اور متعصبانہ تھا مگر عیسائی علماء کا روّیہ منصفانہ تھا۔

مکہ مکرمہ کے قریب ایک جگہ تھی مَرُّالظَّهران، وہاں ایک شامی راہب رہائش پذیر تھا جس کا نام عَيص تھا۔ وہ سابقہ الہامی کتابوں کا ماہر ایک نہایت متقی اور پرہیزگار انسان تھا۔ سال بھر میں ایک دفعہ لوگوں سے ملاقات کرنے مکہ مکرمہ آیا کرتا تھا اور اہل مکہ سے کہا کرتا تھا۔

يُوْشِکُ اَنْ يُّوْلَدَ فِيْکُمْ يَا اَهْلَ مَكَّةَ ! مَوْلُوْدٌ تَدِيْنُ لَهُ الْعَرَبُ وَ يَمْلِکُ الْعَجَمَ --- هٰذَا زَمَانُهُ.

(مکہ والو! عنقریب تمہارے ہاں ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے جس کے سامنے عربوں کو بھی جھکنا پڑے گا اور عجم کا بھی مالک ہوگا --- اس کے ظہور کا یہی زمانہ ہے۔)

اس کے اس اعلان کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں جس کسی کا بیٹا پیدا ہوتا وہ جا کر عیص

---

(۱) الزرقانی، ج ۱، ص ۱۴۵ . السیرة الحلبیه، ج ۱، ص ۷۷. طبقات ابنِ سعد، ج ۱، ص ۱۰۶، ۱۰۷.

سے پوچھتا تھا کہ یہ وہی بچہ تو نہیں ہے ---؟ مگر سب کو نفی میں جواب ملتا تھا۔ جب جانِ دوعالم ﷺ کی ولادت ہوئی تو عبدالمطلب بھی عیص سے یہی بات پوچھنے کے لئے مَرُّالظَّھْرَان گئے۔ گرجے کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے عیص کو آواز دی، عیص نے اوپر سے جھانکا تو دیکھا عبدالمطلب کھڑے ہیں۔ انہیں دیکھ کر وہ دروازہ کھولنا بھول گیا اور وہیں سے بے ساختہ بولنے لگ گیا

کُنْ اَبَاہُ --- فَقَدْ وُلِدَ ذٰلِکَ الْمَوْلُوْدُ الَّذِیْ کُنْتُ اُحَدِّثُکُمْ عَنْہُ اَنَّہٗ یُوْلَدُ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَ یُبْعَثُ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَ یَمُوْتُ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ.

(اس کا باپ آپ کو ہی ہونا چاہئے (۱) آج وہ پیدا ہوگیا ہے جس کے بارے میں آپ کو بتایا کرتا تھا کہ وہ سوموار کے دن پیدا ہوگا، سوموار کے دن اس کو نبوت ملے گی اور سوموار ہی کے دن اس کا وصال ہوگا۔)

پھر جب اس کی اور عبدالمطلب کی تفصیلی گفتگو ہوئی تو عبدالمطلب نے اسے بتایا کہ آج صبح کے قریب میرے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے۔ عیص نے پوچھا

''فَمَا سَمَّیْتَہٗ ؟'' (آپ نے اس کا نام کیا رکھا ہے؟)

''مُحَمَّدْ نام رکھا ہے۔'' عبدالمطلب نے جواب دیا۔

''میری تمنا اور آرزو یہی تھی'' عیص نے بتایا ''کہ وہ مبارک ہستی آپ کے معزز گھرانے میں پیدا ہو --- الحمد للہ کہ ایسا ہی ہوا --- اس کے ظہور کی تین علامات میرے علم میں تھیں۔ پہلی علامت تو ستارے کا طلوع ہے، دوسری علامت اس کا بروز سوموار پیدا ہونا اور تیسری علامت یہ تھی کہ اس کا نام مُحَمَّدْ ہوگا --- ستارہ تو آج رات طلوع ہوگیا تھا

---

(۱) چونکہ حضرت عبداللہ کا انتقال آپ ﷺ کی ولادت سے پہلے ہی ہو چکا تھا اسلئے آپ کو ابنِ عبداللہ کہنے کے بجائے زیادہ تر ابنِ عبدالمطلب کہا جاتا تھا۔ اس نسبت پر خود آپ کو بھی فخر تھا چنانچہ آپ اپنے رجزیہ شعر میں فرماتے ہیں

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبْ

اور باقی دو علامات بھی اس بچے میں موجود ہیں---بلاشبہ یہی وہ مولود مسعود ہے جس کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔(۱)

عقیقہ

ساتویں دن عبدالمطلب نے دھوم دھام سے اپنے پوتے کا عقیقہ کیا۔ بہت سارے اونٹ ذبح کئے گئے اور عظیم الشان دعوت کا اہتمام کیا گیا۔قریش کے تقریباً تمام اہم افراد اس ضیافت میں شریک ہوئے۔کھانے سے فراغت کے بعد انہوں نے عبدالمطلب سے پوچھا کہ جس نومولود کی خوشی میں آپ نے یہ دعوت کی ہے، اس کا نام کیا رکھا ہے؟

''اس کا نام مُحَمَّدُ رکھا ہے'' عبدالمطلب نے جواب دیا۔

''مگر آپ کے خاندان میں تو یہ نام اس سے پہلے کسی کا نہیں ہوا'' قریش نے حیرت سے کہا'' آبائی ناموں کو چھوڑ کر یہ نیا نام آپ نے کس بنا پر منتخب کیا ہے؟''

''میری خواہش ہے کہ آسمانوں کا خالق اس بچے کی تعریف کرے اور زمین پر مخلوق اس کی مدح وستائش کرے---اس نام کا انتخاب اس خواہش کے اظہار کے لئے کیا ہے۔''(۲)

دراصل نام رکھنے کی یہ وجہ غیبی ہستی نے سیدہ آمنہ کو بتائی تھی (۳) اور انہوں نے عبدالمطلب کو اس سے مطلع کر دیا تھا، اسلئے عبدالمطلب نے وہی وجہ لوگوں کے سامنے بیان کر دی۔

---

(۱) الزرقانی، ج ۱، ص ۱۶۱، ۱۶۲. السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۷۷. تاریخ الخمیس، ج ۱، ص ۱۹۷.

(۲) السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۸۷. البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۶۶. تاریخ الخمیس، ج ۱، ص ۲۰۴.

(۳) اس واقعہ کی تفصیل کے لئے سیدالورٰی کا صفحہ نمبر ۸۲ ملاحظہ فرمائیں۔

رضاعت

چھ سات دن تک تو سیدہ آمنہ نے خود ہی دودھ پلایا، اس کے بعد ابولہب کی کنیز ثویبہ(۱) نے چند دن تک یہ خدمت انجام دی۔

ثویبہ کی شہرت

اگرچہ ثویبہ کو رضاعت کی سعادت صرف چند روز حاصل ہوئی مگر ایک اور واقعہ نے اس عورت کو شہرت دوام بخش دی۔

ہوا یوں کہ جب جانِ دوعالم ﷺ کی ولادت ہوئی تو ثویبہ اپنے آقا ابولہب کے پاس دوڑی گئی اور اسے خوشخبری سنائی کہ آپ کے بھائی عبداللہ کا بیٹا ہوا ہے۔ ابولہب کو اپنے مرحوم بھائی کی نشانی پیدا ہونے پر اتنی مسرت حاصل ہوئی کہ اس نے انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے ثویبہ سے کہا

اِذْهَبِیْ! فَاَنْتِ حُرَّةٌ. (جا! اس خوشی میں تجھے آزاد کیا)

بات آئی گئی ہوگئی --- چالیس سال بعد جب جانِ دوعالم ﷺ منصب نبوت سے سرفراز ہوئے اور آپ نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اعلان کرکے بزم کفر وشرک کو درہم برہم کردیا تو وہی چچا جس نے آپ کی ولادت کی خوشی میں ثویبہ کو آزادی کا

---

(۱) واضح رہے کہ یہ لفظ ثُوَیْبَۃ ہے جسے لوگ غلطی سے ثَوْبِیَۃ پڑھتے رہتے ہیں۔ ثویبہ کی اس چندروزہ رضاعت کا بھی جانِ دوعالم ﷺ کو اس قدر پاس تھا کہ جب آپ ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو جب تک ثویبہ زندہ رہیں آپ ان کے لئے وہاں سے تحفے تحائف ارسال کرتے رہے۔

جانِ دوعالم ﷺ سے پہلے ثویبہ نے سیدالشہداء حضرت حمزہؓ کو بھی دودھ پلایا تھا۔ اس لحاظ سے حضرت حمزہؓ چچا ہونے کے علاوہ آپ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ اسی لئے جب ایک دفعہ جانِ دوعالم ﷺ کو حضرت حمزہؓ کی بیٹی امامہ کے رشتے کی پیش کش کی گئی تو آپ نے منع کردیا اور فرمایا ''اِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِیْ، اِنَّهَا ابْنَةُ اَخِیْ مِنَ الرَّضَاعَةِ.'' (وہ میرے لئے حلال نہیں ہے کیونکہ وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔) طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۱۶۸

انعام بخشا تھا آپ کا کٹر مخالف بن گیا۔ اس کی بیوی ام جمیل شوہر سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ دونوں نے آپ کے خلاف محاذ بنالیا اور آپ کی دلآزاری اور ایذا رسانی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اللہ تعالیٰ اس قدر غضبناک ہوا کہ ان دونوں کے عبرتناک انجام پر مشتمل ایک مستقل سورہ نازل فرمادیا---تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَھَبٍ.........

بایں ہمہ جب ابولہب مرگیا(۱) تو تقریباً ایک سال کے بعد حضرت عباسؓ نے اس کو خواب میں دیکھا، پوچھا---''مَا حَالُکَ؟'' (تیرا کیا حال ہے؟)

ابولہب نے جواب دیا---''بُرا حال ہے، جہنم میں جل رہا ہوں، مرنے کے بعد راحت کا کوئی لمحہ مجھے میسر نہیں آیا؛ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ میں نے اپنے بھتیجے کی ولادت پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ثویبہ کو آزاد کردیا تھا۔ اس کا مجھے یہ انعام ملا ہے کہ سوموار کے دن میری انگلی اور انگوٹھے کے درمیان سے پانی نکلتا رہتا ہے اور میں اسے

---

(۱) ابولہب کی موت چیچک کی وجہ سے واقع ہوئی تھی اور عرب میں چیچک کو اس قدر منحوس و متعدی مرض سمجھا جاتا تھا کہ کوئی شخص مریض کے قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ چنانچہ ابولہب کی لاش بھی تین دن تک پڑی سڑتی رہی۔ جب تعفن پھیل گیا تو ایک شخص نے ابولہب کے بیٹوں سے کہا---''تمہیں شرم نہیں آتی کہ تمہارے باپ کی لاش گل سڑ رہی ہے اور تم نے اب تک اسے دفن نہیں کیا؟''

چاروناچار بیٹوں نے اسے ''دفن'' تو کردیا مگر کس عبرتناک طریقے سے!! مَعَاذَ اللہ! بعض روایات میں آیا ہے کہ اس کے لئے گڑھا کھودا گیا اور اس کی لاش کو لمبی لمبی لاٹھیوں سے دھکیل کے اس میں پھینک دیا گیا، پھر گڑھا پاٹ دیا گیا۔ اور بعض روایات کی رو سے اس کی لاش کو کسی نہ کسی طرح ایک گرنے پہ آئی ہوئی دیوار کے قریب پہنچایا گیا اور دیوار کو دھکا دے کر اس پر گرادیا گیا، پھر بھی جسم کے بعض حصے نظر آرہے تھے، چنانچہ دور سے پتھر مار مار کر ان حصوں کو ڈھانپ دیا گیا۔ وَ ذٰلِکَ جَزَاءُ الظّٰلِمِیْنَ.

الزرقانی، ج ۱، ص ۲۴۵۔

یہ انجام ہوا اُس حسین وجمیل شخص کا جسے شفق رنگ رخساروں اور گلنار چہرے کی مناسبت سے اَبُوْ لَھَبٍ (شعلہ رو) کہا جاتا تھا؛ جبکہ اس کا حقیقی نام عبدالعزّٰی تھا۔

چوستا رہتا ہوں۔(۱)

اَللّٰہُ اَکْبَرْ! جب میلادِ مصطفےٰ ﷺ کی لمحاتی خوشی منانے پر ابولہب جیسے قطعی جہنمی کو اتنا فائدہ حاصل ہوا کہ آتشِ دوزخ میں رہتے ہوئے بھی اس کو پینے کے لئے پانی مل جاتا ہے تو پھر آپ ہی سوچئے میرے محترم قارئین---! کہ اگر کوئی مومن وموحد عمر بھر میلادِ مصطفےٰ ﷺ کی خوشیاں منائے تو اس کو کیا کیا انعام ملیں گے اور اس پر کیسی کیسی نوازشیں ہوں گی!

حافظ شمس الدینؒ نے کیا پتے کی بات کہی ہے

اِذَا كَانَ هٰذَا كَافِرٌ جَاءَ ذَمُّهٗ وَ تَبَّتْ يَدَاهُ فِي الْجَحِيْمِ مُخَلَّدَا
اَتٰى اَنَّهٗ فِيْ يَوْمِ الْاِثْنَيْنِ دَائِمًا يُخَفَّفُ عَنْهُ لِلسُّرُوْرِ بِاَحْمَدَا
فَمَا الظَّنُّ بِالْعَبْدِ الَّذِيْ كَانَ عُمْرَهٗ بِاَحْمَدَ مَسْرُوْرًا وَمَاتَ مُوَحِّدَا

(جب ایک کافر کے بارے میں---جس کی مذمت قرآن میں نازل ہوئی، جس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔(۲) اور جو ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہے گا---یہ روایت آئی ہے کہ ہر سوموار کو اس کے عذاب میں محض اس لئے تخفیف ہو جاتی ہے کہ اس نے ولادتِ اَحْمَدْ ﷺ پر مسرت کا اظہار کیا تھا---پھر اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو زندگی بھر اَحْمَدْ ﷺ کی آمد پر مسرور رہا ہو اور اس کا خاتمہ توحید پر ہوا ہو۔) (۳)

دودھ پلانے والی کی تلاش

یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ شہری زبان میں کئی زبانوں کے الفاظ اور لہجے مخلوط ہو جاتے ہیں کیونکہ شہروں میں مختلف علاقوں کے لوگ ضروریات زندگی کی خرید وفروخت کے لئے آتے رہتے ہیں، ان سے میل ملاپ اور بات چیت کی وجہ سے شہریوں کی زبان ان کے لب ولہجہ سے متاثر ہو جاتی ہے اور اس میں وہ چاشنی باقی نہیں رہتی جو خالص زبان میں پائی

---

(۱) طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۶۷. الزرقانی، ص ۱۶۶، ۱۶۷.

(۲) ہاتھ ٹوٹ جانا، تباہ وبرباد ہونے سے کنایہ ہے۔

(۳) الزرقانی، ص ۱۶۶، ۱۶۸. الآثار المحمدیہ، ص ۵۲.

جاتی ہے۔

عربوں کو چونکہ اپنی فصاحت و بلاغت پر بہت ناز تھا، اس لئے وہ زبان کے تحفظ کا انتہائی خیال رکھتے تھے اور بیرونی آمیزش سے بچانے کے لئے نہایت اہتمام کرتے تھے۔

اس سلسلے میں وہ سب سے پہلا قدم یہ اٹھاتے تھے کہ بچے کو پرورش کے لئے شہر سے باہر بھیج دیتے تھے، تاکہ اس کی زبان اِدھر اُدھر کے الفاظ اور لہجوں کے اختلاط سے محفوظ رہے---خصوصاً مکہ مکرمہ میں تو اس کی ضرورت اور زیادہ تھی، کیونکہ یہ بابرکت شہر مرجع خلائق تھا۔ ایک کارواں جاتا تھا، تو دو آتے تھے۔ یہ لوگ مختلف علاقوں کے ہوتے تھے اور اپنی اپنی بولیاں اور لہجے رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والے بچے کی زبان خارجی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی، اس لئے مکہ مکرمہ کے صاحب حیثیت شرفا اپنے بچوں کو رضاعت کے لئے دیہات میں رہائش پذیر زبان آور قبیلوں میں بھیج دیا کرتے تھے۔ (۱) تاکہ ابتداء سے ہی فصیح عربی ان کی زبان پر چڑھ جائے اور اس کا مٹھاس بھرا لہجہ ان کی گفتگو میں رچ بس جائے۔

اسی دستور کے مطابق عبدالمطلب نے بھی اپنے پوتے کی رضاعت کے لئے کسی دیہاتی عورت کی تلاش شروع کردی۔

چونکہ دودھ پلانے والیوں کو بچوں کے والدین کافی کچھ دے دیتے تھے، اس لئے بچے حاصل کرنے کے لئے گاؤں کی عورتیں مکہ مکرمہ آتی رہتی تھیں۔ جن دنوں جانِ دو عالم ﷺ کی ولادت ہوئی تھی، انہی ایام میں قبیلہ بنی سعد کی کچھ عورتیں اسی غرض سے مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوئیں۔ انہی عورتوں میں ایک عورت حلیمہ سعدیہ (۲) بھی تھیں۔ یہی

---

(۱) چند دنوں کے جگر گوشے کو ایک دور دراز بسنے والی اجنبی عورت کے حوالے کردینا اور سالوں تک اس کی جدائی برداشت کرنا، ماں باپ کے لئے کتنا کٹھن اور صبر آزما کام ہے! حیرت ہوتی ہے کہ محض زبان کو اپنی اصلی اور فطری حالت پر برقرار رکھنے کے لئے عرب اتنی بڑی قربانی دیتے تھے۔

(۲) حضرت حلیمہ سعدیہؓ کا تعلق قبیلۂ بنی سعد سے تھا جو قبیلۂ ہوازن کی ایک ☜

وہ خوش نصیب خاتون ہیں جن کو جانِ دو عالم ﷺ کی رضاعی ماں بننے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ رضاعت باکرامت کی پرلطف روئداد انہی کی زبانی پیش خدمت ہے۔

شاخ تھی۔ ابن سعد نے محمد بن منکدر کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی جس نے بچپن میں آپ کو دودھ پلایا تھا۔ اسے دیکھ کر آپ ''میری ماں، میری ماں'' کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی چادر بچھا کر اسے بٹھایا۔

مشکوٰۃ میں حضرت ابوالطفیلؓ سے روایت ہے کہ غزدۂ حنین کے بعد جب رسول اللہ ﷺ ''جعرانہ'' میں تشریف فرما تھے تو ایک خاتون آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپ نے ان کی بہت تعظیم وتکریم کی اور اپنی چادر مبارک بچھا کر انہیں بٹھایا۔ حضرت ابوالطفیلؓ کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ خاتون کون ہیں؟ تو مجھے بتایا گیا کہ یہ حلیمہ سعدیہ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔

طبقات ابنِ سعد کی ایک روایت کے مطابق جانِ دو عالم ﷺ کی حضرت خدیجہ الکبرٰیؓ سے شادی کے بعد ایک مرتبہ حضرت حلیمہؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے علاقے میں قحط سالی کی شکایت کی۔ آپؐ نے چالیس بکریاں اور سامان سے لدا ہوا ایک اونٹ عطا فرمایا۔

علامہ سہیلی نے ''روض الانف'' میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حلیمہ سعدیہؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو خدیجہ الکبرٰی نے ان کو کئی اونٹنیاں مرحمت فرمائیں جن کو لے کر وہ دعائیں دیتی رخصت ہوئیں۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حلیمہؓ گاہے گاہے جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتی رہتی تھیں اور آپ ان کے ساتھ نہایت عزت واحترام اور احسان ومحبت سے پیش آتے تھے۔

حضرت حلیمہؓ نے جس محبت بھرے اور والہانہ انداز میں جانِ دو عالم ﷺ کی رضاعت کے دوران پیش آنے والے واقعات بیان کیے ہیں، اس سے ان کے مؤمنہ اور مسلمہ ہونے میں تو کوئی شبہ باقی نہیں رہتا؛ البتہ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ کے اعلان نبوت کے بعد وہ کب اور کہاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر باقاعدہ مشرف باسلام ہوئیں۔

حضرت حلیمہؓ کب تک زندہ رہیں، کتنی عمر پائی، کس سن میں فوت ہوئیں اور کہاں پر دفن کی گئیں؟ ان باتوں کی تفصیلات دستیاب نہیں ہوسکیں۔

رضاعت کی کہانی ، مائی حلیمہ کی زبانی

''ہمارے علاقے میں قحط پڑ گیا۔ کھانے کو کچھ نہ رہا تو بنی سعد سے تعلق رکھنے والی دس عورتیں رضاعت کے لئے بچوں کی تلاش میں مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں بھی اپنے خاوند (۱) کے ہمراہ ان کے ہمرکاب تھی۔ سواری کے لئے ہمارے پاس ایک اونٹنی تھی اور ایک سفید رنگ کی گدھی۔ قحط سالی کی وجہ سے اونٹنی کے تھن خشک ہو چکے تھے اور ان میں

---

(۱) حلیمہؓ کے شوہر رضاعت کی نسبت سے جانِ دو عالم ﷺ کے رضاعی باپ ہوتے ہیں۔ ان کا نام حارث تھا اور کنیت ابوذؤیب۔ جانِ دو عالم ﷺ کے منصب نبوت پر فائز ہونے کے کچھ عرصہ بعد مکہ مکرمہ آئے تو قریش نے ان سے گلہ کرنے کے انداز میں پوچھا

''اَلَا تَسْمَعُ یَاحَارِ ! مَایَقُوْلُ اِبْنُکَ ؟'' (حارث! کیا تم نے وہ باتیں نہیں سنیں جو تمہارا بیٹا کہتا ہے؟)

''مَایَقُوْلُ ؟'' (کیا کہتا ہے؟) حارث نے حیرت سے سوال کیا۔

''کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دو گھر بنا رکھے ہیں --- جنت اور جہنم --- اطاعت کرنے والوں کو جنت میں اعزاز و اکرام سے نوازے گا اور نافرمانی کرنے والوں کو جہنم میں عذاب دے گا۔ اس کی ان باتوں سے ہمارے اندر پھوٹ پڑ گئی ہے اور اجتماعیت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے۔''

قریش کی شکوہ سنجی سے متاثر ہو کر حارث جانِ دو عالم ﷺ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا

''بیٹے! کیا بات ہے۔ تیری قوم تجھ سے شاکی ہے؟ وہ لوگ کہتے ہیں کہ تم بعث بعد الموت اور عذاب و ثواب کی باتیں کرتے ہو --- کیا یہ درست ہے؟''

''جی ہاں!'' جانِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا ''میں واقعی یہ حقائق بیان کرتا ہوں ---- اور جب وہ دن آئے گا نا، تو میں آپ کا ہاتھ تھام کر آپ کو آج کی گفتگو یاد دلا دوں گا۔''

بعد میں جب حارثؓ مشرف باسلام ہو گئے تو فخریہ کہا کرتے تھے۔

''میرے ساتھ میرے بیٹے کا وعدہ ہے کہ وہ روز محشر میرا ہاتھ پکڑ کر ان باتوں کی

سے ایک قطرہ دودھ کا نہیں نکلتا تھا۔ گدھی بھی اتنی لاغر و کمزور ہو چکی تھی کہ بمشکل چل رہی تھی۔ بار بار پیچھے رہ جاتی تھی اور قافلے والوں کو رُک رُک کر ہمارا انتظار کرنا پڑتا تھا۔''

حلم اور سعادت

''بہر حال جوں توں کر کے ہم مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور بچوں کی تلاش شروع کر دی۔ میری ساتھی عورتوں کو تو بچے مل گئے مگر عجیب اتفاق ہوا کہ مجھے کوشش کے باوجود کوئی بچہ نہ مل سکا۔ اسی دوران عبدالمطلب ادھر آ نکلے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ تو کون ہے؟

''بنی سعد کی ایک عورت ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تیرا نام کیا ہے؟'' عبدالمطلب نے پوچھا۔

''حلیمہ۔'' میں نے بتایا۔

یہ سنتے ہی عبدالمطلب کے چہرے پر مسرت امنڈ آئی اور مسکراتے ہوئے بولے

''خوب! خوب! --- حلم اور سعادت، دو ایسی صفات ہیں، جن کے ساتھ عمر بھر کی بھلائی اور دائمی عزت وابستہ ہے (۱) حلیمہ! میرے گھر میں ایک یتیم بچہ ہے۔ میں نے اس کے بارے میں بنی سعد کی دیگر عورتوں سے بھی بات چیت کی ہے مگر والد زندہ نہ ہونے کی بنا پر کوئی عورت اسے لینے پر آمادہ نہیں ہوتی --- وہ سب کہتی ہیں کہ ہم تو بچے کے ماں باپ سے انعام و اکرام ملنے کی توقع پر رضاعت کی خدمات انجام دیتی ہیں۔ جس بچے کا باپ وفات پا چکا ہو اس کی رضاعت سے ہمیں کسی خاص بھلائی کی امید نہیں۔

حلیمہ --- ! کیا تو اسے لینے کے لئے تیار ہے؟ فَعَسیٰ اَنْ تَسْعَدِیْ بِہٖ. (امید

یاد دہانی کرائے گا، جو اسے نبوت ملنے کے بعد پہلی مرتبہ میرے اور اس کے درمیان ہوئی تھیں --- اور مجھے یقین ہے کہ اگر اس نے ایک دفعہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، تو پھر اس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک مجھے جنت میں داخل نہ کرا دے۔''

(روض الانف، ج ۱، ص ۱۰۷، الزرقانی، ج ۱، ص ۱۷۲، ۱۷۳)

(۱) عبدالمطلب نے ''حلیمہ'' سے (حلم) کی اور ''بنی سعد'' سے ''سعادت'' کی نیک فال اخذ کی۔

ہے کہ وہ تیرے لئے باعثِ سعادت ہو گا۔)

عبدالمطلب نے پوری صورت حال بیان کی تو میں نے کہا---"ذرا ٹھہریئے! میں اپنے شوہر سے پوچھ لوں۔"

چنانچہ میں اپنے خاوند کے پاس آئی اور اسے بتایا کہ مجھے اور تو کوئی بچہ نہیں مل سکا؛ البتہ عبدالمطلب کا ایک یتیم پوتا ہے---اگر اجازت ہو تو میں اس کو ہی لے لوں--- مجھے یہ بات کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی کہ باقی تمام عورتیں تو بچے لے کر جائیں اور میں خالی ہاتھ لوٹ جاؤں۔"

خاوند نے بخوشی اجازت دے دی تو میں دوبارہ عبدالمطلب کے پاس آئی۔ وہ بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ جب میں نے انہیں خاوند کی رضامندی کے بارے میں بتایا تو وہ کھل اٹھے اور مجھے ساتھ لے کر آمنہ کے گھر کی طرف چل دیئے۔

آمنہ نے مجھے اَھْلًا وَّسَھْلًا کہا، پھر اس کمرے میں لے گئیں جس میں بچہ تھا۔"

مولود دلنشین و عنبریں

"وہ بچہ نہایت ہی سفید اونی کپڑے میں لپٹا ہوا تھا اور سبز رنگ کی ریشمی چادر پر محوِ خواب تھا۔ اس کے بدن سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور فضا میں دلآویز مہک رچی بسی تھی۔ اتنا حسین و جمیل اور پیارا بچہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ جاگ نہ اٹھے، میں دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ اسی وقت اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کی روشن روشن آنکھوں سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں بے تابانہ اس پر جھک گئی اور اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر اسے اٹھا کر سینے سے لگایا، گھر والوں سے اجازت لی اور اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئی۔"

مولود عادل

"خشک سالی کے دوران اچھی غذا میسر نہ آنے کی وجہ سے میرا دودھ تقریباً ختم ہو چکا تھا--- میرا اپنا بیٹا ساری ساری رات بھوک سے بلکتا اور بلبلاتا رہتا تھا۔ نہ خود سوتا تھا، نہ ہمیں سونے دیتا تھا۔ مگر جب میں عبدالمطلب کے پوتے کو دودھ پلانے بیٹھی تو حیرت انگیز

طور پر بے تحاشہ دودھ اتر آیا۔

ایک طرف سے پلانے کے بعد جب دوسری طرف سے پلانا چاہا تو اس نے منہ پرے کرلیا۔ گویا دوسری جانب اپنے رضاعی بھائی کے لئے چھوڑ دی --- رضاعت کی پوری مدت میں اس کا یہی معمول رہا۔(۱)

دودھ کافی تھا، میں نے اپنے بیٹے کو بھی پلایا اور وہ اچھی طرح سیر ہو کر سو گیا۔"

نَسَمَةٌ مُّبَارَكَةٌ

"دونوں بچوں کو آرام سے لٹانے کے بعد اپنا پیٹ بھرنے کی فکر ہوئی۔ میرا خاوند اٹھ کر اونٹنی کی طرف گیا کہ شاید مسلسل نچوڑنے سے کچھ رس ہی پڑے، مگر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ اونٹنی کے تھن پوری طرح بھرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خوب دودھ دوہا اور جی بھر کے پیا۔

قحط کے بعد وہ پہلی رات تھی جو ہم نے پوری آسودگی سے بسر کی۔

پُرآسائش رات گزارنے کے بعد صبح جب بیدار ہوئے تو میرا خاوند کہنے لگا۔

"وَاللهِ يَاحَلِيمَةُ! لَقَدْ اَخَذْتِ نَسَمَةً مُّبَارَكَةً." (حلیمہ! واللہ تو، تو کوئی بڑی مبارک روح لے آئی ہے۔)

میں نے جواب دیا "وَاللهِ اِنِّیْ لَاَرْجُوْ ذٰلِکَ." (بخدا، مجھے بھی یہی امید ہے۔)

سواری کی کایا پلٹ گئی

"واپسی پر آمنہ کے لال کو سینے سے لگائے جب میں اپنی سواری پر سوار ہوئی تو اس مولود مسعود کی برکت نے ایسا اثر دکھایا کہ وہی سواری جو آتی دفعہ چلنے سے قاصر تھی، اتنی تیز گام ہوئی کہ بار بار کارواں کو پیچھے چھوڑ جاتی --- وہ لوگ مجھ سے کہتے

---

(۱) اَللهُ غَنِیٌّ، حقوقِ عالم کے نگہبان آقا نے رضاعت کے زمانے سے ہی رضاعی بھائی کے حق کو تحفظ دے دیا۔ حَسُنَتْ جَمِيعُ خِصَالِهٖ صَلُّوْا عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ

''حلیمہ! ہم پر ترس کھا! اتنی تیز نہ چل کہ ہم تیرا ساتھ نہ دے سکیں۔''

میری ساتھی عورتیں حیرت سے پوچھتیں---''حلیمہ! کیا یہ وہی سواری نہیں ہے جو آتے وقت اس قدر لاغر تھی کہ تیرا بوجھ بھی نہیں سہار سکتی تھی اور تجھے بار بار اتر کر پیدل چلنا پڑتا تھا؟''

جب میں جواب دیتی کہ سواری تو وہی ہے، تو وہ تعجب سے پکار اٹھتیں۔

''وَاللهِ! اِنَّ لَهَا لَشَانًا. (واللہ! اب تو اس کی شان ہی نرالی ہے'')

مولود مشک بار

''یونہی سفر بخریت تمام ہوا اور جب ہم اپنے گھروں میں پہنچے تو فضائیں مہک اٹھیں کہ لَمْ يَبْقَ مَنْزِلٌ مِنْ مَنَازِلِ بَنِيْ سَعْدٍ اِلَّا شَمَمْنَا مِنْهُ رِيْحَ الْمِسْكِ.

(بنی سعد کا کوئی ایسا گھر نہ تھا جس سے کستوری کی خوشبو نہ پھوٹتی ہو'')

نزول برکات

''اس مبارک بچے کی آمد سے میرے گھر میں خوشحالی اور راحت کا دور دورہ ہو گیا---ہمارا علاقہ قحط زدہ تھا، گھاس اور سبزہ نام کو نہ تھا، مگر میری بکریاں جب سرِ شام صحرا سے واپس آتیں تو ان کے پیٹ غذا سے اور تھن دودھ سے بھرے ہوتے؛ جبکہ باقی لوگوں کی بکریاں بھوکی لوٹ کر آتیں اور ان کے نیچے ایک قطرہ دودھ کا نہ ہوتا۔ قبیلے والوں کو مجھ پر رشک آتا اور وہ اپنے نوجوانوں سے کہا کرتے

''تم بھی وہیں بکریاں چرایا کرو نا! جہاں حلیمہ کی بکریاں چرتی ہیں۔''

نوجوان جواب دیا کرتے---''چراتے تو ہم بھی وہیں پر ہیں---اللہ جانے ہماری بکریاں بھوکی کیوں رہ جاتی ہیں!''

اسی سرور و فرحت اور خیر و برکت کے عالم میں دودھ پلاتے ہوئے جب دو سال کا عرصہ گزر گیا تو میں نے دودھ چھڑا دیا۔''(۱)

(مائی حلیمہ کی زبانی رضاعت کی کہانی ختم ہوئی۔)

---

(۱) اس واقعہ کو بعض مؤرخین نے مختصراً بیان کیا ہے اور بعض نے مفصلاً۔ ہم نے درمیانی ☜

دستِ شفا

جانِ دوعالم ﷺ کی برکات سے صرف حلیمہ ہی فیضیاب نہیں ہوئیں، بنی سعد کے دیگر افراد کو بھی وافر حصہ ملا۔ قبیلے کا کوئی فرد اگر بیمار پڑ جاتا تو مرض سے متاثرہ حصے پر آپ کا دست مبارک رکھتا اور اسی وقت شفایاب ہو جاتا۔ اسی طرح اگر کوئی جانور مبتلائے مرض ہو جاتا تو اس پر بھی آپ کا دستِ شفا پھرایا جاتا اور وہ بھلا چنگا ہو جاتا (۱)

قادر الکلام قبیلہ

بنی سعد کی فصاحت و بلاغت پورے عرب میں مسلمہ تھی --- ان کے مرد تو کیا، عورتیں بھی شاعرہ تھیں۔ مائی حلیمہ کی دعاؤں بھری یہ مختصر سی لوری کتنی پیاری ہے۔

يَا رَبِّ اِذْ اَعْطَيْتَهُ فَاَبْقِهٖ

وَ اَعْلِهٖ اِلَى الْعُلٰى وَرَقِّهٖ

وَادْحِضْ اَبَاطِيْلَ الْعِدٰى بِحَقِّهٖ

(اے میرے رب! جب یہ بچہ تو نے عنایت کیا ہے تو اسے عمر دراز بھی عطا فرما، اسے بلندیوں تک پہنچا، اسے عروج نصیب فرما اور اس کے ساتھ عداوت رکھنے والوں کے مکروفریب کو ناکام بنا!) (۲)

حلیمہؓ تو خیر پھر بھی خاصی عمر کی خاتون تھیں، ان کی بیٹی شیماءؓ جو بالکل نوعمر تھی، وہ بھی جانِ دوعالم ﷺ کو کھلاتے ہوئے منظوم آرزوؤں کے نذرانے پیش کرتی رہتی تھی۔

طریقہ اختیار کیا ہے۔ حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو۔ سیرت حلبیہ، ج ۱، ص ۹۸، ۹۹، ۱۰۰۔ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۲۶، ۱۲۷، طبقاتِ ابن سعد، ج ۱، ص ۶۹، ۷۰، سیرتِ ابن ھشام، ج ۱، ص ۱۰۸، ۱۰۹۔

(۱) السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۱۰۲، الزرقانی، ج ۱، ص ۱۷۶، الآثار المحمدیہ، ج ۱، ص ۵۶۔

(۲) تاریخ الخمیس، ج ۱، ص ۲۲۴، الزرقانی، ج ۱، ص ۱۷۶۔

هٰذَا اَخٌ لِّی لَمْ تَلِدْهُ اُمِّیْ
وَلَيْسَ مِنْ نَسْلِ اَبِیْ وَعَمِّیْ
فَدَيْتُه‘ مِنْ مُخْوِلٍ مُعِمٍّ
فَانْمِهِ اَللّٰهُمَّ فِيْمَا تُنْمِیْ

(میرا یہ بھائی نہ تو میری ماں سے پیدا ہوا، نہ ہی میرے باپ یا چچا کی اولاد میں سے ہے، اس کے باوجود میں اس پر صدقے قربان --- اس کے چچا اور خالائیں سب ہی باعزت ہستیاں ہیں۔ الٰہی! جس طرح تو اوروں کو آگے بڑھاتا ہے، اسی طرح اس کو بھی ترقی عطا فرما۔) (۱)

کبھی یوں نغمہ سرا ہوتی تھی۔

يَا رَبَّنَا اَبْقِ اَخِیْ مُحَمَّدًا
حَتّٰی اَرَاهُ يَافِعًا وَّ اَمْرَدًا
ثُمَّ اَرَاهُ سَيِّدًا مُسَوَّدًا
وَاكْبِتْ اَعَادِيهِ مَعًا وَالْحُسَّدَا
وَاَعْطِهِ عِزًّا يَدُوْمُ اَبَدًا

(یَارَبَّنَا! میرے بھائی محمد کو طویل زندگی دے، یہاں تک کہ میں اس کو جوان ہوتے دیکھوں، پھر سردار بنتے دیکھوں۔ اس کے دشمنوں اور حاسدوں کو ذلیل کر اور اس کو ایسی عزت بخش جو ہمیشہ برقرار رہے۔) (۲)

خدا کی شان، حلیمہ اور شیماءؓ کی سب دعائیں مستجاب ہوئیں اور انہوں نے اپنی

---

(۱) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۲۲۴، الزرقانی ج ۱، ص ۱۷۶، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۱۴.

(۲) الزرقانی ج ۱، ص ۱۷۷، --- جانِ دو عالم ﷺ کی حیران کن فصاحت کی بڑی وجہ یہی تھی کہ آپ کا بچپن بنی سعد کے فصیح اور قادر الکلام بچوں میں رہتے بستے اور ہنستے بولتے گزرا ☜

آنکھوں سے وہ تمام آرزوئیں پوری ہوتی دیکھ لیں، جو ان کے دلوں میں جانِ دو عالم ﷺ کے لئے مچلا کرتی تھیں۔

لَمْ نُخْلَقْ لِهٰذَا

بچپن کا دور کھیل کود کا زمانہ ہوتا ہے مگر جس کے کندھوں پر دو جہاں کا بوجھ پڑنے والا تھا، اس کو ابتدا سے ہی لہو ولعب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مائی حلیمہ کہتی ہیں--- ''جب وہ کھیل کود کے قابل ہوا تو اپنے بھائی کے ساتھ کھیلنے چلا تو جاتا تھا، مگر خود کسی کھیل میں شریک نہ ہوتا۔ بس، بھائی کو دوسرے بچوں سے کھیلتے ہوئے دیکھتا رہتا--- کبھی کبھی اس کو بھی منع کیا کرتا اور اسے سمجھایا کرتا کہ ''اِنَّا لَمْ نُخْلَقْ لِهٰذَا'' (ہم کھیل کے لئے نہیں پیدا کئے گئے۔) (۱)

نیازِ معصومانہ

اس ہستی کو کھیل تماشے اور لہو ولعب سے دلچسپی ہو بھی کیسے سکتی تھی جس کے احساس کا یہ عالم تھا کہ مائی حلیمہ کہتی ہیں

''ایک دفعہ رات کے کسی پہر میری آنکھ کھل گئی تو میں نے سنا کہ وہ اپنے رب کے ساتھ یوں مصروفِ راز و نیاز تھا--- لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، قُدُّوْسًا، قُدُّوْسًا. نَامَتِ الْعُيُوْنُ وَالرَّحْمٰنُ لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ.

تھا--- یہ وجہ خود آپ نے بیان فرمائی تھی، جب ایک مرتبہ صدیق اکبرؓ نے آپ کے منہ سے پھول جھڑتے دیکھے تو حیرت سے کہا--- ''مَا رَاَيْتُ اَفْصَحَ مِنْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!''

(یارسول اللہ! میں نے آپ سے زیادہ فصیح کوئی نہیں دیکھا۔)

آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا

''وَمَا يَمْنَعُنِيْ؟ وَاَنَا مِنْ قُرَيْشٍ وَّاُرْضِعْتُ فِيْ بَنِيْ سَعْدٍ''

(ایسا کیوں نہ ہو؟ جب کہ میں قریش سے تعلق رکھتا ہوں اور میری رضاعت کا زمانہ بنی سعد میں گزرا ہے۔) (۱) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۲۲۵، الزرقانی ج ۱، ص ۱۷۸.

(لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ --- پاک ہے، پاک ہے، آنکھیں سوگئیں، مگر رحمٰن کو نہ اونگھ چھوسکتی ہے نہ نیند۔) (۱)

نشو و نما

جو بچہ کھیلنے سے جی چرائے، وہ عموماً بیمار اور مریل سا ہوتا ہے مگر تعجب ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کھیل سے بیزاری کے باوجود قابل رشک صحت کے مالک تھے۔ مائی حلیمہؓ بتاتی ہیں

لَمَّا بَلَغَ تِسۡعَةَ اَشۡهُرٍ كَانَ يَتَكَلَّمُ بِالۡكَلَامِ الۡفَصِيۡحِ وَلَمَّا بَلَغَ عَشَرَةَ اَشۡهُرٍ كَانَ يَرۡمِيۡ السِّهَامَ مَعَ الصِّبۡيَانِ. (۲)

(نو ماہ کی عمر میں آپ فصیح گفتگو کرتے تھے اور جب دس مہینوں کے ہوئے تو بچوں کے ساتھ تیراندازی کیا کرتے تھے۔)

نور کی جھلک

جسمانی نشو و نما کے ساتھ ساتھ غیر معمولی روحانی عظمتوں کے آثار بھی ہویدا ہوتے رہتے تھے۔ وَكَانَ يَنۡزِلُ عَلَيۡهِ كُلَّ يَوۡمٍ نُوۡرٌ كَنُوۡرِ الشَّمۡسِ ثُمَّ يَنۡجَلِيۡ عَنۡهُ. (۳)

(آپ ﷺ پر روزانہ (چند لمحوں کے لئے) سورج کی روشنی جیسا نور نازل ہوتا تھا، پھر چھٹ جاتا تھا۔)

واپس لے جانا، لے آنا

جس بچے کی آمد کے ساتھ بنی سعد کے دن پھر گئے اور حلیمہؓ کے گھر برکتوں اور خوشیوں کا راج ہوگیا، اس کو واپس کرنا اور اپنے آپ سے جدا کرنا انتہائی کٹھن کام تھا، مگر اب دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور دستور کے مطابق مائی حلیمہ بچے کو اتنی ہی مدت تک

---

(۱) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۲۲۵، السیرة الحلبیه ج ۱، ص ۱۰۲، الآثار المحمدیه ج ۱، ص ۵۶.

(۲) السیرة الحلبیه ج ۱، ص ۱۰۱، الآثار المحمدیه ج ۱، ص ۵۵، الزرقانی ج ۱، ص ۱۷۹.

(۳) الآثار المحمدیه ج ۱، ص ۵۵، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۲۲۵.

رکھنے کی مجاز تھیں۔ چنانچہ ایک دن بادلِ ناخواستہ اسے واپس کرنے کے لئے مکہ تشریف لے گئیں---اب اسے حسنِ اتفاق کہیے یا مائی حلیمہؓ کی خوش قسمتی، کہ ان دنوں مکہ مکرمہ میں کچھ وباء سی پھوٹی ہوئی تھی۔ مائی حلیمہؓ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور سیدہ آمنہ سے کہنے لگیں۔

''اس بچے کو فی الحال آپ ہمارے ہاں ہی رہنے دیں کیونکہ اِدھر تو وبا پھیلی ہوئی ہے۔''

سیدہ آمنہ نے کہا---''ہاں، میں خود بھی یہ خطرہ محسوس کر رہی ہوں کہ کہیں یہ کسی وبائی مرض کا شکار نہ ہو جائے---بہتر ہے کہ تم اسے واپس ہی لے جاؤ۔''

مائی حلیمہؓ کو اور کیا چاہیے تھا---یہی تو ان کے من کی مراد تھی، چنانچہ اس منبع خیرات اور مصدرِ برکات کو لئے ہوئے فرحاں وشاداں واپس ہو گئیں۔

ابر سایہ کُناں

مکہ مکرمہ سے مراجعت کے بعد جانِ دو عالم ﷺ کی مزید عظمتوں کا مشاہدہ ہوا۔

مائی حلیمہؓ کہتی ہیں کہ ادھر سے واپسی کے بعد میں اس کا اور زیادہ خیال رکھا کرتی تھی اور حتی الوسع اس کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔ ایک دن شدید گرمی تھی اور دوپہر کا وقت تھا، اچانک میں نے محسوس کیا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ میں اس کی تلاش میں بے تابانہ باہر کی طرف لپکی، دیکھا تو وہ اپنی بہن شیما کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے شیما کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''فِیْ ھٰذَا الْحَرِّ؟'' (اس گرمی میں تو اسے باہر نکال لائی ہے؟)

شیماء نے جواب دیا---''امی! میرے بھائی کو تو ذرا سی گرمی بھی نہیں لگی۔ اس پر تو بادل کا ایک ٹکڑا سایہ کئے ہوئے تھا، یہ چلتا تھا تو سایہ بھی چلتا تھا، یہ رکتا تھا تو سایہ بھی رک جاتا تھا۔''

میں نے حیرت سے پوچھا---''اَحَقًّا یَا بُنَیَّۃ!؟'' (بیٹی! کیا تو سچ کہہ رہی ہے؟)

شیما نے پورے تیقن سے جواب دیا ''اِیْ! وَاللّٰہِ.'' (ہاں! اللہ کی قسم۔) (۱)

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۱۴، الزرقانی ج ۱، ص ۱۷۹۔

شق صدر

یوں تو جانِ دوعالم ﷺ کے بچپن کے تمام واقعات محیرالعقول ہیں لیکن سب سے حیران کن واقعہ شقِ صدر کا ہے۔

مکہ مکرمہ سے واپسی کے بعد تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ایک دن آپ نے مائی حلیمہؓ سے پوچھا

''اماں! میرے بہن بھائی دن بھر کہاں غائب رہتے ہیں؟''

''بیٹا! وہ تو بکریاں چرانے جاتے ہیں۔'' مائی حلیمہؓ نے جواب دیا۔

''پھر میں ان کے ساتھ کیوں نہیں جاتا؟''

''کیا تمہارا بھی جانے کو جی چاہتا ہے؟''

''ہاں! اماں!''

''بہتر ہے---کل سے تم بھی جایا کرنا''۔

اور یوں آپ قبیلے کے دیگر بچوں کے ساتھ بکریاں چرانے لگے۔

ایک دن سب بچے پہاڑ کے دامن میں واقع ایک وادی میں ہنس کھیل رہے تھے کہ ناگاہ تین اجنبی کہیں سے نمودار ہوگئے۔ ان میں سے ایک چپ چاپ آگے بڑھا اور جانِ دوعالم ﷺ کو پکڑ کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف چل پڑا۔ دوسرے بچے وقتی طور پر خوفزدہ ہوکر بھاگ اٹھے مگر پھر واپس آگئے۔ ان معصوموں کے ننھے ننھے ذہنوں میں یہی آیا کہ یہ کوئی دشمن ہیں جو ہمارے دوست کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔ بچوں میں اتنی طاقت تو نہیں تھی کہ تین توانا مردوں سے اپنے دوست کو چھڑا لیتے اور بچا لیتے؛ تاہم انہیں قتل سے باز رکھنے کے لئے بچوں نے زبانی طور پر ہر ممکن کوشش کی---معصومانہ جملے---ہر جملہ خوف، غم، ہراس اور بیچارگی کا مرقع۔

''آپ لوگوں نے اس کو کیوں پکڑ لیا ہے---؟ یہ ہم میں سے نہیں ہے---یہ تو سردارِ قریش کا بیٹا ہے---ہمارے پاس صرف رضاعت کے لئے آیا ہوا ہے---یتیم ہے---اس کا باپ مر چکا ہے---اس کو مار کر آپ کو کیا ملے گا؟ کیا فائدہ حاصل ہوگا؟''

اجنبیوں نے بچوں کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے جانِ دو عالم ﷺ کو زمین پر لٹا دیا۔ اب تو سب ساتھیوں کو یقین ہو گیا یہ لوگ ہمارے پیارے دوست کو مار ڈالیں گے۔ اس موقع پر ان معصوموں نے جو پیش کش کی، وہ معصومانہ فدا کاری اور جاں نثاری کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائے گی --- انہوں نے کہا --- ''اگر آپ نے بہر حال قتل کرنا ہی ہے تو ایسا کیجئے کہ اس کو چھوڑ دیجئے اور اس کے بدلے ہم میں سے جس کو آپ کا جی چاہے، مار ڈالئے!'' (۱)

اجنبیوں نے پھر بھی کوئی توجہ نہ دی اور اپنے کام میں مشغول رہے۔ ایک نے جانِ دو عالم ﷺ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر نیچے کی جانب کھینچا تو سینے سے ناف تک شگاف پڑ گیا۔ بچوں نے یہ منظر دیکھا تو دہشت زدہ ہو کر اپنے گھروں کی طرف بھاگ نکلے۔

مائی حلیمہؓ کہتی ہیں --- ''دوپہر کا وقت تھا، ہم گھر میں بیٹھے تھے کہ اچانک میرا بیٹا چیختا چلاتا ہوا دوڑتا آیا --- ''او امی! --- او ابو! --- میرے قریشی بھائی کو بچا لیجئے!! اگرچہ مجھے امید نہیں ہے کہ آپ اسے زندہ پا سکیں گے۔''

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا --- ''مَاقِصَّتُہٗ؟'' (قصہ کیا ہے؟) میں نے اس سے پوچھا۔

''ہم اُدھر کھڑے تھے'' اس نے ہانپتے ہوئے وادی کی طرف اشارہ کیا ''کہ اچانک ایک آدمی آیا اور اس کو پکڑ کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف لے گیا پھر اسے لٹا کر اس کا سینہ چیرنے لگا --- مجھے کچھ پتہ نہیں کہ پھر کیا ہوا۔''

وہ بچہ جو سب کی آنکھوں کا تارا تھا، پھر پرائی امانت تھا، اس کے بارے میں یہ وحشت اثر خبر سن کر خدا جانے مائی حلیمہؓ کے دل پر کیا بیتی ہو گی --- ! انہیں تو یہ سوچ سوچ کر ہول آتا ہو گا کہ اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو میں اس کی ماں اور دادا کو کیا جواب دوں گی؟

---

(۱) اَللّٰہُ غَنِیٌّ --- تماشا گاہ عالم میں کیا کیا مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں --- کبھی حقیقی بھائی ''برادرانِ یوسف'' کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں اور کبھی رضاعی بھائی اور ساتھ والے دوست اپنی معصوم جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں --- وَلِلّٰہِ فِیْ خَلْقِہٖ شُئُوْنٌ۔

یہ خبر سنتے ہی مائی حلیمہؓ پہاڑ کی طرف سرپٹ بھاگ اٹھیں۔ پیچھے پیچھے ان کا شوہر اور قبیلے کے دیگر افراد بھی دوڑ پڑے۔

وہ کون تھے؟

وہ تین اجنبی جو جانِ دو عالم ﷺ کو پکڑ کر لے گئے تھے، حقیقت میں تین فرشتے تھے (۱) جو آپ کے قلبِ مطہر کی مزید تطہیر کے لئے بھیجے گئے تھے۔ آپ انتہائی دلچسپ پیرائے میں خود ہی تفصیلات بیان فرماتے ہیں۔

''ان میں سے ایک کے ہاتھ میں برف (۲) سے بھرا ہوا سونے کا طشت تھا، انہوں نے مجھے انتہائی لطافت اور آرام سے لٹایا اور میرے سینے پر ہاتھ پھیر کر اسے کھول ڈالا، اندر سے میرا دل نکالا، اسے بھی چیرا اور اس میں سے ایک سیاہ داغ نکال کر پھینک دیا اور کہا--- هٰذَا حَظُّ الشَّيْطَانِ. (یہ وہ جگہ ہے، جہاں سے شیطان انسان پر اثر انداز ہوتا ہے۔)

اس کے بعد دل کو برف کے پانی سے اچھی طرح دھویا اور اس کو ایمان، حکمت اور سکینہ سے بھر دیا، پھر اس کو بند کر کے اوپر نور کی مُہر لگا دی--- مہر اتنی نورانی تھی کہ اس سے خیرہ کن شعاعیں پھوٹتی تھیں اور اس میں ایسی برودت اور راحت تھی کہ اس کی ٹھنڈک مجھے آج تک اپنی رگ رگ اور جوڑ جوڑ میں محسوس ہوتی ہے--- اس کے بعد دل کو سینے میں اپنی جگہ پر جما کر حسبِ سابق میرے سینے پر ہاتھ پھیرا تو اسی وقت شگاف بند ہو گیا اور سوائے ایک باریک لکیر کے کوئی نشان باقی نہ رہا--- اس سارے عمل کے دوران کسی بھی مرحلے میں مجھے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

اسی دوران قبیلے والے قریب آ پہنچے۔ فرشتے اس وقت بھی میرے پاس موجود تھے، مگر میرے سوا کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ سب سے آگے اماں بین کرتی ہوئی آ رہی

---

(۱) ایک کے بارے میں تو صحیح مسلم میں تصریح ہے کہ وہ جبرائیل امین تھے۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرائیل امین کے دو ساتھی میکائیل اور اسرافیل تھے۔

(۲) صحیح مسلم میں برف کی جگہ آبِ زمزم کا ذکر ہے۔

تھیں ''وَاضَعِیفَاهُ، وَا وَحِیدَاهُ، وَایَتِیمَاهُ.'' (ہائے ضعیفا! ہائے بے یارا! ہائے یتیما!)

اماں تو بین کر رہی تھیں اور فرشتے مجھے اپنے سینوں سے چمٹا رہے تھے اور میرے سر اور پیشانی پر بوسے دے رہے تھے۔ جب اماں نے وَاضَعِیفَاهُ کہا تو فرشتوں نے میرا ماتھا چوما اور کہا ''حَبَّذَا مِنْ ضَعِیفٍ'' (کیا ہی عمدہ ضعیف ہے) اماں نے جب وَاوَاحِیدَاهُ کہا تو فرشتوں نے پھر میرے سر اور پیشانی پر بوسے دیئے اور کہا ''حَبَّذَا مِنْ وَّحِیدٍ.'' اماں بولیں وَایَتِیمَاهُ. فرشتوں نے پھر مجھے سینے سے چمٹایا، سر و پیشانی چومی اور کہا، ''حَبَّذَا مِنْ یَّتِیمٍ'' اماں نے کہا --- ''اُسْتُضْعِفْتَ مِنْ بَیْنِ اَصْحَابِکَ فَقُتِلْتَ لِضُعْفِکَ'' (شاید تو ہی انہیں سب سے زیادہ کمزور نظر آیا تھا کہ انہوں نے جرم ضعفی کی سزا میں تجھے قتل کر ڈالا۔) فرشتوں نے پھر مجھے چوما اور کہا --- ''مَا اَکْرَمَکَ عَلَی اللّٰهِ! لَوْ تَعْلَمُ مَا اُرِیْدَ بِکَ مِنَ الْخَیْرِ لَقَرَّتْ عَیْنُکَ'' (کتنا اکرام ہے آپ کا اللہ کے ہاں! اگر آپ جانتے کہ آپ کے ساتھ کیسی کیسی بھلائیوں کا ارادہ کیا جا رہا ہے تو آپ کو بے پایاں مسرت حاصل ہوتی۔)

ابھی تک اماں کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ جب مزید قریب آئیں اور مجھے زندہ دیکھا تو حیران رہ گئیں، کہنے لگیں --- ''ہائیں! یہ کیا --- ! میں تجھے اب تک زندہ دیکھ رہی ہوں!'' پھر مجھ پر جھک گئیں اور مجھے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا کر دیوانہ وار چومنے لگیں۔

''فَدَتْکَ نَفْسِیْ، مَا الَّذِیْ دَهَاکَ؟'' (میں صدقے، تجھ پر کیا مصیبت آپڑی تھی؟)

میں نے جو کچھ پیش آیا تھا بیان کیا تو بعض لوگ کہنے لگے کہ بچے پر کسی بھوت پریت کا سایہ ہو گیا ہے اس لئے اس کو فلاں کاہن کے پاس لے چلو تا کہ وہ کوئی حیلہ منتر کرے۔

میں نے بھتیرا کہا کہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور مجھے آسیب وغیرہ کی کوئی شکایت نہیں ہے، مگر کون سنتا تھا ---؟ وہ مجھے ایک کاہن کے پاس لے ہی گئے۔

کاہن نے جب ان کی زبانی قصہ سنا تو کہنے لگا --- ''تم لوگ ذرا چپ کرو اور مجھے بچے سے پوچھنے دو۔ جس پر گزری ہے وہی صحیح بتا سکتا ہے۔''

مجھ سے پوچھا تو میں نے مِن وعَن سارا واقعہ بیان کر دیا۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچ کر چلانے لگا---''یَالِلْعَرَبُ، یَالِلْعَرَبُ مِنْ شَرٍّ قَدِاقْتَرَبُ.......(اے عرب والو! اے عرب والو! ایک بڑی مصیبت نزدیک آ گئی ہے۔ اس لڑکے کو مار ڈالو اور اس کے ساتھ ہی مجھے بھی مار ڈالو۔ لات وعزّٰی کی قسم! اگر یہ زندہ رہا تو تمہارے دین کو بدل ڈالے گا، تمہیں اور تمہارے آباء واجداد کو بے وقوف قرار دے گا، تمہاری شدید مخالفت کرے گا، تمہارے دیوتاؤں کو من گھڑت اور خود ساختہ کہے گا اور بالکل ہی نیا اور انوکھا دین پیش کرے گا۔''

اماں کو اس کی لایعنی خرافات پر بے حد غصہ آیا۔ انہوں نے مجھے کھینچ کر اس کے بازوؤں سے نکال لیا اور اس کے خوب لتّے لئے۔

''لَاَنْتَ اَعْتَهُ وَاَجَنُّ.......(تُو تو بالکل ہی پاگل اور دیوانہ ہے--- اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تو ایسی لغو بکواس کرے گا تو اس کو تیرے پاس لاتی ہی نہ--- تجھے مرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو اپنے لئے کوئی قاتل تلاش کر! اس معصوم بچے کو تو میں ہرگز قتل نہ کرنے دوں گی۔)(۱) اس کے بعد ہم سب اپنے گھروں کو واپس چلے آئے--- میرے سینے سے ناف تک، تسمے جیسا باریک نشان جو نظر آتا ہے، یہ اسی شقِ صدر کی یادگار ہے۔''(۲)

اندیشہ

اس واقعہ سے مائی حلیمہؓ کے شوہر کو یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں بچے کو سچ مچ ہی کوئی

---

(۱) مائی حلیمہؓ کا غصہ اپنی جگہ، لیکن اس کاہن کے کمال میں کوئی شک نہیں، اس کی تمام پیشگوئیاں حرف بحرف درست ثابت ہوئیں۔

(۲) یہ واقعہ متعدد طریقوں سے مروی ہے۔ نہایت اختصار سے، قدرے تفصیل سے اور مکمل تفصیل سے۔ ہم نے قدرے تفصیل والا انداز اختیار کیا ہے۔ حوالہ جات کے لئے ملاحظہ فرمایئے۔ صحیح مسلم ج ۱، ص ۹۲، سنن دارمی ص ۶، مستدرک حاکم ج ۲، ص ۶۱۶، شرح الشفاء للخفاجی وعلی القاری ج ۲، ص ۳۲۱، الزرقانی ج ۱، ص ۱۸۱ تا ۱۸۵۔

گزند نہ پہنچ جائے، چنانچہ انہوں نے مائی حلیمہؓ کو مشورہ دیا---''حلیمہ! اس بچے کی بے حساب برکات کی وجہ سے فلاں گھرانہ ہم سے حسد رکھتا ہے۔ بچے کے ساتھ جو کچھ ہوا، مجھے یہ سب کچھ انہی لوگوں کا کیا دھرا نظر آتا ہے۔(۱) اس لئے بہتر یہی ہے کہ اب یہ امانت واپس کردی جائے۔''

تاریخ طبری ج ۲، ص ۱۲۷ تا ۱۳۰، روض الانف ج ۱، ص ۱۰۹ تا ۱۱۱، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۰۴ تا ۱۱۵۔

آج کل کے بعض مغرب گزیدہ لوگوں کو شقِ صدر کا واقعہ ناقابلِ یقین معلوم ہوتا ہے، لیکن چونکہ نہایت صحیح احادیث و روایات سے ثابت ہے، اس لئے انکار کی جرأت بھی نہیں کرپاتے۔ مجبوراً تاویلات کا سہارا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شقِ صدر کی تمام تفصیلات محض تمثیلی رنگ کے مشاہدات ہیں اور دراصل شقِ صدر اسی کیفیت کا نام ہے، جس کو قرآن میں شرحِ صدر کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے--- حالانکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا، بچوں کا بھاگ کر جانا اور ماں کو مطلع کرنا، پھر آپ کے سینۂ انور پر عمر بھر اس نشان کا باقی رہ جانا، یہ سب کچھ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ یہ حقیقی واقعہ ہو۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان علماءِ حق کو جنہوں نے اس قسم کی تشکیکات کا صدیوں پہلے رد کردیا تھا۔ چنانچہ ملا علی قاریؒ شرح مشکوٰۃ میں اسی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

وَهٰذَا الْحَدِيْثُ وَاَمْثَالُهٗ مِمَّا يَجِبُ فِيْهِ التَّسْلِيْمُ وَلَايُتَعَرَّضُ لَهٗ بِتَاْوِيْلٍ مِنْ طَرِيْقِ الْمَجَازِ اِذْ لَا ضَرُوْرَةَ فِيْ ذٰلِکَ، اِذْهُوَ خَبَرُ صَادِقٍ مَصْدُوْقٍ عَنْ قُدْرَةِ الْقَادِرِ.

(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۵، ص ۴۱۳)

(یہ حدیث اور اس طرح کی (مافوق العادۃ) دیگر حدیثوں کو بے چون وچرا تسلیم کرلینا چاہئے اور مجازی معنوں پر محمول کرکے تاویل نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو قادرِ مطلق کی قدرت کے کرشمے ہیں جن کے بارے میں ایک تصدیق شدہ سچے نے خبر دی ہے۔ (پھر تاویل کی کیا حاجت؟)

(۱) مائی حلیمہؓ کے شوہر کے خیال میں یہ واقعہ حاسدین کے کسی جادو ٹونے کا نتیجہ تھا۔

مائی حلیمہؓ کا جی تو نہیں چاہتا تھا، مگر حالات کو دیکھتے ہوئے چار و ناچار متفق ہو گئیں اور ایک دن جانِ دو عالم ﷺ کو سیدہ آمنہ کے حوالے کرنے روانہ ہو گئیں۔

گمشدگی

مکہ کی گلیوں سے گزرتے ہوئے مائی حلیمہؓ سے جانِ دو عالم ﷺ کھو گئے۔ مائی حلیمہ نے بہت تلاش کیا مگر نہ مل سکے۔ تھک ہار کر عبدالمطلب کو مطلع کیا۔ وہ بھی بے حد پریشان ہو گئے، اسی وقت حرمِ کعبہ تشریف لے گئے اور منظوم دعا پڑھی۔

لَاهُمَّ ! اِنَّ رَاكِبِیْ مُحَمَّدًا
اَدِّهِ اِلَیَّ وَاصْطَنِعْ عِنْدِیْ یَدًا
لَایَبْعُدُ الدَّهْرُ بِهٖ فَیَبْعَدَا
اَنْتَ الَّذِیْ سَمَّیْتَهٗ مُحَمَّدًا

(الٰہی! میرے کندھوں پر سواری کرنے والے محمد کو لوٹا دے اور مجھ پر احسان فرما دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زمانہ اس کو دور کر دے اور وہ مجھ سے بچھڑ جائے۔ تو نے ہی اس کا نام محمد رکھا ہے۔)

اس کے بعد متعدد آدمی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ بالآخر آپ وادیٔ تہامہ میں ایک درخت تلے کھڑے ہوئے مل گئے مگر عبدالمطلب نے چونکہ کافی عرصہ سے آپ کو نہیں دیکھا تھا، اس لئے پہلی نظر میں پہچان ہی نہ سکے اور پوچھنے لگے۔

''مَنْ اَنْتَ یَاغُلَامُ؟'' (لڑکے! تو کون ہے؟)

''اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ.'' جانِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا۔

عبدالمطلب --- فَدَتْکَ نَفْسِیْ، اَنَا جَدُّکَ عَبْدُالْمُطَّلِبِ (تجھ پر میری جان قربان، میں ہی عبدالمطلب ہوں --- تیرا دادا) کہتے ہوئے بے تابانہ آگے بڑھے اور آپ کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا، پھر سرور و غم کی ملی جلی کیفیت میں دیر تک روتے رہے۔

جب پوتے کو لے کر مکہ مکرمہ پہنچے تو اس کی بازیابی کی خوشی میں آپ نے اہل مکہ کی

دعوت کی وَنَحَرَ الشِّیَاہَ وَالْبَقَرَ اور کئی بھیڑیں اور گائیں ذبح کیں۔(۱)

کَلَّا وَاللہ.......

جب مائی حلیمہؓ سیدہ آمنہ کے پاس پہنچیں اور جانِ دو عالم ﷺ کو واپس کرنے لگیں تو سیدہ آمنہ نے پوچھا---''حلیمہ! کیا بات ہے، آج تو خود ہی اس کو لے آئی ہے، حالانکہ اس سے پہلے تُو اس کو اپنے پاس رکھنے کی بے حد مشتاق تھی؟''

''رضاعت کی مدت ختم ہو چکی ہے اور میں نے اپنی ذمہ داری بطریق احسن پوری کر دی ہے---اب مجھے ڈر لگتا ہے کہ اس کو کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے۔'' مائی حلیمہ نے اصل وجہ چھپانے کی کوشش کی مگر سیدہ آمنہ بہت ذہین خاتون تھیں، کھٹک گئیں، کہنے لگیں،

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔اصل قصہ کچھ اور ہے---بہتر یہی ہے کہ تو سچ بتا دے۔''

جب مائی حلیمہ نے دیکھا کہ یوں جان چھوٹنی مشکل ہے تو شقِ صدر کا سارا واقعہ بلاکم و کاست بیان کر دیا۔سیدہ آمنہ نے پوچھا---''اَفَتَخَوَّفْتِ عَلَیْہِ الشَّیْطَانَ؟'' (کیا تیرے خیال میں اس پر شیطان قسم کے کسی جن کا اثر ہو گیا ہے؟)

''نَعَمْ'' مائی حلیمہ نے جواب دیا۔

سیدہ آمنہ نے کہا''کَلَّا وَاللہِ مَا لِلشَّیْطَانِ عَلَیْہِ مِنْ سَبِیْلٍ......(ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! شیطان اس پر کسی طرح اثر انداز ہو ہی نہیں سکتا۔) اس کے بعد سیدہ آمنہ نے بوقت ولادت ظاہر ہونے والے واقعات بیان کئے اور کہا---''ایسے مبارک بچے پر شیطان کا داؤ بھلا کب چل سکتا ہے---؟ بہر حال تو اسے چھوڑ جا اور خوش خوش واپس چلی جا!(۲)

عبدالمطلب نے رضاعت کے عوض اتنا کچھ دے دیا کہ مائی حلیمہؓ ہر لحاظ سے مسرور و شادماں ہو کر الوداع ہو گئیں۔(۳)

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۰۵، الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۱۵۸۔

(۲) سیرتِ ابن ہشام ج ۱، ص ۱۱۱، تاریخ طبری ج ۲، ص ۱۲۷۔

(۳) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۲۲۸۔

وفاتِ سیدہ آمنہ

حضرت عبداللہ کی وفات مدینہ طیبہ میں ہوئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد سیدہ آمنہ کو ان کی قبر پر جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ جب جانِ دو عالم ﷺ کی عمر چھ سال کے لگ بھگ ہوگئی اور آپ طویل سفر کے قابل ہوگئے تو سیدہ آمنہ نے آپ کو اور ام ایمن (۱) کو ساتھ لیا اور شوہر کے مزار پر حاضری دینے کے لئے مدینہ طیبہ روانہ ہوگئیں۔ (۲) کچھ مدت وہاں ٹھہرنے کا ارادہ تھا، مگر جانِ دو عالم ﷺ کے بارے میں یہودی نجومیوں اور قیافہ شناسوں کی بھانت بھانت کی بولیوں سے تنگ آ کر صرف ایک مہینہ بعد واپسی اختیار کر لی۔ کارے از قضا، راستے میں بیمار ہوگئیں اور جب ابواء نامی جگہ پر پہنچیں تو ان کا آخری وقت قریب آ گیا۔ وہ بہترین شاعرہ تھیں --- اپنے شوہر کی وفات پر ان کا شہکار مرثیہ پہلے گزر چکا ہے --- زندگی کے آخری لمحات میں انہوں نے اپنے پیارے بیٹے کو جو دل آویز نصیحت کی وہ بھی فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے سرہانے کھڑے لختِ جگر کے چہرے پر محبت بھری الوداعی نظر ڈالی اور کہا

---

(۱) ام ایمن حضرت عبداللہ کی لونڈی تھیں، ان کا اصلی نام برکہ تھا۔

(۲) اکثر مؤرخین، سیدہ آمنہ کے مدینہ طیبہ جانے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں سے ملنا چاہتی تھیں لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے، کیونکہ سیدہ آمنہ کی ذاتی طور پر مدینہ طیبہ میں کوئی رشتہ داری نہیں تھی --- عبدالمطلب کے ننہال کا تعلق مدینہ طیبہ سے ضرور تھا، مگر سسر کی ننہال بہت ہی دور کی رشتہ داری ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں۔

"رشتہ دور کا رشتہ تھا، قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے۔ میرے نزدیک بعض مؤرخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لئے گئی تھیں، جو مدینہ میں مدفون تھے۔" (سیرت النبی ج ۱، ص ۱۶۳)

ہمیں جناب شبلی کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے۔

بَارَکَ فِیکَ اللّٰہُ مِنْ غُلَام   یَا ابْنَ الَّذِیْ مِنْ حَوْمَۃِ الْحِمَام
نَجَا بِعَوْنِ الْمَلِکِ الْعَلَّام   فُوْدِیْ غَدَاۃَ الضَّرْبِ بِالسِّهَام
بِمِائَةٍ مِنْ اِبِلٍ سَوَام   اِنْ صَحَّ مَا اَبْصَرْتُ فِیْ الْمَنَام
فَاَنْتَ مَبْعُوْثٌ اِلَی الْاَنَام   مِنْ عِنْدِ ذِی الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام
فَاللّٰہَ اَنْهَاکَ عَنِ الْاَصْنَام   اَنْ لَّا تُوَالِیْهَا مَعَ الْاَقْوَام

(بیٹے! اللہ تمہیں برکت دے، تم اس عظیم انسان کے بیٹے ہو جو علم والے بادشاہ (خدا) کے فضلِ محض سے عظیم موت سے بچ گیا تھا، جب قرعہ اندازی میں اس کا نام نکل آیا تھا، پھر اس کے فدیہ میں سو اونٹ قربان کئے گئے تھے۔(۱) تمہارے بارے میں جو خواب میں نے دیکھے ہیں، اگر وہ سچے ہیں تو تم ذوالجلال والاکرام کی جانب سے دنیا کے لئے رسول بنائے جاؤ گے۔ اس لئے میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتی ہوں کہ کہیں لوگوں کی باتوں میں آ کر بتوں کے پاس جانا نہ شروع کر دینا!)

پھر کہنے لگیں---"کُلُّ حَیٍّ مَیِّتٌ وَاَنَا مَیِّتَةٌ وَذِکْرِیْ بَاقٍ"(۲)
(ہر جاندار نے مرنا ہے، میں بھی مرنے لگی ہوں، لیکن میری یاد ہمیشہ باقی رہے گی۔)
اسی طرح کی باتیں کرتے کرتے ان کی پاکیزہ روح زندانِ بدن سے آزاد ہوگئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن o

ابواء میں ان کی تدفین کے بعد ام ایمن، جانِ دو عالم ﷺ کو لے کر مکہ مکرمہ آئیں اور عبدالمطلب کو اس حادثہ فاجعہ سے مطلع کیا۔ عبدالمطلب کو انتہائی صدمہ ہوا--- ان کا جو پوتا ولادت سے پہلے ہی یتیم ہو چکا تھا، اب اتنی چھوٹی سی عمر میں ماں کی مامتا سے بھی محروم ہو گیا تھا--- یتیم و یسیر پوتے کو سینے سے لگا کر بے طرح رو پڑے وَرَقَّ عَلَیْهِ رِقَّةً لَمْ یَرِقَّهَا عَلٰی وُلْدِهٖ. (اور ان پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ کبھی اپنی حقیقی اولاد کے

(۱) ان واقعات کی تفصیل کے لئے سیدالوریٰ کے پہلے باب کا مطالعہ کیجئے۔
(۲) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۲۲۹، الزرقانی ج ۱، ص ۱۹۸۔

معاملے میں بھی ایسی رقت طاری نہ ہوئی تھی۔(۱)

عبدالمطلب کی کفالت

ماں باپ کی رحلت کے بعد جانِ دو عالم ﷺ مکمل طور پر اپنے دادا کی کفالت میں آگئے۔ دادا نے بھی شفقت و محبت کا حق ادا کر دیا اور آپ کو اتنا پیار دیا کہ ماں باپ کی کمی پوری کر دی۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ عبدالمطلب، جانِ دو عالم ﷺ کے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔ جب دستر خوان پر کھانا چن دیا جاتا تو عبدالمطلب حکم دیتے، عَلَیَّ بِابْنِیْ (میرے بیٹے کو میرے پاس لاؤ) آپ آتے تو کبھی ان کو پہلو میں بٹھا لیتے، کبھی ران پر۔ عمدہ عمدہ کھانے اٹھا کر ان کے سامنے رکھتے اور کھانے پر اصرار کرتے۔

شوخی پر پیار

لوگ جس حرکت کو شوخی سمجھتے تھے شفیق دادا کو پوتے کی اس حرکت پر بھی پیار آتا تھا۔

عبدالمطلب کے لئے دیوارِ کعبہ کے سائے میں بچھونا بچھایا جاتا۔ چونکہ عبدالمطلب قریش کے سردار تھے اسلئے احتراماً کوئی شخص بھی سردار کے بچھونے پر پاؤں نہیں رکھتا تھا، حتیٰ کہ حرب بن امیہ جیسے صاحبِ حیثیت لوگ بھی اس پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ لیکن جانِ دو عالم ﷺ جب بھی دادا کے پاس جاتے، بے دھڑک اس بچھونے پر چڑھ جاتے۔ عبدالمطلب کے بیٹے آپ کو کھینچ کر اتارنا چاہتے تو عبدالمطلب کہا کرتے "دَعُوْا اِبْنِیْ......" (میرے بیٹے کو اس کے حال پر چھوڑ دو، کیونکہ مجھے امید ہے کہ میرا یہ بیٹا اتنے بلند مقام پر فائز ہوگا کہ اس سے پہلے کوئی عرب اس مرتبے تک نہ پہنچا ہوگا۔) پھر آپ کو اپنے پہلو میں بٹھاتے اور آپ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکراتے جاتے۔(۲)

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۸۲.

(۲) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۲۰. البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۸۱.

سیرتِ ابنِ ہشام ج ۱، ص ۱۱۳.

حفاظت، احتیاط

جانِ دو عالم ﷺ کی دیکھ بھال میں ذراسی لاپرواہی بھی عبدالمطلب کے لئے ناقابل برداشت ہوتی۔

ام ایمنؓ کہتی ہیں کہ سیدہ آمنہ کی وفات کے بعد میں ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت کیا کرتی تھی۔ ایک دن میں ذراسی غافل ہوئی تو آپ باہر نکل گئے، ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ عبدالمطلب آپ کو ساتھ لئے ہوئے میرے پاس آ کھڑے ہوئے اور مجھ سے پوچھا

''تجھے پتہ ہے، میں نے اپنے بیٹے کو کہاں پایا؟''

''نہیں، حضور!'' میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''یہ اُدھر، بیری کے پاس بچوں کے ساتھ کھڑا تھا۔'' عبدالمطلب نے بتایا۔ پھر مجھے تنبیہ کی۔ ''لَا تَغْفَلِیْ عَنْ اِبْنِیْ...... '' (میرے بیٹے کے بارے میں آئندہ ایسی غفلت کا مظاہرہ نہ کرنا---! تجھے پتہ نہیں ہے کہ اہلِ کتاب کو اس کے نبی بن جانے کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کو کہیں ان کے ہاتھوں نقصان نہ پہنچ جائے۔'') (۱)

استسقاء

ایک دفعہ مکہ مکرمہ اور گردونواح میں قحط پڑ گیا۔ کھانے کے قابل ہر شئے ختم ہوگئی اور بھوکوں مرنے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ ایسے میں ہر شخص افسردہ وملول تھا۔ عبدالمطلب کی اہلیہ رقیقہ کہتی ہیں کہ ایک دن اسی پریشانی کے عالم میں میری آنکھ لگ گئی تو میں نے خواب میں ایک غیبی ندا سنی۔ (۲)

''یَا مَعْشَرَ قُرَیْشٍ! تمہارے اندر ایک ایسا لڑکا ہے جس کو عنقریب نبوت ملنے والی ہے۔ اسی کی برکت سے یہ قحط سالی دور ہو سکتی ہے اور رحمت کی گھٹا برس سکتی ہے۔ تم لوگ ایک ایسا بزرگ شخص تلاش کرو جو شریف النسب اور طویل قامت ہو، اس کا رنگ سفید

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۲۲، البدایہ والنہایہ ج ۱، ص ۲۸۲۔

(۲) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۲۳، ۱۲۴، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۲۳۹۔

ہو، ابرو گھنے ہوں اور بینی بلند ہو---وہ، اس کے بیٹے اور پوتے سب باہر نکلیں۔ اہلِ مکہ کی ہر شاخ سے بھی ایک ایک آدمی نکلے۔ سب لوگ غسل کریں، خوشبو لگائیں، بیت اللہ کا طواف کریں اور پھر سب ابوقبیس پہاڑ پر چڑھ جائیں۔ وہاں پر بزرگ شخص دعا کرے اور باقی سب افراد آمین کہیں---انشاء اللہ اس طرح خشک سالی دور ہو جائے گی۔"

رقیقہ نے جب یہ خواب بیان کیا تو لوگوں نے فی الفور کہا کہ یہ صفات و علامات تو صرف عبدالمطلب میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ سب نے ان سے دعا کے لئے التماس کی، جسے انہوں نے بخوشی منظور کر لیا۔

آخر ایک دن مقرر کیا گیا۔ اس دن خواب میں بتائے گئے طریقے پر سب تیار ہوئے۔ عبدالمطلب بھی اپنی تمام اولاد کو لے کر باہر آئے اور لوگوں کی قیادت کرتے ہوئے ابو قبیس کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاڈلا پوتا بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ پہاڑ پر پہنچ کر عبدالمطلب نے پوتے کو اپنے پاس کھڑا کیا اور جب ہاتھ اٹھا کر خداوندِ کریم سے بارانِ رحمت کا سوال کیا تو آمین کی روح پرور صدا سے جبل ابوقبیس گونج اٹھا۔ ابھی دعا جاری ہی تھی کہ بدلی اٹھی اور چھا گئی، پھر برس پڑی اور ایسی ٹوٹ کر برسی کہ جل تھل ہو گیا اور ندی نالوں میں طغیانی آ گئی۔

وفاتِ عبدالمطلب

جانِ دو عالم ﷺ کے والد ماجد تو آپ کی ولادت سے پہلے ہی چل بسے تھے، چھ سال کے ہوئے تو پیاری امی داغِ مفارقت دے گئیں، اس کے بعد ابھی دو ہی سال مزید گزرے تھے کہ محبتیں نچھاور کرنے والے دادا کا دستِ شفقت بھی اٹھ گیا۔

عبدالمطلب کی وفات کا عجیب قصہ ہے---ان کی چھ بیٹیاں تھیں، زبان آور اور فصیح اللسان۔

جب عبدالمطلب کو یقین ہو گیا کہ میری آخری گھڑی قریب آ گئی ہے تو انہوں نے اپنی تمام بیٹیوں کو بلایا۔ سب اکٹھی ہوئیں تو ان سے کہنے لگے

"میں جانتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد تم میرے مرثیے کہو گی مگر اس وقت میں تو نہ سن سکوں گا، اس لئے ابھی میرے سامنے کہہ دو تا کہ میں بھی سن لوں۔"

سخت حیرت ہوتی ہے ان خواتین کی قادر الکلامی پر، کہ انہوں نے بغیر کسی قسم کی تیاری کے، اسی وقت یکے بعد دیگرے چھ شہکار مرثیے کہہ ڈالے۔
آخری مرثیہ ختم ہوا تو اس وقت عبدالمطلب کی زبان بند ہو چکی تھی؛ تاہم انہوں نے سر ہلا کر اپنی پسندیدگی اور اطمینان کا اظہار کیا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں موندلیں۔(۱)

سوگ

اس دن مکہ والوں پر رنج و غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا کیونکہ ان کا محبوب سردار ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہو گیا تھا۔ عرب یوں تو بڑے دل گردے والے لوگ تھے مگر یہ صدمہ ایسا ہی جانکاہ تھا کہ سب کا رو رو کر بُرا حال ہو گیا۔
وَلَمْ يُبْکَ اَحَدٌ بَعْدَ مَوْتِهٖ مَابُكِيَ عَبْدُالْمُطَّلِبِ بَعْدَ مَوْتِهٖ وَلَمْ يَقُمْ لِمَوْتِهٖ بِمَكَّةَ سُوْقٌ اَيَّامًا كَثِيْرَةً. (۲)
(عبدالمطلب کے لئے جتنا لوگ روئے اتنا کبھی کسی شخص کے لئے نہیں روئے اور ان کے سوگ میں کئی دنوں تک مکہ میں کوئی بازار نہیں لگا۔)
جس ہستی کے فراق میں اغیار بھی غم سے نڈھال تھے---وَاللّٰهُ اَعْلَمُ---اس کی وفات سے اس کے لاڈلے پوتے کے ننھے سے دل پر کیا بیت رہی ہوگی---؟ وہ آٹھ برس کا معصوم بھی جنازے کے پیچھے چل رہا تھا اور روئے جا رہا تھا۔(۳)

ابو طالب کی کفالت

عبدالمطلب اپنی زندگی میں ہی ابو طالب کو وصیت کر گئے تھے کہ میرے بعد میرے

---

(۱) طبقاتِ ابنِ سعد ج ۱، ص ۷۵، سیرت ابنِ ہشام ج ۱، ص ۱۱۳، ابن ہشام نے تمام مرثیے بھی نقل کئے ہیں۔
(۲) السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۶، طبقاتِ ابنِ سعد ج ۱، ص ۷۵۔
(۳) السیرۃ الحلبیۃ ج ۱، ص ۱۲۵۔

پوتے کی پرورش اور دیکھ بھال تمہارے ذمہ ہوگی۔ ابو طالب اگرچہ تنگدست تھے؛ تاہم انہوں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی --- اور یوں جانِ دو عالم ﷺ ان کے ساتھ رہنے لگے۔

عبدالمطلب کی طرح ابو طالب بھی جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ والہانہ پیار کرتے تھے اور اپنی اولاد سے بھی زیادہ چاہتے تھے --- دراصل آپ تھے ہی ایسے من موہنے کہ ہر شخص کا دل بے اختیار آپ کی جانب کھنچا جاتا تھا۔ اس پر مستزاد آپ کی وہ برکات تھیں جن کا دم بدم مشاہدہ ہوتا رہتا تھا۔

مثلاً اگر آپ کھانے میں سب کے ساتھ شامل ہوتے تو تھوڑا سا کھانا سب کے لئے نہ صرف کافی ہوجاتا؛ بلکہ بچ بھی رہتا۔

اسی طرح دودھ کے جس کٹورے سے آپ چند گھونٹ نوش فرمالیتے، اس سے سب شکم سیر ہوجاتے، حالانکہ اس میں دودھ کی مقدار اتنی ہی ہوتی کہ بمشکل ایک آدمی کی ضرورت پوری کرسکے۔ (۱)

ایسے برکت بداماں بھتیجے سے ابو طالب جتنا بھی پیار کرتے، کم تھا۔

وقار و متانت

شوخی، شرارت اور ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ بچوں کی عادت ہوتی ہے۔ ابو طالب کے بچے بھی صبح جب ناشتے کے لئے بیٹھتے تو چھینا جھپٹی شروع کردیتے۔ جانِ دو عالم ﷺ چونکہ فطرتاً سنجیدہ اور باوقار تھے، اس لئے اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرتے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ آپ کا حصہ بھی عموماً دوسرے چٹ کرجاتے۔ ابو طالب کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے آپ کے لئے علیحدہ ناشتے کا انتظام کردیا۔ (۲)

چمک دار بال، سُرمگیں آنکھیں

بچے ہوں کہ بڑے، جب سو کر اٹھتے ہیں تو بال بکھرے ہوتے ہیں اور آنکھیں

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۸۲، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۲۸.

(۲) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۸۳، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۲۸.

غیر مصفیٰ۔ ابوطالب کے بچوں کا بھی صبح صبح یہی حال ہوتا تھا مگر جانِ دو عالم ﷺ کے بال قدرتی طور پر آراستہ اور چمک دار ہوتے اور آنکھوں میں ہلکا ہلکا سرمہ بھی لگا ہوتا۔(۱)

طلبِ باراں

رحمۃ للعالمین کے صدقے بارہا بارانِ رحمت نازل ہوئی ---عبدالمطلب کا واقعہ پہلے گزر چکا ہے، اس سے ملتا جلتا قصہ ابوطالب کا بھی ہے۔

ان دنوں بھی مکہ مکرمہ میں قحط پڑا ہوا تھا اور خشک سالی کی وجہ سے ہر شخص پریشان تھا۔ ایک محفل میں اسی سلسلے میں تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا اور اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی تدابیر سوچی جارہی تھیں۔ کسی نے لات وعزّیٰ کے روبرو فریاد کرنے کی تجویز پیش کی اور کسی نے منات کی خوشنودی حاصل کرنے پر زور دیا۔ مجلس میں ایک سمجھدار آدمی بھی بیٹھا تھا۔ لوگوں کی اس طرح کی باتیں سن کر کہنے لگا۔

''اَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ......؟ کیا فضول باتیں کر رہے ہو تم لوگ!! جب تمہارے درمیان ابراہیم واسمٰعیل کی اولاد سے ایک معزز آدمی موجود ہے تو پھر کسی اور کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

لوگ سمجھ گئے، کہنے لگے---''کَاَنَّکَ عَنَیْتَ اَبَا طَالِبٍ'' (شاید آپ کی مراد ابوطالب سے ہے۔)

''ہاں!'' سمجھدار شخص بولا ''میں انہی کا کہہ رہا ہوں۔''

اس رائے سے سب نے اتفاق کیا اور اسی وقت ابوطالب کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ ابوطالب باہر نکلے تو لوگوں نے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا

''ابوطالب! آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ کس زور کا قحط پڑا ہوا ہے اور ہمارے اہل وعیال کا کیا حال ہو رہا ہے---! براہ مہربانی آیئے اور ہمارے لئے خداوندِ عالم سے بارش طلب کیجئے!''

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۸۳، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۲۸ تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۲۰۴.

ابو طالب نے اپنے شمس و قمر بھتیجے کو ساتھ لیا اور دیوارِ کعبہ کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ چچا نے دعا کی، بھتیجے نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کچھ اشارہ کیا، اسی وقت ہر طرف سے بادل امنڈ آئے اور ارضِ مکہ کو سیراب کر گئے۔

ابو طالب اپنے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وَاَبْیَضُ یُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ

ثِمَالُ الْیَتَامٰی ، عِصْمَةٌ لِلْاَرَامِلِ

(وہ سفید رنگ والا، جس کے چہرے کے صدقے بارش برس جاتی ہے، یتیموں کا ملجا و ماوٰی اور بیواؤں کا محافظ ہے۔)(۱)

چشمۂ صحراء

جس ہستی کے طفیل آسمان سے گھٹائیں گہر بار ہو جائیں، اس کے صدقے اگر لق و دق صحراء میں چشمہ ابل پڑے تو کیا تعجب ہے!

ابو طالب بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اور میرا بھتیجا کہیں جا رہے تھے۔ جب ہم ذوالمجاز نامی جگہ پر پہنچے تو مجھے پیاس لگ گئی۔ پہلے تو صبر کرتا رہا مگر جب تشنگی برداشت سے باہر ہو گئی تو بھتیجے سے کہا

''یَا ابْنَ اَخِیْ! قَدْ عَطِشْتُ.'' (بھتیجے! مجھے پیاس لگ گئی ہے)

بھتیجا یہ سنتے ہی اپنی سواری سے اترا اور زیرِ لب کچھ پڑھتے ہوئے وہاں پڑے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری۔ پتھر اپنی جگہ سے ہٹا تو میری حیرت کی انتہاء نہ رہی --- جہاں سے پتھر ہٹا تھا، وہاں شفاف پانی کا چشمہ چمک رہا تھا۔

''پئیں، چچا جان!'' اس نے کہا۔

میں نے خوب جی بھر کر پی لیا تو اس نے پوچھا

''اَرَوِیْتَ؟'' (سیر ہو گئے ہیں؟)

---

(۱) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۲۰۳، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۲۹.

میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے پتھر سرکا کر پھر اپنی جگہ کر دیا---اب وہاں چشمہ تھا، نہ پانی۔(۱)

شام کا پہلا سفر

جانِ دو عالم ﷺ کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ تھی کہ ابو طالب قریش کے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جانِ دو عالم ﷺ کو ساتھ لے جانے کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ آپ کی عمر چھوٹی تھی اور سفر طویل و مشکل، لیکن جب قافلے کی روانگی کا وقت آیا تو آپ روتے ہوئے آئے اور ابو طالب کی اونٹنی کی مہار تھام کر بصد حسرت ویاس گویا ہوئے۔

"یَاعَمِّ! اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ---؟ لَا اَبَ لِیْ وَلَا اُمٌّ."

(چچا جان! مجھے کس کے حوالے کئے جا رہے ہیں---؟ نہ میرا باپ ہے، نہ ماں)

ابو طالب پر رقت طاری ہو گئی۔(۲) اشکوں کی برسات میں آپ نے اعلان کیا۔

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۳۰، الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۱۰۳، طبقاتِ ابنِ سعد ج ۱، ص ۹۸۔

(۲) ابو طالب نے ایک طویل نظم میں سفرِ شام کے واقعات بیان کئے ہیں۔ وہ اس منظر کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں

بَکٰی حُزْنًا وَالْعِیْسُ قَدْ فَصَلْتُ بِنَا

وَاَمْسَکْتُ بِالْکَفَّیْنِ فَضْلَ زِمَامِیْ

(جب کارواں روانہ ہونے لگا اور میں نے لٹکتی ہوئی مہار تھام لی تو وہ رو پڑا۔)

ذَکَرْتُ اَبَاہُ ثُمَّ رَقْرَقْتُ عَبْرَۃً

تَجُوْدُ مِنَ الْعَیْنَیْنِ ذَاتِ سِجَامٖ

(اس وقت مجھے اس کا باپ یاد آ گیا اور میری آنکھوں سے بھی مسلسل آنسو برسنے لگے۔)

(روض الانف ج ۱، ص ۱۲۰)

''میں اپنے بھتیجے کو ضرور ساتھ لے جاؤں گا اور آئندہ ہم ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ لَا یُفَارِقُنِیْ وَلَا اُفَارِقُهٗ اَبَدًا.''

چنانچہ آپ بھی چچا کے ہمسفر ہو گئے۔

خدا کے فضل سے سفر بخیریت گزر گیا اور قافلہ حدودِ شام میں واقع مشہور بستی بصریٰ کے پاس جا پہنچا۔ وہاں ایک گھنا پیڑ تھا جس کے سائے میں اکثر کارواں ٹھہرا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی ستانے کے لئے ادھر ہی چل پڑے۔ اس درخت کے قریب ہی گرجا تھا جس میں ایک راہب قیام پذیر تھا۔ اس کا اصل نام تو جرجیس تھا مگر مشہور بحیرا کے ساتھ تھا --- نہایت متقی و پرہیزگار اور پرانی کتابوں، روایتوں کا ماہر۔

اس کی نگاہ درخت کی طرف جاتے قافلے پر جو پڑی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی --- قافلے میں ایک بچہ تھا جس پر بادل کے ایک ٹکڑے نے مسلسل سایہ کر رکھا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ درخت کے پاس پہنچ کر جب لوگ سواریوں سے اترنے لگے تو وہ بچہ بھی اتر کر درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی بادل کا ٹکڑا تو درخت کے اوپر جا ٹھہرا اور درخت کی ٹہنیاں اس پر بے تابانہ جھک گئیں۔

یہ تعجب خیز مناظر دیکھ کر راہب گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے یاد آیا کہ ہماری قدیم کتابوں میں یہ علامت تو نبی آخرالزمان کی بتائی گئی ہے --- کیا یہ بچہ وہی آخری پیغمبر ہے؟ مگر اس نبی کی تو کچھ اور علامات بھی مذکور ہیں، کیا وہ سب اس میں موجود ہیں ---؟ کیوں نہ قافلے کی دعوت کی جائے اور جب وہ لوگ کھانا کھانے کے لئے آئیں تو بچے کا تفصیلی معائنہ کر لیا جائے۔

اس رائے پر اس کا دل جم گیا اور قافلے کو کھانے پر بلا لیا۔ اس بات سے اہل قافلہ کو بے حد تعجب ہوا۔ آخر ایک شخص نے پوچھ ہی لیا

''محترم! اس راستے سے تو ہم اکثر گزرتے رہتے ہیں اور یہاں قیام بھی کرتے رہتے ہیں مگر اس سے پہلے آپ کو کبھی ہماری دعوت کا خیال نہیں آیا --- اس دفعہ کیا خاص بات ہو گئی ہے؟''

''بات تو کوئی خاص نہیں'' راہب نے کہا ''بس، یونہی تمہاری ضیافت کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔''

قافلے والوں نے دعوت منظور کر لی اور وقت مقرر پر کھانے کے لئے چل پڑے۔ مگر یہ سوچ کر کہ بڑوں کی محفل میں بچوں کا کیا کام، جانِ دو عالم ﷺ کو وہیں چھوڑ گئے۔

سب اکٹھے ہو گئے تو راہب نے فرداً فرداً سب کے چہروں کو غور سے دیکھا مگر اس کو وہ چاند کا ٹکڑا کہیں نظر نہ آیا جس کے لئے اس نے سارا اہتمام کیا تھا۔

''کیا تمام مہمان آ گئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں! کوئی قابلِ ذکر آدمی پیچھے نہیں رہا؛ البتہ دس بارہ سال کا ایک لڑکا ہے جس کو ہم سامان کی دیکھ بھال کے لئے چھوڑ آئے ہیں۔'' ایک شخص نے بتایا۔

''اس کو بھی بلا کر اپنے ساتھ بٹھا لو!'' راہب نے مشورہ دیا ''یہ تو انتہائی معیوب بات ہے کہ باقی سب سیر ہو کر کھا لیں اور وہ محروم رہ جائے۔''

اسی وقت حارث اٹھے اور جانِ دو عالم ﷺ کو بلا لائے۔ راہب نے آپ کو دیکھا تو مطمئن ہو گیا اور کھانا شروع کر دیا گیا۔ کھانے کے بعد جب لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے، تو راہب آپ سے مخاطب ہوا۔

''بیٹا! تجھے لات وعزّٰی (۱) کی قسم......''

''مت نام لیں میرے سامنے لات وعزّٰی کا!'' آپ نے تڑپ کر راہب کی بات کاٹ دی ''خدا کی قسم! مجھے کسی چیز سے اتنی نفرت نہیں ہے جتنی ان دیویوں سے ہے۔''

''اچھا تجھے اللہ کی قسم! میں جو کچھ پوچھوں سچ سچ بتانا۔''

''پوچھئے! کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔'' اللہ کا نام سن کر آپ جواب دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

چنانچہ راہب نے آپ سے متعدد سوالات کئے اور آپ کے جوابات سے مطمئن

---

(۱) لات، منات اور عزّٰی، عرب کی تین مشہور دیویاں تھیں۔

ہوگیا۔ پھر آپ کی پشت اقدس کے بالائی حصہ پر مہر نبوت (۱) کو بغور دیکھا اور اسے چوم لیا۔ پھر ابو طالب سے استفسار کیا۔

''یہ بچہ آپ کا کیا ہے؟''

''بیٹا ہے میرا۔'' (۲) ابو طالب نے جواب دیا۔

''نہیں'' راہب بولا ''یہ آپ کا بیٹا نہیں ہے۔ اس کا باپ زندہ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''ٹھیک ہے --- میرا بھتیجا ہے۔'' ابو طالب کو حقیقت بیان کرنی ہی پڑی۔

''اس کے باپ کی وفات کو کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟''

''وہ تو اسی دوران چل بسا تھا، جب کہ یہ شکمِ مادر میں تھا۔''

''اس کی ماں موجود ہے؟''

''نہیں --- وہ بھی چند سال پہلے انتقال کرگئی ہے۔''

اپنا اطمینان کر لینے کے بعد راہب گویا ہوا --- ''بلاشبہ آپ سچ کہہ رہے ہیں اور میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس کو یہودیوں سے بچا کر رکھئے، کیونکہ یہودی حاسد لوگ ہیں اور اگر انہیں ان علامات کا پتہ چل گیا جو مجھے معلوم ہوئی ہیں تو وہ ضرور اس کو قتل کرنے کی کوشش کریں گے --- یہ میری مخلصانہ نصیحت ہے --- کیونکہ ہمیں پرانی کتابوں اور آباء و اجداد سے جو روایات معلوم ہوئی ہیں، ان کی رو سے یہ لڑکا بہت بڑی شان والا ہوگا۔''

ابو طالب نے یہ پُر خلوص نصیحت پلے باندھ لی --- اس کے بعد دور کے سفر پر کبھی جانِ دو عالم ﷺ کو ساتھ لے کر نہیں گئے۔ (۳)

---

(۱) ''مہر نبوت'' کی تفصیل جلد سوم، باب شمائل میں آئے گی۔

(۲) قدیم کتابوں میں آخری نبی کی ایک علامت یہ بھی مذکور تھی کہ وہ یتیم ہوگا۔ چونکہ حاسد یہودی اس آخری اسمٰعیلی نبی کو قتل کرنے کے درپے تھے، اس لئے ابو طالب جانِ دو عالم ﷺ کو اپنا بیٹا ظاہر کرتے تھے تاکہ بدباطن یہودی اس طرف متوجہ نہ ہوں۔

(۳) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۸۳، ابن ہشام ج ۱، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔

فطرتی طہارت، غیبی حفاظت

بحیرا کی زبانی لات وعزّیٰ کے نام سن کر جانِ دو عالم ﷺ نے جس شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو فطرتاً شرکیہ اعمال وعقائد سے نفرت تھی۔(۱) علاوہ

طبقاتِ ابن سعد ج ۱، ص ۹۹، ۱۰۰۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا --- بحیرا کے ساتھ جانِ دو عالم ﷺ کی ملاقات کیا ہوگئی کہ مستشرقین کے گھر گھی کے چراغ جل اٹھے اور عیسائی بزرجمہر یہ ثابت کرنے میں جت گئے کہ محمد ﷺ کو مذہب اور دین کے بنیادی اسرار ورموز بحیرا نے ہی سکھائے تھے اور اسی کے تعلیم کردہ عقاید ونظریات کے خاکے میں رنگ آمیزی کر کے آپ نے اسلام کے نام سے ایک نیا دین پیش کر دیا۔

مقصد اس ساری کاوش کا یہ باور کرانا ہے کہ اسلام کوئی مستقل خدائی دین نہیں؛ بلکہ عیسائیت کا چربہ ہے، جسے محمد ﷺ کے اخاذ دماغ نے بحیرا کی تعلیمات سے تیار کیا۔

مستشرقین کے ان خیالات کی تردید کے لئے بعض محققین نے اس واقعہ کی صحت ہی سے انکار کر دیا ہے، حالانکہ مستشرقین کی خوش فہمی دور کرنے کے لئے تو قاضی سلیمان منصور پوری کا یہ دلچسپ اور لاجواب سوال ہی کافی ہے۔

''میں کہتا ہوں، اگر آنحضرت ﷺ نے تثلیث اور کفارہ کا رد، مسیح کے صلیب پر جان دینے کا بطلان، اس راہب کی تعلیم ہی سے کیا تھا، تو اب عیسائی اپنے اس بزرگ کی تعلیم کو قبول کیوں نہیں کرتے؟''

(رحمۃ للعالمین ج ۱، ص ۴۵)

(۱) اس خداداد پاکیزگی کو نبوت ملنے کے بعد جانِ دو عالم ﷺ نے ان زریں الفاظ میں بیان فرمایا۔

''مَازِلْتُ اَعْرِفُ اَنَّ الَّذِیْ هُمْ عَلَیْهِ کُفْرٌ وَمَا کُنْتُ اَدْرِیْ مَا الْکِتَابُ وَلَا الْاِیْمَانُ'' (سیرتِ حلبیہ ج ۱، ص ۱۳۸)

(میں شروع سے جانتا تھا کہ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ کفر ہے۔ حالانکہ اس وقت مجھے نہ کتاب کا علم تھا، نہ ایمان کا۔)

اُمّی آقا ﷺ کی اس ''لاعلمی'' پر لاکھوں علوم قربان!

ازیں چونکہ اللہ تعالیٰ آپ کے دامن کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھنا چاہتا تھا --- تا کہ کل کلاں کسی کو آپ کے کردار پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ مل سکے --- اس لئے اگر آپ بڑوں کے کہنے سننے اور مجبور کرنے پر کسی بت کے پاس چلے بھی جاتے تو غیبی آواز آپ کو متنبہ اور خبر دار کر دیتی۔

اُمِ ایمن بیان کرتی ہیں کہ دیگر بہت سے اصنام کے علاوہ بُوانَہ نام کا ایک بت بھی قریش کا مرکز عقیدت تھا۔ سال میں ایک دفعہ اس کے استھان پر حاضر ہو کر قربانی پیش کیا کرتے تھے اور رات تک اس کے پاس اعتکاف بیٹھا کرتے تھے۔

ابو طالب بھی سب کے ساتھ اس تقریب میں شامل ہوا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بھتیجا بھی شریک ہوا کرے۔ کئی دفعہ جانِ دو عالم ﷺ کو کہا بھی، مگر آپ نے سنی ان سنی کر دی۔ آخر ایک دفعہ ابو طالب بہت ناراض ہوئے۔ پھوپھیوں نے بھی سخت سست کہا --- ان کے خیال میں بھتیجا "بے دین" ہوتا جا رہا تھا --- سب نے سختی سے باز پرس کرتے ہوئے کہا۔

"آخر تمہیں اپنی قوم سے کیا ضد ہے کہ نہ تو ان کے ساتھ کسی میلے میں شریک ہوتے ہو، نہ کسی اجتماع میں ---؟ اگر تم نے اپنا یہی رویہ برقرار رکھا تو ہمارے خداؤں کی طرف سے تم پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی۔"

چچاؤں اور پھوپھیوں کو یوں ناراض ہوتے دیکھ کر آپ بادلِ ناخواستہ ابو طالب کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

جانے کو تو چلے گئے، مگر جلد ہی لرزتے کانپتے واپس آ گئے۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر پھوپھیاں خوفزدہ ہو گئیں اور پوچھنے لگیں۔

"مَا الَّذِیْ دَھَاکَ؟" (کیوں اتنے دہشت زدہ ہو رہے ہو؟)

"شاید مجھ پر کسی آسیب وغیرہ کا سایہ ہو گیا ہے۔" آپ الجھن آمیز لہجے میں بولے

"نہیں نہیں" سب نے کہا "تم پر آسیب کا اثر کس طرح ہو سکتا ہے؟ تم تو بہت اچھے انسان ہو --- یہ شبہ تمہیں کیونکر ہوا؟"

''اس بنا پر'' آپ نے اپنے شبہے اور خوف کی وجہ بیان کی ''کہ میں جب بھی بت کے قریب جانے کی کوشش کرتا تھا، ایک سفید چہرے والی طویل قامت ہستی نمودار ہو کر چیخ پڑتی تھی

''وَرَاءَ کَ یَا مُحَمَّدُ! لَا تَمَسَّہ'' (پیچھے ہٹئے یا محمد! اسے مت ہاتھ لگایئے)

اس روایت کی راوی اُمِ ایمن فرماتی ہیں کہ اس واقعہ کے بعد آپ نے کبھی کسی مشرکانہ تقریب میں شرکت نہیں کی۔ (۱)

گانے کی محفل میں

شرک تو خیر ہے ہی بڑی چیز، جانِ دو عالم ﷺ کو تو باری تعالیٰ نے چھوٹی موٹی لغزشوں سے بھی محفوظ رکھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک دن داستان گوئی کی محفل (۲) میں شمولیت کو میرا جی چاہا۔ میں ادھر روانہ ہوا تو چلتے چلتے میرے کانوں میں گانے بجانے کی آواز پڑی۔ میں نے پوچھا کہ یہ آواز کیسی ہے؟ تو مجھے بتایا گیا کہ فلاں شخص کی شادی کی تقریب ہے۔ میں نے بزمِ داستان گوئی میں شمولیت کا ارادہ ترک کیا اور محفل موسیقی میں شرکت کے لئے چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نیند نے آلیا اور میں وہیں پر سو گیا، پھر دن چڑھے آنکھ کھلی۔ دوسرے دن پھر گانا سننے کے لئے گیا تو پھر وہی معاملہ پیش آیا --- ان دو مواقع کے علاوہ میرے دل میں کبھی ایسی خواہش ہی پیدا نہیں ہوئی --- یوں مجھے اللہ تعالیٰ نے نبوت

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۳۶، طبقات ابنِ سعد ج ۱، ص ۱۰۳، الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۱۰۹.

(۲) داستان سرائی کی محفلیں اُس دور کی عرب ثقافت کا لازمی جزو تھیں۔ کام کاج سے فارغ ہو کر رات کو لوگ چوپال میں جمع ہو جاتے اور کسی داستان گو سے کہانی سنانے کی فرمائش کرتے۔ داستان گو طویل کہانی چھیڑ دیتا جو عموماً قسط وار ہوا کرتی اور جب ایسے موڑ پر پہنچتی جہاں سامعین آئندہ کا حال ☜

ملنے تک جاہلیت کی قباحتوں سے بچائے رکھا۔(۱)

گلہ بانی

جب جانِ دو عالم ﷺ مائی حلیمہؓ کے پاس تھے تو رضاعی بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرانے جایا کرتے تھے۔ پھر جب آپ تقریباً بارہ تیرہ برس کے ہوئے تو اس وقت مکہ مکرمہ میں بکریاں چرایا کرتے تھے۔

آپ کے علاوہ دیگر انبیاء علیہم السلام نے بھی بکریاں چرائی ہیں۔ کلیم اللہ علیہ السلام کی شبانی کا تذکرہ تو کلامِ الٰہی میں موجود ہے اور باقی انبیاء کے بارے میں جانِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے۔

''مَا بَعَثَ اللّٰہُ نَبِیًّا اِلَّا رَعَی الْغَنَمَ.'' (اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا نبی نہیں بھیجا، جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔)

صحابہ کرامؓ نے عرض کی۔ ''وَاَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ !؟'' (کیا آپ نے بھی یارسول اللہ!؟)

فرمایا ''نَعَمْ وَاَنَا رَعَیْتُھَا عَلٰی قَرَارِیْطَ لِاَھْلِ مَکَّۃَ.'' (ہاں میں بھی قراریط کے عوض اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔(۲)

جاننے کے لئے مضطرب اور بے قرار ہوتے، تو داستان گو ''باقی آئندہ'' کہہ کر خاموش ہو جاتا اور لوگ یہ جاننے کے لئے کہ پھر کیا ہوا؟ دوسری رات پھر اکٹھے ہو جاتے۔

(۱) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۳۶، البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۸۸.

(۲) قَرَارِیْط، قِیْرَاط کی جمع ہے۔ آج کل تو ۲۰۰ ملی گرام وزن کو قیراط کہتے ہیں، اس دور میں غالباً دینار کا ۲۴/۱ قیراط کہلاتا تھا۔

علامہ ابراہیم حربی نے کہا ہے کہ قراریط مکہ مکرمہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ اس لحاظ سے حدیث کا معنی یہ ہوگا کہ میں قراریط نامی جگہ پر اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔

علامہ عینیؒ اور ابن جوزیؒ کو یہی رائے پسند ہے اور جناب شبلیؒ کا جھکاؤ بھی اسی طرف ☜

حضرت جابرؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم پیلو کے درخت سے پھل توڑ رہے تھے تو جانِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا

''عَلَیْکُمْ بِالْاَسْوَدِ........'' (کالے کالے دیکھ کر توڑو، وہ زیادہ خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ یہ میرا اس زمانے کا تجربہ ہے، جب میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔)

''آپ بھی چرایا کرتے تھے یارسول اللہ!؟'' ہم نے حیرت سے پوچھا

''ایک میں ہی کیا!'' آپ نے جواب دیا ''تمام انبیاء چراتے رہے ہیں۔'' (۱)

حربُ الفجار

جب جانِ دو عالم ﷺ ۱۴ سال کے ہوئے تو جنگ فجار کا واقعہ پیش آیا اور قریش و قیس کے درمیان معرکے کا رن پڑا۔ چار یا چھ دن تک زور شور سے لڑائی ہوتی رہی، بالآخر عتبہ کی کوششوں سے صلح ہوگئی اور جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔

چونکہ اس معرکے میں جانِ دو عالم ﷺ کے چچا زبیر، بنی ہاشم کے علمبردار تھے اور زبیر کے دیگر بھائی بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اس لئے آپ کو بھی اپنے چچاؤں کے ساتھ میدان کارزار میں جانا پڑتا؛ تاہم آپ نے بذاتِ خود اس لڑائی میں کوئی

معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمارے خیال میں قراریط قیراط ہی کی جمع ہے کیونکہ مکہ کے آس پاس قراریط نام کی کوئی جگہ نہ پہلے کبھی تھی، نہ اب ہے۔ مکہ مکرمہ کے قدیم وجدید جغرافیے اور تاریخیں اس کے ذکر سے یکسر خالی ہیں۔

علاوہ ازیں امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الاجارہ میں ذکر کیا ہے اور ابن ماجہ نے اس روایت کے بعد اپنے استاذ کی یہ تشریح بھی نقل کی ہے۔ یَعْنِیْ کُلُّ شَاۃٍ بِقِیْرَاطٍ. (یعنی فی بکری ایک قیراط) ابن ماجه ص ۱۵٦

جب اس حدیث کو روایت کرنے والے محدثین اس کو اجارہ میں درج کر رہے ہیں اور صراحۃً بتا رہے ہیں کہ قراریط، قیراط کی جمع ہے تو پھر قراریط نام کی کوئی جگہ اختراع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

(۱) طبقات ابن سعد ج ۱، ص ۸۰، السیرة الحلبیة ج ۱، ص ۱۴۱.

حصہ نہیں لیا۔(۱)

تعجب خیز بات یہ تھی کہ جب آپ میدان میں تشریف لے جاتے، قریش غالب آنے لگتے اور جب آپ واپس چلے جاتے تو فریق مخالف کا دباؤ بڑھ جاتا۔ یہ صورت حال دیکھ کر سب نے آپ سے کہا لَا تَغِبْ عَنَّا. (ہمیں چھوڑ کے نہ جایا کرو) چنانچہ ان کی خواہش کے مطابق آپ وہیں ٹھہرے رہتے، تا آنکہ صلح ہوگئی۔(۲)

حلف الفضول

جنگِ فجار کے بعد جب حالات معمول پر آگئے تو ایک دن زبید قبیلہ کا ایک فرد باہر

---

(۱) جانِ دو عالم ﷺ نے اس جنگ میں بہ نفس نفیس حصہ کیوں نہیں لیا---؟ علامہ سہیلی نے روض الانف میں اس کی جو وجہ بیان کی ہے، اس سے ایمان تازہ ہوجاتا ہے لیکن روض الانف سے نقل کرنے کی بہ نسبت جناب شبلی کی سیرت النبی سے اقتباس پیش کرنا زیادہ لطف دے گا۔ وہ لکھتے ہیں۔

''چونکہ قریش اس جنگ میں برسرِ حق تھے اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بھی شرکت فرمائی۔ لیکن جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے، آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ امام سہیلی نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود جنگ نہیں کی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

وَاِنَّمَا لَمْ يُقَاتِلْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَعَ اَعْمَامِهٖ فِي الْفِجَارِ وَقَدْ بَلَغَ سِنَّ الْقِتَالِ لِاَنَّهَا كَانَتْ حَرْبَ فِجَارٍ وَكَانُوْا اَيْضًا كُلُّهُمْ كُفَّارًا وَلَمْ يَاْذَنِ اللهُ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يُقَاتِلَ اِلَّا لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَاء

(اور آپ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی حالانکہ آپ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی۔ نیز یہ وجہ تھی کہ فریقین کافر تھے اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم صرف اس لئے خدا نے دیا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔'' (سیرت النبی ج ۱، ص ۱۷۰)

ثابت ہوا کہ جانِ دو عالم ﷺ منصب نبوت پر فائز ہونے سے پہلے بھی وہی کام کیا کرتے تھے، جن کا حکم بعد میں مسلمانوں کو دیا گیا۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

(۲) السیرة الحلبیه ج ۱، ص ۱۴۲، الآثار المحمدیه ص ۱۱۲.

سے کچھ سامان لے کر آیا اور مکہ مکرمہ کے ایک نہایت با اثر اور طاقتور سردار عاص ابن وائل کے ہاتھ فروخت کیا۔ عاص نے سامان تو لے لیا مگر قیمت ادا کرنے سے مکر گیا۔ زبیدی بے یار و مددگار آدمی تھا، بے چارے نے متعدد افراد کو اپنا دکھڑا سنایا اور مدد کی درخواست کی مگر عاص جیسے مقتدر سردار کے مقابلے میں اس کی حمایت پر کوئی بھی آمادہ نہ ہوا۔ ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو طلوع آفتاب کے وقت کوہ ابوقبیس پر چڑھ کر چیخنے لگا۔

یَاآلَ فَهرٍ! لِمَظْلُومٍ بِضَاعَتُه'

بِبَطْنِ مَكَّةَ نَائِي الدَّارِ وَالنَّفَرِ

(اے خاندانِ فہر! (۱) تمہیں ایک مظلوم مدد کے لئے پکار رہا ہے۔ جس کا سازو سامان مکہ میں چھین لیا گیا ہے اور جس کا گھر اور گروہ یہاں سے دور ہے۔)

یہ دردناک صدا صحنِ حرم میں پہنچی تو جانِ دو عالم ﷺ کے چچا زبیر اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔ بنی ہاشم، بنی زہرہ اور بنی اسد قبائل کے متعدد سرکردہ افراد بھی ان کے ہمراہ ہوگئے۔ یہ سب لوگ عبداللہ ابن جدعان کے گھر اکٹھے ہوئے اور قسم اٹھا کر عہد کیا کہ آئندہ ہم سب مل کر مظلوم کی امداد کیا کریں گے، خواہ وہ کسی معمولی خاندان کا فرد ہو یا معزز خاندان کا۔ مَابَلَّ بَحْرٌ صُوفَةً وَّرَسَاحَرَاءُ وَثُبَيْرٌ مَكَا نَيهِمَا. جب تک دریا کا پانی اون کو تر کرتا رہے گا اور کوہِ حراء وثبیر اپنی جگہ کھڑے رہیں گے۔ (یعنی تا ابد)

یہی معاہدہ بعد میں حلف الفضول (۲) کے نام سے مشہور ہوا۔

عہد و پیمان کے بعد سب اٹھ کر عاص کے پاس گئے اور وہ مال و متاع جو اس نے ہتھیا لیا تھا، اس سے لے کر زبیدی کے حوالے کر دیا۔ اتنے معزز آدمیوں کے سامنے عاص کو

---

(۱) فہر، قریش کے جدِ امجد تھے۔

(۲) علامہ سہیلی نے مسند حارث ابن اسامہ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معاہدے کا نام حلف الفضول اس لئے پڑا کہ اس میں یہ الفاظ شامل تھے --- "تَرُدُّ الْفُضُوْلَ عَلٰی اَهْلِهَا (فاضل چیزیں ان کو لوٹائی جائیں گی جو ان کے مستحق ہوں گے)

روض الانف، ج ۱، ص ۹۱

اس عہد کے سب شرکاء یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو گئے مگر یہ حلف مدتوں تک نصرتِ مظلوم کی علامت بنا رہا۔ جب کوئی شخص ہر طرف سے ناامید ہو جاتا تو وہ حلف الفضول کے نام کی دہائی ☜

بولنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔(۱)

آپ سوچ رہے ہوں گے قارئین کرام! کہ اس سارے واقعہ کا سیرتِ جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ تو عرض یہ ہے کہ بہت گہرا تعلق ہے، کیونکہ جن لوگوں نے مظلوم کی نصرت وحمایت کا حلف اٹھایا تھا، ان میں جانِ دو عالم ﷺ بھی بہ نفس نفیس شامل تھے اور آپ کو اس معاہدے کی حرمت کا اتنا پاس تھا کہ آپ زمانۂ نبوت میں فرمایا کرتے تھے۔

''لَوْ دُعِيْتُ بِهٖ لَاَجَبْتُ'' (اگر مجھے آج بھی اس معاہدے کے نام پر مدد کے لئے بلایا جائے تو میں اس پکار پر لبیک کہوں گا۔)(۲)

شام کا دوسرا سفر

جانِ دو عالم ﷺ پچیس سال کی عمر میں دوبارہ شام تشریف لے گئے۔

اس سفر کی ضرورت یوں پیش آئی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام جانے کے لئے تیار ہوا۔ ابو طالب یوں بھی قلیل المال تھے مگر ان دنوں کچھ زیادہ ہی ہاتھ تنگ تھا،

دیتا اور اسی وقت اس کی حمایت میں شمشیریں بے نیام ہو جاتیں۔

حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ان کا بھتیجا ولید، مدینہ منورہ کا حاکم تھا۔ اس کا امام حسنؓ کے ساتھ ایک مالی معاملے میں اختلاف ہو گیا۔ مال امام حسنؓ کا تھا، مگر ولید نے اپنی حاکمانہ حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر قبضہ جما لیا تھا۔ امام حسنؓ کو اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے ولید سے کہا۔

''تمہیں میرے ساتھ انصاف کرنا پڑے گا، ورنہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اپنی تلوار لے کر مسجد نبوی میں کھڑا ہو جاؤں گا اور حلف الفضول کے نام پر لوگوں کو امداد کے لئے پکار لوں گا۔''

ولید کی محفل میں اس وقت عبداللہ بن زبیرؓ بھی موجود تھے۔ انہوں نے امام حسنؓ کی یہ بات سنتے ہی ولید کے سامنے اعلان کر دیا۔

''اور میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ اگر حسن نے حلف الفضول کے نام پر آواز دی تو اپنی تلوار لے کر اس کی حمایت میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ پھر یا تو حسن کے ساتھ انصاف ہو گا، یا ہم سب لڑتے ہوئے جان دے دیں گے۔''

عبداللہ بن زبیرؓ کے علاوہ بھی جس کسی نے یہ بات سنی، اس نے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔ ولید نے یہ صورت حال دیکھی تو اسی وقت امام حسن کا حق انہیں لوٹا دیا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۹۳)

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۹۱، ۲۹۲، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۱۴۶۔

(۲) طبقات ابن سعد ج ۱، ص ۸۲۔

اس لئے جانِ دو عالم ﷺ سے کہنے لگے۔

''بھتیجے! میں تنگدست آدمی ہوں، خصوصاً یہ دور شدید مشکل کا ہے۔ مسلسل کئی سال سے میری مالی حالت دگرگوں ہے۔ کسی طرف سے امداد و تعاون کی بھی امید نہیں اور آمدن کا بھی کوئی معقول ذریعہ نہیں۔

اتفاق سے تمہاری قوم کے کچھ افراد بغرض تجارت شام جانے کے لئے تیار ہیں۔ خدیجہ بنت خویلد کا معمول ہے کہ جب قافلہ روانہ ہوتا ہے تو وہ بھی کسی نہ کسی آدمی کو تجارتی سامان دے کر بھیجتی ہے اور اس کے عوض معقول معاوضہ ادا کرتی ہے۔ اگر تم آمادہ ہو تو اس سے بات کی جائے۔ وہ کسی اور کو بھیجنے کی بہ نسبت تمہیں بھیجنا زیادہ پسند کرے گی کیونکہ اس کو تمہاری طہارت اور پاکیزگی کا اچھی طرح علم ہے۔

بھتیجے---! اگرچہ تمہیں شام بھیجتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہودی تمہیں کوئی گزند نہ پہنچائیں مگر کیا کروں، مجبور ہوں۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''ہوسکتا ہے وہ خود ہی اس سلسلے میں رابطہ قائم کرلے۔''(۱)

مگر ابوطالب کو خطرہ تھا کہ خدیجہ طاہرہ کسی اور کو اس کام کے لئے نہ منتخب کرلیں، اس لئے خود ہی جا کر ان سے بات چیت کی اور انہیں بتایا کہ بغرض تجارت بھیجنے کے لئے اگر کسی آدمی کی تلاش ہو تو میرا بھتیجا اس کام کے لئے آمادہ ہے؛ البتہ میں نے سنا ہے کہ اس سے پہلے فلاں آدمی کو اس کام کے عوض صرف دو اونٹ دیئے گئے تھے۔ اگر محمد کو چار دینے کا وعدہ کیا جائے تو میں اسے بھیج دونگا۔

اس نصیبہ ور خاتون کو اور کیا چاہئے تھا، جانِ دو عالم ﷺ جیسا امین ان کے لئے تجارت کرنے پر رضامند تھا۔ چنانچہ انہوں نے کہا

''ابوطالب! یہ مطالبہ تو آپ نے ایک قریبی اور پسندیدہ شخصیت کے لئے کیا

---

(۱) الزرقانی ج ۱، ص ۲۳۸، السیرۃ الحلبیۃ ج ۱، ص ۱۴۷.

ہے، حالانکہ آپ اگر کسی ناپسندیدہ اجنبی کے لئے یہ مطالبہ کرتے تو میں پھر بھی آپ کی بات نہ ٹالتی۔"(۱)

معاملہ طے ہوگیا اور جب جانِ دو عالم ﷺ قافلے کے ہمراہ روانہ ہونے لگے تو خدیجہ طاہرہ نے اپنا ایک غلام میسرہ بھی خدمت گزاری کے لئے ساتھ کردیا، تاکہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

دو اونٹوں کی سُستی اور چُستی

سفر کے دوران ایک دن خدیجہ طاہرہ کے دو اونٹ تھک کر سست ہوگئے اور قافلے کی رفتار کا ساتھ دینے کے قابل نہ رہے اس وقت جانِ دو عالم ﷺ قافلے کے اگلے حصے میں تھے۔ میسرہ نے آگے بڑھ کر آپ کو مطلع کیا کہ دو اونٹ ناکارہ ہوتے جارہے ہیں اور خطرہ ہے کہ کہیں پیچھے نہ رہ جائیں۔

آپ نے پیچھے آکر سست ہوجانے والے اونٹوں کی ٹانگوں پر اپنا دستِ مبارک پھیرا تو ان کی سستی یکلخت کافور ہوگئی اور وہ تمام اونٹوں سے زیادہ تیز رفتار ہوگئے۔(۲)

نسطورا راہب

مشہور نصرانی راہب نسطورا کے گرجے کے پاس قافلے نے پڑاؤ کیا تو جانِ دو عالم ﷺ ایک درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ نسطورا نے آپ کو وہاں بیٹھے دیکھا تو میسرہ کو بلایا۔ چونکہ میسرہ اس راستے پر اکثر سفر کرتا رہتا تھا، اس لئے نسطورا اس سے متعارف تھا۔ میسرہ اس کے پاس گیا تو اس نے پوچھا کہ وہ درخت کے نیچے جو شخص بیٹھے ہیں وہ کون ہیں؟

"خاندانِ قریش کے ایک فرد ہیں۔" میسرہ نے جواب دیا۔

"کیا ان کی آنکھوں میں سرخی رہتی ہے؟"

"ہاں! ہمہ وقت۔" میسرہ نے جواب دیا۔

---

(۱) السیرة الحلبیة ج ۱، ص ۱۵۰، طبقاتِ ابنِ سعد ج ۱، ص ۸۳.

(۲) السیرة الحلبیه ج ۱، ص ۱۵۰، الآثار المحمدیه ص ۱۲۰.

''بلاشبہ یہ وہی ہیں --- آخر الانبیاء۔ ہمیں عیسیٰ علیہ السلام نے بتا رکھا ہے کہ ایک دن اس درخت کے نیچے ایک نبی آ کر بیٹھیں گے۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب یہ نبوت سے سرفراز ہوں گے۔(۱)

پھر نسطورا آپ کے پاس آیا اور قدم بوس ہوا، پھر مہر نبوت کو چوما اور کہا، اَشْهَدُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللهِ النَّبِیُّ الْاُمِّیُّ الَّذِیْ بَشَّرَ بِهٖ عِیْسٰی علیہ السلام.

(میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، وہ نبی امی، جس کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام دے کر گئے ہیں۔)(۲)

منافع

بصریٰ کے بازار میں جانِ دوعالم ﷺ نے ساتھ لائے ہوئے سامان کو فروخت کیا۔ اس سودے میں اتنا منافع ہوا کہ میسرہ حیران رہ گیا اور کہنے لگا

''میں مدت سے اپنی مالکہ کے لئے تجارت کر رہا ہوں مگر اتنا نفع ہمیں آج تک نہیں ہوا۔(۳)

واپسی

اس تجارتی سفر سے جانِ دوعالم ﷺ کامیاب و کامران لوٹے۔ واپس آ کر میسرہ نے سفر کے دوران پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات اپنی مالکہ کے گوش گزار کئے تو وہ بہت متاثر ہوئیں اور آپ کی خدمت میں طے شدہ معاوضے سے دگنا پیش کیا۔(۴)

اسی دوران آپ کی شادی سیدہ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوئی جس کے تفصیلی حالات جلد سوم، باب ''ازواج مطہرات'' میں آ رہے ہیں۔

---

(۱) الزرقانی، ج ۱، ص ۲۳۹، طبقاتِ ابنِ سعد، ج ۱، ص ۱۰۱.

(۲) السیرۃ الحلبیۃ، ج ۱، ص ۱۴۸، الزرقانی، ص ۲۳۹.

(۳) السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۱۵۰.

(۴) الزرقانی، ج ۱، ص ۲۴۰، طبقاتِ ابنِ سعد، ج ۱، ص ۱۰۲.

کعبہ کی تعمیرِ نو

جانِ دو عالم ﷺ پینتیس برس کے تھے جب قریش نے کعبۃ اللہ کی تعمیرِ نو کا ارادہ کیا کیونکہ دو حادثوں کی وجہ سے کعبہ کی دیواروں میں دراڑیں پڑگئی تھیں۔

ایک دفعہ کوئی عورت کعبہ کو خوشبودار دھونی دے رہی تھی کہ ایک چنگاری نے آگ بھڑکا دی جس کو بجھاتے بجھاتے بھی خاصا نقصان ہوگیا۔

ایک بار وہ بند ٹوٹ گیا جو مکہ مکرمہ کو سیلابی ریلے سے بچانے کے لئے بنایا گیا تھا اور صحن حرم میں پانی بھر گیا، جس کی وجہ سے دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔

علاوہ ازیں اس وقت تک کعبہ کی چھت نہیں تھی، صرف چار دیواری تھی اور قریش چاہتے تھے کہ اس پر چھت بھی ڈالی جائے۔

ان وجوہات کی بناء پر کعبہ کو ازسرِ نو تعمیر کرنے کا پروگرام بن گیا۔

حسنِ اتفاق سے انہی دنوں ایک بحری جہاز ساحل جدہ کے قریب طوفان میں گھر کر ٹوٹ پھوٹ گیا اور اس کا ملبہ ساحل کے ساتھ آلگا۔ قریش نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ولید بن مغیرہ نے جا کر اس کے تختے اور دیگر کارآمد سامان خرید لیا۔

جہاز کے عملے میں باقوم نامی ایک رومی معمار بھی تھا۔ ولید اس کو بھی تعمیر کعبہ کے لئے ساتھ لے آیا۔(۱)

پرندہ اور سانپ

نئی تعمیر کے لئے ضروری تھا کہ پہلی شکستہ عمارت کو گرایا جائے، لیکن اس میں یہ الجھن پڑ گئی کہ کعبہ کے اندر سالہا سال سے ایک بہت بڑا سانپ رہتا آرہا تھا جو ویسے تو کسی کو کچھ نہیں کہتا تھا لیکن اگر کوئی شخص کعبہ یا اس کی کسی چیز کو چھیڑنے کی کوشش کرتا تو اس پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔

آج یہی صورت درپیش تھی---لوگ شکستہ دیواریں گرانے کے لئے جمع تھے مگر جو

---

(۱) الاعلام ببیت اللہ الحرام ص ۵۴، الزرقانی ج ۱، ص ۲۴۵.

بھی اس ارادے سے آگے بڑھتا، سانپ پھنکارتا ہوا اس کی طرف لپک پڑتا۔

اہل مکہ اس کو مارنا بھی نہیں چاہتے تھے، کیونکہ وہ کعبہ کا محافظ تھا۔ اسی شش و پنج میں تھے کہ اچانک ایک بہت بڑا پرندہ فضا میں نمودار ہوا اور دیوارِ کعبہ پر بیٹھے سانپ پر جھپٹ پڑا، پھر اسے پنجوں میں دبوچ کر اڑا اور لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ فَسُبْحَانَ مَنْ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱)

بایں ہمہ کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کعبہ کی مقدس دیواروں پر کدال چلائے --- مبادا ربِ کعبہ ناراض ہو جائے --- بالآخر ولید نے ہمت کی اور اَللّٰهُمَّ لَا نُرِيْدُ اِلَّا الْخَيْرَ. (اے اللہ! ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اچھی نیت سے کر رہے ہیں۔) کہتے ہوئے کدال چلانی شروع کی۔ تھوڑا سا حصہ گرا کر کام روک دیا گیا اور ایک رات انتظار کیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہ رات خیریت سے گزر گئی اور کسی کو کچھ نہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ربِ کعبہ ہمارے اس کام پر راضی ہے۔

رات بخیریت گزری تو سب نے مل کر پہلی عمارت کو ڈھا دیا اور انہی بنیادوں پر ایک بلند و بالا اور مستحکم عمارت کا آغاز کر دیا۔ (۲)

اختلاف و نزاع

دورانِ تعمیر جب حجرِ اسود نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو قبائل میں اختلاف پڑ گیا کیونکہ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ حجرِ اسود نصب کرنے کا اعزاز اسے حاصل ہو۔ یہ جھگڑا پانچ چھ دن تک چلتا رہا اور بڑھتا رہا۔ آخر ایک معمر اور سمجھ دار آدمی نے مشورہ دیا کہ اس طرح فیصلہ ہونا مشکل ہے۔ یوں کرو کہ کل سب سے پہلے جو شخص باب بنی شیبہ سے حرم میں داخل ہو، اس کو منصف تسلیم کر لو اور وہ جو بھی فیصلہ کرے، اس پر بے چون و چرا سب عمل کرو!

یہ رائے سب کو پسند آئی اور اس پر اتفاق ہو گیا۔

---

(۱) الاعلام بیت اللہ الحرام، ص ۵۴، الزرقانی، ج ۱، ص ۲۴۶، السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۱۵۹۔

(۲) الزرقانی، ج ۱، ص ۲۴۷، السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۱۵۸۔

کون آیا؟

اگلی صبح سب کی نظریں باب بنی شیبہ (موجودہ باب السلام) پر لگی تھیں اور دل دھڑک رہے تھے --- جانے کون آئے اور کیا فیصلہ کرے ---! آخر انتظار ختم ہوا اور ایک جوانِ رعنا باب بنی شیبہ سے داخل ہوا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی سب یک زبان پکار اٹھے۔

هٰذَا الْاَمِیْن --- رَضِیْنَا --- هٰذَا مُحَمَّدٌ. (یہ امین ہے --- ہم اس پر راضی ہیں --- یہ محمد ہے۔) صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ (۱)

فیصلہ

جانِ دو عالم ﷺ کے روبرو صورت حال بیان کی گئی تو آپ نے ایسا بہترین اور منصفانہ حل تجویز فرمایا کہ سب اش اش کر اٹھے۔

آپ نے فرمایا --- ''زمین پر ایک بڑی سی چادر بچھاؤ!''

چادر بچھا دی گئی تو آپ نے حجر اسود کو خود اٹھا کر اس پر رکھ دیا پھر فرمایا ''اس

---

(۱) الزرقانی، ج ۱، ص ۲۴۷، الاعلام ببیت اللہ الحرام، ص ۵۵، البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۳۰۳.

علامہ سہیلی نے لکھا ہے کہ جب اہل مکہ نے جانِ دو عالم ﷺ کو حکم تسلیم کیا تو ابلیس شیخ نجدی کی صورت میں نمودار ہوا اور چلّانے لگا

''لوگو! کیا کر رہے ہو؟ کیا تمہیں گوارا ہے کہ اتنے شرفاء و روساء کے ہوتے ہوئے ایک یتیم نوجوان کو منصف مان لیا جائے؟''

وقتی طور پر کچھ لوگ اس کی چیخ و پکار سے متاثر ہوئے مگر پھر خاموش ہو گئے اور جانِ دو عالم ﷺ کو وہ اعزاز مل کر رہا، جو ازل سے آپ کا مقدر تھا۔ (روض الانف ج ۱، ص ۲۳۲)

جانِ دو عالم ﷺ کی شان گھٹانے کے لئے ابلیس کی کوششیں تو قابل فہم ہیں کہ اس کا مشن ہی یہ ہے؛ البتہ اس طرح کی کاروائیوں کے لئے ہمیشہ شیخ نجدی کا روپ دھار کر نمودار ہونا حیران کن ہے --- ! ہو گی کوئی مناسبت!! وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ؞

چادر کو سب مل کر اٹھا لیں اور کعبہ کے قریب لے چلیں۔''

سب نے ہاتھ لگائے اور چادر کو اٹھا کر کعبہ کے پاس پہنچا دیا۔ پھر آپ نے حجر اسود کو بہ نفس نفیس اٹھایا اور مقررہ جگہ پر اپنے ہاتھ سے نصب فرما دیا --- یوں آپ کی ذکاوت و ذہانت کی بدولت سب کو پتھر اٹھانے کی سعادت حاصل ہوگئی اور جھگڑا نہایت خوش اسلوبی سے نمٹ گیا۔

جانِ دو عالم ﷺ کی شرکت

تعمیر کعبہ میں جانِ دو عالم ﷺ نے بھی حصہ لیا اور اپنے چچا حضرت عباسؓ کے ساتھ مل کر پتھر ڈھوتے رہے۔ کندھوں پر وزن اٹھاتے وقت عرب عموماً اپنی ازاریں کھول کر کندھوں پر رکھ لیا کرتے تھے۔ اس دن بھی اکثر افراد نے اسی طرح کر رکھا تھا۔ حضرت عباس نے آپ کو مشورہ دیا کہ تم بھی اپنی ازار کندھوں پر رکھ لو، تاکہ پتھروں سے کندھے نہ چھل جائیں۔ آپ نے ان کے مشورہ پر عمل تو کیا، لیکن اس طرح (غالباً قمیص چھوٹا ہونے کی وجہ سے) آپ (کے گھٹنے یا ران کے کچھ حصے) ننگے ہوگئے۔ رب کریم کو کب گوارا ہو سکتا تھا کہ جس ہستی نے دنیا کو شرم و حیا کا درس دینا تھا، اس کی کوئی قابل ستر جگہ ننگی ہو جائے۔ اسی وقت غیبی آواز آئی یَا مُحَمَّدُ! غَطِّ عَوْرَتَکَ. (۱)

(یا محمد! قابلِ پردہ حصہ ڈھک دیجئے۔)

اس صدائے غیبی کا آپ پر اتنا اثر ہوا کہ آپ بے ہوش ہو کر گر گئے۔ افاقہ ہوا تو اِزَارِیْ اِزَارِیْ (میری ازار، میری ازار) کہتے ہوئے اٹھے اور ازار باندھ لی۔

---

(۱) بخاری ج ۱، ص ۵۰، ۲۱۵، ۵۴۰، زرقانی ج ۱، ص ۲۴۷۔

حدیث میں ''عَوْرَۃ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور عَوْرَۃ دو قسم کی ہوتی ہے۔ عَوْرَۃ غَلِیْظَۃ اور عَوْرَۃ خَفِیْفَۃ۔ عَوْرَۃ غَلِیْظَۃ شرمگاہ کو کہتے ہیں اور عَوْرَۃ خَفِیْفَۃ ناف سے گھٹنوں تک کے باقی حصے کو کہا جاتا ہے۔

علامہ زرقانی نے تصریح کی ہے کہ آپ کے جسم کا جو حصہ ننگا ہوا تھا وہ عَوْرَۃ غَلِیْظَۃ نہ تھا، عَوْرَۃ خَفِیْفَۃ تھا۔ نَعَمْ لَیْسَ الْمُرَادُ الْعَوْرَۃُ الْغَلِیْظَۃ. (الزرقانی ج ۱، ص ۲۴۸)

مہرِ رسالت

عاصی کرنالی

آپ کی بعثت سے پہلے تھا ہر منظر، ہر نقشِ دو عالم
اُجڑا اُجڑا ، پھیکا پھیکا ، ہلکا ہلکا ، مدھم مدھم
حسن کا چہرہ اترا اترا ، عشق کی رنگت بدلی بدلی
دہر کا نقشہ بگڑا بگڑا ، زیست کا مقصد مبہم مبہم
آنکھ کی پتلی سہمی سہمی ، دل کی دھڑکن ٹھہری ٹھہری
شوق کا دریا سمٹا سمٹا ، جوشِ جنوں کے طوفاں کم کم
چاند کی کرنیں میلی میلی ، صبح کے جلوے دھندلے دھندلے
کوچۂ ہستی سُونا سُونا ، محفلِ فطرت برہم برہم
دنیا کی دنیا آزردہ ، ہر شئے افسردہ ، پژمردہ
تارا تارا ، ذرہ ذرہ ، موتی موتی ، شبنم شبنم
اتنے میں مشرق کے اُفق سے مہرِ رسالت کی ضو ابھری
خنداں خنداں ، روشن روشن ، افزوں افزوں ، محکم محکم
چاک ہوا باطل کا پردا ، اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا
نورِ ہدایت ، آیۂ رحمت ، صلی اللہ علیہ وسلم

باب ۳

طُلُوعِ آفتاب

﴿وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰیo﴾

(اور آپ کو اپنی جستجو میں سرگرداں پایا تو رہنمائی فرمادی)

اُتر کر حِرا سے سُوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

سرکار کی باتیں کریں

طارقؔ سلطان پوری، واہ کینٹ

آمدِ سرکار ہے سرکار کی باتیں کریں
شاہِ خوباں، سیدالابرار کی باتیں کریں

وہ زمانے کا مُعلّم، آگہی بخشِ جہاں
ایک اُمّی کاشفِ اسرار کی باتیں کریں

ذکر چھیڑیں حسنِ کردارِ رسولِ پاک کا
مصطفیٰ کی خوبیِ گفتار کی باتیں کریں

خلوتِ قوسین میں جس نے کیا دیدارِ حق
اُس بشر، اُس پیکرِ انوار کی باتیں کریں

اُن کی عادات و شمائل کی، نظامِ کار کی
اُن کے معمولات کی، اطوار کی باتیں کریں

کثرتِ اصنام کے ہمت شکن ماحول میں
وحدتِ حق کے علم بردار کی باتیں کریں

ناموافق صورتِ حالات میں کیسا تھا وہ
ہم اُحد کے قافلہ سالار کی باتیں کریں

دشمنوں کی ذلت و خواری پہ کیا اس نے کیا
بدر کے فاتح، سپہ سالار کی باتیں کریں

حامیانِ حق، مہاجر سَابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن
ان کے تاریخ آفریں کردار کی باتیں کریں

استعارہ بن گئے قربانی و ایثار کا
عاشقانِ مصطفیٰ انصار کی باتیں کریں

وہ صداقت کیش جس نے صدق کی تصدیق کی
ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْھُمَا فِی الْغَارْ کی باتیں کریں

سطوتِ اسلام کا مظہر، مرادِ مصطفیٰ
اس اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارْ کی باتیں کریں

جامع القرآن، ذوالنورین، جواد و کریم
قلزمِ قربانی و ایثار کی باتیں کریں

بابِ شہرِ علم، زوجِ فاطمہ، خیبر شکن
شیرِ یزداں، حیدرِ کرار کی باتیں کریں

ہے یہی طارقؔ ہماری کامرانی کی سند
خالقِ سرکار کی، سرکار کی باتیں کریں

قَبلَ النُّبُوَّۃ ، بَعدَ النُّبُوَّۃ

گزشتہ صفحات میں جو واقعات مذکور ہوئے، وہ زمانہ قبلِ نبوت کے ساتھ متعلق تھے، اب نبوت اور بعد نبوت کے حالات بیان کئے جائیں گے۔(۱)

جب آپ کی عمر اقدس چالیس برس کے قریب پہنچ گئی تو مقدماتِ نبوت کا ظہور شروع ہو گیا، تاکہ آپ ذہنی طور پر پہلے سے اس بارگراں کو اٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ تمہید نبوت کا آغاز رؤیائے صادقہ (سچے خوابوں) سے ہوا۔ اس دور میں آپ کو جو بھی خواب نظر آتا، عالم بیداری میں اس کی تعبیر کا مشاہدہ ہو جاتا۔ عائشہ صدیقہؓ کے الفاظ میں

''آپ کے ہر خواب کی تعبیر صبح درخشاں کی طرح نمودار ہو جاتی۔'' (۲)

علاوہ ازیں جب آپ گھاٹیوں اور صحراء میں تنہا محوِ خرام ہوتے تو ہر شجر و حجر آپ کو

---

(۱) واضح رہے کہ قبل النبوۃ اور بعد النبوۃ کی تقسیم جانِ دو عالم ﷺ کے ظاہری حالات کی بنا پر ہے، ورنہ در حقیقت تو آپ کو اس وقت سے نبوت ملی ہوئی تھی، جب ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام ابھی آب و گل کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ اسی لئے جب ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا

''یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَتٰی وَجَبَتْ لَکَ النُّبُوَّۃُ؟'' (یارسول اللہ! آپ کو نبوت کب ملی؟)

تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا۔ ''وَاٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ.'' (جب آدم روح و جسم کے درمیان تھے۔) (ترمذی ص ۲۰۱)

اس حدیث کو بعض لوگ یوں بیان کرتے ہیں۔ کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ.

لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت، حدیث کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو، زرقانی ج ۱، ص ۴۰.

(۲) صحیح بخاری ج ۱، ص ۱، صحیح مسلم ج ۱، ص ۸۸.

سلام کا نذرانہ پیش کرتا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللہِ. اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللہِ. (۱)

اس زمانہ میں آپ کی طبیعت پر مخلوق سے انقطاع اور خالق کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کا غلبہ تھا، اس لئے آپ شہروں اور آبادیوں سے دور کوہ وصحرا کی خلوتوں میں حسنِ ازل کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ رفتہ رفتہ آپ نے غارِ حرا کو اپنی تنہائیوں کا رازدار بنا لیا۔ کھانے پینے کی ضروری اشیاء ساتھ لے لیتے اور کئی کئی دن اس مقدس غار میں گزار دیتے۔ کبھی کبھی تو پورا مہینہ وہیں بسر کرتے اور انتظار و مراقبہ کی لذتوں سے سرشار ہوتے۔

بالآخر ایک دن عرصہ انتظار ختم ہوا اور اکیس رمضان المبارک کو بروز سوموار اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر قاصد جبریل امین، رب العلمین کے ازلی وابدی پیغام کی پہلی قسط لے کر نازل ہوئے اور جانِ دوعالم ﷺ سے کہا

''اِقْرَأْ'' (پڑھئے!)

آپ نے فرمایا ''مَااَنَا بِقَارِئٍ.'' (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔)

اس پر جبریل امین نے آپ کو اپنے سینے سے چمٹا کر اچھی طرح بھینچا، پھر کہا ''اِقْرَأْ''

آپ نے فرمایا ''مَااَنَا بِقَارِئٍ''

جبریل امین نے آپ کو دوبارہ اپنے سینے سے لگایا اور کہا ''اِقْرَأْ''

آپ نے پھر فرمایا ''مَااَنَا بِقَارِئٍ''

پھر جب تیسری مرتبہ جبریل امین نے آپ کو سینے سے لگا کر چھوڑا اور کہا ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ..........''

تو آپ کی زبان پر یہی مقدس کلمات رواں ہوگئے۔

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ٥ اِقْرَأْ

---

(۱) طبقاتِ ابن سعد، ج ۱، ص ۱۰۲، البدایہ والنہایہ، ج ۳، ص ۱۱، الزرقانی، ج ۱، ص ۲۶۳۔

وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ o﴾ (۱)

(آپ پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا فرمایا، پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے، پڑھیے آپ کا رب بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم کے واسطہ سے، اس نے سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔)

یہ تو جانِ دو عالم ﷺ کا جگر گردہ تھا کہ آپ اس باجبروت کلام کو برداشت کر گئے، جو اگر پہاڑ پر نازل ہوتا تو اس کے پرخچے اڑ جاتے؛ تاہم اتنا اثر ضرور ہوا کہ آپ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اسی عالم میں گھر تشریف لائے اور خدیجہ طاہرہؓ سے فرمایا ''زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ.'' (مجھے کچھ اوڑھاؤ، مجھے کچھ اوڑھاؤ) چنانچہ آپ کو گرم کپڑے اوڑھا دیئے گئے، جب کچھ افاقہ ہوا تو آپ نے خدیجہ طاہرہ کو پورا واقعہ سنایا اور فرمایا

''لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ.'' (میری تو جان پر بن گئی تھی۔)

خدیجہ طاہرہؓ نے آپ کو تسلی دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہ ہونے دے گا کیونکہ آپ راست باز، مہمان نواز، رشتہ داروں کے حقوق کا پاس کرنے والے، محتاجوں کا بوجھ اٹھانے والے، فقیروں پر نوازشیں کرنے والے اور حق کا ساتھ دینے والے ہیں۔

آپ کو تسلی و تشفی دینے کے بعد انہوں نے مناسب سمجھا کہ اس سلسلے میں ورقہ بن نوفل سے بات کر لی جائے کیونکہ وہ دین عیسوی کے بہت بڑے فاضل تھے اور ایسے معاملات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے تھے۔ چنانچہ خدیجہ طاہرہ جانِ دو عالم ﷺ کو ان کے پاس لے گئیں۔ (۲) اور ان

---

(۱) یہ سارا واقعہ تو عالم بیداری کا ہے، لیکن اس سے پہلے یہ منظر آپ کو خواب میں بھی دکھایا گیا تھا تاکہ جبریل امین کے اچانک سامنے آجانے سے آپ کو کسی قسم کی پریشانی لاحق نہ ہو، چنانچہ متعدد روایات میں آپ کا یہ بیان مذکور ہے کہ ایک دفعہ میں نے خواب میں جبریل امین کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے اور وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں اِقْرَأْ.........الی الآخر (البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۱۲)

(۲) بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے ہاں لے جانے سے پہلے خدیجہ طاہرہؓ ایک اور نصرانی عالم عداس کے پاس بھی گئی تھیں اور ان سے پوچھا تھا

عداس! یہ بتائیے کہ جبرائیل کون ہے؟''

عداس حیران رہ گئے۔ کہنے لگے، اس سرزمین پر جہاں ہر طرف شرک و بت پرستی کا راج ☜

سے کہا---''بھائی جان! ذرا اپنے بھتیجے سے سنیئے تو!---ان کے ساتھ کیا پیش آیا؟

ورقہ نے جانِ دو عالم ﷺ سے پوچھا

یَاابْنَ اَخِیْ! مَاذَاتَرٰی؟ (بھتیجے! آپ نے کیا دیکھا؟)

جانِ دو عالم ﷺ نے جو کچھ پیش آیا تھا، تفصیل سے بیان فرمایا۔

ورقہ نے پوری روئیداد سن کر کہا ''هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِیْ کَانَ یَنْزِلُ عَلٰی مُوْسٰی. ''یہ وہی محرم اسرار قاصد ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوا کرتا تھا---کاش! میں جوان ہوتا، کاش! میں اس وقت تک زندہ رہتا، جب آپ کی قوم (یہ پیام سنانے کے جرم میں) آپ کو ارض مکہ سے نکال دے گی۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے حیرت سے پوچھا ''اَوَمُخْرِجِیَّ هُمْ؟'' (کیا یہ لوگ مجھے یہاں سے نکال دیں گے؟)

ورقہ نے کہا ''نَعَمْ!---جو پیامبر بھی اس طرح کا پیغام لے کر آیا، لوگ اس کے دشمن ہو گئے---اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔'' (۱)

افسوس! حضرت ورقہ کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی اور آپ تھوڑے ہی عرصہ بعد خالق

ہے، جبرائیل کا نام کہاں سے آ گیا؟''

''اس بات کو جانے دیجئے'' خدیجہ طاہرہؓ نے کہا ''یہ بتائیے کہ یہ ہستی ہے کون؟''

عداس نے کہا ''اِنَّهٗ اَمِیْنُ اللهِ بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ النَّبِیِّیْنَ..........'' (جبریل اللہ تعالیٰ اور انبیاء کے مابین امانت دار رابطہ ہے۔ موسیٰ اور عیسیٰ تک احکام الٰہیہ بھی اسی فرشتے نے پہنچائے تھے۔

(زرقانی ج ۱، ص ۲۵۷)

(۱) صحیح بخاری کتاب بدء الوحی ج ۱، ص ۲، صحیح مسلم ج ۱، ص ۸۸.

تاریخ وسیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کی مزید تفصیلات بھی مروی ہیں، مگر ہم نے بغرض اختصار صرف صحیح بخاری ومسلم کی روایت پر اکتفا کیا ہے۔

حقیقی سے جاملے۔(۱) رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ.

وضو اور نماز

اسلام میں طہارت وعبادت کوکس قدر اہمیت حاصل ہے---؟اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کے منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد سب سے پہلے آپ کو وضواور نماز کا طریقہ سکھایا گیا۔

چنانچہ جبریل امین آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا---''اللہ تعالیٰ آپ کوسلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ آپ تمام جن وانس کی طرف رسول ہیں، اس لئے انہیں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ. کی دعوت دیجئے!''

اس کے بعد جبریل امین نے اپنی ایڑی زمین پر ماری تو وہاں سے شفاف پانی کا چشمہ ابل پڑا۔ جبریل امین نے آپ کے روبرو اس چشمے سے وضو کیا، پھر آپ سے کہا کہ آپ بھی وضو کیجئے، چنانچہ آپ نے بھی اسی طرح وضو کیا۔ پھر جبریل امین قبلہ رو ہو کر کھڑے ہوگئے اور آپ سے بھی کہا کہ میرے ساتھ کھڑے ہو جائیے۔ چنانچہ دونوں نے مل کر دو رکعت نماز ادا کی۔اس کے بعد جبریل امین واپس چلے گئے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے گھر آ کر حضرت خدیجہؓ سے یہ واقعہ بیان کیا،تو انہیں بیحد

---

(۱) ورقہ بن نوفلؓ خدیجہ طاہرہؓ کے چچازاد بھائی تھے، جانِ دو عالم ﷺ کی ولادت سے پہلے شرک وبت پرستی میں مبتلا تھے، جب جانِ دو عالم ﷺ کی ولادت ہوئی تو ان کا پسندیدہ بت اوندھے منہ گر پڑا اور بار بار اٹھانے کے باوجود کھڑا نہ ہوسکا۔ (یہ واقعہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔)

اپنے معبود کی یہ درگت بنتے دیکھ کر بت پرستی سے متنفر ہوگئے اور عیسائی مذہب اختیار کر کے قدیمی کتابوں کے مطالعہ میں مستغرق ہوگئے۔انہی کتابوں کے مطالعہ کے دوران ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ عنقریب ایک عظیم الشان نبی ظاہر ہونے والا ہے، وہ اس نبی کے لئے سراپا انتظار تھے اور اپنے اشعار میں اکثر اس کا اظہار کرتے رہتے تھے۔جب جانِ دو عالم ﷺ نے نزول جبریل کا واقعہ ☜

مسرت حاصل ہوئی اور خواہش ظاہر کی کہ مجھے بھی وضو اور نماز کا طریقہ بتائیے۔ چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر انہوں نے بھی وضو کیا اور آپ کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ نماز سے فراغت کے بعد بیساختہ بول اٹھیں، اَشْھَدُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللہِ. (میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں۔) (۱)

انقطاعِ وحی

پہلی وحی کے بعد کچھ مدت کے لئے سلسلۂ وحی منقطع ہو گیا۔ (۲) اس سے آپ بے حد پریشان ہو گئے --- اتنے پریشان کہ آپ کو اپنی زندگی ایک قسم کا بوجھ محسوس ہونے لگی اور آپ نے بارہا ارادہ کر لیا کہ پہاڑ سے چھلانگ لگا کر اس زندگی کا خاتمہ کر لیں۔ (۳) لیکن آپ جب بھی اس ارادے سے کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے، جبریل امین نمودار ہو جاتے اور کہتے

یَامُحَمَّدُ! اِنَّکَ رَسُوْلُ اللہِ حَقًّا. (یا محمد (ﷺ) آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔)

یہ سن کر وقتی طور پر دلِ بے چین کو قرار آ جاتا اور آپ پر سکون ہو جاتے، لیکن کچھ

بیان کیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہی وہ نبی ہیں جن کا مدتوں سے انتظار تھا۔ اس لئے فوراً ایمان لے آئے اور وفات کے بعد سیدھے جنت میں داخل ہو گئے۔ جانِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں

رَاَیْتُہٗ فِیْ بُطْنَانِ الْجَنَّةِ عَلَیْهِ سُنْدُسٌ

(میں نے اس کو وسطِ جنت میں دیکھا، اس نے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔)

(البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۹)

(۱) تاریخ ابن جریر ج ۲، ص ۲۱۰، زرقانی ج ۱، ص ۲۸۳ --- باقاعدہ طور پر پانچ نمازیں تو شبِ معراج میں فرض ہوئی تھیں؛ تاہم اس سے پہلے بھی جانِ دو عالم ﷺ اور صحابہ کرام، جبریل امین کے بتائے ہوئے طریقے پر وقتاً فوقتاً نماز پڑھا کرتے تھے۔

(۲) اس انقطاع میں مصلحت یہ تھی کہ اس قولِ ثقیل کا نزول وقفے وقفے سے ہو، تاکہ آپ پر یک دم ہی بہت زیادہ بوجھ نہ پڑ جائے۔

(۳) محبوب کی طرف سے نامہ و پیام منقطع ہو جانے پر عشاق کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

وقت گزرنے کے بعد پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔

جب آپ کی بے تابی و بے قراری حد سے بڑھ گئی تو جبریل امین پیامِ الٰہی کی دوسری قسط لے کر نازل ہوئے ﴿ یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ٥ قُمْ فَاَنْذِرْ ٥ ﴾ (اے چادر لپیٹنے والے، اُٹھئے اور (لوگوں کو) ڈرائیے۔)

اس کے بعد وحی کا تسلسل قائم ہو گیا۔(۱)

جہاں گیر بعثت

جانِ دو عالم ﷺ کی پیدائش سے پہلے انبیاء کرام آپ کی آمد کی بشارتیں دیتے رہے۔ پھر ولادت کے وقت کاہنوں اور یہودی و نصرانی عالموں --- بلکہ بے جان بتوں نے شہادت دی کہ آج وہ عظیم ہستی دنیا میں تشریف لے آئی ہے۔(۲) پھر جب آپ کو عالمگیر نبوت عطا ہوئی تو ہر طرف ڈنکا بج اُٹھا اور ہر سمت سے یہی ندا آنے لگی کہ رسول ہاشمی جلوہ گر ہو گئے ہیں، اس لئے جو شخص ہدایت پانا چاہتا ہو اسے چاہئے کہ ان کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو جائے۔

اس قسم کے واقعات یوں تو بہت زیادہ ہیں مگر ہم صرف چند مستند اور دلچسپ واقعات بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

✿ --- فاروق اعظمؓ اپنے دورِ خلافت میں ایک دن احباب کے ساتھ بیٹھے تھے کہ سامنے سے ایک صحابی گزرے۔ کسی نے کہا --- ''امیر المؤمنین! یہ جو شخص گزر رہے ہیں، کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟''

''کون ہے یہ؟'' فاروق اعظمؓ نے پوچھا۔

''یہ سواد بن قارب ہیں'' لوگوں نے بتایا ''وہی سواد، جن کے تابع ایک جن نے انہیں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی اطلاع دی تھی۔''

فاروقِ اعظمؓ نے ان کو بلا بھیجا۔ وہ آئے تو آپ نے ابتدائی گفتگو کے بعد ان سے

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب التعبیر، ج۲، ص ۱۰۳۳۔

(۲) یہ واقعات دوسرے باب میں گزر چکے ہیں۔

پوچھا کہ تمہارے تابع جن نے رسول اللہ کی بعثت کی اطلاع تمہیں کس طرح پہنچائی تھی؟ انہوں نے بتایا کہ ایک دن میں نیم بیداری کے عالم میں تھا کہ میرا جن آیا اور مجھے ہلا جلا کر کہنے لگا۔

''سواد بن قارب اٹھئے اور میری بات سنئے اور سمجھئے---! لوی بن غالب سے ایک رسول مبعوث ہوگئے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ہر سمت سے جنات کے قافلے مکہ مکرمہ کی طرف رواں دواں ہیں۔

فَارْحَلْ اِلَی الصَّفْوَۃِ مِنْ ھَاشِمٍ. (بنی ہاشم کی اس منتخب روزگار ہستی کی خدمت میں حاضری کے لئے آپ بھی چل پڑیں۔)

میں نے اس کی باتوں پر کان نہ دھرا اور کہا ''دَعْنِیْ اَنَامُ......'' (چھوڑ! مجھے سونے دے۔ بڑے زور کی نیند آئی ہوئی ہے۔)

اس وقت تو وہ چلا گیا، لیکن دوسری رات پھر آموجود ہوا اور گزشتہ شب کی طرح نصیحت کرنے لگا۔ میں نے پھر بھی توجہ نہ دی تو تیسری رات وہ پھر آیا اور رسول ہاشمی کی خدمت میں حاضری کی تلقین کی۔

آخر اس کی بات ماننا پڑی اور علی الصبح اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوگیا۔ آپ اس وقت اپنے اصحاب کے ساتھ محفل سجائے بیٹھے تھے۔ میں نے حاضر ہوتے ہی عرض کی

''یارسول اللہ! میرا کلام سنئے!''

''سناؤ!'' آپ نے خندہ پیشانی سے فرمایا۔

چنانچہ میں نے نعت کا نذرانہ پیش کیا۔

(نعت طویل ہے۔ صرف دو شعر پیش خدمت ہیں۔)

وَاَنَّکَ اَدْنَی الْمُرْسَلِیْنَ وَسِیْلَۃً اِلَی اللّٰہِ یَا ابْنَ الْاَکْرَمِیْنَ الْاَطَائِبِ

وَکُنْ لِیْ شَفِیْعًا یَوْمَ لَاذُوْشَفَاعَۃٍ سِوَاکَ بِمُغْنٍ عَنْ سَوَادِ ابْنِ قَارِبِ

(بلاشبہ اللہ تک پہنچنے کے لئے آپ تمام رسولوں کی بہ نسبت زیادہ قریبی وسیلہ ہیں

اے معزز اور پاک ہستیوں کے فرزندِ گرامی!

آپ اس روز میری شفاعت کیجئے، جس دن آپ کے سوا کوئی بھی شفاعت کرنے والا سواد بن قارب کے کام نہ آسکے گا۔)

یہ نذرانۂ عقیدت مقبولِ بارگاہ ہوا۔ فَفَرِحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَصْحَابُهٗ فَرْحًا شَدِيْدًا حَتّٰى رُئِيَ الْفَرَحُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ. (رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحاب اتنے خوش ہوئے کہ مسرت کی فراوانی سے ان کے چہرے دمک اٹھے۔)

نعت ختم ہونے پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''اَفْلَحْتَ يَاسَوَادُ!'' (سواد! تم کامیاب ہوگئے۔)

سواد بن قاربؓ نے واقعہ ختم کیا تو فاروق اعظمؓ نے بے تابانہ اٹھ کر سواد کو گلے لگا لیا اور فرمایا---''کتنا اشتیاق تھا مجھے تمہاری زبان سے، یہ واقعہ سننے کا!!

پھر سوادؓ سے پوچھا ''هَلْ يَأْتِيْكَ رِئْيُكَ الْيَوْمَ'' (کیا وہ جن اب بھی تمہارے پاس آتا ہے۔)

سوادؓ نے جواب دیا---''جب سے میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا ہے، یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ وَنِعْمَ الْعِوَضُ كِتَابُ اللّٰهِ مِنَ الْجِنِّيِّ. (اور جنوں کی باتوں سے اللہ کی کتاب بدرجہا بہتر ہے۔)

فاروق اعظمؓ نے فرمایا---''ایک دفعہ میرے، ساتھ بھی اس طرح کا واقعہ پیش آیا تھا۔ میں قریش کے ایک گھرانے آلِ ذریح کے پاس گیا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک بچھڑا ذبح کر رکھا تھا اور قصاب اسے کاٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ناگاہ بچھڑے سے آواز آنے لگی

يَاآلَ ذَرِيْحٍ، اَمْرٌ نَجِيْحٌ، صَائِحٌ يَصِيْحُ، بِلِسَانٍ فَصِيْحٍ، يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ.

(اے آلِ ذریح! کامیاب بات ظاہر ہوگئی۔ ایک اعلان کرنے والا بزبانِ فصیح اعلان کر رہا ہے۔ گواہی دے رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔)

یہ سن کر میں وہاں سے چلا آیا، انہی ایام میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی نبوت کا

اعلان کردیا۔''(۱)

✿ ---حضرت مازنؓ بیان کرتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں عمان کے قریب سمایا نامی گاؤں میں ایک بت کی خدمت اور دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ ایک دن ہم قربانی پیش کرکے بت کے سامنے بیٹھے تھے کہ اچانک بت کے اندر سے آواز آنے لگی

''یَامَازِنُ! اِسْمَعْ تَسُرّ، ظَهَرَ خَيْرٌ وَّبَطَنَ شَرّ، بُعِثَ نَبِیٌّ مِنْ مُضَر، بِدِيْنِ اللّٰهِ الْاَكْبَر، فَدَعْ نَحِيْتًا مِّنْ حَجَر، تَسْلِمْ مِّنْ حَرِّ سَقَر.''

(اے مازن! سن اور خوش ہو جا۔ بھلائی ظاہر ہوگئی اور برائی چھپ گئی۔ قبیلہ مضر سے ایک نبی، اللہ کے دین کے ساتھ مبعوث ہوگیا ہے۔ اب تم پتھر کے تراشے ہوئے، بتوں کی پوجا چھوڑ دو، تاکہ جہنم کی حرارت سے بچ جاؤ۔)

یہ ندا سن کر میں انتہائی خوفزدہ ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر اسی طرح قربانی کرکے ہم بیٹھے تھے کہ دوبارہ بت سے یہ صدا آنے لگی

''...... هٰذَا نَبِیٌّ مُّرْسَل، جَآءَ بِحَقٍّ مُّنْزَل ......'' (وہ نبی مرسل، نازل شدہ حق کے ساتھ آ گیا ہے۔ اس پر ایمان لے آؤ اور بھڑکتی ہوئی آگ سے نجات پا جاؤ۔)

چند روز کے بعد حجاز سے ایک آدمی آیا اور اس نے بتایا کہ مکہ میں احمد ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کے پاس جو بھی جاتا ہے، اس سے یہی کہتے ہیں ''اَجِيْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ.'' (اللہ کی طرف پکارنے والے کی بات مان لو۔)

یہ سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ بت سے جس ہستی کی نبوت کا اعلان ہوا تھا، وہ یہی احمد ﷺ ہیں۔ چنانچہ میں نے اسی وقت جا کر بت کو توڑ پھوڑ دیا اور رسول اللہ کی خدمت

---

(۱) یہ واقعہ تاریخ و سیرت کی تقریباً تمام کتابوں میں تھوڑے بہت لفظی تغیر کے ساتھ موجود ہے اور کسی قدر اختصار کے ساتھ صحیح بخاری میں بھی مذکور ہے۔

ملاحظہ فرمایئے! صحیح بخاری ج ۱، باب اسلام عمر ص ۵۴۵، عینی شرح بخاری ج ۸، ص ۶۷، البدایہ والنہایہ، ص ۳۳۲ تا ۳۳۷۔

میں حاضری کے لئے عازمِ سفر ہوگیا۔ وہاں پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسلام کے لئے کھول دیا اور میں ایمان لے آیا، پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کے روبرو اپنی کمزوریاں اور پریشانیاں بیان کیں۔

''یارسول اللہ! میں بہت عیاش آدمی ہوں۔ گانا بجانا، عورتیں اور شراب--- انہی لغویات میں میری عمر بسر ہوتی ہے۔ کچھ زمانے سے ہمارے علاقے میں قحط پڑا ہوا ہے، اس لئے آج کل تنگدست ہوں اور ابھی تک اولاد کی نعمت سے بھی محروم ہوں۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت دے، ہماری پریشانیاں دور فرمائے، ہماری سرزمین پر بارانِ رحمت برسائے اور مجھے بیٹا عنایت فرمائے۔''

رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی۔

''اَللّٰھُمَّ! مازن کے گانے کو تلاوتِ قرآن سے، اس کے رزقِ حرام کو رزقِ حلال سے اور اس کی بے راہروی کو پاکدامنی سے بدل دے۔ اس کے علاقے پر بارش برسادے اور اسے بیٹا عنایت فرمادے۔''

رسول اللہ ﷺ کی تمام دعائیں مستجاب ہوئیں--- مجھ سے تمام عیاشیاں چھٹ گئیں، میرا علاقہ سرسبز و شاداب ہوگیا، میں نے چار عورتوں کے ساتھ شادی کی، قرآن کا بڑا حصہ یاد کیا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹا بھی عطا فرمادیا، جس کا نام حیان ہے--- حیان بن مازن۔''

دربارِ رسالت میں حاضر ہوتے وقت حضرت مازنؓ نے بھی ایک خوبصورت نعت پیش کی تھی۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اِلَیۡکَ رَسُوۡلَ اللہِ خَبَّتۡ مَطِیَّتِیۡ تَجُوۡبُ الۡفَیَافِیۡ مِنۡ عَمَانٍ اِلَی الۡعَرَجِ

لِتَشۡفَعَ لِیۡ یَاخَیۡرَ مَنۡ وَطِیَ الۡحَصٰے فَیَغۡفِرَ لِیۡ رَبِّیۡ وَاَرۡجِعَ بِالۡفَلَجِ

(یارسول اللہ! میری اونٹنی عمان سے عرج تک پھیلے ہوئے طویل صحراؤں کو تیزی سے طے کرتی ہوئی آپ کے دربار میں پہنچی ہے۔ غرض یہ ہے کہ آپ بارگاہِ الٰہی میں میری سفارش کریں اے روئے زمین پر چلنے والے تمام لوگوں سے افضل ہستی! تاکہ میرا رب

میرے گناہ معاف فرمادے اور میں کامیابی کے ساتھ واپس جاؤں۔) (۱)

۞---قبیلۂ خثعم کے کچھ لوگوں نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ یوں بیان کیا۔

ہم ایک دفعہ اپنے ایک بت کے پاس بیٹھے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی کسی نزاعی مسئلے کا تصفیہ کرانے کے لئے اسی بت کے پاس آئے ہوئے تھے۔ (۲) اچانک ایک غیبی آواز سنائی دینے لگی۔

(اے لوگو!--- بچو! بوڑھو! کیا لغو اور بے ہودہ خیالات ہیں تمہارے، کہ تم فیصلوں کے لئے بتوں کی طرف رجوع کرتے ہو---! کیا تم سب حیرت میں مبتلا ہو اور خوابِ غفلت میں پڑے ہو---؟ کیا تم نہیں جانتے کہ تہامہ (مکہ) سے روشنی طلوع ہو چکی ہے، جس سے اندھیرے اور تاریکیاں چھٹ رہی ہیں؟

ذَاکَ نَبِیٌّ سَیِّدُ الْاَنَامِ قَدْ جَآءَ بَعْدَ الْکُفْرِ بِالْاِسْلَامِ........

وہ نبی جو تمام لوگوں کا سردار ہے۔ کفر کے طویل زمانے کے بعد اب دینِ اسلام کے ساتھ آ گیا ہے۔ اسے رحمٰن نے عزت عطا کی ہے۔ بڑا رہنما اور سچا رسول ہے۔ بہت انصاف کے ساتھ فیصلے کرتا ہے۔ نماز، روزے، نیکی اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ گناہوں سے، بتوں سے اور تمام حرام کاموں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ بنی ہاشم کے بلند و بالا خاندان سے ہے اور بلدِ حرام (مکہ مکرمہ) میں اپنی نبوت کا اعلان کر رہا ہے۔)

ہم نے جب یہ غیبی ندا سنی تو بتوں کو چھوڑ چھاڑ کر دربارِ رسالت میں حاضر ہو گئے اور اسلام لے آئے۔ (۳)

---

(۱) البدایہ والنہایہ ص ۳۳۷، ۳۳۸، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۲۲۱، ۲۲۲ الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۱۴۹، ۱۵۰.

(۲) بے جان بتوں نے کیا فیصلہ کرنا تھا! البتہ اس رسم سے مجاورانِ اصنام کے وارے نیارے ہوتے تھے۔ وہ کوئی الٹی سیدھی فال نکال کر کہہ دیتے تھے کہ "خدا نے یہ حکم دیا ہے۔" اور اپنے پیسے کھرے کر لیتے تھے۔

(۳) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۳۴۳، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۲۲۴.

---عمر بن مرۃؓ فرماتے ہیں کہ میں زمانہ جاہلیت میں ایک مرتبہ جب حج کے لئے گیا تو مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران خواب میں ایک روشنی دیکھی جو کعبہ سے طلوع ہوئی اور یثرب کی پہاڑیوں تک پھیل گئی۔اس روشنی سے آواز آئی۔

اِنْقَشَعَتِ الظَّلْمَآءُ، وَسَطَعَ الضِّیَاءُ، وَبُعِثَ خَاتَمُ الْاَنْبِیَآءِ.

(ظلمتیں دور ہو گئیں، روشنی چمک اٹھی، خاتم الانبیاء مبعوث ہو گئے۔)

پھر دوبارہ چمک ظاہر ہوئی۔اس چمک میں مجھے حیرہ کے محلات نظر آنے لگے اور مدائن جگمگا اٹھا۔اس نور سے پھر ندا آنے لگی۔

ظَھَرَ الْاِسْلَامُ، وَکُسِرَتِ الْاَصْنَامُ، وَوُصِلَتِ الْاَرْحَامُ.

(اسلام ظاہر ہو گیا، بت توڑ دیئے گئے اور صلہ رحمی کا آغاز ہو گیا۔)

یہ خواب دیکھ کر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔لوگوں سے اپنا خواب بیان کیا اور کہا

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب قریش میں کوئی عظیم واقعہ رونما ہونے والا ہے۔''

بہر حال ہم حج کے بعد اپنے گھروں کو واپس چلے آئے۔کچھ ہی دنوں بعد مکہ سے ایک شخص آیا اور اس نے بتایا مکہ میں احمد نامی ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔یہ سن کر میں مکہ گیا۔احمد ﷺ سے ملاقات کی اور اپنا خواب بیان کیا۔انہوں نے فرمایا۔

''عمر بن مرہ! میں ہی تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔میں انہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، خون ریزی سے منع کرتا ہوں اور صلہ رحمی، اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت، بتوں کو چھوڑنے، حج کرنے اور روزے رکھنے کا حکم دیتا ہوں مَنْ اَجَابَ فَلَهُ الْجَنَّةُ. جس نے میری دعوت پر لبیک کہا، اس کے لئے جنت ہے۔وَمَنْ عَصٰی فَلَهُ النَّارُ. اور جس نے نافرمانی کی اس کے لئے جہنم ہے۔

عمر بن مرہ! تُو بھی ایمان لے آ تا کہ اللہ تعالیٰ تجھے جہنم کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھے۔''

میں نے اسی وقت کلمہ شہادت پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

میرا باپ ایک بت کا خدمت گزار تھا، اسلام لانے کے بعد میں نے بت کو توڑ پھوڑ دیا اور نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں یہ نعتیہ اشعار پڑھتے ہوئے حاضر ہوا۔

شَهِدْتُ بِاَنَّ اللّٰهَ حَقٌّ وَّ اَنَّنِیْ لِاٰلِهَةِ الْاَحْجَارِ اَوَّلُ تَارِکٖ

وَشَمَّرْتُ عَنْ سَاقِی الْاِزَارَ مُهَاجِرًا اِلَیْکَ اَجُوْبُ الْقَفْرَ بَعْدَ الدَّکَادِکٖ

لِاَ صْحَبَ خَیْرَ النَّاسِ نَفْسًاوَّ وَالِدًا رَسُوْلَ مَلِیْکِ النَّاسِ فَوْقَ الْحَبَائِکٖ

(میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ حق ہے اور میں پتھر سے تراشے ہوئے خداؤں کو سب سے پہلے چھوڑنے والا ہوں۔ میں کمر ہمت کس کر، ویرانوں اور سخت زمین کو طے کرتا ہوا آپ کی طرف ہجرت کر آیا ہوں۔ تا کہ مجھے صحبت میسر آ جائے، اس کی جو اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اور اپنے والد کے لحاظ سے بھی، تمام لوگوں میں افضل ہے اور جو اوپر والے بادشاہ کا نمائندہ اور رسول ہے۔)

یہ اشعار سن کر رسول اللہ ﷺ بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا

مَرْحَبًا بِکَ یَا عَمْرَ بْنَ مُرَّةَ. (خوش آمدید، عمر بن مرہ!)

میں نے عرض کی---''یارسول اللہ! مجھے اپنی قوم کے پاس جانے کی اجازت مرحمت فرمایئے تاکہ میں انہیں اسلام کی دعوت دوں۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر میرے ذریعے سے مہربانی فرمادے، جس طرح اس نے مجھ پر آپ کے صدقے احسان فرمایا۔''

آپ نے بخوشی اجازت دیتے ہوئے یہ ہدایات بھی دیں۔

عَلَیْکَ بِالرِّفْقِ وَالْقَوْلِ السَّدِیْدِ وَلَا تَکُنْ فَظًّا وَّلَا مُتَکَبِّرًا وَّلَا حَسُوْدًا.

(نرمی اختیار کرنا اور ہمیشہ سچی بات کہنا، بدخو، متکبر اور حاسد نہ بننا۔)

عمر بن مرہؓ کی تبلیغ سے ایک آدمی کے سوا سارا قبیلہ مسلمان ہوگیا، عمر بن مرہؓ ان سب کو ساتھ لے کر دربار رسالت میں حاضر ہوئے تو جانِ دوعالم ﷺ بے حد خوش ہوئے سب کو مرحبا کہا اور دولتِ اسلام سے مشرف ہونے پر مبارکباد دی۔(۱)

اس طرح کے گوناگوں واقعات سے تاریخ کا دامن بھرا پڑا ہے، مگر ہم انہی پر اکتفا کرتے ہوئے دوبارہ اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۳۵۱، ۳۵۲۔

قُمْ فَاَنْذِرْ

وحی الٰہی کی دوسری قسط میں جب لوگوں کو کفر وشرک کے ہولناک انجام سے ڈرانے کا حکم دیا گیا تو جانِ دو عالم ﷺ نے تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ خدیجہ الکبریٰ تو اسی وقت ایمان لا چکی تھیں جب آپ پر پہلی وحی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ نازل ہوئی تھی۔ اس لئے وہ بالاتفاق سب سے پہلی مؤمنہ ہیں۔ ان کے بعد اوّلین مؤمن ہونے کا اعزاز بڑوں میں صدیق اکبر کو، بچوں میں علی مرتضیٰ کو، عورتوں میں اُمِ ایمن کو، آزاد کردہ غلاموں میں زید بن حارثہ کو اور غلاموں میں بلال حبشی کو حاصل ہوا۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ اَجْمَعِیْنَ. (۱)

---

(۱) خدیجہ الکبریٰؓ کے مفصل حالات جلد سوم، باب ''ازواج مطہرات'' میں بیان کئے جائیں گے انشاء اللہ۔ صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰؓ کا ذکر سیرت میں جابجا آتا رہے گا۔ باقی تین خوش نصیبوں کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

۱--- اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا

ان کا اصلی نام ''برکہ'' تھا۔ جانِ دو عالم ﷺ کے والد ماجد کی کنیز تھیں۔ ان کی وفات کے بعد بطور وراثت آپ کی ملکیت میں آ گئیں۔ سیدہ آمنہ کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر آ پڑی۔ انہوں نے جی جان سے اس ذمہ داری کو نباہا اور آپ کی بھرپور خدمت کی۔ اس لئے آپ ان کو یَا اُمَّاہُ (اے میری امی!) کہہ کر بلایا کرتے تھے۔

جس ہستی کو آپ یَا اُمَّاہُ کہہ کر پکاریں، اس کی عظمت کا کیا کہنا!

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے موقع پر جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ آزادی کے بعد ان کی شادی عبید بن یزید سے ہوئی۔ عبید سے ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام ایمن رکھا گیا، اسی مناسبت سے اُمِ ایمن کے ساتھ مشہور ہو گئیں۔ عبید کے بعد ان کی شادی حضرت زیدؓ سے ہو گئی۔ (زید کا تعارف آ رہا ہے۔) زید سے اسامہ بن زیدؓ پیدا ہوئے۔ (تلخیص المستدرک ج ۴، ص ۳)

اہل عشق ومحبت کی نظروں میں اس خاتون کی عزت وتوقیر کا کیا عالم تھا؟ ☜

صدیق اکبرؓ صاحب ثروت ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت خوش اخلاق اور ملنسار

اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے کیجئے!

حضرت اسامہ بن زیدؓ کے بیٹے حسن اور آزاد کردہ غلام ابن ابی الفرات میں ایک دفعہ جھگڑا ہوگیا۔ تلخ کلامی کے دوران ابن ابی الفرات نے حسن کو ''برکہ کے بیٹے'' کہہ دیا۔ حسن نے وہاں پر موجود حاضرین سے کہا کہ تم لوگ اس بات کے گواہ رہنا۔ اس کے بعد حسن نے قاضی مدینہ ابوبکر بن محمد کی عدالت میں ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دیا۔ قاضی صاحب نے ابن ابی الفرات سے پوچھا کہ تو نے حسن کو ''برکہ کے بیٹے'' کیوں کہا تھا؟

ابن ابی الفرات نے جواب دیا ''میں نے ان کی دادی کا نام ہی تو لیا تھا، کوئی گالی تو نہیں دی تھی۔''

عاشقِ رسول قاضی صاحب کو اس --- عذرِ گناہ بدتر از گناہ --- پر غصہ آ گیا، نہایت جلال کے عالم میں گویا ہوئے --- ''نزاع اور غصے کے موقع پر اس لہجہ میں ''برکہ کے بیٹے'' کہہ کر تو نے محترمہ برکہ کی توہین کی ہے --- کیا تجھے محترمہ برکہ کا مقام و مرتبہ معلوم نہیں؟ تو حسن کو اس عظیم خاتون کی اولاد ہونے کا طعنہ دیتا ہے، جس کو رسول اللہ ﷺ یا اُمّاہُ کہہ کر پکارا کرتے تھے؟! اس گھناؤنے جرم پر اگر میں تجھے معاف کر دوں تو خدا مجھے کبھی معاف نہ کرے۔''

پھر قاضی صاحب نے یہ زریں فیصلہ سنایا۔

''ابن ابی الفرات کو محترمہ برکہ کی توہین کے جرم میں ستر کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے۔''

(المستدرک للحاکم ج ۴، ص ۶۴)

ایک دفعہ اُمِ ایمنؓ کی ایک نادانستہ غلطی ان کے لئے نوید شفا بن گئی۔

خود ہی بیان فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ رات کو اٹھے اور کمرے میں رکھے ایک برتن میں پیشاب کیا، تھوڑی دیر بعد میری آنکھ کھلی تو مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے اس برتن کو بھرا پایا تو سمجھی کہ پانی ہے۔ چنانچہ اٹھایا اور سارے کا سارا پی گئی۔

صبحدم آپ نے مجھے کہا کہ اٹھو! اور اس برتن میں جو کچھ ہے اسے باہر پھینک آؤ۔

میں نے کہا ''اللہ کی قسم یا رسول اللہ! وہ تو میں نے رات کو پی لیا تھا۔''

انسان تھے اس لئے ان کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا، ان کی ترغیب سے متعدد افراد حلقہ بگوش

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کھلکھلا کر ہنس دیئے اور فرمایا

''اب زندگی بھر تجھے پیٹ کی کوئی بیماری نہ ہوگی۔''

(المستدرک ج ۴، ص ۶۳)

سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِیْمِ. ایک عام انسان کا پیشاب پلید اور مضر، مگر جانِ دو عالم ﷺ کا آبِ مقطر طاہر اور امراضِ شکم سے دائمی نجات کا سبب!

تجھے یک نے یک بنایا

خلافتِ حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور میں اس بابرکت خاتون کا انتقال ہوا۔ رضی اللہ عنہا وبرکتها عنا.

۲---زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

تمام صحابہ کرام میں یہ واحد ہستی ہیں، جن کا نام قرآنِ کریم میں آیا ہے۔

﴿فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا.﴾ (سورہ ۳۳، آیت ۳۷)

نوعمری میں ہی ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے، انہوں نے غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام نے حضرت خدیجہؓ کے لئے خرید لیا اور انہوں نے تحفۃً جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ دوسری روایت کے مطابق خریدنے والے خود آپ تھے۔ بہرحال جو صورت بھی ہوئی ہو، حاصل یہ کہ حضرت زیدؓ آپ کی غلامی میں آگئے---اس ذاتِ اقدس کی غلامی میں جس کی غلامی آزادی کی آخری معراج ہے۔

ادھر حضرت زیدؓ کے ماں باپ لختِ جگر کے گم ہوجانے پر خون کے آنسو رو رہے تھے۔ حارثہ (حضرت زید کا والد) اعلیٰ درجے کا شاعر تھا، اس کے جذباتِ غم، شعروں میں ڈھل جاتے، جنہیں پڑھ پڑھ کر وہ خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا۔ اس کی ایک دردناک نظم کے چند اشعار کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ اگر قارئین کی اکثریت ذوقِ عربیت سے آشنا ہوتی تو ہم یہ المناک نظم انہیں ضرور سناتے، مگر مجبوراً صرف مطلع پیش کر رہے ہیں اور باقی شعروں کے رواں ترجمے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ ☜

اسلام ہوگئے اور یوں کفر و شرک کی سرزمین پر اللہ کو وحدہ لاشریک ماننے والوں کی ایک چھوٹی سی

کیا صحیح عکاسی ہے اس باپ کے جذبات کی جس کا نورِ عین کھو گیا ہو!

بَكَيْتُ عَلٰى زَيْدٍ وَّ لَمْ اَدْرِ مَا فَعَلْ اَحَيٌّ فَيُرْجٰى اَمْ اَتٰى دُوْنَهُ الْاَجَلْ

(میں زید کے لئے رو رہا ہوں، اور مجھے کچھ پتہ نہیں کہ اس پر کیا گزری---؟ کیا وہ زندہ ہے کہ میں اس کی آس رکھوں، یا اس کو اجل نے آلیا ہے؟

اے کاش! مجھے پتہ چل سکے اے زید! کہ اب عمر بھر تو لوٹ کر آئے گا بھی کہ نہیں؟---اگر تو واپس آجائے تو دنیا میں میرے لئے یہی خوشی بس ہے۔

جب سورج طلوع ہوتا ہے، تب بھی اس کی یاد آتی ہے اور جب غروب ہوتا ہے تب بھی اس کی یاد ستاتی ہے۔

جب ہوائیں چلتی ہیں تو وہ بھی اس کی یاد کو برانگیختہ کر دیتی ہیں---ہائے! اس کے غم اور فکر میں مجھ پر کتنا طویل زمانہ بیت گیا ہے۔

میں پوری کوشش سے اس کی تلاش میں اونٹوں کو دوڑاتا رہوں گا---چاہے اونٹ اکتا جائیں، لیکن میں کبھی نہیں اکتاؤں گا۔

یہ جستجو زندگی بھر جاری رکھوں گا، یہاں تک کہ میری موت آجائے، کہ ہر آدمی نے آخر مرنا ہی ہے۔خواہ اس کی آرزوئیں اسے کتنا ہی بہلاتی رہیں۔)

اتفاق سے ایک دفعہ حضرت زیدؓ کے علاقے کے چند افراد حج کے لئے آئے تو انہوں نے حضرت زید کو پہچان لیا اور ان سے مل کر باپ کی بیقراری و بیتابی کا حال بیان کیا، وہ اشعار بھی سنائے جو حارثہ نے غمِ فراق میں کہے تھے۔حضرت زید نے بھی جواباً تین شعر کہلا بھیجے جن کا ماحصل یہ ہے کہ آپ لوگ میرے لئے اس قدر پریشان اور غمگین نہ ہوں۔

فَاِنِّیْ بِحَمْدِ اللّٰهِ فِیْ خَيْرِ اُسْرَةٍ كِرَامِ مَعَدٍّ كَابِرًا عَنْ كَابِرِ

(کیونکہ میں بحمد اللہ بہترین خاندان میں ہوں---اولادِ معد (قریش کے ایک جدامجد) کے ایسے لوگوں کے درمیان جو آباؤ اجداد سے معزز چلے آتے ہیں۔)(روض الانف ج ۱، ص ۱۶۳)

ان لوگوں نے واپس جا کر جب حارثہ کو زیدؓ کی بازیابی کی نوید سنائی اور دیگر تفصیلات

جماعت تیار ہوگئی۔ یہ بندگان خدا عبادت کے لئے گھاٹیوں کی طرف نکل جاتے اور مشرکین

بتائیں تو حارثہ اور اس کا بھائی کعب، زیدؓ کو لینے مکہ مکرمہ روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچ کر جانِ دو عالم ﷺ سے ملے اور عرض کی

''اے عبدالمطلب کے بیٹے! اے ہاشم کے بیٹے! اے سردار قوم کے بیٹے! ہم آپ کے پاس اپنے بیٹے کے سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں، آپ ہم پر احسان کیجئے اور فدیہ لے کر ہمارا بیٹا ہمیں دے دیجئے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا---''اور کچھ؟''

''نہیں'' انہوں نے کہا ''ہماری آمد کا بس یہی مقصد ہے۔''

''اس طرح کرو'' جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ''کہ زید کو بلاؤ اور اس سے پوچھو کہ وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنے کا خواہشمند ہے۔ اگر تمہارے ساتھ جانے پر رضا مند ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔ لیکن اگر میرے پاس رہنا چاہے تو جو بچہ مجھ سے اتنی الفت رکھتا ہو، اس کو فدیہ لے کر بزور تمہارے حوالے کرنے کا کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔''

انہوں نے کہا---''یہ تو انصاف سے بھی بڑھ کر بات ہے، سراسر احسان ہے۔''

چنانچہ حضرت زیدؓ کو بلایا گیا۔ وہ آئے تو جانِ دو عالم ﷺ نے حارثہ اور کعب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا---''زید! ان کو پہچانتے ہو؟''

زیدؓ نے ان پر ایک نظر ڈالی اور عرض کی---''جی ہاں یا رسول اللہ! ایک میرے والد ہیں، دوسرے چچا۔''

''یہ تجھے لینے آئے ہیں'' جانِ دو عالم ﷺ نے بتایا ''میری صحبت میں تیرا جو تھوڑا سا عرصہ گزرا ہے، اس میں تو نے میرے طرزِ عمل کو بھی اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ اب تیری مرضی ہے، ان کے ساتھ جانے کو جی چاہے تو چلا جا، میری رفاقت پسند ہو تو ادھر ہی ٹھہر جا۔''

کوئی بھی ماں باپ کی فرقت کا مارا بچہ ایسے موقع پر اس کے سوا کیا جواب دے سکتا تھا کہ میں اپنے باپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں اور اپنے اعزہ و اقارب میں رہنا چاہتا ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ اس معصوم نے جس کی عمر اس وقت صرف آٹھ سال تھی، کیا ایمان افروز جواب دیا---؟ اس نے کہا۔

سے چھپ کر نماز ادا کرتے۔

"مَا اُرِیْدُ ھُمَا وَمَا اَنَا بِالَّذِیْ اَخْتَارُ عَلَیْکَ اَحَدًا."

(میں ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔ میں کسی بھی فرد کو آپ پر ترجیح نہیں دے سکتا۔)

اس خلافِ توقع جواب پر باپ اور چچا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حارثہ نے بیٹے کو ملامت کرتے ہوئے کہا

"وَیْحَکَ! اَتَخْتَارُ الْعُبُوْدِیَّۃَ عَلَی الْحُرِّیَّۃِ وَاَبِیْکَ وَاَھْلِ بَیْتِکَ؟"

(تو ہلاک ہو جائے، کیا آزادی پانے، اپنے باپ کے ساتھ جانے اور اپنے خاندان میں رہنے کے بجائے تو غلامی کا طوق گلے میں ڈالے رکھنا چاہتا ہے؟)

"ہاں" حضرت زیدؓ نے اطمینان سے جواب دیا۔ پھر جانِ دو عالم ﷺ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "دراصل میں نے اس عظیم ہستی کے حسن سلوک کا ایسا مظاہرہ دیکھا ہے کہ اب اس ذاتِ گرامی کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جا سکتا۔"

حضرت زیدؓ کی اس والہانہ محبت نے جانِ دو عالم ﷺ کے دل پر گہرا اثر کیا، آپ نے اسی وقت زید کا ہاتھ تھاما اور قریش کے روبرو جا کر اعلان کر دیا۔ اِشْھَدُوْا اَنَّ زَیْدًا اِبْنِیْ. (تم سب گواہ رہنا کہ آج سے زید میرا بیٹا ہے۔)

یوں جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت زیدؓ کو نہ صرف یہ کہ آزاد کر دیا؛ بلکہ اپنا بیٹا قرار دے دیا۔

حارثہ اور کعب نے جب جانِ دو عالم ﷺ کی اس غیر معمولی شفقت کا مشاہدہ کیا تو بیٹے کو حق بجانب پایا اور خوشی خوشی واپس چلے گئے۔ (محمد رسول اللہ ص ۹۰)

جانِ دو عالم کے اس اعلان کی وجہ سے ایک عرصے تک حضرت زیدؓ کو "زید بن محمد" کہا جاتا رہا۔ مگر بعد میں قرآن کریم نے فرمایا کہ کسی کو بیٹا کہہ دینے سے وہ حقیقتاً بیٹا نہیں بن جاتا۔ یہ تو صرف منہ کی بات ہے، جس سے حقیقت نہیں بدل سکتی، اس لئے آئندہ منہ بولے بیٹوں کو ان کے حقیقی آباء کی طرف منسوب کیا کرو۔ (سورہ ۳۳، آیات ۴،۵) ☜

ایک دن حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اہلِ اسلام کے ساتھ ایک گھاٹی میں نماز

اس کے بعد زید ابن محمد کہنا ترک کر دیا گیا اور زید ابن حارثہ کہا جانے لگا؛ تاہم جانِ دو عالم ﷺ ان کو اپنے ہی خاندان کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ اسی بناء پر اپنی پھوپھی زاد بہن زینبؓ کو ان کے عقد میں دے دیا مگر بوجوہ خاوند بیوی میں نباہ نہ ہو سکا اور علیحدگی ہو گئی۔ بعد میں حضرت زینبؓ آپ کی زوجہ بنیں اور اُم المؤمنین ہونے کی سعادت سے بہرہ مند ہو گئیں۔

حضرت زیدؓ کی پوری زندگی جانِ دو عالم ﷺ کے ظلِ عاطفت میں بسر ہوئی اور آپ کی حیات مبارکہ میں ہی ۸ھ کو غزوہ موتہ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَاَرْضَاہُ عَنَّا۔

۳--- بلال بن رباح ؓ

ان کا رنگ کالا تھا، مگر دل نہایت ہی اجلا اور پاک صاف۔ پیدائشی غلام تھے۔ پہلے ابنِ جدعان کی ملکیت میں تھے اور اس کی بکریاں چرانے پر مامور تھے۔ اسی دور میں ایمان کی روشنی نے ان کے دل کو جگمگا دیا۔ غلامانہ زندگی کی مجبوریوں کے پیش نظر پہلے تو اپنے ایمان کو چھپائے رکھا، لیکن ایک دن ''چوری'' پکڑی گئی۔ اس روز حضرت بلالؓ کعبہ کے گرد نصب شدہ بتوں کے پاس کھڑے تھے، اتفاق سے اس وقت وہاں اور کوئی نہیں تھا۔

حضرت بلالؓ نے جب دیکھا کہ مکمل تنہائی ہے تو معبودانِ باطلہ سے نفرت کا بھرپور مظاہرہ شروع کر دیا۔ وہ بتوں پر تھوکتے جاتے اور کہتے جاتے

''قَدْ خَابَ وَخَسِرَ مَنْ عَبَدَ کُنَّ.'' (جس شخص نے تمہاری عبادت کی وہ یقیناً گھاٹے اور خسارے میں رہا۔)

حضرت بلالؓ سمجھ رہے تھے کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا مگر وہ دور سے دیکھے جا چکے تھے۔ دیکھنے والے ابن جدعان کے پاس گئے اور اس سے پوچھا۔

''اَصَبَوْتَ؟'' (کیا تم اپنے دین سے منحرف ہو گئے ہو؟)

''میں---؟'' ابن جدعان حیرت سے بولا ''کیا میرے جیسے انسان کے بارے میں یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟'' ☜

ادا کر رہے تھے کہ ناگاہ مشرکین کا ایک گروہ اِدھر آ نکلا۔ اصحابِ جانِ دو عالم ﷺ کو یوں

''ہاں'' انہوں نے جواب دیا'' کیونکہ تمہارے اس کلوٹے نے آج یہ حرکت کی ہے۔'' (یعنی تمہاری پشت پناہی کے بغیر اس کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔)

ابن جدعان اپنے خداؤں کی اس توہین پر لرز اٹھا۔ اس نے اس جرمِ عظیم کے کفارہ میں بتوں کے لئے سو اونٹ ذبح کئے اور لوگوں سے کہہ دیا کہ بلال کے ساتھ تمہارا جس طرح دل چاہے، سلوک کرو۔ اس کے بعد حضرت بلالؓ کو سزائیں دی جانے لگیں۔ (السیرۃ الحلبیہ ص ۳۲۵)

مگر شدید ابتلا کا دور اس وقت شروع ہوا جب ابن جدعان نے ان کو امیہ بن خلف کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ امیہ بھی ایک ہی ظالم تھا۔ وہ اذیت رسانی کے نت نئے ڈھنگ سوچتا اور حضرت بلالؓ پر آزماتا۔ کبھی ان کی گردن میں رسی ڈال کر لڑکوں کے ہاتھ میں دے دیتا اور لڑکے انہیں مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے۔ گلے پر رسی کے نشان پڑ جاتے، دم گھٹنے لگتا، مگر زبان پر توحید کا نغمہ مچلتا رہتا۔ اَحَدٌ، اَحَدٌ ---اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے۔ (السیرۃ الحلبیہ ص ۲۲۴)

کبھی شدید گرمی کے موسم میں ایک دن بھوکا پیاسا رکھ کر دوسرے دن عین دوپہر کے وقت آگ کی طرح تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر، سینے پر ایک بھاری سل رکھ دیتا اور کہتا۔

''تیرے ساتھ یہی سلوک ہوتا رہے گا، حَتّٰی تَمُوْتَ اَوْتَکْفُرَ بِمُحَمَّدٍ. یہاں تک کہ تو یا تو مر جائے گا، یا محمد کا دامن چھوڑ دے گا۔''

اس کے جواب میں حضرت بلالؓ پھر توحید کا ڈنکا بجا دیتے۔ اَحَدٌ، اَحَدٌ. (البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۵۷)

اور کبھی سنگدلی و بے رحمی کی ہر حد کو توڑتے ہوئے ان کے جسم کو پتھروں سے کوٹتا اور کچلا جاتا۔

(الاستیعاب ج ۱، ص ۱۴۴)

ایک دن صدیق اکبرؓ نے حضرت بلال کو اس عالم میں دیکھا تو امیہ سے کہا

''اَلَاتَتَّقِی اللّٰہَ فِیْ ھٰذَا الْمِسْکِیْنِ؟'' (اس مسکین پر یوں ستم ڈھاتے ہوئے تجھے ذرا بھی خدا کا خوف محسوس نہیں ہوتا؟) ☜

مصروف عبادت دیکھ کر یہ لوگ سیخ پا ہو گئے اور انہیں برا بھلا کہنے لگے۔ تلخ کلامی بڑھی تو

''اس کو تم نے ہی بگاڑا ہے'' امیہ جھنجلا کر بولا ''اگر ایسا ہی ترس آرہا ہے تو اسے چھڑا لو۔'' (یعنی خرید لو۔)

صدیق اکبرؓ نے کہا ''میرے پاس ایک حبشی غلام ہے جو اس سے زیادہ توانا اور مضبوط ہے اور ہے بھی تیرا ہم مذہب---وہ لے لے اور یہ مجھے دے دے!''

امیہ کا تو خود ناک میں دم تھا کہ اس ستم ایجاد کا ہر حربہ بے اثر ہو چکا تھا، ہر تدبیر ناکام ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ رضامند ہو گیا---اور یوں کافر غلام، کافر مالک کے پاس چلا گیا اور مومن غلام، مومن آقا کا ہو گیا۔ (السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۲۲۵)

اگر مومن آقا اس کو اپنی ملکیت میں رکھتا تب بھی اس کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیتا، مگر رحم دل آقا نے صبر و استقامت اور خلوص و وفا کے اس مجسمے کو آزادی کی نعمت سے محروم رکھنا گوارا نہ کیا اور خریدتے ہی لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔

پھر غزوۂ بدر میں خدا نے یہ دن بھی دکھایا کہ ظالم امیہ پر مظلوم بلال شہباز کی طرح جھپٹا اور لمحوں میں اس بے رحم وسفاک شخص کو خاک وخون میں لوٹا دیا اور اس کی مکروہ زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

صدیق اکبرؓ کو اس واقعہ سے بے پناہ مسرت حاصل ہوئی اور انہوں نے حضرت بلالؓ کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

هَنِيئًا ، زَادَکَ الرَّحْمٰنُ خَيْرًا　　　فَقَدْ اَدْرَکْتَ ثَارَکَ يَا بِلَال!

(مبارک ہو بلال!---رحمٰن تمہیں مزید بھلائیوں سے نوازے---کہ تم نے اپنا انتقام لے لیا۔) (الاستیعاب بھامش الاصابہ ج ۱، ص ۱۴۴)

مسجد نبوی کے مؤذن کی حیثیت سے ان کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ وہ اذان بھی دیتے اور حسب موقع جہاد میں بھی شمولیت کر لیتے۔ مگر جانِ دو عالم ﷺ کے وصال کے بعد اذان کے ساتھ ساتھ جہاد کا عمل جاری رکھنا مشکل ہو گیا، کیونکہ سلطنتِ اسلامیہ کی حدود کافی وسیع ہو چکی تھیں اور میدانِ کارزار بہت دور چلا گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اذان کی ذمہ داری سے استعفاد ے دیا اور ملکِ شام میں ☜

نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کے ہاتھ میں کسی مردہ اونٹ

سرحد کے قریب داریا نامی قصبہ میں سکونت اختیار کرلی۔ وہاں قیام کے دوران ایک رات خواب میں جانِ دو عالم ﷺ کی زیارت ہوئی۔ آپ نے فرمایا

''مَاهٰذِهِ الْجَفْوَةُ يَابِلَالُ---؟ اَمَا اٰنَ لَكَ اَنْ تَزُوْرَنِیْ؟''

(یہ کیا بے وفائی ہے بلال---؟ کیا ابھی وہ گھڑی نہیں آئی کہ تم میری زیارت کے لئے آؤ؟)

یہ خواب دیکھ کر بیدار ہوئے تو بے حد افسردہ و غمگین تھے۔ اسی وقت رختِ سفر باندھا اور مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ مزارِ پرانوار پر حاضر ہوئے تو آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا۔ دیر تک روتے رہے اور اپنا چہرہ قبر انور پر ملتے رہے---فَجَعَلَ يَبْكِیْ وَيُمَرِّغُ وَجْهَهٗ عَلَيْهِ---اسی دوران امام حسن اور امام حسین علیہما السلام آپہنچے۔ حضرت بلالؓ نے ان شہزادوں کو سینے سے لگالیا اور چومنے لگے۔ حسنین نے فرمایا---''ہم آپ کی اذان سننا چاہتے ہیں---وہی اذان جو آپ نانا جان کے لئے دیا کرتے تھے۔''

حضرت بلالؓ ان کی فرمائش کو ٹال نہ سکے اور مسجد نبوی میں اپنی پرانی جائے اذان پر چڑھ گئے۔ جب اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہا تو اہل مدینہ چونک اٹھے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا تو ایک ہل چل مچ گئی۔ اور جب اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہا تو لوگ گھروں سے نکل کر مسجد کی طرف دوڑ پڑے۔ حتیٰ کہ پردہ دار خواتین بھی بے ساختہ باہر نکل آئیں۔ سب کی نگاہوں میں وہ حسین زمانہ پھر گیا جب جانِ دو عالم ﷺ بنفسِ نفیس مسجد نبوی میں جلوہ افروز ہوا کرتے تھے اور فضاؤں میں اذانِ بلال گونجا کرتی تھی۔ اس دور کو یاد کرکے ہر شخص بے طرح رو پڑا اور کوچہ بکوچہ، خانہ بخانہ سسکیاں، ہچکیاں اور آہیں گونج اٹھیں۔ اس دن ضبط کے بندھن ٹوٹنے اور اشکوں کے سیلاب امنڈنے کا جو منظر دیکھنے میں آیا، اس کی مثال نہیں ملتی۔

(زرقانی علی المواہب ج ۸، ص ۳۴۲، ۳۴۳)

ابھی بہت سے واقعات ہیں جو دامنِ قلم کو کھینچ رہے ہیں مگر بغرض اختصار ایک دلچسپ واقعہ پر اس مردِ حق گو کے تذکرے کا اختتام کیا جاتا ہے۔

حضرت بلالؓ کے ایک بھائی تھے۔ انہوں نے ایک گھرانے میں اپنے لئے شادی کا پیغام بھیجا۔ لڑکی والوں نے کہا کہ اگر حضرت بلالؓ ہمارے گھر تشریف لے آئیں تو ہم رشتہ دے دیں گے۔ بھائی کے کہنے پر حضرت بلالؓ چلے تو گئے، مگر وہاں جا کر گی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ میرے اس بھائی کی شکل و

کے جبڑے کی ہڈی آ گئی۔ انہوں نے اپنے حریف کو وہی دے ماری، جس سے وہ زخمی ہو گیا اور اس کا خون بہنے لگا۔(۱)

صورت بھی اچھی نہیں ہے اور دین کے معاملے میں بھی کمزور ہے اس لئے آپ لوگوں کا جی چاہے تو رشتہ دیں، نہ چاہے تو انکار کر دیں۔

کیا عجب سفارش تھی---! مگر وہ لوگ بھی کیسے عجیب ایمان والے تھے! انہوں نے کہا ''ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ آپ کے بھائی ہیں---ہم یہ رشتہ ضرور دیں گے۔''

اس طرح برادرِ بلال کی شادی ہو گئی۔ (المستدرک للحاکم ج ۳، ص ۲۸۳)

کیسے سچے انسان تھے حضرت بلال اور کیسے قدر دان تھے وہ لوگ!! رَضِیَ اللّٰہُ تَعالیٰ عَنہ.

حضرت فاروقِ اعظمؓ کے دورِ خلافت میں ۲۰ھ کو اس پیکرِ وفا کا وصال ہو گیا۔

(حضرت بلالؓ کے مزید حالات جاننے کے لئے فصیح و بلیغ صاحبِ قلم مولینا صحبت خان کوہاٹی کی شہکار کتاب ''سیدنا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' کا مطالعہ کیجئے!)

(۱) ہجومِ اعداء سے خوفزدہ ہونے کی بجائے دشمن کو ہڈی مار کر لہولہان کر دینا حضرت سعدؓ کی شجاعت و بسالت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسی لئے تو جانِ دو عالم ﷺ ان پر ناز کیا کرتے تھے اور ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے

''ھٰذَا خَالِیْ --- فَلْیُرِنِیْ اِمْرُءٌ خَالَہٗ.'' (یہ میرے ماموں ہیں---کوئی دکھائے تو سہی ایسا ماموں!)

حضرت سعدؓ آپ کے حقیقی ماموں تو نہیں تھے مگر ان کا تعلق چونکہ خاندان بنی زہرہ سے تھا اور آپ کی والدہ ماجدہ بھی اسی خاندان سے تھیں۔ اس مناسبت سے آپ ان کو اپنا ماموں کہا کرتے تھے۔

ماموں قرار دینے کے علاوہ ان کو لبہائے رسالت نے ایک ایسے اعزاز سے نوازا کہ اس پر حضرت سعد جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔

یہ کارزارِ احد کا واقعہ ہے، جب جانِ دو عالم ﷺ کفار کے نرغے میں آ گئے تھے اور حضرت سعدؓ آپ کا دفاع کر رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے کچھ اتنی عمدگی سے مدافعت کی اور اس خوبی سے دشمنوں پر تیر برسائے کہ آپ کا دل باغ باغ ہو گیا اور زبانِ مبارک سے یہ گراں بہا ☜

بہر حال وقتی طور پر تو معاملہ رفع دفع ہوگیا، مگر جانِ دو عالم ﷺ کو خیال آیا کہ اس

الفاظ ادا ہوئے۔

''اِرْمِ سَعْد! فِدَاکَ اُمِّیْ وَاَبِیْ.'' (تیر چلاؤ سعد! تم پر میرے ماں باپ قربان!)

اللہ اللہ!! صحابہ کرام؛ بلکہ تمام اہل ایمان تو اپنے ماں باپ جانِ دو عالم ﷺ پر قربان کریں اور آپ اپنے ماں باپ حضرت سعدؓ پر قربان کردیں---! واللہ بہت بڑا اعزاز ہے--- بہت ہی بڑا۔

دربارِ نبوت سے حضرت سعدؓ کو ایک اور انعام بھی ملا، کہ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو مستجاب الدعوات بنادیا۔ ایک مرتبہ ان کے لئے آپ نے ان الفاظ میں دعا فرمائی۔

''اَللّٰھُمَّ اسْتَجِبْ لِسَعْدٍ اِذَا دَعَاکَ.'' (اے اللہ! سعد جب بھی تجھ سے کچھ مانگے تو اس کی تمنا پوری فرمادینا۔) (طبقات ابن سعد ج ۳، ص ۱۰۰)

اس دعا کا یہ اثر تھا کہ حضرت سعدؓ جو بھی دعا کرتے، فوراً قبول ہوجاتی۔

ایک دفعہ حضرت سعد نے کچھ لوگوں کو ایک سوار کے گرد کھڑے دیکھا۔ حضرت سعدؓ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو بتایا گیا کہ یہ سوار حضرت علیؓ کی شان میں گستاخی کررہا ہے اور ان کو گالیاں دے رہا ہے۔ (معاذ اللہ)

حضرت سعدؓ سے یہ بے ہودگی برداشت نہ ہوسکی۔ اسی وقت قبلہ رو ہوکر کھڑے ہوگئے اور ہاتھ اٹھا کر یہ بددعا دی۔

(الٰہی! یہ شخص تیرے دوستوں میں سے ایک دوست کو گالیاں دے رہا ہے۔ خداوندا! یہاں پر موجود لوگوں کے منتشر ہونے سے پہلے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھادے۔)

حضرت سعد ابھی بددعا سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ اچانک اس بدزبان سوار کا گھوڑا اس زور سے بدکا کہ وہ بدبخت سر کے بل زمین پر آرہا اور اس کا بھیجا کھل کر اِدھر اُدھر بکھر گیا۔

(مستدرک للحاکم ج ۳، ص ۵۰۰)

حضرت علی سے اتنی والہانہ محبت کے باوجود جنگِ صفین میں غیر جانبدار رہے اور علیؓ و ☜

طرح تو روز روز جھگڑے ہوں گے، اس لئے کوئی ایسا مکان ہونا چاہئے جہاں اہل ایمان مشرکین کی نظروں سے اوجھل رہتے ہوئے اپنے رب کی عبادت بھی کر سکیں اور وہیں ان کی

معاویہؓ میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا کیونکہ جس تلوار سے وہ عمر بھر کافروں کے سر قلم کرتے رہے تھے، اس کو مسلمانوں پر اٹھانا ان کو گوارا نہ ہوا۔

تاریخ اسلام اس مرد مجاہد کے لافانی کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

فاروقی عہد میں تسخیر ایران کے لئے جو لشکر بھیجا گیا تھا، اس کے قائد وسپہ سالار یہی سعد ابن ابی وقاصؓ تھے۔ اس مردِ حق پرست نے آتش پرست ایران کا بیشتر حصہ اپنے گھوڑوں کے سموں تلے روند ڈالا اور میدان قادسیہ میں دشمن کی لاتعداد افواج کو عبرتناک شکست دے کر ایران کے طول وعرض میں اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ فَجَزَاہُ اللّٰہُ عَنَّا وَعَنْ جَمِیْعِ الْمُسْلِمِیْنَ خَیْرًا۔

فاروق اعظمؓ کو ان کی فہم وفراست پر اس قدر اعتماد تھا کہ زندگی کے آخری لمحات میں انتخاب امیر کے لئے جو چھ رکنی مجلسِ شوریٰ نامزد فرمائی تھی، اس میں حضرت سعدؓ کو بھی شامل کیا تھا اور فرمایا تھا

''اِنْ اَصَابَتْہُ الْاِمْرَۃُ فَذَاکَ وَاِلَّا فَلْیَسْتَعِنْ بِہِ الْوَالِیْ۔''

(اگر سعد امیر منتخب ہو گئے تو ٹھیک ہے، ورنہ جو بھی منتخب ہو، اسے چاہئے کہ سعد کی امداد وتعاون سے کام چلائے۔) (الاصابہ ج ۲، ص ۳۳)

ظلمت کدۂ فارس کو نور ایمان سے منور کرنے والا یہ آفتاب ہدایت ۵۵ ھ کو غروب ہو گیا۔ وفات سے چند لمحے پیشتر ایک پرانا اونی جبہ نکلوایا اور وصیت فرمائی کہ مجھے اس کا کفن پہنایا جائے، کیونکہ یہ وہ یادگار جبہ ہے، جسے پہن کر میں نے غزوۂ بدر میں مشرکین کے ساتھ جہاد کیا تھا۔ (مستدرک حاکم ج ۳، ص ۴۹۶)

یہ اہتمام انہوں نے اپنی مغفرت کے لئے نہیں کیا تھا کیونکہ وہ تو ان دس خوش نصیبوں (عشرہ مبشرہ) میں سے ہیں جن کے جنتی ہونے کا اعلان زبانِ رسالت نے کیا تھا --- یہ اہتمام شاید اس لئے تھا، کہ بارگاہ الٰہی میں حاضری اس انداز سے ہو کہ حق وباطل کے اولین معرکہ میں شمولیت کی نشانی تن پر بھی ہو۔ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔

اجتماعی تعلیم و تربیت بھی ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے آپ کی نگاہِ انتخاب ''دارارقم'' پر پڑی۔ حضرت ارقمؓ خود بھی اس مقدس جماعت کے ایک رکن تھے، اس لئے انہیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا؟ چنانچہ دارارقم کو دعوتِ ایمانی کا پہلا ہیڈ کوارٹر بننے کا شرف حاصل ہوگیا--- جہاں اللہ تعالیٰ کا محبوب نمائندہ تین سال تک اپنے پیروکاروں کو آدابِ خود آگاہی سکھاتا رہا اور ان کے سامنے اسرارِ شہنشاہی بے نقاب کرتا رہا۔ (۱)

---

(۱) اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں حضرت ارقمؓ کا نمبر ساتواں ہے۔ ان کے اس مکان میں کیا خصوصیت تھی کہ اسے دعوتِ ایمانی کے خفیہ مرکز کے طور پر منتخب کیا گیا---؟ اس سلسلے میں اگرچہ تاریخ خاموش ہے؛ تاہم غور کرنے سے چند وجوہ سمجھ میں آتی ہیں۔ وَالْعِلْمُ عِنْدَاللهِ الْعَلِيْمِ.

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ مکان کوہ صفا پر واقع تھا اور صفا ایک مقدس اور معظم پہاڑی ہے، کیونکہ وہ شَعَائِرُاللهِ میں سے ہے۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ. اس بنا پر اشاعتِ اسلام کے پاکیزہ اور عظیم کام کے لئے مقدس اور باعظمت مقام کا انتخاب ہر لحاظ سے موزوں تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ صفا مروہ میں جو سعی کی جاتی ہے اس کی ابتدا صفا سے ہی ہوتی ہے۔ اس مناسبت سے تبلیغ دین کی جو ''سعی'' ہو رہی تھی، اس کا آغاز بھی صفا سے کرنا نہایت ہی مناسب تھا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے یہ مکان خفیہ تحریک کے لئے بہترین مقام تھا۔ کیونکہ بلندی سے دشمنوں پر نظر رکھی جاسکتی تھی؛ جبکہ مخالفین نشیب میں ہونے کی وجہ سے اندرونی سرگرمیوں سے آگاہ نہیں ہوسکتے تھے۔

وجہ کچھ بھی ہو، بہرحال یہ مکان اس سعادت سے بہرہ مند ہوا کہ اللہ کا حبیب تین سال تک اس میں ارشاد و ہدایت کی محفل سجاتا رہا اور اپنے اصحاب کے دلوں کو فرامینِ الٰہیہ سے گرماتا رہا۔ ان تین برسوں میں ایمان والوں کی تعداد ۴۰ (چالیس) ہوگئی اور یہ چالیسواں ایسا جیالا نکلا کہ اس نے حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے ہی اعلان کر دیا۔

''آج سے خفیہ عبادت کا سلسلہ ختم، اب صحنِ حرم میں سرِعام عبادت ہوا کرے گی۔''

یہ تاریخ ساز اعلان کرنے والا انسان عمر بن خطاب تھا، جسے دربارِ رسالت سے ☜

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ

تین سال تک یہ تحریک خفیہ طور پر چلتی رہی۔ اس دور میں صرف محرمانِ خاص کو

فاروق کا خطاب عنایت ہوا۔

اس کے بعد علانیہ عبادت شروع ہوگئی اور کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوئی۔

اب چونکہ دارِ ارقم کی کوئی خاص ضرورت نہ رہی تھی، اس لئے حضرت ارقمؓ نے فراغت کے ان لمحات کو غنیمت جانا اور عرض کی

''یارسول اللہ! میں بیت المقدس جانا چاہتا ہوں۔''

''بیت المقدس ---؟ وہاں کیا کام ہے --- کیا تجارت کرنے کا ارادہ ہے؟'' جانِ دو عالم ﷺ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں یارسول اللہ!'' حضرت ارقمؓ نے جواب دیا ''تجارت کے لئے نہیں؛ بلکہ اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے جانا چاہتا ہوں۔''

حضرت ارقمؓ کا خیال ہوگا کہ وہاں نماز پڑھنے کا بہت زیادہ ثواب ہے، اس لئے یہ نعمت حاصل کرلینی چاہئے، مگر جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا۔

''صَلَاةٌ هٰهُنَا خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ ثَمَّ.'' (یہاں ایک نماز پڑھنا وہاں ہزار نمازیں پڑھنے سے افضل ہے۔) (مستدرک حاکم ج ۳، ص ۵۰۴)

چنانچہ انہوں نے بیت المقدس کا ارادہ ترک کردیا اور ہمہ وقت اس ہستی کے ساتھ رہنے لگے، جس کی معیت میں ادا کی گئی ایک نماز بیت المقدس کی ہزاروں نمازوں سے بہتر تھی۔

چونکہ اشاعتِ اسلام کا ابتدائی کام دارِ ارقم میں ہوا تھا، اس وجہ سے اس مکان کا لقب ''دارالاسلام'' ہوگیا۔ یہ لقب بہت بڑا اعزاز تھا اور حضرت ارقمؓ نے اس اعزاز کو تا ابد برقرار رکھنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ مرتے دم وصیت فرما گئے۔

''إِنَّهَا صَدَقَةٌ بِمَكَانِهَا، لَا تُبَاعُ وَلَا تُوْرَثُ.''

(یہ مکان صدقہ ہے (یعنی وقف ہے) نہ اسے بیچا جاسکے گا، نہ اس میں وراثت جاری ☜

اسلام کی دعوت دی جاتی تھی اور پوری احتیاط برتی جاتی کہ راز افشاء نہ ہو کیونکہ اس وقت تک علانیہ دعوت کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، تا آنکہ یہ آیت جلیلہ اتری۔
فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ. (آپ کو جس چیز کا حکم دیا جائے، اسے برملا کہیے۔)

ہو سکے گی۔)

چنانچہ حضرت ارقمؓ کی اولاد اس وصیت پر عمل پیرا رہی، تا آنکہ عباسی حکمران منصور کے زمانے میں امام حسن ؓ کے پوتے محمد نے منصور کے خلاف تحریک شروع کی تو حضرت ارقمؓ کے پوتے عبداللہ نے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ تحریک ناکام ہوئی اور عبداللہ پابہ زنجیر کر دیئے گئے۔ کچھ عرصہ بعد منصور کے ایک نمائندے شہاب نے جیل میں ان سے ملاقات کی۔ اس وقت عبداللہ کی عمر اسی (۸۰) سال سے اوپر تھی اور جیل کی سختیاں جھیل جھیل کر تنگ آچکے تھے۔ شہاب نے پوچھا

''کیا تم رہا ہونا چاہتے ہو؟''

''ہاں۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔

''اس کے لئے شرط یہ ہے۔'' شہاب نے کہا ''کہ دارِ ارقم میں تمہارا جو حصہ ہے، وہ مجھ پر فروخت کر دو کیونکہ امیر المومنین (منصور) اس کو خریدنا چاہتے ہیں۔''

''مگر وہ تو وقف ہے۔'' عبداللہ نے کہا ''علاوہ ازیں، اس میں میرے علاوہ اور بھی ورثاء شریک ہیں۔''

''تم صرف اپنے حصے کے ذمہ دار ہو'' شہاب نے کہا ''دوسروں کا انتظام میں کرلوں گا۔''

چنانچہ مجبوراً عبداللہ نے اپنا حصہ سترہ ہزار روپیہ اور رہائی کے عوض فروخت کر دیا۔ اسی طرح دیگر ورثاء کے حصے بھی خرید لئے گئے اور یوں ملوکیت کے پنجۂ استبداد نے اس مقدس مکان کو اپنی گرفت میں لے کر ذاتی جاگیر بنا لیا۔ (تلخیص المستدرک ج ۳، ص ۵۰۴)

حضرت ارقمؓ جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شامل رہ کر دادِ شجاعت دیتے رہے۔ ۵۳ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کی وصیت کے مطابق نمازِ جنازہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے پڑھائی۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ (الاصابہ ج ۱، ص ۲۸)

اس کے بعد آپ نے صرف مخصوص لوگوں کو دعوت دینے کا طریقہ ترک کر دیا اور ڈنکے کی چوٹ پر اعلان حق کرنا شروع کر دیا۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ

دعوتِ عامہ کا آغاز کہاں سے ہو؟ اس سلسلے میں بھی وحی الٰہی نے رہنمائی فرما دی اور ارشاد ہوا، وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اپنے قریبی خاندان کو (عذاب سے) ڈراؤ) چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ نے اولادِ عبدالمطلب کی ضیافت کا اہتمام کیا، جس میں ابولہب سمیت آپ کے تمام چچاؤں اور پھوپھیوں نے شرکت کی۔ کھانے کے بعد آپ نے انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول بنایا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے خاندان والوں کو عذابِ الٰہی سے ڈراؤں۔

یہ سنتے ہی ابولہب آگ بگولہ ہو گیا اور واہی تباہی بکنے لگا، اس لئے مزید بات چیت نہ ہو سکی اور محفل برخاست ہو گئی۔ (۱)

چند دنوں بعد جبریل امین تشریف لائے اور کہا--- ''یارسول اللہ! خاندان والوں کو آگاہ کرنے کی ایک بار پھر کوشش کیجئے!''

چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ نے دوبارہ سب کو بلایا اور نہایت دردمندانہ انداز میں ان سے خطاب فرمایا۔

پہلے چند تمہیدی باتیں ارشاد فرمائیں، پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے فرمایا۔

''اس اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں اللہ کا رسول ہوں--- خصوصاً تمہاری طرف اور عموماً تمام لوگوں کی طرف۔ واللہ! جس طرح تم سوتے ہو، اسی طرح ایک دن مر جاؤ گے اور جس طرح جاگتے ہو، اسی طرح روز محشر اٹھ کھڑے ہو گے، پھر تم سے حساب لیا جائے گا۔ نیکی کی جزا ملے گی اور برائی کی سزا۔ پھر یا تو ہمیشہ کے لئے جنت میں چلے جاؤ گے، یا ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے۔ خدا کی قسم اے اولاد عبدالمطلب! جتنا کچھ تمہارے لئے میں لے کر آیا ہوں، اتنا کبھی کوئی لے کر نہیں آیا--- میں تمہارے لئے دنیا و آخرت

(۱) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۳۱۰، الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۲۱۔

کی بھلائیاں لے کر آیا ہوں۔"

اس محفل میں بھی ابولہب موجود تھا۔ اس نے حسب سابق پھر جانِ دو عالم ﷺ کو نازیبا باتیں کہنی شروع کر دیں، پھر اپنے بھائیوں بہنوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا

"اے اولاد عبدالمطلب! یہ بہت ہی بری باتیں ہیں۔ اس کو ایسی باتوں سے روکو، پہلے اس سے کہ یہ کام دوسروں کو کرنا پڑے --- اگر لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو اس وقت تم کیا کرو گے ---؟ اگر تم نے اس کو ان کے سپرد کر دیا تو یہ بات تمہارے لئے باعثِ عار ہو گی اور اگر تم نے اس کی حفاظت کی کوشش کی تو تم چند آدمی پورے عرب کا کس طرح مقابلہ کر سکو گے ---؟ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم سب مارے جاؤ گے۔"

جانِ دو عالم ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ(۱) کو ابولہب کی باتیں ناگوار گزریں اور کہنے لگیں۔

---

(۱) جانِ دو عالم ﷺ کی یہ پھوپھی تاریخ اسلام کی بہادر خواتین میں سے ایک ہیں۔ ان کے بیٹے حضرت زبیرؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور غیر معمولی فضائل و مناقب کے حامل ہیں۔ حضرت صفیہؓ حضرت حمزہؓ کی سگی بہن ہیں۔ غزوۂ احد میں جب حضرت حمزہؓ کی شہادت کا المناک سانحہ پیش آیا تو یہ ان کو دیکھنے کے لئے آئیں۔ چونکہ حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک اور ناک کان کٹے ہوئے تھے، اس لئے جانِ دو عالم ﷺ نے مناسب نہ سمجھا کہ یہ ان کو اس حال میں دیکھیں --- نہ جانے بھائی کے پارہ پارہ جسم کو دیکھ کر بہن کے دل پر کیا گزر جائے --- چنانچہ حضرت زبیرؓ نے ان سے کہا۔

"امی جان! رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ واپس چلی جائیں۔"

حضرت صفیہؓ بولیں "کیوں بھلا ---؟ مجھے پتہ ہے کہ میرے بھائی کے ناک کان کاٹ لئے گئے ہیں، مگر اس کے ساتھ یہ سب کچھ تو خدا کی راہ میں ہوا ہے اور خدا کی تقدیر پر مجھ سے زیادہ راضی کون ہو سکتا ہے ---؟ میں انشاء اللہ صابر رہوں گی۔"

حضرت زبیرؓ نے یہ جرأت مندانہ جواب جانِ دو عالم ﷺ کو بتایا تو آپ نے آخری دیدار کی اجازت دے دی۔ حضرت صفیہ نے کمال صبر و ضبط سے بھائی کا لخت لخت لاشہ دیکھا۔ ☜

''تم تو ہر موقع پر اپنے بھتیجے کو رسوا کرنے کے درپے رہتے ہو۔ کیا یہ اچھی بات

اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہا، دعائے مغفرت کی اور کہا--- ''اب انہیں دفن کر دیا جائے۔''
(الاصابہ ج ۴، ص ۳۴۹)

غزوۂ خندق میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ جانِ دو عالم ﷺ نے عورتوں کے تحفظ کی خاطر انہیں فارغ نامی ایک چھوٹے سے قلعہ میں بھیج دیا اور ان کی حفاظت و نگہبانی کے لئے حضرت حسانؓ کو متعین فرما دیا۔ مدینہ کے بد باطن یہودیوں نے سوچا کہ اس وقت مرد تو سارے جہاد میں مصروف ہیں، کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور مستورات کو ذلیل و رسوا کیا جائے۔

چنانچہ انہوں نے ایک آدمی کو سن گن لینے کے لئے قلعہ کی طرف بھیجا۔ حضرت صفیہؓ نے اس کو مشکوک حالت میں پھرتے اور تاک جھانک کرتے دیکھا تو سمجھ گئیں کہ یہودیوں کا جاسوس ہے۔ انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ اگر اس نے واپس جا کر دوسروں کو بتا دیا کہ مستورات کی حفاظت کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے تو نہ جانے ذلیل یہودی کیا کر گزریں۔ اس لئے انہوں نے حضرت حسانؓ سے کہا

''حسان! تم نیچے جاؤ اور اس آدمی کو قتل کر دو!''

حضرت حسانؓ رزم کے آدمی نہ تھے۔ وہ تو بزم کے بادشاہ تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔

''بی بی جی! اگر میں اس کام کا ہوتا تو یہاں عورتوں میں بیٹھا ہوتا---؟ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصروفِ جہاد نہ ہوتا؟''

حضرت حسانؓ کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت صفیہؓ نے خود ہی ہمت کی، ایک خیمے کا چوبی ستون اکھیڑ کر نیچے اتریں، آہستہ سے دروازہ کھولا اور جونہی جاسوس سامنے آیا، چوبی ستون سے ایسا زوردار وار کیا کہ اس کو مار ہی ڈالا۔ پھر واپس جا کر حضرت حسانؓ سے کہا

''حسان! میں نے اس کو مار ڈالا ہے۔ اب تم جا کر اس کا سر کاٹ لاؤ تا کہ اسے قلعہ کے اوپر سے یہودیوں کی آبادی کی طرف پھینک دیا جائے۔ اپنے جاسوس کا یہ حشر دیکھ کر ان کو دوبارہ شرارت کی جرأت نہ ہوگی۔''

مگر حضرت حسانؓ نے پھر معذوری ظاہر کر دی۔ ''بی بی جی! میرے بس سے یہ کام

ہے؟ خدا کی قسم! ہر مذہب کے علماء مدتوں سے یہ خوش خبری سناتے آ رہے ہیں کہ عبدالمطلب کی اولاد سے ایک نبی پیدا ہوگا --- وہ نبی یہی تو ہے۔"

ابولہب بولا --- "یہ سب فضول باتیں ہیں، عربوں کی مشترکہ قوت کے سامنے ہم نہیں ٹھہر سکتے۔"

ابوطالب نے کہا --- "بہر حال جب تک دم میں دم رہا ہم اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔" (۱)

کوہِ صفا پر

قریبی رشتہ داروں کو متنبہ کرنے کے بعد جانِ دو عالم ﷺ باقی ماندہ قریشیوں کو دعوتِ حق دینے کے لئے کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور بآوازِ بلند پکارنے لگے، یَامَعْشَرَ قُرَیْش! یَامَعْشَرَ قُرَیْش!

لوگوں کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو سب آپ کی طرف دوڑ پڑے اور کہنے لگے،

"مَالَکَ یَامُحَمَّدُ؟" (اے محمد! (ﷺ) کیا بات ہے؟)

بھی باہر ہے۔"

مجبوراً یہ فریضہ بھی حضرت صفیہؓ کو ہی انجام دینا پڑا --- اور جب اس کا سر نیچے پھینکا گیا تو یہودی کہنے لگے

"ہم پہلے سے جانتے تھے کہ محمد نے مستورات کے تحفظ کا معقول انتظام کر رکھا ہوگا۔"

(الاصابہ ج ۴، ص ۳۴۹)

غیر معمولی طور پر دلیر اور شجاع ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت صفیہؓ شاعرہ بھی اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ اپنے والد کی وفات، بھائی کی شہادت اور جانِ دو عالم ﷺ کے وصال پر انہوں نے جوشہکار مرثیے کہے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

فاروقِ اعظمؓ کے دورِ خلافت میں بعمر ۷۳ سال انتقال فرمایا۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا.

(۱) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۳۱۱، الآثار المحمدیہ ص ۲۲۲، ۲۲۳.

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا--- ''اگر میں یہ اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کے عقبی دامن سے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے تو کیا تم یقین کر لو گے؟''

''ہاں! کیوں نہیں؟'' سب نے کہا ''ہم نے تم کو بارہا آزمایا ہے اور ہمیشہ سچا پایا ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے قریش کی تمام شاخوں کو نام بنام مخاطب کرنے کے بعد ارشاد فرمایا۔

''میں اللہ کے شدید عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ اے قومِ قریش! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے خاندان والوں کو اس کے عذاب سے ڈراؤں۔ یاد رکھو! جب تک تم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نہ کہو گے، میں تمہارے لئے نہ دنیا کے کسی فائدے کا مالک ہوں، نہ آخرت میں تم کو کوئی نفع پہنچا سکتا ہوں۔''

ابولہب یہاں بھی پہنچا ہوا تھا۔ کہنے لگا، تَبًّا لَکَ، اَلِھٰذَا دَعَوْتَنَا؟ (تو ہلاک ہو جائے، کیا یہی کچھ سنانے کے لئے ہمیں بلایا تھا؟) (۱)

جانِ دو عالم ﷺ تو خاموش ہی رہے، مگر رب ذوالجلال کو اپنے محبوب کی یہ توہین گوارا نہ ہوئی۔ اس نے ابولہب کے الفاظ مزید اضافے کے ساتھ اسی پر لوٹا دیئے۔ (۲)

﴿تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ۝﴾

یہ بھی واضح کر دیا کہ بروزِ قیامت اس کا مال و منال اس کے کسی کام نہ آ سکے گا اور سیدھا جہنم میں جائے گا۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج۳، ص ۳۸، طبقاتِ ابن سعد ج ۱، ص ۱۳۳، محمد رسول اللہ ص ۹۹۔

(۲) رحمٰن و رحیم خدا کو اتنا غصہ کیوں آیا کہ اس نے نام لے کر ابولہب کی تباہی و بربادی کا اعلان کیا؟ حالانکہ پورے قرآن میں اس دور کے کسی کافر کا نام نہیں آیا--- وجہ یہ تھی کہ اس نے اللہ کے محبوب کی شان میں گستاخی کی تھی اور اسے تَبًّا لَکَ کہا تھا۔

معلوم ہوا کہ گستاخِ رسول وہ بدنصیب ہے کہ اس کو ارحم الراحمین کے دامانِ رحمت کے نیچے بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا عَنْ سُوْءِ الْاَدَبِ بِجَاہِ سَیِّدِ الْعَرَبِ۔

﴿مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝﴾
جانے کیوں ابولہب کو جانِ دو عالم ﷺ سے اتنی عداوت تھی؟ اس کی بیوی اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ خار دار شاخیں لاتی اور آپ کے راستے میں کانٹے بکھیرتی رہتی۔ ایک دفعہ اسی طرح لکڑیاں اٹھا کر لا رہی تھی، کہ اچانک رسی کا پھندا گلے میں پڑ گیا اور دم گھٹ کر مر گئی۔

﴿وَامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝﴾
ابولہب کا تو گویا اور کوئی کام ہی نہیں تھا، وہ ہمہ وقت جانِ دو عالم ﷺ کو ایذا پہنچانے، دکھ دینے اور آپ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچنے سے روکنے کی جدوجہد میں مصروف رہتا۔ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ذوالمجاز کے بازار میں لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے فرما رہے تھے۔ "یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قُوْلُوْا، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا." (اے لوگو! لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ دو، نجات پا جاؤ گے۔)
پیچھے سے ایک شخص آپ پر مٹی ڈال رہا تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔
"لوگو! یہ بے دین ہے، جھوٹا ہے، اس کی باتوں میں آ کر کہیں اپنے آبائی دین سے منحرف نہ ہو جانا۔"
وہ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے اس شخص کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ محمد کا چچا ہے، ابولہب۔ (۱)
یہی حال ابوجہل کا تھا۔ اس نے ایک دفعہ قسم کھائی کہ میں کل محمد کا سر ایک بھاری پتھر سے کچل دوں گا۔ دوسرے دن وہ ایک بڑا سا پتھر لے کر حرم میں آ بیٹھا اور جانِ دو عالم ﷺ کا انتظار کرنے لگا۔ آپ حسبِ معمول تشریف لائے اور نماز میں مصروف ہو گئے۔ جب آپ سجدہ ریز ہوئے تو ابوجہل پتھر اٹھا کر آپ کی طرف بڑھا، لیکن جب قریب پہنچا تو یکلخت بھاگ اٹھا، رنگ فق ہو گیا اور شدتِ خوف سے ہاتھ پتھر پر جم کر رہ گیا۔ اس وقت حرم

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۴۱۔

میں کافی لوگ موجود تھے اور سب کی نظریں ابوجہل پر لگی تھیں۔ اس کو یوں خوفزدہ ہوکر بھاگتے دیکھا تو سب اس کے گرد اکٹھے ہوگئے اور پوچھنے لگے

''مَالَکَ یَا اَبَا الْحِکَمِ!؟'' (ابوالحکم! (ابوجہل کی کنیت) کیا ہوگیا ہے؟)

ابوجہل نے کانپتے ہوئے بتایا کہ جب میں محمد کے قریب پہنچا تو میں نے ایک ہیبت ناک اونٹ کو منہ کھولے اپنی طرف بڑھتے دیکھا، وہ مجھے کھا جانا چاہتا تھا۔ اتنے موٹے سر، لمبی گردن اور بڑے بڑے دانتوں والا اونٹ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔(۱)

اسی طرح ایک بار ابوجہل نے ایک اراشی (قبیلہ اراش سے تعلق رکھنے والا) سے اونٹ خریدے اور پیسے دینے سے مکر گیا۔ اراشی بے چارہ مسجد حرام میں آیا۔ اس وقت مسجد میں متعدد رؤساء قریش بیٹھے تھے۔ وہ ان کے پاس جاکر فریادی ہوا کہ ابوالحکم نے مجھ غریب مسافر کا حق مار لیا ہے۔ کیا آپ میں سے کوئی شخص میرا حق دلا سکتا ہے؟

ان کو دل لگی سوجھی، کہنے لگے---''وہ، اُدھر (جانِ دو عالم ﷺ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو مسجد کے ایک کونے میں تشریف فرما تھے) جو شخص بیٹھا ہے نا! اس سے جاکر بات کرو، وہ ضرور تمہارا حق دلا دے گا۔''

اراشی جانِ دو عالم ﷺ کے پاس گیا اور اپنا دکھڑا سنایا۔ آپ اسی وقت اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑے۔ قریش جانتے تھے کہ ابوجہل کو آپ سے شدید دشمنی ہے۔ انہوں نے سوچا کہ اب خوب تماشا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ایک آدمی کو بھیجا کہ تم تماشا دیکھ کر آؤ اور ہمیں بھی تفصیلات بتاؤ۔ لیکن معاملہ ان کی توقعات کے برعکس ہوگیا

جانِ دو عالم ﷺ نے جب جاکر دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ابوجہل نے پوچھا۔

''مَنْ هٰذَا؟'' (کون ہے؟)

جانِ دو عالم ﷺ نے نہایت پروقار انداز میں جواب دیا۔

---

(۱) سیرت ابن هشام ج ۱، ص ۱۸۸، البدایه والنهایه ج ۱، ص ۴۳، السیرة الحلبیه ج ۱، ص ۲۱۴.

''میں محمد ہوں --- باہر نکلو!''

اللہ جانے اس آواز میں کیا تاثیر تھی کہ ابوجہل باہر نکلا تو اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور چہرے پر نام کو بھی سرخی نہ تھی۔

جانِ دو عالم ﷺ نے ابوجہل کو حکم دیا --- ''اس شخص کا حق ادا کرو!''

''میں ابھی ادا کرتا ہوں، آپ یہیں ٹھہریئے!'' ابوجہل یہ کہہ کر اندر گیا اور اس شخص کا جو حق بنتا تھا، لا کر اس کے حوالے کر دیا۔

اراشی کا کام بن گیا۔ اب اسے یہ پتہ تو نہیں تھا کہ دراصل قریش نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا --- وہ سمجھ رہا تھا کہ واقعی انہوں نے صحیح رہنمائی کی تھی۔ چنانچہ ادھر سے واپسی پر اس نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ مجھے پورا پورا حق مل گیا ہے اور جس شخص نے یہ حق دلوایا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔

وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا مگر یہ لوگ حیرت میں ڈوب گئے، تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص بھی واپس آ گیا جس کو انہوں نے تماشا دیکھنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی تماشا نہیں ہوا۔ محمد کے مطالبے پر ابوالحکم نے بلاچون وچرا اراشی کا مال دے دیا تھا۔ یہ بات ان کے لئے ناقابل فہم تھی --- ابوجہل یوں آسانی سے مال دے دے اور وہ بھی محمد کے مطالبے پر!!

اسی دوران ابوجہل بھی آ گیا۔ اس کو دیکھتے ہی سب ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔

''وَیْلَکَ مَالَکَ......؟ تم ہلاک ہو جاؤ، یہ کیا حرکت کی تم نے؟ ہم کو تم سے ایسی بزدلی کی توقع نہ تھی۔''

ابوجہل نے جواب دیا --- ''تم برباد ہو جاؤ، میں کیا کر سکتا تھا؟ میں تو اس کی آواز سنتے ہی دہشت زدہ ہو گیا تھا، پھر جب باہر نکلا تو اس کے پاس اسی طرح کا خوفناک اونٹ جبڑے کھولے کھڑا تھا، پھر میں اس کا مطالبہ پورا نہ کرتا تو کیا کرتا؟''(۱)

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۴۵، السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۳۴۴

ابوجہل کی ضد اور ہٹ دھرمی نے اس کو ایمان کی دولت سے محروم رکھا، ورنہ اس نے ایسے کئی معجزے دیکھے تھے۔

ایک دفعہ اس نے قسم کھائی کہ محمد جب سربسجود ہوگا تو اس کی گردن پر پاؤں رکھوں گا۔ لیکن پاؤں رکھنا تو درکنار، وہ جانِ دو عالم ﷺ کے قریب جانے کی جرأت بھی نہ کرسکا۔ لوگوں نے پوچھا---''کیا بات ہے؟ آگے کیوں نہیں بڑھتے؟''

کہنے لگا ''میرے اور اس کے درمیان آگ کی خندق حائل ہے اور زمین سے آسمان تک دہشت ناک شکلیں اور پَر نظر آرہے ہیں۔''

بعد میں جب اس واقعہ کا تذکرہ جانِ دو عالم ﷺ سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

''اگر اس وقت وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو ملائکہ اس کا ایک ایک عضو الگ کر ڈالتے۔''(۱)

تین ناکام کوششیں

کاروانِ اسلام کو اگرچہ قدم بقدم طرح طرح کی رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا تھا، مگر بایں ہمہ یہ قافلہ جادہ پیما تھا اور اس میں شامل ہونے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ سردارانِ قریش سخت پریشان تھے کیونکہ جانِ دو عالم ﷺ کو دعوتِ توحید سے روکنے کا کوئی حربہ کارگر نہیں ہورہا تھا۔ آخر قریش کے چند رؤساء ابوطالب کے پاس گئے اور کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کی توہین کرتا ہے، اس کو اس سے منع کرو۔ ابوطالب نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے ان کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا اور دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔ جب کفار نے دیکھا کہ ابوطالب نے ہماری باتوں پر کان نہیں دھرا اور اپنے بھتیجے کو منع نہیں کیا تو وہ دوبارہ ابوطالب کے پاس گئے اور اس مرتبہ سختی سے مطالبہ کیا کہ محمد کو روکو، وہ ہمارے خداؤں کو برا کہتا ہے اور ہمیں اور ہمارے آباء و اجداد کو احمق و بیوقوف قرار دیتا ہے۔ ہمارے لئے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت ہے۔ اگر وہ ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو پھر

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۴۴۔

ہماری تمہاری کھلی جنگ ہے۔ یا تو ہم ہلاک ہو جائیں گے یا تم مارے جاؤ گے۔

ابو طالب کے لئے اکابرین قریش کی عداوت مول لینا بہت مشکل تھا، لیکن بھتیجے کی حمایت سے دستبردار ہونا اس سے زیادہ مشکل تھا۔ آخر انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کو بلایا، کفارِ قریش نے جو کچھ کہا تھا، اس سے مطلع کیا اور کہا

''بھتیجے! مجھ پر اور اپنی جان پر رحم کر اور مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈال کہ میں برداشت نہ کر سکوں۔''

ہجومِ اعداء میں جانِ دو عالم ﷺ کا واحد ظاہری سہارا ابو طالب ہی تھے اور اب وہ بھی نصرت و تعاون سے دستکش ہوتے نظر آ رہے تھے---کوئی کیا جانے کہ ایسے میں جانِ دو عالم ﷺ کے دل پر کیا گزری ہوگی---! آپ کی چشمہائے نرگسیں ڈبڈبا آئیں مگر غم و اندوہ کے اس عالم میں بھی بصد صبر و استقلال گویا ہوئے۔

''چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں اور پھر مجھ سے مطالبہ کریں کہ میں اعلانِ توحید ترک کر دوں تو میں پھر بھی ان کا مطالبہ نہیں مان سکتا۔ اب یہ کام جاری رہے گا، یا تو میں کامیاب ہو جاؤں گا، یا اسی راہ میں میری جان چلی جائے گی۔''

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے آپ بے اختیار اشکبار ہو گئے اور اٹھ کر چل دیئے۔ بھتیجے کی یہ کیفیت دیکھ کر شفیق چچا کو بے طرح پیار آ گیا۔ پیچھے سے آواز دی۔ جانِ دو عالم ﷺ نے بچشمِ نم مڑ کر دیکھا تو صاحب عزم و ہمت چچا نے کہا

''جا بھتیجے! تیرا جو جی چاہتا ہے کہہ! خدا کی قسم میں تیری حمایت سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گا۔''

کھلی جنگ کی دھمکی سے بھی کام نہ بنا تو مشرکین نے ایک اور کوشش کی۔ اس دفعہ وہ ولید کے بیٹے عمارہ کو ساتھ لے گئے اور ابو طالب کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ تم عمارہ کو لے لو۔ یہ عرب کا سب سے خوبصورت، بہادر، تندرست و توانا اور عقیل و فہیم نوجوان ہے۔ یہ تمہارا بیٹا ہو گا اور زندگی کے ہر مرحلے میں تمہارا دست و بازو ثابت ہو گا۔ اس کے عوض محمد کو

ہمارے حوالے کردو تاکہ ہم اسے دیویوں اور دیوتاؤں کی توہین کے جرم میں قتل کر ڈالیں اور روز روز کا جھگڑا ختم ہو جائے۔

ابوطالب نے کہا---''کیا ہی احمقانہ تجویز لے کر آئے ہو تم---! یعنی میں تو تمہارے عمارہ کی پرورش اور نگہداشت کرتا رہوں اور تم میرے بھتیجے کو مار ڈالو۔ چہ خوب! ایسا تو میں ہرگز نہیں کروں گا۔''

اس پر کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی مگر ابوطالب اس بے ہودہ مشورے پر عمل کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوئے اور یہ کوشش بھی رائگاں گئی۔ (۱)

مضر تدبیر

اسی دوران حج کا زمانہ آ گیا۔ حج کے لئے اہل عرب دور دراز سے سفر کر کے آتے تھے اور تقریباً ہر علاقے کے لوگ مکہ مکرمہ میں جمع ہوتے تھے۔ اب کفار کو یہ دھڑکا لگا تھا کہ محمد اپنی رس بھری باتوں سے حاجیوں کا دل موہ لے گا اور دعوت اسلام مکہ سے نکل کر سارے عرب میں پھیل جائے گی۔ اس لئے کوئی ایسی الزام تراشی کی جائے کہ لوگ محمد سے متنفر ہو جائیں اور اس کی سامعہ نواز آواز پر کان نہ دھریں۔

اس سلسلے میں سردار ولید بن مغیرہ کے ہاں میٹنگ ہوئی۔ ولید نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا---''یَامَعْشَرَ قُرَیْش! حج کا موسم آ گیا ہے اور ملک بھر سے حجاج کے قافلے آنے والے ہیں۔ ان کو محمد کے اثرات سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ تم لوگ اس کے بارے میں کوئی ایک بات طے کر لو، تاکہ بعد میں تمہارے بیانات میں اختلاف نہ پایا جائے، پھر سب کو وہی بات بتاؤ اور اس کا خوب پروپیگنڈا کرو۔''

لوگوں نے کہا---''ہم سب میں آپ ہی زیادہ تجربہ کار اور سمجھ دار ہیں، اس لئے آپ ہی بتائیے کہ ہمیں کیا کہنا چاہیے؟''

''نہیں، پہلے تم اپنی تجاویز بیان کرو'' ولید نے کہا ''میں سن رہا ہوں۔''

---

(۱) ابن ھشام ج ۱، ص ۱۷۰، ۱۷۱، البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۴۷، ۴۸.

ایک نے کہا---''ہم لوگوں سے کہیں گے کہ محمد کاہن ہے۔''

''غلط، بالکل غلط'' ولید نے پر زور تردید کی ''ہم نے کاہنوں کی باتیں سن رکھی ہیں۔ واللہ! کاہنوں کی گول مول اور بناوٹی عبارتوں کو محمد کی شستہ اور صاف باتوں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔''

''پھر ہم اسے پاگل کہیں گے۔'' دوسرے نے تجویز پیش کی۔

''پاگل ایسے ہوتے ہیں بھلا؟'' ولید نے کہا ''اس میں دیوانوں جیسی کوئی ایک بات بھی تو نہیں۔''

''ہم اس کو شاعر قرار دیں گے۔'' تیسرے نے رائے ظاہر کی۔

''مگر شاعری کی جملہ اصناف سے تو ہم آگاہ ہیں اور محمد کا کلام شاعری کی کسی بھی صنف میں داخل نہیں ہے۔'' ولید نے یہ رائے بھی مسترد کر دی۔

''پھر یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ جادوگر ہے۔'' چوتھی آواز آئی۔

''نہیں'' ولید کو یہ تجویز بھی پسند نہ آئی ''وہ ساحر نہیں ہے---کہاں جادوگروں کے جنتر منتر اور کہاں محمد کا عالی کلام!''

''پھر آخر کیا کہیں---؟ آپ ہی کچھ رہنمائی کیجئے!''

''اگرچہ سارے الزامات سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔'' ولید بولا ''تاہم جادوگری والی بات کسی حد تک چل سکتی ہے۔ تم حاجیوں سے کہو کہ محمد بہت بڑا جادوگر ہے۔ جادو کے زور سے بہن بھائی، خاوند بیوی اور باپ بیٹے میں تفرقہ ڈال دیتا ہے، اس لئے بچ کر رہیں اور اس کی باتیں نہ سنیں۔''

اس تجویز پر سب نے صاد کیا اور اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مگر یہ تدبیر الٹی مضر ثابت ہوئی---ان کی گفتگو سن کر قدرتی طور پر ہر آدمی کے دل میں اس ''جادوگر'' سے ملنے اور اس کی باتیں سننے کا اشتیاق پیدا ہو جاتا---پھر یہ کہاں ممکن تھا کہ کوئی اس جادو بیاں کا بیان سنے اور اس کے دل کی دنیا تہ و بالا نہ ہو جائے!

نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی دعوت پورے عرب میں پھیل گئی اور گھر گھر اس کا چرچا ہونے لگا۔(۱) وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ.

ایذا رسانی

ساری تدبیریں الٹی ہوگئیں تو مشرکین جھنجلا اٹھے اور جانِ دو عالم ﷺ کو ایذاء اور دکھ دینے پر کمر بستہ ہوگئے۔ یہ دور آپ کے لئے بے انتہا مصائب و آلام کا تھا۔ ہر نبی کو اپنی قوم کے ہاتھوں تکالیف پہنچتی رہیں، مگر آپ کے مخالفین تو آپ کی عداوت میں انسانیت کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے۔ شاید اسی زمانے کو یاد کر کے ایک دفعہ آپ نے فرمایا۔ مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ مِثْلَ مَا اُوْذِیْتُ. (کسی نبی کو اتنی ایذاء نہیں پہنچائی گئی، جتنی مجھے پہنچائی گئی۔)

ایک مرتبہ آپ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ ابن ابی معیط آیا اور آپ کے گلے میں چادر ڈال کر اس زور سے بل دیا کہ آپ کا دم گھٹنے لگا۔ کرب و اذیت اتنی شدید تھی کہ آپ کھڑے نہ رہ سکے اور زانو مبارک زمین کے ساتھ جا لگے۔

ناگاہ صدیق اکبرؓ نے اس تنِ نازک پر یہ ستم ٹوٹتا دیکھ لیا، وہ بے تابانہ دوڑتے ہوئے آئے اور دھکے دے کر عقبہ کو آپ سے دور ہٹایا۔ اس وقت شدید غم سے صدیق اکبر کی سسکیاں نکل رہی تھیں، آنسو بہہ رہے تھے اور زبان پر قرآن کی یہ آیت جاری تھی۔

''اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ.''

(ظالمو!) تم ایک انسان کو محض اس جرم میں مار ڈالنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب، اللہ ہے؟(۲)

---

(۱) ابن هشام ج ۱، ص ۱۷۳، زرقانی ج ۱، ص ۳۰۲، البدایه والنهایه ج ۳، ص ۶۱.

(۲) زرقانی ج ۱، ص ۳۰۳، البدایه والنهایه ج ۳، ص ۴۶.

آل فرعون میں ایک شخص تھا جو موسیٰؑ پر ایمان لے آیا تھا، مگر فرعون کے خوف سے ☜

اسی طرح ایک مرتبہ جانِ دو عالم ﷺ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ رؤساء شرک بھی حرم میں موجود تھے، اچانک ابوجہل آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا،

''ذرا اس ریا کار کو دیکھو تو سہی ---!'' پھر اس کو ایک انتہائی رکیک اور گھٹیا حرکت سوجھی، کہنے لگا ---''فلاں جگہ کل اونٹ ذبح کئے گئے ہیں۔ ان کی آنتیں اور اوجھڑیاں وہاں بکھری پڑی ہیں --- ہے کوئی ایسا جیالا، جو ان کو اٹھا لائے اور جب محمد سربسجود ہو تو اس کے شانوں اور گردن پر رکھ دے؟''

عقبہ ابن ابی معیط ایسے ''نیکی'' کے کاموں میں پیش پیش رہتا تھا۔ وہ بدبخت اٹھا اور غلاظت آلود اوجھڑیاں اٹھا لایا اور جب جانِ دو عالم ﷺ سجدہ ریز ہوئے تو اس نے نجاست سے لتھڑا ہوا وہ سارا ملبہ آپ کی پاک گردن اور مطہر شانوں پر رکھ دیا۔ اس کے بوجھ سے آپ کے لئے سر اٹھانا دشوار ہو گیا۔ آپ کی یہ کیفیت دیکھ کر بدبختوں کو

اس نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ یہ آیت مبارکہ اس کے الفاظ کی حکایت ہے۔

اس نے لوگوں کو حضرت موسیٰ کے درپے آزار دیکھ کر کہا تھا کہ تم ایک ایسے شخص کو مار ڈالنا چاہتے ہو جو اللہ کو اپنا رب کہتا ہے، حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے کھلی نشانیاں لے کر آیا ہے۔

ایک مرتبہ سیدنا علیؓ، صدیق اکبرؓ کا مندرجہ بالا واقعہ بیان کر کے رو پڑے، پھر حاضرین سے پوچھا---''تمہارے خیال میں مومنِ آل فرعون افضل ہے یا صدیق اکبر؟''

لوگ آپ کی زبان سے اس سوال کا جواب سننے کے اشتیاق میں خاموش رہے تو آپ نے فرمایا۔

''وَاللهِ لَسَاعَةٌ مِنْ اَبِیْ بَکْرٍ خَیْرٌ مِنْ مِثْلِ مُؤْمِنِ اٰلِ فِرْعَوْنَ --- ذَاکَ رَجُلٌ یَکْتُمُ اِیْمَانَهٗ وَهٰذَا اَعْلَنَ اِیْمَانَهٗ.''

(اللہ کی قسم! صدیق کی حیات کا ایک لمحہ مومن آل فرعون کی پوری زندگی سے افضل ہے۔ اس نے تو اپنا ایمان چھپا رکھا تھا؛ جبکہ صدیق نے دشمنوں کے نرغے میں برملا ایمان کا اظہار کیا تھا۔)

زرقانی ج ۱، ص ۳۰۴.

اتنی مسرت حاصل ہوئی کہ وہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے اور ایک دوسرے پر گرنے لگے۔

اسی دوران کسی نے سیدہ فاطمہؓ کو مطلع کر دیا۔ وہ آٹھ دس سال کی معصوم بچی دوڑتی ہوئی آئی، مشرکین کو برا بھلا کہا اور اپنے پیارے ابا جان کی گردن سے نجس اوجھڑیاں اتار کر پرے پھینکیں۔

یوں تو جانِ دو عالم ﷺ نے کبھی مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنے دشمنوں کو بددعا نہ دی تھی لیکن اس مرتبہ انہوں نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ سراپا رحمت کو بھی جلال آ گیا--- جلال کیسے نہ آتا؟--- ظالموں نے ایسے وقت میں ان کی گردن پر پلیدی لا ڈالی تھی، جب وہ اپنے محبوب رب کے ساتھ مصروف راز و نیاز تھے اور قرب و وصال کی لذتوں سے سرفراز تھے۔ کیف و سرور کی ایسی شیریں گھڑیوں میں یہ گھٹیا حرکت آپ کو تڑپا گئی، چنانچہ نماز سے فارغ ہوتے ہی آپ نے نام بنام ان کو بددعا دی۔

"اَللّٰهُمَّ عَلَيْکَ بِعُمَرَ بْنِ هِشَامٍ وَالْوَلِيْدِ بْنِ رَبِيْعَةَ وَ عُتْبَةَ ابْنِ رَبِيْعَةَ........." (الٰہی! اپنی گرفت میں لے لے، ابوجہل کو، ولید کو، عتبہ کو، شیبہ کو، امیہ کو، عقبہ کو اور عمارہ کو۔)(۱)

آپ کی بددعا سن کر سب کے رنگ فق ہو گئے--- جانتے تھے کہ محمد کے منہ سے نکلی بات ہر حال میں پوری ہو کر رہتی ہے۔

بات واقعی پوری ہوئی--- گفتۂ او گفتۂ اللہ بود--- یہ سارے کے سارے عبرتناک موت سے دوچار ہوئے اور تاابد جہنم میں جلنے کے لئے راہی عدم ہوئے۔

وَاُتْبِعُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ. رہتی دنیا تک ان پر پھٹکار برستی رہے گی اور روزِ محشر بھی ملعون ہوں گے۔

اسلامِ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ

ابو طالب جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ بے انتہا محبت رکھتے تھے اگر ان کے بس

---

(۱) زرقانی ج ۱، ص ۳۰۵.

میں ہوتا تو وہ اپنے بھتیجے کے تلوے میں ایک کانٹا بھی نہ چبھنے دیتے، لیکن ایک تو ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، دوسرے وہ جسمانی طور پر کمزور تھے؛ جبکہ جانِ دو عالم ﷺ کے اعداء مکہ کے رئیس تھے اور انتہائی مضبوط و طاقتور۔ اب کسی ایسے منچلے اور جیالے کی ضرورت تھی جو رؤساء مکہ کا ہم پلہ ہو اور ان کے ساتھ انہی کی زبان میں گفتگو کر سکے --- اور یہ ضرورت اتنے عمدہ طریقے سے پوری ہوئی کہ پھر مکہ میں آپ کو ستانے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ یعنی آپ کے دوسرے چچا اسد اللہ واسد رسولہ (۱) سیدنا وسید الشھداء حمزۃ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

حضرت حمزہؓ عرب کے نہایت زور آور، شجاع، نڈر اور بے باک انسان تھے۔ مزاجاً ان لوگوں میں سے تھے جو دشمن کے منہ پر تھپڑ پہلے مارتے ہیں اور وجہ بعد میں بیان کرتے ہیں۔ شکار کے شائق تھے اور تقریباً روزانہ ہی تیر کمان لے کر شکارگاہ کی طرف نکل جایا کرتے تھے۔ ایک دن ابوجہل نے جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ تلخ کلامی کی اور جو کچھ منہ میں آیا بکتا چلا گیا۔ حضرت صفیہ کی ایک آزاد کردہ کنیز کا گھر بھی وہیں تھا۔ اس نے ابوجہل کی

---

(۱) اسد اللہ واسد رسولہ (اللہ و رسول کا شیر) حضرت حمزہؓ کا یہ لقب نہ صرف زمین پر؛ بلکہ آسمانوں میں بھی رائج ہے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا --- "مجھے جبریل نے خبر دی ہے کہ آسمان والوں کے پاس حمزہ کا نام اس طرح لکھا ہے حمزۃ ابن عبدالمطلب اسد اللہ واسد رسولہ۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۱۹۴۔

جانِ دو عالم ﷺ کا چچا ہونے کے علاوہ رضاعی بھائی بھی تھے کیونکہ ابولہب کی کنیز ثویبہ نے دونوں کو مختلف وقتوں میں دودھ پلایا تھا۔

اسی لئے جب جانِ دو عالم ﷺ کو ان کی بیٹی سے شادی کرنے کی ترغیب دی گئی تو آپ نے فرمایا۔

"اِنَّمَا اِبْنَۃُ اَخِیْ مِنَ الرَّضَاعَۃ"

(وہ میرے دودھ شریک بھائی کی بیٹی ہے۔) طبقات ابن سعد ج ۳، ص ۶

غزوۂ احد میں حضرت حمزہؓ کی المناک شہادت کا واقعہ پیش آیا، باقی تفصیلات وہیں پر ذکر کی جائیں گی، اِنشاءَ اللہ

ساری خرافات اپنے کانوں سے سنیں اور جب حضرت حمزہؓ حسب معمول شکار سے لوٹے تو ان سے کہنے لگی۔

''آپ کو پتہ ہے آج ابوالحکم نے آپ کے بھتیجے کے ساتھ کیا سلوک کیا---؟ اس نے محمد ﷺ کے ساتھ نہایت بے ہودہ اور دل آزار باتیں کیں اور انہیں بہت دکھ پہنچایا، مگر وہ خاموشی سے سنتے رہے اور ابوالحکم کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔''

حضرت حمزہؓ کو یہ سن کر سخت غصہ آیا---ابوالحکم کی یہ جرأت کہ میرے بھتیجے کے ساتھ ایسی گفتگو کرے---! اسی وقت دوڑتے ہوئے حرم شریف کی طرف روانہ ہو گئے۔

ابوجہل کعبہ کے پاس مجلس لگائے خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ حضرت حمزہؓ جا پہنچے اور کوئی بات کئے بغیر اپنے ہاتھ میں پکڑی کمان اس زور سے ابوجہل کے سر پر ماری کہ اس کا سر زخمی ہو گیا اور خون بہنے لگا، پھر انتہائی جلال کے عالم میں اس سے مخاطب ہوئے۔

''تو نے محمد کو گالیاں دی ہیں اور بکواس کی ہے---؟ آج سے میں بھی اس کے دین پر ہوں اور وہی کچھ کہتا ہوں جو وہ کہتا ہے، اگر تُو مجھے روک سکتا ہے تو روک لے۔''

ابوجہل ان کے غیض و غضب کو دیکھ کر گھبرا گیا اور لگا توجیہیں پیش کرنے،

''دیکھو نا، ابوعمارہ! (حضرت حمزہؓ کی کنیت) وہ ہمیں بے وقوف قرار دیتا ہے، ہمارے خداؤں کو برا کہتا ہے اور آبائی دین کی مخالفت کرتا ہے۔''

''تمہاری بیوقوفی میں کوئی شک ہے کیا؟'' حضرت حمزہؓ نے جواب دیا ''بے جان پتھروں کو پوجنے والے احمق نہیں تو اور کیا ہیں؟ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔''

ابوجہل کی کیا مجال تھی کہ اس شیرِ غراں کے سامنے مزید لب کشائی کرتا---! البتہ اس کے چند حمایتی اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت حمزہؓ سے پوچھنے لگے۔

''کیا تم نے اپنا آبائی دین چھوڑ دیا ہے؟''

''ہاں! چھوڑ دیا ہے۔'' حضرت حمزہؓ نے دوٹوک جواب دیا ''اور کیوں نہ چھوڑتا؟ جب کہ میں نے جان لیا ہے کہ محمد جو کچھ کہتا ہے، صحیح کہتا ہے---اگر تم مجھے منع کر سکتے ہو تو کر دیکھو!''

یہ سن کر ابو جہل کے کچھ حواری غصے میں حضرت حمزہ کی طرف بڑھے مگر ابو جہل جانتا تھا کہ حمزہ میرے حواریوں کے بس کے نہیں ہیں، اس لئے کہنے لگا۔

''چھوڑو! ابو عمارہ کو جانے دو۔ یہ غصے میں حق بجانب ہے۔ واقعی میں نے اس کے بھتیجے کو ناروا باتیں کہی ہیں۔'' (۱)

جس شخص کی ہیبت و دبدبے کا یہ عالم ہو کہ سرِ محفل ابو جہل جیسے سردار کا سر بجا دے اور کسی کو دَم مارنے کی جرأت نہ ہو، اس کے دائرہ اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد مکہ مکرمہ میں کس کی ہمت تھی کہ جانِ دو عالم ﷺ کو ایذاء دے یا تکلیف پہنچائے؟

مستضعفین

جانِ دو عالم ﷺ پر ہاتھ اٹھانا ممکن نہ رہا تو ظالموں نے اذیت رسانی کے تمام حربے ضعیفوں، مسکینوں اور غلاموں پر آزمانے شروع کر دیئے۔ شقاوت و قساوت کے ان مظاہروں میں بوڑھے جوان یا عورت مرد کی کوئی تمیز نہ تھی، جس کا جس پر بس چلا ظلم کی انتہا کر دی۔

ان مظلوموں میں سے سیدنا بلالؓ کے حالات پچھلے صفحات پر گزر چکے ہیں۔ مزید چند پیکرانِ وفا کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

ابو فکیھہ رضی اللہ عنہ

صفوان ابن امیہ کے غلام تھے، حضرت بلالؓ کے ساتھ ہی اسلام لائے اور انہی کی طرح تشدد کا نشانہ بننے لگے۔

ایک دن شدید گرمی میں دوپہر کے وقت صفوان کے باپ امیہ نے ان کو گرم پتھروں پر لٹایا ہوا تھا اور ان کے سینے پر اتنا بھاری پتھر رکھا ہوا تھا کہ ان کی زبان باہر نکل آئی تھی۔ اس پر بھی سنگدلوں کی تسکین نہیں ہو رہی تھی اور امیہ کا بھائی --- جو قریب کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا --- اُمیہ کو مزید تشدد پر اُکساتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۳۲، سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۱۸۵، سیرت حلبیہ ج ۱، ص ۳۲۲۔

''زِدْهُ عَذَابًا........''(اس پر اور تشدد کرو اور اس وقت تک کرتے رہو جب تک محمدآ کر اپنے جادو کے زور سے اس کو چھڑا نہ لے۔)

صدیق اکبرؓ نے ان کو اس حال میں دیکھا تو خرید کر آزاد کر دیا۔(۱)

خباب بن ارت رضی اللہ عنہ

اُمِ انمار کے غلام تھے۔ان کو دہکتے انگاروں پر لٹایا جاتا، جسم جلتا، چربی پگھلتی اور آگ بجھ جاتی، مگر آتشِ انتقام سرد نہ ہوتی۔

ایک مرتبہ انہوں نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو اس پر برص جیسے سفید داغ پڑے ہوئے تھے۔انہوں نے بتایا کہ یہ داغ اس وقت کی یادگار ہیں جب مجھے آگ پر لٹایا جاتا تھا۔(۲) کبھی ان کی مالکہ لوہے کی سلاخ گرم کر کے ان کے سر پر رکھ دیتی، یہاں تک کہ سلاخ ٹھنڈی ہو جاتی۔ایک دن حضرت خبابؓ نے بارگاہِ نبوت میں اپنی حالتِ زار بیان کی تو جانِ دوعالم ﷺ نے دعا فرمائی۔

''اَللّٰھُمَّ انْصُرْ خَبَابًا''(یااللہ!خباب کی امداد فرمادے۔)

اور اللہ تعالیٰ نے خبابؓ کی یوں امداد فرمائی کہ ان کی مالکہ اُمِ انمار کے سر میں شدید درد شروع ہو گیا۔اس وقت کے سیانوں نے کہا کہ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ اس کا سر داغا جائے، چنانچہ معاملہ الٹ گیا---اب خبابؓ کے ہاتھ میں سرخ کیا ہوا سریا ہوتا اور اُمِ انمار کا سر۔وَاللّٰہُ عَلٰی مَایَشَآءُ قَدِیْرٌ ٥(۳)

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ

حضرت عمارؓ کے والد یاسر دراصل یمن کے رہنے والے تھے۔ایک دفعہ اپنے بھائی کے ساتھ مکہ آئے تو یہیں کے ہو رہے۔ابوحذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سمیہ کے ساتھ ان کا

---

(۱) سیرت حلبیه ج ۱، ص ۳۲۶، الآثار المحمدیه ج ۱، ص ۲۸۱.

(۲) طبقات ابن سعد ج ۳، ص ۱۱۷، الآثار المحمدیه ج ۱، ص ۲۷۷.

(۳) سیرت حلبیه ج ۱، ص ۳۲۷، الآثار المحمدیه ج ۱، ص ۲۷۷.

نکاح کر دیا۔ حضرت عمارؓ اسی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ یاسرؓ پردیسی تھے اور سمیہ کنیز، اس لئے بے سہارا تھے۔ جب عمارؓ، یاسرؓ اور سمیہؓ، تینوں ہی ایمان لے آئے تو مشرکین کی آتش انتقام بھڑک اٹھی اور انہوں نے ان تینوں کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچانا شروع کر دیں۔ حضرت یاسرؓ تشدد کی تاب نہ لاسکے اور واصل بحق ہوگئے۔ حضرت سمیہؓ کو ابوجہل نے اس زور سے برچھی ماری کہ وہ تڑپ تڑپ کر مرگئیں۔ یہ اسلام کی پہلی شہیدہ خاتون تھیں۔ حضرت عمارؓ البتہ زندہ رہے اور مدتوں سختیاں جھیلتے رہے۔ کبھی ان کو لوہے کی زرہ پہنا کر سخت گرم دھوپ میں بٹھایا جاتا اور کبھی ان کے بدن کو آگ سے جلایا جاتا۔ جب اذیت رسانی کا مرحلہ گزر جاتا تو جانِ دوعالم ﷺ تشریف لاتے اور ان کے جلے ہوئے بدن پر اپنا دستِ شفقت پھیرتے ہوئے اس طرح دم کرتے --- ''يَا نَارُ كُونِيْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰى عَمَّارٍ كَمَا كُنْتِ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ'' (اے آگ تو عمار کے لئے اسی طرح ٹھنڈی اور سلامتی بن جا، جس طرح ابراہیمؑ کے لئے بنی تھی۔) (۱)

کون جانے کہ اس پیار بھرے انداز میں دم کرنے اور اس نورانی ہاتھ کے لمس سے حضرت عمارؓ کے بدن میں کیف وسرور اور برودت وسکون کی کیسی لہریں دوڑ جاتی ہوں گی

کبھی عین عالم تعذیب میں جانِ دوعالم ﷺ ان کو یہ خوشخبری سناتے --- اِصْبِرُوْا يَا اٰلَ يَاسِرٍ! فَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ. (اے آل یاسر! صبر کرو، تمہارا ٹھکانہ جنت ہے۔) (۲)

---

(۱) سیرت حلبیہ ج ۱، ص ۳۲۷.

(۲) (طبقاتِ ابن سعد ج ۳، ص ۱۷۸.

حضرت عمارؓ کو تاریخ اسلام میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ جانِ دوعالم ﷺ کے ساتھ تمام مشہور غزوات میں شریک رہے اور آقا کی خصوصی نگاہِ التفات سے سرفراز ہوئے۔ ایک دفعہ آپ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر کچھ لوگوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ لشکر میں حضرت عمارؓ بھی شامل تھے۔ دورانِ جنگ ایک مسئلے میں دونوں کا اختلاف ہوگیا جو بڑھتے بڑھتے تلخ کلامی تک جا پہنچا۔ واپسی پر دونوں نے جانِ دوعالم ﷺ کے روبرو ایک دوسرے کی شکایت کی۔ ☜

صہیب رومی رضی اللہ عنہ

یہ رومی مشہور ہیں مگر درحقیقت یہ رومی نہیں تھے؛ بلکہ عربی تھے اور ان کے والد

آپ خاموشی سے سنتے رہے اور کسی کو کوئی جواب نہ دیا۔ جب حضرت عمار نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ میرے حق میں فیصلہ نہیں فرما رہے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اٹھ کر چل دیئے۔ آپ سے اس انسان کا رونا برداشت نہ ہو سکا جس نے اسلام کے لئے اذیت ناک مراحل طے کئے تھے۔ چنانچہ آپ نے حضرت خالدؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا

''مَنْ یَسُبَّ عَمَّارًا یَسُبَّہُ اللہُ وَمَنْ یُبْغِضْ عَمَّارًا یُبْغِضْہُ اللہُ وَمَنْ یُحَقِّرْ عَمَّارًا یُحَقِّرْہُ اللہُ. (جو عمار کو برا کہے گا خدا اس کو برا سمجھے گا، جو عمار سے بغض رکھے گا، خدا اس کو ناپسند کرے گا اور جو عمار کو حقیر جانے گا، خدا اس کو حقیر جانے گا۔)

حضرت خالدؓ جانِ دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سن کر باہر نکلے، حضرت عمارؓ کو تلاش کیا، ان سے معافی مانگی اور اس وقت تک معافی طلب کرتے رہے، جب تک حضرت عمارؓ نے معاف نہیں کر دیا۔

(مستدرک ج ۳، ص ۳۸۹، ۳۹۱)

جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ حضرت عمارؓ کو جو محبت تھی، وہ تو تھی ہی، اہل بیت نبی سے بھی آپ کو اس قدر والہانہ عقیدت تھی کہ ان کی شان میں ذرا سی گستاخی حضرت عمارؓ کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ ایک شخص نے ان کے روبرو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شان میں کچھ گستاخانہ کلمات کہہ دیئے تو وہ تڑپ کر بولے۔

''اُسْکُتْ مَقْبُوْحًا مَنْبُوْحًا --- اَتُؤْذِیْ حَبِیْبَۃَ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ. (چپ رہ بے ہودہ بھونکنے والے! --- کیا تو محبوبۂ رسول ﷺ کو ایذا پہنچانا چاہتا ہے؟) (تلخیص المستدرک ج ۳، ص ۳۹۳)

مسجد نبوی کی تعمیر میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دیگر صحابہ ایک ایک پتھر اٹھا کر لا رہے تھے اور حضرت عمارؓ دو دو پتھر۔ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کے غبار آلود سر کو دیکھا تو اپنے دستِ مبارک سے ان کے سر سے مٹی جھاڑی اور فرمایا۔

''وَیْحَکَ اِبْنَ سُمَیَّۃَ! تَقْتُلُکَ الْفِئَۃُ الْبَاغِیَۃُ.'' (تجھ پر افسوس ہے سمیہ کے ☜

سنان کسریٰ کی طرف سے ایلہ کے حاکم تھے۔ ایک دفعہ رومیوں نے ان کے علاقے پر حملہ کیا اور حضرت صہیبؓ کو بچپن کی عمر میں گرفتار کر کے ساتھ لے گئے۔ یہ وہیں پلے بڑھے، اس لئے رومی مشہور ہو گئے۔ جوان ہوئے تو رومیوں نے ان کو قبیلہ بنی کلب کے ہاتھ فروخت کر دیا اور بنی کلب نے مکہ میں لا کر عبداللہ بن جدعان پر بیچ دیا۔ بعد میں ان کے آقا نے اگرچہ ان کو آزاد کر دیا تھا مگر تھے تو غریب الوطن ہی، اس لئے ایمان لانے کے جرم میں ان کو اس قدر اذیتیں دی جاتیں کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے اور سوچنے سمجھنے کی قوتیں زائل ہو جاتیں مگر ان کی استقامت میں فرق نہ آتا۔ (۱)

بیٹے!--- تجھ کو ایک باغی جماعت مار ڈالے گی۔) طبقات ابن سعد ج ۳، ص ۱۸۰۔

جانِ دو عالم ﷺ کی یہ پیشگوئی کئی سال بعد پوری ہوئی جب معرکہ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے انہوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

شہادت کے دن روزے سے تھے۔ شام کے وقت پانی ملے ہوئے دودھ کے ساتھ روزہ افطار کیا پھر فرمایا۔

''مجھے رسول اللہ ﷺ نے بتا دیا تھا کہ میری زندگی کی آخری غذا پانی والا دودھ ہوگا۔''

اسی رات لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ (مستدرک حاکم ج ۳، ص ۳۸۵)

شہادت کے وقت ان کی عمر ۹۴ سال تھی۔

سبحان اللہ! اس عمر میں بھی جس چیز کو حق سمجھا، اس کے لئے جان لڑا دی۔

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ

(۱) قرآن کریم میں ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ (کچھ لوگ خدا کی رضا جوئی کی خاطر اپنے آپ کو خرید لیتے ہیں۔) یہ آیت حضرت صہیبؓ ہی کی شان میں نازل ہوئی تھی، آپ نے جب سوئے مدینہ ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنا سامان باندھ کر تیار ہوئے تو مشرکین مکہ نے آپ کو روک لیا اور کہا۔

''جب تم یہاں آئے تھے، تو فقیر و محتاج تھے، یہاں رہ کر مالدار اور غنی ہو گئے ہو، اب تم

مردوں کے علاوہ بہت سی کنیزوں پر بھی ایسے ہی ہولناک مظالم ڈھائے گئے۔

حضرت زنیرہؓ ایک بے کس کنیز تھیں، اسلام لائیں، تو ابوجہل از روئے تمسخر کہنے لگا، ''اگر اسلام سچا مذہب ہوتا، تو زنیرہ ہم سے سبقت نہ لے جاتی --- بھلا یہ بھی کوئی تک

چاہتے ہو کہ وہ سب کچھ جو تم نے یہاں کمایا، ساتھ لے کر مدینہ چلے جاؤ! --- واللہ! یہ تو ہم کبھی نہ ہونے دیں گے۔''

حضرت صہیبؓ نے کہا ''اگر میں یہ سارا کچھ تمہارے لئے چھوڑ دوں تو کیا تم مجھے جانے دو گے؟''

''ہاں! پھر تم آزاد ہو۔'' مشرکین نے جواب دیا۔

اور حضرت صہیبؓ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنا سارا ساز و سامان اور مال و متاع ان کے حوالے کر دیا اور خالی ہاتھ روانہ ہو گئے۔ جانِ دو عالم ﷺ کو جب ان کی اس قربانی کی خبر دی گئی تو آپ نے فرمایا۔

''رَبِحَ صُهَيْبٌ، رَبِحَ صُهَيْبٌ.'' (صہیب نے بڑا نفع کمایا، صہیب نے بڑا نفع کمایا۔)

واقعی جان و ایمان کی سلامتی کے عوض سب کچھ قربان کر دینا نفع مند سودا ہے۔

اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی، وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِئ........الآیہ۔

مزاج کے اعتبار سے حضرت صہیبؓ بہت زندہ دل اور خوش طبع انسان تھے۔ جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ کے قریب پہنچے تو اس وقت جانِ دو عالم ﷺ قبا (مدینہ کے پاس ایک بستی) میں تشریف فرما تھے۔ ابوبکرؓ و عمرؓ بھی پاس بیٹھے تھے۔ تینوں کے سامنے کھجوریں پڑی تھیں اور کھانے میں مصروف تھے۔ حضرت صہیبؓ کو طویل سفر کی وجہ سے سخت بھوک لگی تھی، اس لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی کھجوروں پر ٹوٹ پڑے۔ اس وقت ان کی ایک آنکھ دکھ رہی تھی۔ چونکہ آشوب چشم کے دوران میٹھی چیز کھانا مضر سمجھا جاتا ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے دل لگی کرتے ہوئے فرمایا۔

''یارسول اللہ! آپ نے صہیب کو دیکھا؟ --- آنکھ آئی ہوئی ہے اور کھجوریں کھائے جا رہا ہے!''

حضرت صہیبؓ نے برجستہ جواب دیا، ''یارسول اللہ! میں خراب آنکھ والی طرف سے تھوڑا ہی کھا رہا ہوں، میں تو صحیح آنکھ والی جانب سے کھا رہا ہوں۔''

جانِ دو عالم ﷺ اس دلچسپ توجیہہ سے محظوظ ہوئے اور تبسم فرمایا۔ طبقات ابن ☜

ہے کہ ہم تو باطل پہ ہوں اور زنیرہ حق پر ہو!''

اس بے سہارا خاتون پر اتنا ستم کیا گیا کہ اس کی بینائی جاتی رہی۔ مشرکین نے کہا۔

''لات وعزیٰ نے اس کی نظر چھین لی ہے۔''

محترمہ زنیرہؓ کا ایمان ملاحظہ ہو کہ انہوں نے جواب دیا۔

''کَذَبُوْا وَبَیْتِ اللہِ.......'' (خدا کے گھر کی قسم! یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں---لات و عزیٰ کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان؛ البتہ میرا رب جب چاہے میری بینائی لوٹا دے۔)

اس بے بس عورت کی یہ اولوالعزمی اللہ تعالیٰ کو اتنی بھائی کہ اسی وقت اس کی بینائی لوٹ آئی۔ مشرکین نے یہ ماجرا دیکھا تو کہا۔

''ھٰذَا مِنْ سِحْرِ مُحَمَّدٍ'' (یہ بھی محمد کی ایک جادوگری ہے۔)(۱)

حضرت زنیرہ کے علاوہ حمامہ، لبینہ، نہدیہ اور ام عبیس بھی ایسی ہی وفا شعار خواتین تھیں، جو ظلم کی چکی میں پستی رہیں، مگر کملی والے کے دامن سے لپٹی رہیں۔

رَضِیَ اللہُ عَنْھُنَّ وَ رَضِیْنَ عَنْہُ

پہلی ہجرت سوئے حبشہ

جب شقاوت و بربریت کے یہ مظاہرے دن بدن بڑھتے ہی چلے گئے تو جانِ

سعد، ج ۳، ص ۱۶۳

حضرت صہیبؓ جانِ دوعالم علیہ السلام کی معیت میں تمام غزوات میں شریک رہ کر داد شجاعت دیتے رہے ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ جب فاروق اعظمؓ کو ایک بد باطن مجوسی نے گھائل کر دیا تو انہوں نے حضرت صہیبؓ کو اپنی جگہ مسجد نبوی کا امام مقرر فرمایا۔ فاروق اعظمؓ کی نماز جنازہ بھی حضرت صہیبؓ نے پڑھائی۔

۳۸ھ میں بعمر ستر سال وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ

(۱) سیرت حلبیہ ج ۱، ص ۳۲۷، زرقانی ج ۱، ص ۳۲۵.

دو عالم ﷺ نے اپنے اصحاب کو حبشہ کی جانب ہجرت کی اجازت مرحمت فرما دی، کیونکہ حبشہ کا بادشاہ ایک رحم دل اور رعایا پرور حکمران تھا اور اس سے یہ خطرہ نہ تھا کہ وہ غریب الوطن مسلمانوں کو ستائے گا، یا ان کی عبادت و تلاوت پر پابندیاں لگائے گا۔

چنانچہ گیارہ مرد اور چار عورتیں (۱) اپنے ایمان کو بچانے کے لئے نا آشنا راہوں

---

(۱) ان پندرہ وارفتگانِ شوق کے نام اور مختصر حالات درج ذیل ہیں۔

۱---عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

جانِ دو عالم ﷺ کے داماد اور تیسرے خلیفہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے حالات اور فضائل و مناقب مشہور و معروف ہیں۔

۲---زبیر ابن عوام رضی اللہ عنہ

جانِ دو عالم ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کے بیٹے ہیں (حضرت صفیہؓ کا تذکرہ پچھلے صفحات پر گزر چکا ہے۔) بچپن ہی سے غیر معمولی طور پر شجاع و بہادر تھے۔ ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں یہ افواہ اڑ گئی کہ آپ کو مشرکین نے پکڑ لیا ہے۔ حضرت زبیرؓ نے سنا تو اسی وقت تلوار ہاتھ میں لی اور آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے۔ آپ نے ان کو اس ہیئت میں دیکھ کر پوچھا ''مَاشَانُکَ؟'' (کس طرح آئے ہو؟)

''جس نے آپ کو گرفتار کیا تھا، اس کا سر اتارنے آیا ہوں۔'' حضرت زبیرؓ نے جواب دیا۔

جانِ دو عالم ﷺ بہت مسرور ہوئے اور فرمایا۔ ''خدا کی راہ میں یہ پہلی تلوار اٹھی ہے۔''

انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ اس وقت حضرت زبیرؓ کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ (تلخیص المستدرک ج ۳، ص ۳۶۱)

اسی طرح بچپن میں ان کے ساتھ ایک اور لڑکے کی لڑائی ہوگئی۔ تو حضرت زبیرؓ نے اس کا بازو ہی توڑ ڈالا۔ اس لڑکے کو حضرت صفیہؓ کے پاس لایا گیا، تو انہوں نے پوچھا۔

''اس کو کیا ہوا ہے؟'' ☜

پر گامزن ہو گئے۔ سمندر تک پہنچے تو ایک کشتی کرائے پر دستیاب ہوگئی اور اس پر بیٹھ کر حبشہ کی

لوگوں نے بتایا کہ یہ شامت کا مارا آپ کے بیٹے زبیر سے لڑنے کی غلطی کر بیٹھا تھا۔ اس پر حضرت صفیہ اس لڑکے سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔

''کَیْفَ وَجَدْتَ زَبْرًا ---؟ اَقِطًا حَسِبْتَه' اَمْ تَمْرًا --- ؟ --- اَمْ مُشْمَعِلًا صَقْرًا --- ؟ (تو نے زبیر کو کیسا پایا؟ پنیر کے ٹکڑے یا کھجور کی طرح زود ہضم یا بھڑکے ہوئے شکرے کی طرح ناقابل تسخیر؟) طبقات ابن سعد ج ۳، ص ۷۱.

حضرت زبیرؓ کے مزاج میں یہ تہوّر اس لئے تھا کہ والدہ نے ان کی تربیت ہی ان خطوط پر کی تھی۔ وہ خود حضرت زبیرؓ کو اتنا مارتیں کہ لوگ چیخ اٹھتے۔

''قَتَلْتِ هٰذَا الْغُلَامَ.'' (آپ نے تو اس لڑکے کو مار ہی ڈالا۔)

حضرت صفیہؓ جواب دیتیں کہ میں اس کو اس لئے مارتی ہوں کہ اسے عقل آجائے اور بڑا ہو کر شور مچاتے لشکروں کی قیادت کر سکے۔ (طبقات ج ۳، ص ۷۹)

آپ سابقین اولین میں سے ہیں، لڑکپن میں ایمان لائے اور تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ غزوۂ احزاب میں ان کی شجاعت کی داد جانِ دو عالم ﷺ نے ان گرامی قدر الفاظ سے دی۔ ''اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًا وَحَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ.'' (ہر نبی کا ایک نہ ایک مخلص ساتھی ہوا ہے اور میرا مخلص ساتھی زبیر ہے۔)

علاوہ ازیں حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی طرح ان کو بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو فرمایا --- ''فِدَاکَ اُمِّیْ وَاَبِیْ.'' (تجھ پر میرے ماں باپ قربان) (مستدرک حاکم، ج ۳)

جب جانِ دو عالم ﷺ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو حضرت مقدادؓ لشکر کے میمنہ (دائیں طرف) کے امیر تھے اور حضرت زبیرؓ میسرہ (بائیں طرف) کے قائد تھے۔ جب لڑائی تھم گئی تو آپ نے اپنے دست مبارک سے ان دونوں کے منہ پر کپڑا پھیرا اور گرد و غبار صاف کیا۔

جانِ دو عالم ﷺ کی اس شفقت و محبت نے ہی تو ایک عالم کو آپ کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ ﷺ

ایک شخص نے حضرت زبیرؓ کو نہاتے ہوئے دیکھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کا سارا جسم زخموں کے نشانات سے بھرا پڑا ہے۔ جب اس نے حضرت زبیرؓ سے ان کے بارے پوچھا تو ☜

طرف روانہ ہو گئے۔ مشرکین کو پتہ چلا تو انہوں نے تعاقب کیا، لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے

انہوں نے جواب دیا کہ یہ سارے کے سارے زخم رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد کرتے ہوئے لگے ہیں۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۳۶۱.

جب کچھ لوگوں کی ریشہ دوانیوں سے حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ میں جنگ چھڑ گئی، جو جنگِ جمل کے نام سے مشہور ہے، تو اس وقت حضرت زبیرؓ، عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ تھے، مگر جب دیکھا کہ مسلمان کی تلوار مسلمان کا گلا کاٹ رہی ہے تو دل برداشتہ ہو کر جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی اور گھر کی طرف واپس ہو گئے۔ راستے میں دشمنوں سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ان ظالموں نے دھوکے سے اس شیر مرد کو شہید کر دیا اور اپنے اس کارنامے کی داد پانے کے لئے ان کا سر کاٹ کر حضرت علیؓ کے پاس لے آئے --- خیال ہو گا کہ اس اقدام سے حضرت علیؓ خوش ہوں گے، ہو سکتا ہے کہ انعام سے بھی نوازدیں مگر دربارِ مرتضیٰ سے ان کو جو انعام ملا وہ یہ تھا۔

''بَشِّرُوْ قَاتِلَ ابْنِ صَفِیَّۃَ بِالنَّارِ'' (جس نے صفیہ کے بیٹے کو قتل کیا ہے اسے ''خوشخبری'' سنا دو کہ وہ جہنمی ہے۔)

شہادت کے وقت ان کی عمر ۶۴ سال تھی۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

۳--- مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ

مکہ کے حسین ترین جوان۔

چونکہ ان کی والدہ بہت مالدار عورت تھی۔ اس لئے ان کی پرورش بہت ناز ونعم سے ہوئی۔ اعلیٰ ترین لباس پہنتے، بیش قیمت جوتے استعمال کرتے اور ہر وقت خوشبو میں بسے رہتے۔ جانِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں --- ''میں نے مکہ میں کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا، جس کی زلفیں مصعب کی طرح حسین ہوں، جس کا لباس مصعب جیسا نفیس ہو اور جس کو مصعب کی مانند زندگی کی ہر آسائش مہیا ہو۔'' طبقاتِ ابنِ سعد ج ۳، ص ۸۲.

دارِ ارقم میں ایمان لائے۔ پہلے تو اپنے ایمان کو چھپاتے رہے مگر ایک دن عثمان ابن

ہی یہ لوگ ساحل چھوڑ چکے تھے، اس لئے مشرکین کو بے نیلِ مرام واپس آنا پڑا۔

طلحہ نے ان کو نماز پڑھتے دیکھ لیا اور ان کے والدین کو اطلاع دے دی۔ والدین اتنے ناراض ہوئے کہ انہوں نے اپنے نازوں پلے بیٹے سے سب کچھ چھین لیا اور اسے قید کر دیا۔ ہجرت حبشہ کے وقت کسی نہ کسی طرح انہوں نے قید سے جان چھڑائی اور مہاجرین کے ہمسفر ہو گئے۔ پھر جب مہاجرین کی واپسی شروع ہوئی تو مصعب بھی واپس آئے، اس وقت سفر اور غربت کی وجہ سے ان کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا اور تن ڈھانپنے کو معقول لباس بھی میسر نہ تھا۔ ایک دن پھٹی پرانی پیوند لگی چادر اوڑھے ہوئے جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ نے ان کے استقلال و استقامت کی بے حد تعریف کی اور فرمایا ''زمانے کے انقلابات ہیں --- ایک وقت تھا کہ مصعب سے زیادہ خوش لباس اور ذی نعمت شخص پورے مکہ میں کوئی نہیں تھا --- مگر اس نے اللہ رسول کی محبت میں وہ ساری نعمتیں ٹھکرا دیں۔'' (طبقاتِ ابنِ سعد ج ۳، ص ۸۵)

مدینہ کی طرف ہجرت سے پہلے جو اہل مدینہ اسلام لا چکے تھے، انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ سے درخواست کی کہ کوئی ایسا شخص یہاں بھیجئے جو ہمیں دین سکھائے اور قرآن پڑھائے۔ جانِ دو عالم ﷺ کی نگاہِ انتخاب حضرت مصعبؓ پر پڑی اور ان کو یہ اعزاز ملا کہ وہ اسلام کے پہلے مبلغ بن کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ ان کی تبلیغ و دعوت سے انصار کے بیشتر گھرانے مسلمان ہو گئے۔ جب مسلمانوں کی تعداد خاصی ہو گئی، تو حضرت مصعبؓ نے جانِ دو عالم ﷺ کو لکھا کہ اگر اجازت ہو تو میں یہاں جمعہ پڑھانا شروع کر دوں۔ آپ کی طرف سے اجازت نامہ آیا تو سعد بن خیثمہؓ کے گھر میں حضرت مصعبؓ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کی گئی اور نمازیوں کو بکری ذبح کر کے کھلائی گئی۔ یہ پہلی نماز جمعہ تھی جو اسلام میں ادا کی گئی۔ (طبقاتِ ابنِ سعد ج ۳، ص ۸۳)

غزوۂ بدر میں مہاجرین کا جھنڈا حضرت مصعبؓ کے ہاتھ میں تھا۔ اسی طرح غزوہ احد میں بھی آپ کے ہاتھ میں علم تھا جسے مرتے دم تک انہوں نے اونچا کئے رکھا۔ دایاں ہاتھ کٹ گیا تو بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ بایاں بھی کٹ گیا تو علم کو کٹے ہوئے بازوؤں کے حصار میں لے کر سینے کے ساتھ چمٹا لیا۔ پھر جب زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر گئے تو ایک اور صحابی نے بڑھ کر جھنڈا اٹھا لیا اور حضرت مصعبؓ ☜

شہید ہو گئے۔ لڑائی ختم ہوئی تو جانِ دو عالم ﷺ ان کی لاش کے پاس آئے جو اوندھے منہ پڑی تھی اور یہ آیہ کریمہ تلاوت فرمائی۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ.

(مومنوں میں کچھ ایسے جواں مرد ہیں۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیے گئے وعدے کو سچ کر دکھایا۔) پھر فرمایا ''اے اُحد کے جاں نثارو! اللہ کا رسول گواہی دیتا ہے کہ تم قیامت کے دن بالیقین شہداء کے مقام پر فائز ہو گے۔''

پھر صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا---''لوگو! ان شہداء کی زیارت کے لئے آیا کرو اور ان کو سلام کیا کرو---خدا کی قسم قیامت تک ان کو جو شخص بھی سلام کرے گا، یہ اس کے سلام کا جواب دیں گے۔'' (طبقاتِ ابن سعد ج ۳، ص ۸۵)

پھر جب ان کو کفن دیا جا رہا تھا تو سوائے ایک چادر کے کوئی کپڑا نہ تھا اور وہ بھی اتنی چھوٹی تھی کہ سر پر ڈالی جاتی تو پاؤں ننگے ہو جاتے اور پاؤں ڈھانپے جاتے تو سر برہنہ ہو جاتا۔ جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ''سر کو چادر سے ڈھک دو، اور پاؤں پر اذخر (گھاس کی ایک قسم) ڈال دو۔''

یہ کفن تھا اس شخص کا جس سے زیادہ خوش پوشاک پورے مکہ میں کوئی نہ تھا۔

شہادت کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

۴---ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ

ان کا باپ عتبہ اسلام کے شدید مخالفوں میں سے تھا، مگر بیٹے کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق بخشی، یہ ان اوّلین مومنین میں سے ہیں، جو دارِ ارقم کے زمانہ سے بھی پہلے ایمان لائے۔

غزوۂ بدر میں جو بڑے بڑے کافر مارے گئے، ان میں ابو حذیفہؓ کا باپ عتبہ بھی شامل تھا، جانِ دو عالم ﷺ نے حکم دیا کہ ان سب کی لاشیں گھسیٹ کر کنویں میں پھینک دی جائیں۔ جب عتبہ کی

آزادی حاصل تھی اور کوئی شخص بھی ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ جب ان

لاش کھینچ کر کنوئیں کی طرف لے جائی جا رہی تھی تو اس کو دیکھ کر ابو حذیفہؓ کی طبیعت مکدّر ہو گئی اور چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہو گئے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔

''ابو حذیفہ! تجھے تو اپنے باپ کا یوں گھسیٹا جانا بہت ناگوار گزرا ہے۔''

ابو حذیفہؓ نے عرض کیا---''یا رسول اللہ! ناگوار تو ضرور گزرا ہے، مگر اس بناء پر نہیں کہ مجھے اللہ و رسول کے احکام کی حقانیت میں کوئی شک ہے۔ ناگواری کی وجہ یہ ہے کہ میرا باپ ایک صائب الرائے اور بردبار سردار تھا اور مجھے پوری امید تھی کہ اللہ پاک اس کو ہدایت دے گا، مگر جب میں نے دیکھا کہ وہ اس نعمت سے محروم رہا اور کفر پر مر گیا تو مجھے اس کا انجام ناگوار گزرا اور افسوس ہوا۔''

جانِ دو عالم ﷺ ان کے اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور ان کے لئے دعا فرمائی۔
(مستدرک حاکم ج ۳، ص ۲۲۴)

شیطان انسان کا عدو مبین ہے اور بڑے لوگوں کو بہکانے کی تو وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ ایک دفعہ ابو حذیفہ بھی اس کے بہکاوے میں آ گئے اور ان کی زبان سے ایسے کلمات نکل گئے جو جانِ دو عالم ﷺ کی طبع ہمایوں پر گراں گزرے۔

یہ غزوۂ بدر ہی کا واقعہ ہے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ میرے چچا عباس اگر کسی کے سامنے آ جائیں تو ان پر حملہ نہ کیا جائے کیونکہ وہ بادل ناخواستہ اس جنگ میں شریک ہوئے ہیں۔

ابو حذیفہؓ کو اس حکم کا پتہ چلا تو انہوں نے---اللہ جانے کیسے---کہدیا۔

''عجیب بات ہے، ہم اپنے اعزہ و اقارب کے تو سر قلم کریں اور عباس کو چھوڑ دیں---اس کو تو میں خود قتل کروں گا۔''

جانِ دو عالم ﷺ کو یہ بات پہنچی تو آپ نے حضرت عمرؓ سے شکایتاً کہا۔

ابو حفص! (حضرت عمر کی کنیت) یہ شخص میرے چچا پر تلوار چلانا چاہتا ہے۔''

حضرت عمرؓ نے عرض کی---''یا رسول اللہ! میں اسی کا سر تن سے جدا نہ کر دوں---؟ مجھے تو یہ منافق معلوم ہوتا ہے۔''

کے آرام و سکون کی اطلاعات مکہ مکرمہ پہنچیں تو مزید کئی مسلمان حبشہ جانے کے لئے تیار

مگر جانِ دو عالم ﷺ نے درگزر کیا اور معاف فرما دیا۔

اپنی اس غلطی پر ابو حذیفہؓ کو عمر بھر افسوس رہا۔ اگر چہ ان کی ساری عمر جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت گزاری میں بسر ہوئی اور تمام غزوات میں آپ کے ساتھ رہ کر دادِ شجاعت دیتے رہے اور آپ کا جی خوش کرتے رہے، مگر اس کے باوجود اپنی اس خطا پر ان کو اس قدر ندامت تھی کہ فرمایا کرتے "میرا یہ گناہ اتنا عظیم ہے کہ اس کی معافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی --- ہاں! اگر مجھے شہادت نصیب ہوگئی تو میں سمجھوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے درگزر فرما دیا ہے۔"

ان کی یہ آرزو رب کریم نے پوری فرما دی اور وہ جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ (مستدرک حاکم ج ۳، ص ۲۲۳)

بوقت شہادت آپ کی عمر ۵۳ اور ۵۶ سال کے درمیان تھی۔

رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ

۵--- عبدالرحمن بن عوف ؓ

بہت مشہور صحابی ہیں اور کئی اعزازات کے تمغے ان کے سینے پر سجے ہیں۔ اولین مسلمانوں میں سے ہیں، عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، غزوۂ احد میں ثابت قدم رہنے والوں میں سے ہیں، جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شامل رہنے والوں میں سے ہیں اور فاروق اعظمؓ نے اپنے بعد خلافت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے جو شش رکنی کمیٹی بنائی تھی، اس کے اہم ارکان میں سے ہیں۔

حبشہ کی طرف دو دفعہ ہجرت کی، تیسری مرتبہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔ مدینہ طیبہ میں جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو حضرت سعد ابن ربیعؓ کا بھائی بنا دیا۔ حضرت سعدؓ نے اس بھائی چارے کا اتنا پاس کیا کہ حضرت عبدالرحمانؓ کو مخلصانہ پیش کش کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی! میں مدینہ کا مالدار ترین آدمی ہوں۔ آج سے میرا آدھا مال تمہارا۔ علاوہ ازیں میری دو بیویاں ہیں، میں ان میں سے ایک کو طلاق دے دیتا ہوں تم اس کے ساتھ نکاح کر لو۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جواب دیا --- "اللہ تعالیٰ آپ کے مال اور گھر میں مزید

ہو گئے اور یوں مہاجرین حبشہ کی مجموعی تعداد ۸۳ تک پہنچ گئی۔ جب کفار مکہ نے دیکھا کہ اہل

برکت نازل فرمائے --- میں آپ سے کوئی چیز نہیں لوں گا۔ مجھے تو بس آپ بازار کا راستہ بتادیجئے۔''

بازار جا کر انہوں نے کچھ خرید و فروخت کی اور رات کو کچھ پنیر اور تھوڑا سا گھی منافع میں کما لائے۔ اللہ پاک نے آپ کے کاروبار میں برکت ڈالی اور جلد ہی اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ ایک دن جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو زعفران لگا رکھا تھا۔ چونکہ عرب میں زعفران دولہا کو لگایا جاتا تھا، اس لئے آپ نے پوچھا۔

''مَهْيَمْ؟'' (کیا کر آئے ہو؟)

عرض کی --- ''یارسول اللہ شادی کر لی ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ کو خوشی ہوئی اور پوچھا --- ''مہر کتنا مقرر کیا ہے؟''

''کھجور کی گٹھلی کے مساوی سونا۔'' انہوں نے جواب دیا۔

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ''اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ'' (ولیمہ ضرور کرنا، خواہ ایک ہی بکری سے کیوں نہ ہو۔)

پھر ان کی تجارت میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور تھوڑی ہی مدت کے اندر ان کے گھر میں دولت کی ریل پیل ہو گئی، خوش قسمتی کا یہ عالم تھا کہ خود فرماتے ہیں۔

''لَوْ رَفَعْتُ حَجَرًا رَجَوْتُ اَنْ اُصِيْبَ تَحْتَهٗ ذَهَبًا اَوْ فِضَّةً.''

(اگر میں پتھر اٹھاؤں تو مجھے توقع ہوتی ہے کہ اس کے نیچے سے بھی سونا یا چاندی برآمد ہو گی۔)

مال و دولت کی فراوانی کا تاریک پہلو یہ ہے کہ بروز قیامت ہر چیز کا حساب دینا پڑے گا۔ جب کہ فقیر کے لئے یہ مرحلہ آسان ہو گا اور وہ جلدی سے فارغ ہو جائے گا۔ اسی بناء پر ایک دفعہ جانِ دو عالم ﷺ نے ان سے فرمایا۔

''عبدالرحمٰن! تم اغنیاء میں سے ہو۔ اس لئے جنت میں گھسٹتے ہوئے داخل ہو گے --- اللہ کے ہاں کچھ بھیجو، تاکہ تمہارے قدم پل صراط پر رواں ہو جائیں۔''

''کیا بھیجوں یارسول اللہ؟''

ایمان نے ایک پناہ گاہ تلاش کر لی ہے اور وہاں چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو انہوں نے

"جو کچھ تمہارے پاس ہے۔"

"سارے کا سارا، یارسول اللہ؟"

"ہاں! سب کچھ۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ یہ سنتے ہی اٹھے اور سب کچھ راہ خدا میں لٹانے کے ارادے سے چل پڑے۔ اسی وقت جبریل امین حاضر ہوئے اور عرض کی۔

"یارسول اللہ! ابن عوف سے کہیئے کہ اگر وہ مہمان نوازی کرتے رہیں، مسکینوں کو کھانا کھلاتے رہیں، مانگنے والوں کو دیتے رہیں اور اہل وعیال پر خرچ کرتے رہیں تو یہ ان کے لئے کافی ہے۔ اس سے ان کے مال کا تزکیہ ہو جائے گا۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے یہ نصیحت پلے باندھ لی اور جود وعطا کا بازار گرم کر دیا۔

ایک دفعہ ان کا بہت بڑا تجارتی قافلہ مدینہ منورہ پہنچا --- پانچ سو جانور ساز وسامان سے لدے ہوئے۔

اہل مدینہ اتنا بڑا کاروانِ تجارت دیکھ کر متحیر رہ گئے، مگر ان کو اس سے بھی زیادہ حیرت سے اس وقت دوچار ہونا پڑا، جب حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اعلان کیا۔

"هِيَ وَمَا عَلَيْهَا صَدَقَةٌ." (باربرداری کے یہ سارے جانور مع اس سامان کے جو ان پر بار ہے، اللہ کی راہ میں صدقہ ہیں۔)

ایک دفعہ ان کی زمین چالیس ہزار اشرفیوں میں فروخت ہوئی۔ انہوں نے وہ تمام اشرفیاں ازواج مطہرات میں تقسیم کر دیں۔ حضرت مسور کہتے ہیں کہ میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کے پاس انکا حصہ لے کر گیا تو انہوں نے پوچھا۔

"کس نے بھیجی ہیں؟"

"عبدالرحمان ابن عوف نے۔" میں نے جواب دیا۔

ام المؤمنین نے فرمایا --- "رسول اللہ نے اپنی ازواج سے کہا تھا کہ میرے بعد ☜

مسلمانوں کو وہاں سے واپس لانے کے لئے عمرابن عاص اور عبداللہ ابن ربیعہ پر مشتمل دو

تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا صابرین میں شمار ہوگا۔''

پھر بھیجنے والے کے لئے دعا فرمائی۔

سَقَى اللّٰهُ ابْنَ عَوْفٍ مِنْ سَلْسَبِيلِ الْجَنَّةِ

(اللہ تعالیٰ ابن عوف کو جنت کے چشمہ سلسبیل سے سیراب کرے۔)

اُمّ المؤمنین اُمّ سلمہؓ نے بھی یہی دعا فرمائی۔

علاوہ ازیں انہوں نے تیس ہزار (۳۰۰۰۰) غلام گھرانوں کو خرید کر لوجہ اللہ آزاد کیا۔

نہ جانے ہر گھرانے میں کتنے افراد ہوں گے جو آزادی کی نعمت سے مالا مال ہوگئے!

صحابہ کرامؓ میں سیدنا صدیق اکبرؓ کے علاوہ حضرت عبدالرحمٰنؓ ہی ایسے شخص ہیں، جن کو یہ شرف حاصل ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کی اقتداء میں نماز پڑھی۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز سے پہلے حوائج ضروریہ سے فراغت کے لئے دور تشریف لے گئے۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ فراغت کے بعد آپ نے وہیں وضو فرمایا۔ جب ہم واپس پہنچے تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور عبدالرحمٰن نماز پڑھا رہے تھے۔ میں نے چاہا کہ ان کو رسول اللہ ﷺ کی آمد سے مطلع کردوں تاکہ وہ پیچھے ہٹ جائیں، مگر آپ نے مجھے منع فرمادیا اور جماعت میں شامل ہوگئے۔ ایک رکعت ہو چکی تھی، اس لئے ایک رکعت ہم نے عبدالرحمٰن کے ساتھ پڑھی اور سلام کے بعد اپنی باقی ماندہ نماز مکمل کی۔

جس امام کے پیچھے امام المرسلین نماز پڑھیں اس کی امامت کا کیا کہنا!

انتخاب خلیفہ کے لئے فاروق اعظمؓ کی قائم کردہ مجلس شوریٰ میں جب حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا کہ میں خود تو خلافت سے دست بردار ہوتا ہوں؛ البتہ اگر آپ حضرات پسند کریں تو میں باقی ماندہ افراد میں سے جس کو مناسب سمجھوں، منتخب کرلوں ---تو سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا

''آپ کی پسند پر صاد کرنے والا پہلا شخص میں ہوں گا۔ کیونکہ میں نے ایک دفعہ رسول اللہ سے سنا ہے کہ وہ آپ کو فرما رہے تھے

''اَنْتَ اَمِيْنٌ فِىْ اَهْلِ السَّمَاءِ وَ اَمِيْنٌ فِىْ اَهْلِ الْاَرْضِ.'' (تم آسمان

رکنی سفارت ترتیب دی اور ان کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ شاہ حبشہ کے دربار میں حاضری

والوں کے ہاں بھی امین ہو اور زمین والوں کے نزدیک بھی امین ہو۔)

۳۲ھ میں بعمر ۷۵ سال ان کا وصال ہوا۔ عمر بھر راہ خدا میں مال لٹانے والے اس فیاض صحابی نے مرتے وقت بھی وصیت کی تھی کہ میرے ترکہ میں سے پچاس ہزار اشرفیاں فی سبیل اللہ تقسیم کر دی جائیں۔ اتنا کچھ بانٹنے کے بعد بھی سونے کا ایک ڈلا بچ گیا، جو اتنا بڑا تھا کہ اس کو کلہاڑیوں کے ساتھ کاٹ کر ورثاء میں تقسیم کیا گیا۔ اس وقت دیگر بہت سے ورثاء کے علاوہ ان کی چار بیویاں تھیں اور ہر بیوی کے حصے میں اسی ہزار اشرفی کے برابر سونا آیا۔

علاوہ ازیں ایک ہزار اونٹ، تین ہزار بکریاں اور ایک سو گھوڑے بھی آپ نے ورثہ میں چھوڑے۔

اللہ اللہ!! جب حضرت عبدالرحمٰنؓ ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تھے تو بالکل تہی دامن تھے اور مختصر عرصے میں ہی ان کے تموّل کا یہ عالم ہو گیا کہ ان کے متروک سونے کو تولنے کی بجائے کلہاڑیوں اور تیشوں سے کاٹ کر تقسیم کرنا پڑا اور روایات کے مطابق کاٹنے اور توڑنے والے تھک کر چور ہو گئے۔

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ --- "وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ."

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

(تمام واقعات طبقاتِ ابن سعد ج ۳، ص ۸۷ تا ۹۷ سے ماخوذ ہیں۔)

۶---عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

بے مثال قاری اور عظیم ترین فقیہہ، قرأت و تجوید میں ان کا یہ مقام ہے کہ جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا--- "عبداللہ قرآن کو بعینہٖ اس طرح پڑھتا ہے جس طرح نازل ہوا ہے--- تر و تازہ، جو شخص تازہ بتازہ قرآن پڑھنا چاہے، اسے چاہئے کہ عبداللہ کی قرأت کی پیروی کرے۔"

ان کی قرأت جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر مرغوب تھی کہ آپ بنفس نفیس ان کی قرأت سنا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا--- "عبداللہ! ذرا قرآن تو سناؤ!"

حضرت عبداللہؓ بہت حیران ہوئے، عرض کی--- "یارسول اللہ! میں آپ کو سناؤں---! حالانکہ یہ آپ پر نازل ہوا ہے۔" ☜

دیں اور اس کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ مسلمانوں کو ہمارے حوالے کردے۔

فرمایا---"ہاں! لیکن میں سننا چاہتا ہوں۔"

حضرت عبداللہؓ نے سورہ نساء کی تلاوت شروع کی اور جب اس آیت پر پہنچے۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا۔ (وہ کیسا منظر ہوگا اے محبوب! جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تم کو سب لوگوں پر گواہ بنائیں گے۔)

تو آپ پر گریہ طاری ہوگیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عبداللہؓ خاموش ہوگئے۔ اس وقت محفل میں اور صحابہ کرام بھی موجود تھے، آپ نے فرمایا---"عبداللہ! اب حاضرین سے چند باتیں کردو۔" (یعنی مختصر سی تقریر)

حضرت عبداللہؓ نے حمد وثنا اور صلوٰۃ وسلام کے بعد چند باتیں کیں اور گفتگو کے اختتام پر جب یہ جملہ کہا۔

"رَضِيْتُ لَكُمْ مَا رَضِيَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔" (میں آپ کے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو اللہ اور اس کا رسول پسند کرے۔)

تو جانِ دوعالم ﷺ نے حاضرین سے مخاطب ہوکر فرمایا۔

"وَرَضِيْتُ لَكُمْ مَا رَضِيَ لَكُمْ اِبْنُ اُمِّ عَبْدٍ۔ (اور میں تمہارے لئے وہی کچھ پسند کرتا ہوں، جو ابن مسعود پسند کرے۔)

اللہ اکبر! کتنی یگانگت ہے پسندیدگی اور چاہت میں!

دراصل حضرت عبداللہؓ نے اپنی زندگی جانِ دوعالم ﷺ کی خدمت گزاری کے لئے وقف کردی تھی۔ اس ہمہ وقت کی خدمت ہی کو دیکھتے ہوئے صحابہ کرامؓ نے ان کو مندرجہ ذیل القاب دے رکھے تھے۔

صَاحِبُ السِّوَاكِ (مسواک بردار) صَاحِبُ الْوِسَادِ (بستر لگانے والے) صَاحِبُ الطُّهُوْرِ (وضو کرانے والے) صَاحِبُ النَّعْلَيْنِ (کفش بردار)

جب جانِ دوعالم ﷺ کہیں جانے کے ارادے سے اٹھتے تو حضرت عبداللہؓ لپک کر آپ کو نعلین پہناتے، پھر آپ کا عصا مبارک اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور آپ کے آگے آگے

شاہ حبشہ اور درباریوں کے لئے فرداً فرداً بیش قیمت تحائف تیار کئے گئے اور یوں یہ

خادمانہ انداز میں چل پڑتے۔ جب جانِ دو عالم ﷺ اس مجلس کے پاس پہنچتے جہاں رکنے کا ارادہ ہوتا تو عبداللہؓ آپ کی نعلین مبارکین اتار کر اپنی آستینوں میں ڈال لیتے اور آپ کا عصا آپ کے دستِ اقدس میں دے دیتے۔ واپسی پر بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرتے۔ (طبقاتِ ابن سعد ج ۳، ص ۱۰۸)

جانِ دو عالم ﷺ کے حجرہ شریفہ میں ان کی آمد و رفت اتنی زیادہ تھی کہ ناواقف آدمی یہی سمجھتا تھا کہ یہ گھر کے فرد ہیں۔ ابوموسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ جب میں اور میرا بھائی یمن سے آئے تو عرصہ تک ہم عبداللہ کو رسول اللہ ﷺ کے گھرانے کا ایک فرد سمجھتے رہے، کیونکہ وہ اور ان کی والدہ کثرت سے آپ کے گھر آتے جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ حاضر باش خادم کی نگاہ سے مخدوم کی کوئی چھوٹی بڑی ادا اوجھل نہیں رہ سکتی اور حضرت عبداللہ نے تو آقا کی ادائیں دیکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ ایک ایک ادا کو یوں اپنایا کہ اپنے قول و عمل کے اعتبار سے آقا کی تصویر بن کر رہ گئے۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں ''اَشْبَهُ النَّاسِ هَدْيًا وَّسَمْتًا وَّدَلًّا بِمُحَمَّدٍ ﷺ اِبْنُ مَسْعُوْدٍ.'' (سیرت، عادت اور ہیئت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والے ابن مسعود ہیں۔)

فاروق اعظمؓ نے ان کی علمیت کی داد ان الفاظ میں دی۔

''مُلِئَ عِلْمًا، مُلِئَ عِلْمًا، مُلِئَ عِلْمًا.''

(علم سے بھرا ہوا ہے، علم سے بھرا ہوا ہے، علم سے بھرا ہوا ہے۔)

بابِ مدینۃ العلم نے ان کی فقاہت پر یوں مہرِ تصدیق ثبت کی۔

''فَقِيْهٌ فِي الدِّيْنِ عَالِمٌ بِالسُّنَّةِ.'' (دین میں فقیہ، سنتِ نبویہ کے عالم۔)

اسی بنا پر امام الائمہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے فقہ کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات پر رکھی اور اکثر و بیشتر مسائل میں انہی کی پیروی کی ہے۔

قاری اور فقیہ ہونے کے علاوہ بہترین خطیب بھی تھے۔ عبداللہ ابن مرداسؓ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ ہر جمعرات کو تقریر کیا کرتے تھے اور جب تقریر ختم کرتے تھے تو ہماری تمنا ہوتی تھی کہ ☜

سفارت بصد شان و شوکت مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئی۔ روانگی کے وقت کفار مکہ نے سفیروں کو

کاش ابھی اور بولتے۔

غیر معمولی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کے حامل عبداللہ ابن مسعودؓ جسمانی طور پر نہایت نحیف و نزار سے تھے۔ خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ جب میں اراک کے درخت سے پھل توڑ رہا تھا تو دوسرے صحابہ ہنسنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کیوں ہنس رہے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ عبداللہؓ کی تلی تلی پنڈلیاں دیکھ کر ہنسی آ رہی ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا--- ''تم اس کی پنڈلیوں پر ہنستے ہو، حالانکہ اللہ کے میزان میں اس کی یہ کمزور سی ٹانگیں جبل احد سے بھی گراں ہیں۔''

کمزوری کے علاوہ ان کا قد بھی بہت چھوٹا تھا، مگر کوتاہ قامتی اور جسمانی ضعف کے باوجود ان کی جرأت و بے باکی حیرت انگیز تھی۔ جب نزول قرآن کا ابتدائی زمانہ تھا اور مسلمان چھپ کر عبادت کیا کرتے تھے، ان دنوں ایک روز چند صحابہ کرام بیٹھے تھے اور افسوس کر رہے تھے کہ نزول قرآن کو شروع ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا ہے مگر ہم میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوسکی کہ وہ مشرکین کے روبرو برملا قرآن پڑھے۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا--- ''یہ کام میں کروں گا۔''

دیگر صحابہ کرامؓ نے کہا--- ''نہیں، آپ کو وہ لوگ ایذا پہنچائیں گے، ہم تو یہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا شخص ہو جس کا مضبوط خاندان ہو، جو اس کی پشت پناہی کر سکے۔''

لیکن حضرت عبداللہؓ نے اصرار کیا کہ مجھے یہ کام کرنے دو۔

چنانچہ انہوں نے صحن حرم میں کھڑے ہو کر بآواز بلند سورہ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی۔ ادھر اُدھر مشرکین محفلیں جمائے بیٹھے تھے۔ یہ آواز ان کے کانوں میں پڑی تو بہت متعجب ہوئے کہنے لگے

''یہ کیا کر رہا ہے ابن مسعود؟''

کسی نے کہا--- ''شاید محمد پر نازل ہونے والا کلام پڑھ رہا ہے۔''

یہ سنتے ہی سب اٹھے اور حضرت عبداللہؓ کو مارنے پیٹنے لگے، مگر مار کھاتے ہوئے بھی قرآن پڑھتے رہے۔ جب فارغ ہوئے تو چہرے پر تھپڑوں اور گھونسوں کے نشان پڑ چکے تھے۔ واپس گئے تو ساتھیوں نے کہا--- ''ہم اسی بات سے ڈرتے تھے۔''

ہدایت کی کہ پہلے درباری امراء اور مذہبی رہنماؤں سے ملنا اور ہدیے وغیرہ نذر کرنے کے

حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا---''مجھے تو ذرا بھی ان لوگوں سے خوف محسوس نہیں ہوا---
اگر کہو تو میں کل پھر اسی طرح ان کو سناؤں؟''

مگر دوستوں نے کہا---''بس اتنا ہی کافی ہے۔''

اس جرأت رندانہ کی بنا پر ان کا یہ خاص شرف ٹھہرا کہ

''اَوَّلُ مَنْ جَهَرَ بِالْقُرْآنِ بِمَكَّةَ بَعْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ عَبْدُاللهِ ابْنُ مَسْعُوْدٍ۔''

(رسول اللہ ﷺ کے علاوہ پہلے وہ شخص جنہوں نے مکہ میں بآواز بلند قرآن پڑھا، عبداللہ ابن مسعود ہیں۔) محمد رسول اللہ، ص ۱۰۱.

۳۲ھ میں وفات پائی۔ حضرت عثمان نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کیے گئے، بوقت وفات ساٹھ سال سے کچھ اوپر عمر تھی۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

۷---عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہ

اپنے ہم نام عثمان بن عفانؓ کی طرح شرم وحیا والے۔ ایک دفعہ جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی---''یارسول اللہ! میں نہیں چاہتا کہ میرے بدن کے قابل ستر حصوں پر میری بیوی کی نظر پڑے۔''

''کیوں---؟ اس میں کیا قباحت ہے؟'' جانِ دو عالم ﷺ نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے شرم آتی ہے یارسول اللہ!'' حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔

اس پر جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے، اس لئے ان میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ میری اپنی ازواج کی نظر بھی کبھی میری مستور جگہوں پر پڑ جاتی ہے۔

یہ سن کر حضرت عثمانؓ کی تسلی ہوگئی کہنے لگے۔

''پھر آپ سے زیادہ شرم وحیا والا کون ہو سکتا ہے، یارسول اللہ'' ☜

بعد ان کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرنا، تاکہ جب بادشاہ کے دربار میں تم لوگ اپنا مسئلہ

ان کے واپس جانے کے بعد جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔"اِنَّ عُثْمَانَ لَحَیِیٌّ سِتِیْرٌ" (بلاشبہ عثمان بہت ہی شرم پردے والا ہے۔)

دراصل ان کا مزاج ہی زاہدانہ قسم کا تھا۔ایک بار تو انہوں نے اپنے آپ کو قوت مردمی ہی سے محروم کر لینے کا ارادہ کر لیا تھا مگر جانِ دو عالم ﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے ان کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا۔

"اَلَیْسَ لَکَ فِیَّ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ........"(کیا میرا اسوہ حسنہ تیرے لئے کافی نہیں ہے؟ میں بیویوں کے پاس بھی جاتا ہوں، گوشت بھی کھاتا ہوں اور کبھی روزہ رکھتا ہوں، کبھی نہیں رکھتا---میری امت کا کوئی فرد اگر شہوانی قوتوں کو کم کرنا چاہے تو اس کو چاہئے کہ روزے رکھے---جو شخص اپنی مردانہ قوت کو ختم کر ڈالے وہ میری امت سے نہیں ہے۔)

یہ شدید حکم سن کر حضرت عثمانؓ نے وہ ارادہ تو ترک کر دیا،مگر اپنی زاہدانہ طبیعت کا تقاضا پورا کرنے کے لئے دن بھر روزے سے رہتے اور رات کو عبادت میں مصروف ہو جاتے۔ایک دن ان کی اہلیہ امہات المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوئی تو بہت غمگین اور افسردہ تھی۔امہات المؤمنینؓ نے پوچھا کہ تمہیں کیا پریشانی ہے؟تمہارا شوہر تو کافی مالدار ہے۔

"مالدار تو ہیں" اس نے بتایا "مگر دن کو روزے سے ہوتے ہیں اور رات نوافل میں گزار دیتے ہیں---میری طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے۔"

امہات المؤمنینؓ نے یہ بات جانِ دو عالم ﷺ کو بتائی تو آپ نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا۔

"سنا ہے تم تمام رات نماز پڑھتے رہتے ہو اور دن بھر روزے سے ہوتے ہو!"

"جی ہاں یارسول اللہ! میں اسی طرح کرتا ہوں۔" حضرت عثمانؓ نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---"اس طرح نہ کیا کرو۔تم پر تمہارے نفس کا بھی حق ہے، آنکھوں کا بھی حق ہے اور بیوی کا بھی حق ہے۔اس لئے رات کو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو۔اسی طرح روزہ کبھی رکھ لیا کرو، کبھی چھوڑ دیا کرو۔"

چند دن کے بعد وہی عورت امہات المؤمنینؓ کے پاس آئی تو مسرور و شادمان تھی۔

لے کر جاؤ تو یہ امراء ورہنما تمہاری تائید کریں اور تمہاری بات ماننے کے لئے بادشاہ پر زور دیں۔

امہات المؤمنینؓ نے کہا---''اب تو خوش وخرم نظر آتی ہو!''

''جی ہاں! اب میرے خاوند میری ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔'' طبقات ج ۳، ص ۲۸۷.

حضرت عثمانؓ ایسے پاکیزہ فطرت انسان ہوئے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی شراب نہیں پی۔ کہا کرتے تھے کہ مجھے ایسی چیز پینا سخت ناگوار ہے جسے پی کر میری عقل خبط ہو جائے، لوگ مجھ پر ہنسنے لگیں اور مجھے اپنے پرائے کی تمیز نہ رہے۔ پھر جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو حضرت عثمانؓ کھل اٹھے اور کہا۔

''تَبًّا لَهَا، قَدْ كَانَ بَصَرِيْ فِيهَا ثَابِتًا'' (اس کا بیڑا غرق ہو جائے---اس کے بارے میں میری رائے ٹھیک ہی تھی۔) طبقات ج ۳، ص ۲۸۶.

جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ صرف ایک غزوہ---غزوۂ بدر---میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد اللہ کی طرف سے بلاوا آ گیا اور ہجرت سے اڑھائی سال بعد اپنے خالق سے جا ملے---ان کی خوش نصیبی کی انتہا کہ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کی میت کو بوسہ مرحمت فرمایا اور عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ بوسہ دیتے وقت رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور عثمانؓ کے رخساروں پر ٹپک رہے تھے۔

اللہ اللہ! یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

گریۂ ابرِ رحمت پہ لاکھوں سلام

جنت البقیع میں پہلی قبر انہی کی بنی تھی۔ ان کی قبر کے سرہانے جانِ دو عالم ﷺ نے پتھر رکھا تھا اور فرمایا تھا---''یہ اس کی قبر کی نشانی ہے۔''

رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْهُ

۸---ابو سلمہؓ

آپ قبیلہ مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ حبشہ کی طرف دو دفعہ ہجرت کی۔ تیسری بار مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کی۔ مدینہ کی طرف جانے والے سب سے پہلے مہاجر یہی ابو سلمہ ہیں۔ ☜

جب یہ سفارت وہاں پہنچی تو حسبِ ہدایت سفیروں نے پہلے مقربینِ شاہ سے

یہ جانِ دو عالم ﷺ سے بھی دو مہینے پہلے مدینہ پہنچ گئے تھے۔غزوۂ احد میں ان کے بازو پر بہت گہرا گھاؤ لگا۔ایک ماہ کے علاج کے بعد بظاہر زخم مندمل ہو گیا، مگر اندر سے ٹھیک نہ ہوا اور مواد جمع ہوتا رہا۔ کچھ عرصے بعد زخم پھٹ گیا لیکن اس کا زہر چونکہ پورے بدن میں سرایت کر چکا تھا، اس لئے جانبر نہ ہو سکے اور ۴ھ میں دار الفناء سے دار البقاء کی طرف رحلت کر گئے۔ جب وہ عالم نزع میں تھے تو جانِ دو عالم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے، اُس وقت پس پردہ کچھ مستورات رو رہی تھیں اور شدتِ غم میں اپنے آپ کو بددعائیں دے رہی تھیں۔آپ نے ان کو اس حرکت سے منع کیا اور فرمایا۔

''ایسے لغو کلمات منہ سے نہ نکالو، کیونکہ آخری وقت میت کے آس پاس بہت سے فرشتے موجود ہوتے ہیں جو وہاں پر موجود لوگوں کی دعا پر آمین کہتے ہیں۔اس لئے ایسے موقع پر ہمیشہ اچھی دعا کرنی چاہیے۔

پھر آپ نے حضرت ابو سلمہؓ کے لئے یہ دعا فرمائی۔

''اَللّٰھُمَّ! اس کی قبر کشادہ اور منور فرما، اس کے گناہ معاف فرما، اس کا مرتبہ ہدایت یافتہ لوگوں میں بلند فرما، اس کے پس ماندگان کی حفاظت و نگہبانی فرما اور اس کو بھی بخش دے اور ہمیں بھی یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ!''

اسی دوران حضرت ابو سلمہؓ کی روح پرواز کر گئی اور آنکھیں پتھرا گئیں۔جانِ دو عالم ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے ان کی آنکھیں بند کیں اور فرمایا---''مرتے وقت بدن سے جدا ہو کر جانے والی روح کو دیکھنے کے لئے انسان کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں اور پتلیاں پھر جاتی ہیں۔''

اللہ اکبر! کیسے بیدار بخت تھے یہ لوگ---جن کی نظریں دنیا سے رخصت ہوتے وقت محبوب رب العلمین کے روئے زیبا پر لگی ہوتی تھیں۔

آرزو ہے کہ جب جاں ہو تن سے جدا، سامنے روئے زیبائے سرکار ہو
میرا ہر لمحہ ہو مستیوں کا امیں ، میرا ظلمت کدہ نور الانوار ہو

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

ملاقات کی۔ ہدیئے تحفے پیش کئے اور اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ لوگ چونکہ صحیح حالات سے باخبر نہیں تھے اس لئے سفیروں کی باتوں سے متاثر ہو گئے اور ان کو ہر طرح کی امداد و تعاون کا یقین دلایا۔

شاہی دربار میں

جب سفیر دربار میں حاضر ہوئے اور نذرانے وغیرہ پیش کر کے فارغ ہوئے تو یوں سلسلہ گفتگو کا آغاز کیا۔

مندرجہ بالا آٹھ افراد تو وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے اور بہت شہرت پائی۔ اس لئے ان کی زندگی کے بیشتر واقعات تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں، جن کو ہم نے اختصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ان نامور حضرات کے علاوہ اس کاروانِ شوق میں شامل مزید تین مہاجرین کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

۹---حاطب ابن عمرؓ۔ ۱۰---سہیل ابن بیضاءؓ۔ ۱۱---عامر ابن ربیعہؓ

ان کے حالات زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے کوئی ایسا غیر معمولی طور پر ولولہ انگیز واقعہ نظر سے نہیں گزرا جو سیدالوریٰ میں پیش کیا جا سکے؛ تاہم یہ تینوں اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ، میں سے ہیں جن کی عظمت و تقدیس پر قرآن شاہد ہے اور احادیث بھری پڑی ہیں۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ اَجْمَعِیْنَ.

بعض مردوں کی بیویاں بھی ان کی ہمسفر تھیں، جن میں دو خواتین نہایت ممتاز ہیں، ایک حضرت عثمان ابن عفانؓ کی زوجہ محترمہ سیدہ رقیہؓ بنتِ سیدالوریٰ ﷺ اور دوسری حضرت ابوسلمہؓ کی زوجہ مکرمہ اُمِ سلمہؓ، جو حضرت ابوسلمہؓ کی وفات کے بعد جانِ دوعالم ﷺ کی زوجیت سے مشرف ہوئیں۔ ان دونوں کا تذکرہ علی الترتیب بنات الرسول، اور امہات المؤمنین میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

ان کے علاوہ حضرت ابوحذیفہؓ کی زوجہ محترمہ سہلہؓ اور حضرت عامر بن ربیعہؓ کی اہلیہ مکرمہ لیلیٰؓ بھی ہمرکاب تھیں۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُنَّ

''اَیُّھَا الْمَلِکُ! ہمارے شہر کے چند احمق جوان وہاں سے بھاگ کر آپ کے ملک میں آبسے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنا آبائی مذہب بھی ترک کردیا ہے اور آپ کے مذہب (عیسائیت) میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ انہوں نے ایک نیا دین ایجاد کیا ہے جس سے نہ ہم آشنا ہیں، نہ آپ۔ ہمیں ان لوگوں کے رشتہ داروں اور مکہ کے معززین نے آپ کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ آپ ان کو ہمارے ساتھ واپس بھیج دیں، کیونکہ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے اور جن لوگوں نے ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، وہ ان لوگوں کے گمراہ کن خیالات ونظریات سے بخوبی آگاہ ہیں اور ان کی تمام خامیوں سے باخبر ہیں۔''

''یہ دونوں سچ کہہ رہے ہیں، شہنشاہِ معظم!'' درباری امراء بول اٹھے ''واقعی یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے، لامذہبوں کو ان کے حوالے کردینا چاہئے --- یہ جانیں اور ان کا کام۔''

پہلے گزر چکا ہے کہ حبشہ کا یہ بادشاہ نہایت رحم دل اور انصاف پرور حکمران تھا۔ اس کو امراء کا یہ یک طرفہ فیصلہ پسند نہ آیا، کہنے لگا۔

''نہیں، واللہ! ایسا نہیں ہوگا --- جو لوگ دور دراز سے سفر کرکے میرے ملک میں آئے ہیں اور میرے زیر سایہ پناہ گزیں ہوئے ہیں، ان کو کس طرح میں ان سفیروں کے حوالے کردوں! --- اور وہ بھی محض ان کے کہنے پر!! البتہ میں ان کو بھی دربار میں بلاتا ہوں اور اس بارے میں پوچھتا ہوں، اگر صورت حال واقعۃً اسی طرح ہوئی، جس طرح سفیر بیان کررہے ہیں تو میں ان کو سفیروں کے ساتھ واپس بھیج دوں گا، لیکن اگر سفیروں کا بیان غلط ثابت ہوا تو پھر ان کو سفیروں کے سپرد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

چنانچہ بادشاہ نے ان کو بلا بھیجا۔ ان کے پاس پیغام پہنچا تو انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ ہمیں دربار میں کیا کہنا چاہئے --- ؟ آخر فیصلہ ہوا کہ ہمیں بہرحال سچ بولنا چاہئے اور اللہ رسول کے احکام صاف صاف بیان کردینے چاہئیں --- خواہ اس کی پاداش میں ہمیں کچھ بھی برداشت کرنا پڑے۔

تقریر دلپذیر

مہاجرین کا وفد دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے ان سے پوچھا۔

''یہ تم لوگوں نے کون سا نیا دین اختراع کرلیا ہے جو نہ تمہارے آبائی مذہب کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، نہ کسی دوسرے مذہب کے ساتھ؟''

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت جعفرؓ(۱) ابن ابی طالب نے یہ مختصر اور جامع تقریر کی۔

---

(۱) حضرت جعفرؓ حضرت علیؓ کے بڑے بھائی تھے اور اپنی صورت وسیرت کے لحاظ سے جانِ دو عالم ﷺ کے عکسِ جمیل تھے۔ آپ نے خود ان سے فرمایا --- ''اَشْبَهْتَ خَلْقِیْ وَخُلُقِیْ.'' (تم صورت وسیرت میں میرے ساتھ مشابہ ہو۔) مستدرک حاکم ج ۳، ص ۲۱۱

بے حد جواد وسخی تھے اور غریبوں مسکینوں کے ساتھ بہت محبت رکھتے تھے، اس لئے جانِ دو عالم ﷺ ان کو ابوالمساکین کہا کرتے تھے۔ مشکوٰۃ، ص ۵۷۰

اوّلین مسلمانوں میں سے تھے۔ اپنی اہلیہ سمیت ہجرت کر کے حبشہ گئے تو کئی سال تک وہاں مقیم رہے اور اس وقت واپس تشریف لائے جب جانِ دو عالم ﷺ فتح خیبر کے بعد خیبر میں ہی قیام پذیر تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو آتے دیکھا تو بے تابانہ آگے بڑھے اور ان کو گلے لگالیا۔ پھر ان کے ماتھے پر بوسہ ثبت فرمایا اور ان کی آمد سے اتنے مسرور ہوئے کہ فرمایا

''مَا اَدْرِیْ بِاَیِّهِمَا اَنَا اَشَدُّ فَرَحًا --- بِقُدُوْمِ جَعْفَرٍ اَمْ بِفَتْحِ خَیْبَرَ؟''

(میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ آج میرے لئے دو خوشیوں میں سے زیادہ باعثِ فرحت خوشی کون سی ہے --- جعفر کی آمد یا خیبر کی فتح؟) (الاستیعاب ج ۱، ص ۲۱۰)

سبحان اللہ! کیسی والہانہ الفت ومحبت ہے!

۸ھ میں غزوۂ موتہ کے دوران جام شہادت نوش کیا۔ اس لڑائی میں ان کے دونوں بازو کٹ گئے تھے۔ سینے پر تیروں، تلواروں اور نیزوں کے ستر سے زیادہ زخم لگے تھے اور جسم دو ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔ جب اس المناک شہادت کی اطلاع مدینہ پہنچی تو خاندانِ نبوت میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ سیدہ فاطمہؓ روتی تھیں اور فریاد کرتی تھیں --- وَاعَمَّاهُ --- (ہائے میرے چچا جان) جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو یوں زاروقطار روتے دیکھا تو فرمایا۔

''عَلٰی مِثْلِ جَعْفَرٍ فَلْتَبْکِ الْبَوَاکِیْ.'' (جعفر جیسے انسان پر رونے والیوں کو ☜

''اَیُّھَا الْمَلِکُ! اصل بات یہ ہے کہ ہم جاہل لوگ تھے، مردار کھاتے تھے، فحش

رونا ہی چاہئے۔) (الاستیعاب ج ۱، ص ۲۱۱)

راہِ خدا میں ہر دو بازو کٹانے کا ان کو یہ صلہ ملا کہ جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا --- ''اللہ تعالیٰ نے بازوؤں کے بدلے جعفر کو دو پر عطا کر دیئے ہیں جن کے ساتھ وہ جنت میں ہر طرف اڑتا پھرتا ہے۔''

اسی بناء پر حضرت جعفرؓ کا ایک لقب ''ذُوالْجَنَاحَیْنِ'' ہے اور دوسرا طَیَّار یعنی دو پروں والا اور اڑنے والا۔

ان کی شہادت سے تین چار دن بعد جانِ دو عالم ﷺ ان کی بیوہ اسماء بنت عمیسؓ کے پاس بیٹھے تھے کہ اچانک آپ کی زبان مبارک سے نکلا وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ. پھر اسماء سے فرمایا --- ''اسماء! جبریل، میکائیل اور اسرافیل کی معیت میں پرواز کرتے ہوئے جعفر یہاں سے گزر رہا ہے اور وہ سب سلام کہہ رہے ہیں۔ اس لئے تم بھی سلام کا جواب دو۔''

پھر فرمایا --- ''مجھے جعفر نے اطلاع دی ہے کہ فلاں روز دشمن کے ساتھ مقابلہ ہوا تو میرے بدن پر ۷۳ زخم آئے اور میرے دونوں بازو یکے بعد دیگرے کٹ گئے۔ ان کے عوض اللہ تعالیٰ نے مجھے دو پَر دے دیئے ہیں۔ اب میں جبرئیل و میکائیل کے ساتھ اڑتا ہوں، جنت میں جدھر جی چاہتا ہے، جاتا ہوں اور جو میوہ پسند آتا ہے کھاتا ہوں۔''

اسماءؓ یہ سن کر بہت خوش ہوئیں اور کہا ھَنِیْئًا لِجَعْفَرٍ .... (جعفر کو یہ اعزاز مبارک ہو۔ --- مگر یا رسول اللہ! اگر آپ کی اور جعفر کی روحانی ملاقات کا یہ حیرت انگیز واقعہ میں نے بیان کیا تو لوگ شاید اس پر یقین نہ کریں، اس لئے آپ خود ہی ان کو اس سے مطلع فرما دیجئے۔)

چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر سب کو یہ ایمان افروز واقعہ سنایا۔
مستدرک حاکم ج ۳، ص ۲۱۰۔

واضح رہے کہ اس وقت تک غزوہ موتہ کے شرکاء میں سے کوئی شخص واپس نہیں آیا تھا۔ جعفر شہید نے اس سے پہلے ہی شہادت کی تمام تفصیلات سے جانِ دو عالم ﷺ کو آگاہ کر دیا!!!

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ٥

حرکتیں کرتے تھے، رشتہ داروں کے حقوق پامال کرتے تھے، ہمسائیوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے اور طاقتور لوگ کمزوروں کا حق مار لیتے تھے۔

ہمارے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے کہ اچانک اللہ تعالیٰ نے ہم ہی میں سے ایک ایسے انسان کو رسالت سے سرفراز فرما دیا جس کو ہم اچھی طرح جانتے تھے اور اس کے حسب و نسب اور امانت و دیانت سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس رسول نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا اور بتایا کہ وہ ذات وحدہٗ لاشریک ہے، اس لئے ہمیں چاہئے کہ صرف اسی کی عبادت کریں اور ان خداؤں کی پرستش ترک کر دیں جن کو ہم اور ہمارے آباء و اجداد نے پتھروں سے تراشا ہے۔

اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم ہمیشہ سچ بولیں، امانت کی حفاظت کریں، رشتہ داروں اور ہمسایوں سے اچھی طرح پیش آئیں، اپنی ماؤں بہنوں پر بری نظر نہ ڈالیں اور قتل و خونریزی سے پرہیز کریں۔

اس نے ہمیں فحش کاموں سے، جھوٹ بولنے سے، یتیم کا مال کھانے سے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا۔

ہمیں اس کی یہ ساری باتیں اچھی لگیں، اس لئے ہم نے اس کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لے آئے۔ ہم نے بتوں کی پوجا چھوڑ کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت شروع کر دی اور تمام احکامات میں اس کے رسول کی اطاعت کرنے لگے۔ رسول نے جو چیز ہم پر حرام کی، ہم نے اس کو حرام سمجھا اور جس چیز کو حلال قرار دیا، ہم نے اسے حلال جانا۔

محض اس وجہ سے ہماری قوم، ہماری دشمن بن گئی۔ انہوں نے ہم کو طرح طرح کی اذیتیں دیں اور دوبارہ شرک و کفر کی طرف لوٹانا چاہا، مگر جب ہم اس پر آمادہ نہ ہوئے تو انہوں نے بے پناہ ظلم و ستم کئے اور ہم پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ آخر مجبوراً ہم نے اپنے شہر کو خیر باد کہا اور بے سرو سامانی کے عالم میں یہاں چلے آئے۔

شہنشاہِ معظم! ہم نے ساری دنیا میں آپ کے ملک کو ترجیح دی اور آپ کے زیر سایہ رہنا پسند کیا --- محض اس امید پر کہ یہاں ہم تک کسی ظالم کا ہاتھ نہیں پہنچ سکے گا۔"

اس مختصر مگر انتہائی پراثر تقریر سے تمام حاضرینِ دربار دم بخود رہ گئے اور سفیروں سمیت کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکی۔

تھوڑی دیر بعد بادشاہ نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا---''تمہارا رسول، اللہ کی طرف سے جو کتاب لایا ہے، اس کا کوئی حصہ تمہیں یاد ہے---؟ اگر یاد ہو تو سناؤ!''

اس پر حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی تلاوت شروع کی---اللہ کا کلام، حضرت جعفرؓ کی پرسوز قرأت اور شاہی دربار---! ایک سماں بندھ گیا۔ بادشاہ اتنا متاثر ہوا کہ رونے لگا اور اتنا رویا کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تربتر ہو گئی۔

ایک بادشاہ پر ہی کیا منحصر، وہاں پر موجود مذہبی رہنماؤں کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔ وہ دربار میں مذہبی کتابیں کھولے بیٹھے تھے۔ جب نغمۂ ازل نے ان کے کانوں میں رس گھولا تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا اور اشکوں کے سیلاب نے ان کی کتابوں کو بھگو ڈالا۔

جب جوشِ گریہ ذرا کم ہوا تو بادشاہ نے کہا---''واللہ! یہ کلام اور حضرت عیسیٰ پر نازل ہونے والا کلام ایک ہی مشعل کی کرنیں ہیں۔''

پھر سفیروں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا---''تم لوگ واپس چلے جاؤ! خدا کی قسم! میں ان لوگوں کو ہرگز تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔''

ایک اور کوشش

سفیروں کی یہ کوشش اگرچہ بری طرح ناکام ہو گئی تھی، مگر عمرابن عاص کو اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنا گوارا نہ تھا، اس لئے دربار سے نکلتے ہی اپنے ساتھی سے سرگوشی کی۔

''میں کل دوبارہ کوشش کروں گا اور اب کے ایسی چال چلوں گا کہ مسلمانوں کی یہاں سے جڑ کٹ جائے گی---میں بادشاہ کو بتاؤں گا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بندہ کہتے ہیں۔''

یہ حربہ واقعی خطرناک تھا کیونکہ شاہ حبشہ اور اس کے امراء وغیرہ سب عیسائی تھے اور عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں۔ وہ کب برداشت کر سکتے تھے کہ بیٹے کو بندہ بنا دیا جائے۔

دوسرے دن عمرابن عاص نے پھر دربار تک رسائی حاصل کی اور بادشاہ سے کہا۔

''عالی جاہ! آپ نے جن لوگوں کو پناہ دے رکھی ہے، وہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں بھی بہت غلط نظریات رکھتے ہیں اور ان کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔''

اگرچہ یہ ایک مذہبی مسئلہ تھا اور اس میں ہر انسان جذباتی ہوتا ہے، مگر آفرین ہے اس عادل حکمران پر کہ اس معاملے میں بھی اس نے سفیروں کی بات پر اعتبار نہ کیا اور مسلمانوں کو بلا بھیجا تاکہ اپنے موقف کی وضاحت وہ خود کریں۔

مسلمانوں کا وفد آیا تو بادشاہ نے ان سے پوچھا۔

''تم لوگ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو؟''

حضرت جعفرؓ نے جواب دیا---''ہم ان کو عبداللہ، رسول اللہ، روح اللہ اور کلمۃ اللہ سمجھتے ہیں جو کنواری اور پاک دامن بی بی مریم سے پیدا ہوئے۔''

یہ سن کر بادشاہ نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا---''واللہ! جو کچھ تم نے بیان کیا ہے، حضرت عیسیٰ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔''

بادشاہ کی زبانی اس حقیقت کا اعتراف سن کر عیسائی امراء کو طیش آ گیا اور ان کی ناکوں سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں، لیکن بادشاہ نے ان کے غصے کو کوئی اہمیت نہ دی کہنے لگا---''تم بے شک خرخر کرتے رہو، حقیقت یہی ہے۔''

پھر مسلمانوں سے کہا---''تم بے فکر ہو کر یہاں رہو، آئندہ اگر کسی نے تمہارے بارے میں کوئی غلط بات کی تو اس کو سزا بھگتنی پڑے گی۔''

پھر ملازمین کو حکم دیا۔

''رُدُّوْا اِلَیْھِمَا ھَدَایَا ھُمَا فَلَا حَاجَۃَ لِیْ بِھَا.''(سفیروں نے جو ہدیے پیش کئے ہیں، وہ ان کو واپس کر دیئے جائیں--- مجھے نہیں چاہئیں ایسے ہدیے!)

غرضیکہ دوسری کوشش میں بھی سفیروں نے منہ کی کھائی اور ناکام و نامراد واپس چلے گئے۔

ایمان، بغاوت، مصالحت

مسلمانوں کی حمایت میں اس حد تک آگے جانا اور سر دربار حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا

بندہ مان لینا، بادشاہ کو مہنگا پڑا۔ متعصب عیسائی امراء اس کے خلاف ہو گئے اور بغاوت کر دی۔ اس حالت میں بھی اس نے مسلمانوں کا اتنا خیال رکھا کہ ان کے لئے کشتیاں مہیا کر دیں اور حضرت جعفرؓ سے کہا---''اگر بغاوت کامیاب ہو گئی تو تم لوگوں کا جہاں جی چاہے چلے جانا، اگر ناکام ہو گئی تو پھر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، یہیں آرام سے رہنا۔''

پھر اس نے کاغذ پر لکھا۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَكَلِمَتُهٗ وَرُوْحُهٗ.

(میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں، اسی طرح عیسیٰ ابن مریم بھی اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور روح اللہ وکلمۃ اللہ ہیں۔)

یہ کاغذ اس نے سینے والی جیب میں ڈالا اور باغیوں سے مذاکرات کرنے چل دیا۔

باغیوں نے کہا---''ہمارا آپ سے اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ آپ نے حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بندہ مان لیا ہے۔''

''اگر وہ اللہ کے بندے نہیں ہیں تو کیا ہیں؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔'' سب نے زور دے کر کہا۔

''میرا اس پر ایمان ہے''---بادشاہ نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر اعلان کیا۔

''پھر ہمارا آپ کے ساتھ کوئی نزاع نہیں۔'' باغیوں نے کہا اور سر اطاعت خم کر دیا۔

اس طرح یہ مسئلہ بخوبی نمٹ گیا اور مسلمان وہاں امن وسکون سے رہنے لگے۔(۱)

---

(۱) قارئین حیران ہوتے ہوں گے کہ ایک طرف تو بادشاہ تحریری طور پر رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت کا اقرار کرتا ہے اور دوسری طرف جب باغی کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں تو بادشاہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہتا ہے کہ میرا اس پر ایمان ہے۔

یہ کیا معمہ ہے؟

اصل صورتحال یہ ہے کہ بادشاہ کھل کر اپنے اسلام کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح

مکہ کے شب و روز

قارئین کرام! آیئے مکہ مکرمہ واپس چلتے ہیں، جہاں آوازۂ حق کو دبانے کی مسلسل کوشش ہو رہی تھی اور نت نئی تجویزیں سوچی جا رہی تھیں۔

اس کے لئے بھی مشکلات پیدا ہو جاتیں اور ان مسلمانوں کے لئے بھی جو اس کے زیر سایہ چین کے دن بسر کر رہے تھے۔ اس لئے اس نے یہ تدبیر کی کہ اپنا عقیدہ لکھ کر جیب میں ڈال لیا اور جب اس نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا کہ میرا اس پر ایمان ہے تو اس کا اشارہ اس تحریر کی طرف تھا جو اس کے سینے والی جیب میں محفوظ تھی۔ باغی یہ سمجھے کہ بادشاہ نے حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے پر ایمان کا اعلان کیا ہے۔ اس طرح شورش بھی ختم ہو گئی اور بادشاہ کے ایمان پر بھی آنچ نہ آئی۔ یعنی سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔

اس نیک دل بادشاہ کا اصلی نام اصحمہ تھا اور نجاشی کے نام سے مشہور تھا۔ حضرت جعفرؓ کی دلآویز تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا تھا، مگر اس وقت اسلام کا اظہار اس نے مناسب نہ سمجھا۔ بعد میں جب جانِ دو عالم ﷺ نے مختلف بادشاہوں کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے مکتوبات طیبات تحریر فرمائے تو نجاشی کی طرف بھی ایک نامہ مبارک لکھا اور عمرا بن امیہؓ کو قاصد بنا کر بھیجا۔ نجاشی نے آپ کے نامہ عالی کو چوما، آنکھوں سے لگایا اور اس کے احترام میں تخت سے اتر کر نیچے بیٹھ گیا۔ پھر جوابی خط لکھا، جس میں اپنے ایمان کا کھل کر اظہار کیا اور مزید اطاعت و فرمانبرداری کا یوں ثبوت دیا کہ اپنے بیٹے شاہزادہ ''ارحا'' کو بیش قیمت تحائف دے کر جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔

شاہزادے کی قیادت میں یہ خیر سگالی وفد جب حاضرِ خدمت اقدس ہوا تو جانِ دو عالم ﷺ بہت مسرور ہوئے اور بنفس نفیس ان لوگوں کی مہمانداری کی۔ صحابہ نے عرض کی۔

''یا رسول اللہ! ہم جو موجود ہیں، آپ خود کیوں تکلیف کرتے ہیں؟''

جانِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا --- ''ان لوگوں نے میرے ساتھیوں کو اعزاز و اکرام سے رکھا تھا، اس لئے میرا دل چاہتا ہے کہ میں خود ان کی خدمت کروں۔'' البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۷۸۔

رجب ۹ ھ میں اس حق آگاہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وفات کے دن جانِ دو عالم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا --- ''آج ایک مرد صالح فوت ہو گیا ہے، جس کا نام اصحمہ تھا۔ آؤ،

جب جانِ دو عالم ﷺ کو ڈرانا دھمکانا اور آپ ﷺ پر تشدد کرنا کارگر نہ ہوا تو مال و دولت اور جاہ و اقتدار کا لالچ دے کر آپ کو رام کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔

ایک دن عتبہ نے دیگر اکابرین مکہ سے کہا کہ اگر تم لوگ مجھے اجازت دو تو میں محمد کے ساتھ بات چیت کروں اور اسے کچھ دینے کی پیشکش کروں، شاید اس طرح وہ ہمارا مطالبہ مان لے اور توحید و رسالت کا اعلان ترک کر دے۔ سب نے کھلے دل سے اس کو اجازت دے دی اور ہر قسم کی پیش کش کرنے کا اختیار دیا۔ چنانچہ عتبہ جانِ دو عالم ﷺ کے پاس آیا اور یوں گفتگو شروع کی۔

"بھتیجے! ہمارے معاشرے میں حسب و نسب کے اعتبار سے تمہارا جو اعلیٰ مقام ہے وہ سب کو معلوم ہے اور ہمیں بھی اس کا اعتراف ہے، مگر تم نے اپنی قوم کے لئے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ تم نے ہماری جماعت میں تفریق ڈال دی ہے اور ہمیں احمق و بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ تم ہمارے خداؤں کو برا کہتے ہو، ہمارے دین کی مخالفت کرتے ہو اور ہمارے آباء و اجداد کو کافر و گمراہ قرار دیتے ہو۔ تمہاری یہ باتیں قوم کے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ اس لئے انہوں نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر تمہارے ساتھ معاملات طے کرنے

اس کی نماز جنازہ ادا کریں۔"

چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ نے اس خوش قسمت انسان پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ الاصابہ ج ۱، ص ۱۱۹۔

یوں تو نیک اعمال کے نور سے ہر مردِ صالح کی قبر اندر سے منور ہو جاتی ہے، مگر نجاشی کا ایمان لانا اور غریب الوطن مسلمانوں کو آسائشیں مہیا کرنا اللہ تعالیٰ کو اس قدر بھایا کہ اس کی قبر کے اوپر بھی نور چھایا رہتا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "کُنَّا نَتَحَدَّثُ اَنَّهٗ لَا یَزَالُ یُرٰی عَلٰی قَبْرِهٖ نُوْرٌ۔" (یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ نجاشی کی قبر پر ہر وقت نور دکھائی دیتا ہے) ابو داؤد، ص ۳۴۲۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

کے لئے بھیجا ہے تا کہ اس مسئلہ کا کوئی حل تلاش کیا جائے۔ اب تم بتاؤ کہ تم یہ سب کچھ کس لئے کرتے ہو؟---اگر مال و دولت چاہتے ہو تو ہم اتنا مال اکٹھا کر کے تمہیں دیں گے کہ پورے مکہ میں تم سے زیادہ مالدار کوئی نہیں ہوگا۔

اگر عزت و وقار مطلوب ہے تو ہم تمہیں اتنی عزت دیں گے کہ اپنے تمام معاملات تمہاری رائے اور مشورے کے مطابق طے کیا کریں گے اور تمہارے فیصلے کو حرف آخر سمجھیں گے۔

اگر سر پر تاج شاہی رکھنے کا شوق ہے تو ہم سب متفقہ طور پر تمہیں تاحیات اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں گے۔

اور اگر خدانخواستہ تم پر کسی جن بھوت کا سایہ ہے تو ہم آسیب دور کرنے کے ماہرین سے تمہارا علاج کرانے کے لئے تیار ہیں---غرضیکہ ہم تمہارا ہر مطالبہ پورا کرنے پر رضامند ہیں بشرطیکہ تم ہمارے دین کی مخالفت ترک کردو اور ہمارے دیوتاؤں کو برا کہنا چھوڑ دو۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔''اَفَرَغْتَ یَا اَبَا الْوَلِیْدِ؟'' (ابوالولید (عتبہ کی کنیت) کیا تم اپنی بات ختم کر چکے ہو؟)

''ہاں! میں نے یہی کہنا تھا۔'' عتبہ نے جواب دیا۔

''اب مجھے بھی کچھ سنانے کی اجازت ہے؟''

''ہاں! کیوں نہیں۔''

اس پر جانِ دو عالم ﷺ نے سورہ حٰمٓ السجدہ کی ابتدائی آیات کی تلاوت شروع کردی۔ ﴿حٰمٓ ٥ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥.........﴾

عتبہ دونوں ہاتھ پیچھے ٹیک کر بیٹھ گیا اور بغور سننے لگا---کلامِ خدا بزبانِ مصطفےٰ، اللہ اکبر!---عتبہ مسحور ہو گیا۔

جب جانِ دو عالم ﷺ اس آیت پر پہنچے، ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ.......﴾ (اگر پھر بھی یہ لوگ روگردانی اختیار کریں،

تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو قوم عاد و ثمود پر نازل ہوئی تھی) تو عتبہ لرز اٹھا اور نزول عذاب کے خوف سے دہشت زدہ ہو کر جانِ دو عالم ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر التجا کی کہ خدا کے لئے بس کرو۔

تلاوت کے بعد جانِ دو عالم ﷺ نے عتبہ سے پوچھا۔۔۔ ''تم نے سن لیا؟''

''ہاں! سن لیا ہے۔'' عتبہ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

مشرکین نے اس کو واپس آتے دیکھا تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی سمجھ گئے کہ عتبہ کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے، جب وہ مشرکین کے پاس پہنچا تو انہوں نے پوچھا،

''مَاوَرَاءَکَ یَا اَبَا الْوَلِیْدِ؟'' (ابوالولید! کیا خبر لائے ہو؟)

''خبر یہ ہے'' عتبہ نے بتایا ''کہ آج میں نے ایسا فصیح و بلیغ کلام سنا ہے کہ اب تک اتنا بلند پایہ کلام کبھی نہیں سنا۔ وہ نہ تو شاعری ہے، نہ کہانت۔ اے قوم قریش! میری مانو تو محمد کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ خدا کی قسم! جو کلام میں نے آج سنا ہے، اس کا عنقریب بہت شہرہ ہوگا۔ اس لئے تم لوگ غیر جانبدار رہو، اگر باقی اہل عرب نے محمد کی بات نہ مانی اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو تمہیں ازخود اس سے نجات مل جائے گی اور اگر عرب نے اس کے آگے سر اطاعت خم کر دیا تو اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور اس کا وقار تمہارا وقار ہوگا کیونکہ وہ تمہارے ہی خاندان کا ایک فرد ہے۔''

مگر عتبہ کا یہ معقول مشورہ جذبات کی رو میں بہہ کر رد کر دیا گیا، الٹا اس کو طعنہ دیا گیا۔

''سَحَرَکَ وَاللہِ! یَا اَبَا الْوَلِیْدِ! بِلِسَانِہٖ'' (خدا کی قسم! تم پر بھی اس کی زبان کا جادو چل گیا ہے۔)

عتبہ نے دیکھا کہ یہ لوگ کوئی معقول بات سننے پر آمادہ نہیں ہیں تو کہنے لگا۔

''میری رائے یہی ہے، آگے تمہارا جو جی چاہے کرو۔''(۱)

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۶۳، السیرۃ الحلبیۃ ج ۱، ص ۳۳۰، الزرقانی ج ۱، ص ۲۱۰۔

فضول مطالبات

ترہیب وترغیب کے جملہ حربے ناکام ہوگئے تو ایسے لایعنی مطالبے کر کے جانِ دو عالم ﷺ کو زچ کیا جانے لگا جن کا منصب رسالت سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

﴿وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْبُوْعًا.........﴾

(القرآن سورہ ۱۷، آیات ۹۰ تا ۹۳)

(اور کہتے ہیں، ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے، جب تک تم ہمارے لئے کوئی چشمہ نہ جاری کردو۔

یا خود تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو، جس کے بیچ میں تم ہر طرف نہریں جاری کردو۔

یا تم ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرادو۔

یا تم اللہ اور فرشتوں کو ہمارے روبرو لاکھڑا کرو۔

یا تمہارا کوئی سونے کا مکان ہی ہو۔

یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ۔

اور ہم تو تمہارے آسمان پر چڑھ جانے سے بھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک تم وہاں سے لکھی ہوئی ایک کتاب نہ لاؤ، جسے ہم خود پڑھ سکیں۔)

ظاہر ہے کہ ایسے بے ہودہ مطالبات کا رسالت کے عظیم تر مقام کے ساتھ کوئی جوڑ ہی نہ تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ ، هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا.''

(کہہ دیجئے، میرا رب پاک ہے، میں تو بس ایک انسان ہوں، جسے رسالت سے سرفراز کیا گیا ہے۔)

اور رسالت کا ایسے شعبدوں سے کیا تعلق؟

مطالبہ پورا کرنے پر آمادگی مگر........؟

عموماً تو جانِ دو عالم ﷺ ایسے مہمل اور لغو مطالبے مسترد کر دیا کرتے تھے، مگر کبھی

کوئی مطالبہ پورا کرنے پر تیار بھی ہو جاتے۔

ایک دفعہ مشرکین نے کہا---''اگر تم ہمارے لئے کوہِ صفا کو سونے کا بنا دو تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔''

''کیا واقعی؟'' جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا۔

''ہاں، یقیناً۔'' سب نے یقین دلایا۔

جانِ دو عالم ﷺ دست بہ دعا ہونے لگے تو جبریل امین نازل ہوئے اور عرض کی ''یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر آپ کی خواہش ہو تو صفا کی پہاڑی سونا بن جائے گی، لیکن اگر اس کے باوجود یہ لوگ ایمان نہ لائے تو پھر ان کے لئے توبہ ورحمت کا دروازہ بند ہو جائے گا اور میں ان کو ایسا عذاب دوں گا کہ پوری کائنات میں ایسا عذاب کسی کو نہ ملا ہو گا۔''

جانِ دو عالم ﷺ اپنی قوم کی ہٹ دھرمی سے آگاہ تھے۔ جانتے تھے کہ یہ لوگ ایمان پھر بھی نہیں لائیں گے اور ہولناک عذاب کی لپیٹ میں آجائیں گے، اس لئے آپ نے صفا کے سونا بن جانے کی دعا ترک کر دی اور جبریل امین کو جواب دیا کہ کوہِ صفا بے شک سونا نہ بنے لیکن ان کے لئے توبہ ورحمت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا جائے۔(۱)

اس پیکرِ رحمت پر لاکھوں درود، جو اپنے دشمنوں کو بھی مبتلائے عذاب نہیں دیکھ سکتا تھا اور بارگاہِ الٰہی میں ان کے لئے توبہ ورحمت کے دروازے کھلے رکھنے کی التجائیں کیا کرتا تھا۔ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ.

کبھی جانِ دو عالم ﷺ کو استہزاء و تمسخر کا نشانہ بنایا جاتا۔

اَھٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللہُ رَسُوْلًا؟(۲) (اس شخص کو خدا نے رسول بنا ڈالا ہے!؟)

مَالِ ھٰذَا الرَّسُوْلِ یَأْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ. (۳) (یہ کیسا

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۳۳۶، الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۲۵۱.

(۲) سورہ ۲۵، آیت ۴۱. (۳) سورہ ۲۵، آیت ۸.

رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟)

گویا رسول ایسا ہونا چاہئے جو نہ کھانا کھائے، نہ بازار کو جائے---سبحان اللہ، کیا عجب معیار ہے رسالت کا!

ان کے نزدیک کسی انسان کی عظمت اور بڑائی کا دارومدار اس کی مالداری پر تھا اور چونکہ جانِ دوعالم ﷺ کے ہاں دولت کی فراوانی نہ تھی، اس لئے مشرکین حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا کرتے کہ کیا خدا کو مکہ وطائف کے دونوں شہروں میں کوئی ''بڑا آدمی'' دستیاب نہیں ہوا کہ اس کو رسول بناتا اور اس پر قرآن اتارتا۔ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (۱)

جانِ دوعالم ﷺ ایسی باتوں سے دل تنگ وملول ہوتے تو رب العلمین آپ کی تسلی خاطر کے لئے خود ان اعتراضات کے جوابات دیتا اور مشرکین کے منہ بند کر دیتا۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ

استہزاء وتمسخر کرنے والوں میں پانچ افراد پیش پیش رہا کرتے تھے۔

۱- ولید ابن مغیرہ ۲- عاص بن وائل ۳- اسود ابن یغوث ۴- اسود ابن مطلب ۵- حارث ابن عیطلہ۔

ایک دن جبریل امین جانِ دوعالم ﷺ کے پاس موجود تھے کہ ولید سامنے سے گزرا۔ جبریل نے پوچھا---''یارسول اللہ! یہ کیسا آدمی ہے؟''

''اچھا آدمی نہیں ہے۔'' جانِ دوعالم ﷺ نے جواب دیا۔

یہ سن کر جبریل امین نے اس کی پنڈلی کی طرف اشارہ کر دیا۔

اسی طرح یکے بعد دیگرے مندرجہ بالا پانچوں افراد سامنے سے گزرتے گئے اور جبریل ان کے جسم کے کسی نہ کسی حصے کی جانب اشارہ کرتے گئے۔

ان اشاروں کا مفہوم کچھ عرصہ بعد واضح ہوا، جب یہ پانچوں مختلف بیماریوں میں

---

(۱) سورہ ۴۳، آیت ۳۱۔

مبتلا ہو کر چل بسے، چنانچہ ولید --- جس کی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا --- اس کی پنڈلی میں اتفاقاً ایک دن تیر چبھ گیا۔ زخم معمولی تھا مگر دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ بالآخر اسی تکلیف سے مر گیا۔

عاص بن وائل --- جس کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا --- اس کے تلوے میں کانٹا ٹوٹ گیا اور رفتہ رفتہ یہ ذرا سا زخم اتنا بڑھا کہ پاؤں سوج کر چکی کے پاٹ جتنا ہو گیا۔ آخر ولید کی طرح یہ شخص بھی اسی تکلیف میں ہلاک ہو گیا۔

اسود بن یغوث --- جس کے سر کی جانب اشارہ کیا گیا تھا --- اس کے سر میں پیپ پڑ گئی اور وہ درختوں اور دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود ہی اپنا سر توڑ بیٹھا۔

اسود بن مطلب --- جس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا --- اندھا ہو گیا۔ بصیرت سے تو محروم تھا ہی، بصارت بھی زائل ہو گئی اور اسی عالم میں آنجہانی ہو گیا۔

حارث ابن عیطلہ --- جس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا --- اس کی پیاس نہیں بجھتی تھی، چنانچہ اس نے اتنا پانی پیا کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا۔

غرضیکہ پانچوں مستہزئین عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے اور اللہ کا فرمان سچا ثابت ہوا۔ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِءِیْنَ. (اے نبی! استہزاء کرنے والوں کے لئے تیری طرف سے ہم کافی ہیں۔)(۱)

اسلامِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ

نبوت کا چھٹا سال تھا، جب حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا اہم واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ مشہور و معروف ہے، مختصراً درج ذیل ہے۔

گھر سے جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے۔ راستے میں کسی نے کہا، پہلے گھر کی خبر لو، تمہاری بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ سخت غصے کے عالم میں واپس ہوئے، دروازے پر پہنچے تو اندر سے قرآن پڑھنے کی آواز آئی، غضب اور

(۱) السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۳۳۷، تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۵۵۸.

بھڑک اٹھا، اندر داخل ہوئے تو بہنوئی کو مارا پیٹا اور بہن کو بھی زخمی کر دیا، پھر کہا ''ابھی تم کیا پڑھ رہی تھیں؟'' بہن نے کہا ''اللہ کا کلام۔'' انہوں نے کہا ''لاؤ، مجھے دکھاؤ!'' بہن نے کہا ''پہلے غسل کر کے پاک صاف ہو جاؤ!'' اور غسل کے بعد جب انہوں نے اللہ کا کلام پڑھا تو دل کی دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا، کہنے لگے ''مجھے رسول اللہ کے پاس لے چلو۔ میں ایمان لانا چاہتا ہوں۔''

ان دنوں جانِ دو عالم ﷺ دارِ ارقم میں تبلیغی کام انجام دیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ وہاں گئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک صحابی نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی تو عمر کو تلوار حمائل کئے کھڑے دیکھا۔ اس صحابی نے آپ کو خوفزدہ انداز میں مطلع کیا کہ باہر عمر تلوار گلے میں ڈالے کھڑا ہے۔ شیرِ خدا حضرت حمزہؓ پاس ہی بیٹھے تھے، کہنے لگے ''ڈرنے کی کیا بات ہے؟ دروازہ کھولو! اگر اچھی نیت سے آیا ہے تو خوش آمدید، اگر برے ارادے سے آیا ہے تو اسی کی شمشیر سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔''

دروازہ کھولا گیا تو حضرت عمر اندر داخل ہوئے، جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا ''کیسے آئے ہو؟''

''اللہ، اُس کے رسول اور اُس کی کتاب پر ایمان لانے حاضر ہوا ہوں۔'' حضرت عمر نے جواب دیا۔

یہ بالکل غیر متوقع بات تھی، اس لئے سب کو بے انتہا مسرت حاصل ہوئی اور نعرۂ تکبیر سے مکہ کی فضا گونج اٹھی۔ اسلام لانے کے بعد حضرت عمرؓ نے جانِ دو عالم ﷺ سے پوچھا---''یارسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟''

''کیوں نہیں! یقیناً ہم حق پر ہیں۔'' جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔

''تو پھر یارسول اللہ! ہم چھپ چھپ کر عبادت کیوں کریں؟---آئندہ ہم علانیہ عبادت کیا کریں گے۔'' حضرت عمرؓ نے کہا۔

جانِ دو عالم ﷺ نے منظوری دیدی تو اہل ایمان کی یہ جماعت اس شان سے نکلی کہ ایک طرف حضرت حمزہؓ چل رہے تھے اور دوسری جانب حضرت عمرؓ۔ مشرکین نے جب یہ

منظر دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہاء نہ رہی --- بات ہی حیرانگی کی تھی --- جو شخص کل تک جانِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قتل کرنے کی قسمیں کھایا کرتا تھا اور مسلمانوں پر جبر و تشدد کرنے میں پیش پیش رہا کرتا تھا، آج آپ کا غلام اور مسلمانوں کا محافظ و نگہبان بن گیا تھا! --- یہ دیکھ کر مشرکین کے چہرے تاریک ہوگئے اور وہ سمجھ گئے کہ اب دعوت اسلامی کو روکنا ہمارے بس میں نہیں رہا --- مسلمانوں کو حرمِ مکرم میں عبادت کی آزادی چونکہ حضرت عمرؓ کے طفیل ملی تھی، اس لئے جانِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خوش ہو کر فاروق کے خطاب سے نواز دیا۔(۱)

مہاجرین کی واپسی اور ہجرتِ ثانیہ

مسلمانوں کی علانیہ عبادت کی خبریں جب حبشہ پہنچیں تو بہت سے مہاجرین یہ سوچ کر کہ اب شبِ ظلم تمام ہوگئی ہوگی، وہاں سے واپس چلے آئے، مگر یہاں آکر پتہ چلا کہ اگرچہ مسلمان اجتماعی طور پر علانیہ عبادت کر لیتے ہیں؛ تاہم اپنے قبیلوں اور خاندانوں میں ان کے ساتھ اب بھی وہی سلوک ہو رہا ہے --- وہی مار پیٹ اور ظلم و ستم۔ حبشہ سے واپس آنے والے تو خصوصی طور پر ایذا رسانیوں کا ہدف بننے لگے کیونکہ پہلے یہ لوگ مشرکین کے ہاتھوں سے بچ نکلے تھے۔ چنانچہ اب ساری کسریں نکالی جانے لگیں۔

اس ناقابلِ برداشت صورتِ حالات سے تنگ آکر ایک بار پھر ان لوگوں کو بے گھر ہونا پڑا اور نجاشی کے پاس پناہ لینا پڑی۔ اس دفعہ چند مزید کشتگانِ ستم بھی ساتھ ہوگئے تھے۔ مجموعی طور پر اس مرتبہ، ہجرت کرنے والوں کی تعداد سو [۱۰۰] کے لگ بھگ تھی۔ اگرچہ ان کو روکنے کے لئے کفار نے بھتیرے جتن کئے، مگر یہ لوگ کسی نہ کسی طرح چھپ چھپا کر نکل ہی گئے اور حبشہ میں جا کر آباد ہوگئے۔ پھر جب جانِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے تو کچھ افراد واپس آگئے اور جو باقی رہ گئے، ان کو آپ نے ۷ھ میں خود بلا لیا۔

---

(۱) تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ یہ واقعہ تاریخ و سیرت کی تمام کتابوں میں مرقوم ہے۔

مقاطعہ

جب حبشہ میں مہاجرین آرام سے رہنے لگے اور فاروق اعظمؓ کے اسلام لانے سے مکہ میں بھی علانیہ عبادت شروع ہوگئی تو اشاعتِ اسلام کا کام بہتر طریقے پر ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر مشرکین کی نیندیں حرام ہوگئیں --- ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسلام کو پھیلنے سے کس طرح روکا جائے۔ آخری حربے کے طور پر انہوں نے آپس میں یہ انسانیت سوز معاہدہ کیا کہ بنی ہاشم کے ساتھ مکمل طور پر بائیکاٹ کیا جائے اور جب تک وہ محمد کو قتل کرنے کے لئے ہمارے سپرد نہ کردیں، اس وقت تک ان کے ساتھ نہ شادی بیاہ کیا جائے، نہ ان سے کوئی چیز خریدی جائے، نہ ان پر کوئی شے فروخت کی جائے، نہ ان کے ساتھ صلح کی کوشش کی جائے اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کی نرمی برتی جائے۔

اس ''کارِ خیر'' کے لئے اتنا اہتمام کیا گیا کہ یہ معاہدہ باقاعدہ طور پر تحریر کیا گیا اور کعبہ میں آویزاں کیا گیا۔ (۱)

اس ظالمانہ معاہدے کو ضبطِ تحریر میں لانے والے بدبخت کو اس کے کئے کی سزا دنیا میں ہی مل گئی اور اس کا لکھنے والا ہاتھ ہمیشہ کے لئے شل ہوگیا۔ (۲)

ابتلاء عظیم

اس مقاطعہ کے بعد بنی ہاشم شعب ابی طالب (۳) میں محصور ہوگئے۔ یہ شدید ترین ابتلاء اور آزمائش کا دور تھا۔ قریش نہ تو بنی ہاشم کے ساتھ خود خرید و فروخت کرتے تھے، نہ کسی دوسرے کو کرنے دیتے تھے۔ اگر باہر سے کوئی تجارتی قافلہ مکہ میں آتا اور بنی ہاشم کا کوئی فرد اس سے کوئی چیز خریدنا چاہتا تو ابولہب (۴) زیادہ قیمت دے کر وہ چیز حاصل کرلیتا اور بے بس ہاشمی خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ (۵)

---

(۱) السیرة الحلبیة ج ۱، ص ۳۶۶، البدایہ والنہایہ ج ۱، ص ۸۳.

(۲) الزرقانی ج ۱، ص ۳۳۶، سیرت ابن ھشام ج ۱، ص ۲۳۲.

(۳) شعب ابی طالب، ابوطالب کی موروثی جائیداد تھی اور ایک درہ نما گھاٹی کی شکل میں تھی۔

(۴) واضح رہے کہ تمام بنی ہاشم میں ابولہب وہ واحد شخص تھا جس نے مقاطعہ میں بنی ہاشم کا ساتھ نہیں دیا تھا اور دیگر قریش کا ہمنوا بنا رہا تھا۔

(۵) الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۳۰۲، سیرت حلبیہ ج ۱، ص ۳۶۷.

ایسے میں آپ خود ہی سوچئے کہ ان کے شب و روز کس طرح بسر ہوتے ہونگے!

حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ ان دنوں ایک دفعہ رات کو سوکھا چمڑا ہاتھ آ گیا۔ میں نے اس کو دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی کے ساتھ کھا گیا۔

ظالموں کو معصوم بچوں پر بھی ترس نہیں آتا تھا۔ بنی ہاشم کے نونہال بھوک سے بلکتے رہتے اور ماں باپ حسرت کی تصویر بنے انہیں تکتے رہتے۔ کچھ مشرکین اتنے سنگدل تھے کہ بچوں کی دلدوز چیخیں سن کر خوش ہوتے اور قہقہے لگاتے۔ (۱)

اور یہ کوئی دو چار روز، یا مہینہ دو مہینہ کی بات نہ تھی --- یہ مصیبت بداماں سیاہ رات تین سال کے طویل عرصے پر محیط تھی۔

آفرین ہے ان راہروانِ وفا پر کہ اتنی مدت تک مصائب و آلام کی چکی میں پستے رہے مگر مخالفین کی خواہشات کے آگے ان کے سر خم نہ ہوئے؛ بلکہ اس سارے عرصے میں انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کی پہلے سے زیادہ حفاظت و نگہبانی کی اور اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں دشمن سوتے میں حملہ کر کے آپ کو نقصان نہ پہنچا دیں، ابوطالب نے یہ احتیاطی تدبیر کی کہ آپ کے بستر پر خود سو جاتے یا اپنے کسی عزیز کو سلا دیتے تا کہ اگر حملہ ہو ہی جائے تو ہماری جانیں اس جانِ جہاں ﷺ پر فدا ہو جائیں۔ (۲)

معاھدے کا حشر

تین سال تک اس ظالمانہ معاہدے پر عمل ہوتا رہا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام فرمایا کہ یہ معاہدہ خود بخود ہی کالعدم ہو گیا۔

ایک دن جانِ دو عالم ﷺ نے ابوطالب کو بتایا! --- ''چچا جان! اللہ تعالیٰ نے معاہدے کی تحریر پر دیمک کو مسلط فرما دیا تھا اور اب اس میں اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی۔''

ابوطالب بہت حیران ہوئے کہ بھتیجے کو اس بات کا پتہ کس طرح چل گیا؛ جب کہ

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ۱، ص ۱۴۰۔ (۲) طبقاتِ ابن سعد ج ۱، ص ۱۴۰۔

اس کا بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہے؟ تعجب سے بولے۔

اَرَبُّکَ اَخبَرَکَ بِھٰذَا؟ (کیا تمہارے رب نے تمہیں اس پر مطلع کیا ہے؟)

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---"نَعَمْ!"

ابو طالب اسی وقت حرم میں گئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یَامَعْشَرَ قُرَیْش! میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارا تحریر کردہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے اور اسے دیمک چاٹ گئی ہے۔ اب اس تحریر کو اتار کر لاؤ اور کھول کر دیکھو۔ اگر بھتیجے کی بات غلط ہوئی تو میں اس کو تمہارے حوالے کر دوں گا اور اگر اس کی اطلاع درست ہوئی تو پھر تم کو اپنے طرزِ عمل سے باز آ جانا چاہئے۔"

مخالفین تو تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اتنی حفاظت سے لٹکائے ہوئے معاہدے کو دیمک کھا سکتی ہے، اس لئے سب نے کہا---"قَدْ رَضِینَا" (ہم راضی ہیں۔)

چنانچہ وہ تحریر لا کر کھولی گئی اور سب کی آنکھوں نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ اس میں بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ کے سوا ایک حرف بھی باقی نہیں رہا۔

قدرتِ الٰہیہ کا یہ کرشمہ دیکھ کر بھی ابو جہل جیسے ہٹ دھرم اس ظالمانہ معاہدہ پر ڈٹے رہنے کے لئے اصرار کرتے رہے، مگر انصاف پسند لوگوں نے ان کی باتوں کو قابلِ توجہ نہ سمجھا اور معاہدے کے باطل ہو جانے کا فیصلہ دے دیا---اور یوں تین سال بعد اس المناک قید کا خاتمہ ہو گیا۔(۱)

اسلامِ طفیل ابن عمر

جانِ دو عالم ﷺ کے شعب ابی طالب میں محصور ہو جانے کی وجہ سے وقتی طور پر دعوت و تبلیغ کا کام سرد پڑ گیا تھا، اب تین سال بعد آپ باہر تشریف لائے تو پھر رشد و ہدایت کا بازار گرم ہو گیا اور اہل ایمان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

مشرکین اتنے عرصے تک جانِ دو عالم ﷺ کو اسیر رکھنے کے باوجود آپ

---

(۱) سیرت ابن ھشام ج ۱، ص ۲۳۲، طبقاتِ ابن سعد ج ۱، ص ۱۴۰.

کے پائے ثبات میں لغزش تو کجا، ہلکی سی لرزش بھی پیدا نہ کر سکے تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ لوگوں کو پروپیگنڈے کے زور سے جانِ دو عالم ﷺ سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔

چنانچہ انہی دنوں قبیلہ دوس کا معزز اور شریف النفس سردار طفیل ابن عمر دوسی مکہ مکرمہ آیا تو مشرکین نے اس کو جانِ دو عالم ﷺ سے اتنا بدظن کیا کہ اس نے حرم کو جاتے وقت کانوں میں کپڑا ٹھونس لیا، کہ کہیں محمد کا کلام کانوں میں نہ پڑ جائے۔ جب حرم میں پہنچا تو آپ کعبۃ اللہ کے پاس کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اور بآواز بلند تلاوت فرمارہے تھے۔ طفیل بھی آپ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کانوں میں اگرچہ کپڑا ٹھنسا ہوا تھا مگر پھر بھی چند سامعہ نواز جملے اس کے کانوں میں پڑ ہی گئے۔ اس کو وہ حسین جملے بہت بھلے معلوم ہوئے اور اس نے سوچا کہ ڈرنے کی کیا بات ہے! میں ایک سمجھدار آدمی ہوں اور برے بھلے کی خوب تمیز رکھتا ہوں۔ مجھے یہ کلام ضرور سننا چاہئے --- پھر سننے کی دیر تھی کہ طفیل کی کایا پلٹ گئی اور جب جانِ دو عالم ﷺ نماز سے فارغ ہو کر گھر جانے لگے تو طفیل بھی سر جھکائے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ گھر پہنچ کر طفیل نے عرض کی۔

"یا محمد! آپ کی قوم نے مجھے آپ سے اس قدر بدگمان کر دیا تھا کہ میں اپنے کانوں کو بند کر کے حرم کو گیا تھا، مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کا کلام سننے کا موقع نصیب فرما دیا۔ مجھے وہ کلام بہت ہی پسند آیا ہے، اس لئے ذرا تفصیل سے بتائیے کہ آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں۔

جانِ دو عالم ﷺ نے اسلام کی تعلیمات بتائیں تو طفیل کو وہ بھی بے حد پسند آئیں اور اسی وقت کلمہ پڑھ کر آپ کے خادموں میں شامل ہو گئے۔ (۱)

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۹۹، سیرت ابن ھشام ج ۱، ص ۲۲۵.

اوراقِ تاریخ میں حضرت طفیلؓ کی ایک عجیب کرامت کا تذکرہ ملتا ہے، جو جانِ دو عالم ﷺ کے دربار نور بار کا عطیہ تھی۔ ☜

وفاتِ ابوطالب

نبوت کے دسویں سال جانِ دو عالم ﷺ شعب ابی طالب سے باہر تشریف لائے اور اسی سال آپ کو ایک جانکاہ صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ یعنی آپ کے چچا ابوطالب کا انتقال ہوگیا۔

حضرت طفیلؓ جب مشرف باسلام ہوگئے تو انہوں نے عرض کی---''یارسول اللہ! میں اپنی قوم کا سردار ہوں اور یہاں سے جا کر ان کو بھی اسلام کی دعوت دوں گا۔ آپ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کوئی ایسی نشانی مرحمت فرمادے جو میری صداقت اور سچائی کا ثبوت ہو۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے دعا فرمائی۔''اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ لَہٗ اٰیَۃً.'' (الٰہی! طفیل کو کوئی نشانی عطا فرمادے۔)

جانِ دو عالم ﷺ سے رخصت ہو کر جب حضرت طفیلؓ اپنے گاؤں کے قریب پہنچے تو دعائے مصطفٰے کا اثر ظاہر ہوا اور ان کی پیشانی سے نور کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ حضرت طفیلؓ نے بارگاہِ الٰہی میں التجا کی---''یااللہ! اس روشنی کا مرکز میری پیشانی کے بجائے کسی اور چیز کو بنا کہ کہیں یہ نادان لوگ میری پیشانی کی چمک کو میری صورت بگڑ جانے پر محمول نہ کریں۔''

چنانچہ اسی وقت روشنی ان کی لاٹھی میں منتقل ہوگئی اور لاٹھی شمع کی طرح دمکنے لگی۔

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی نُوْرِ کزو شد نورہا پیدا

اگرچہ حضرت طفیلؓ کا خیال یہی تھا کہ ساری قوم دعوتِ اسلام پر لبیک کہے گی، مگر آبائی مذہب کو یکلخت چھوڑ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے اتنی واضح نشانی دیکھنے کے باوجود گھر کے چند افراد کے علاوہ کسی نے ان کی باتوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

چنانچہ کچھ عرصے بعد حضرت طفیلؓ دل شکستہ وملول، دوبارہ جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی قوم کی نافرمانی کی شکایت کرنے کے بعد عرض کی کہ یارسول اللہ ان ناعاقبت اندیش لوگوں کے لئے بددعا فرمایئے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے ہاتھ اٹھائے حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں بھی اس

وہ چچا --- جو جانِ دو عالم ﷺ کا کفیل و غمگسار تھا۔

وہ چچا --- جو بھتیجے کو اپنی حقیقی اولاد سے زیادہ چاہتا تھا۔

وہ چچا --- جو بھتیجے پر پروانہ وار نثار ہوتا تھا اور زمانہ اسارت میں کبھی خود اس کے بستر پر سوتا تھا، کبھی اپنے کسی عزیز کو سلا دیتا تھا تاکہ اس کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

وہ چچا --- جو اشاعتِ اسلام کی کوششوں میں بھتیجے کا بھرپور ساتھ دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ جب تک دم میں دم ہے، بھتیجے کی حفاظت وحمایت کرتا رہوں گا۔

ایسے ہمدرد اور مہربان چچا کی رحلت سے جانِ دو عالم ﷺ کے دل پر جو بیتی ہوگی، اس کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ابوطالب کی وفات کے بعد ایک

وقت پاس بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب قبیلۂ دوس تباہ و برباد ہو جائے گا، مگر جب کان لگا کر سنا تو رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِیْن ان کے لئے بددعا کرنے کے بجائے یوں مصروف دعا تھے۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْسًا، اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْسًا (الٰہی! قبیلہ دوس کو ہدایت دے دے۔ الٰہی! قبیلہ دوس کو ہدایت دے دے۔)

جانِ دو عالم ﷺ کی دعا سے حضرت طفیلؓ کی زبان میں تاثیر پیدا ہوگئی اور لوگ بتدریج دین اسلام میں داخل ہونے لگے۔ حضرت طفیلؓ کافی عرصہ تک تبلیغ میں مصروف رہے اور تیسری بار اس وقت خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، جب آپ فتح خیبر سے فراغت پا کر وہیں قیام پذیر تھے۔ حضرت طفیل کے ساتھ ستر، اَسی گھرانوں کے افراد بھی تھے، جو ان کی کوششوں سے مشرف باسلام ہوئے تھے۔ آپ ان کی آمد سے بہت مسرور ہوئے اور مالِ غنیمت سے ان لوگوں کو بھی حصہ عطا فرمایا۔

اس کے بعد حضرت طفیلؓ جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ آپ کے وصال کے بعد ختم نبوت کے تحفظ کے سلسلے میں مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

(البدایہ والنہایہ ص ۹۹، ۱۰۰)

بدبخت نے جانِ دوعالم ﷺ کے سر پر مٹی ڈال دی اور آپ کی خم بہ خم عنبریں زلفیں خاک آلود ہوگئیں تو آپ گھر تشریف لائے۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر آپ کی ایک بیٹی اٹھی اور سر دھوتے ہوئے زار زار رونے لگی۔ جانِ دوعالم ﷺ نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا

''بیٹی! نہ رو، تیرے باپ کا اللہ نگہبان ہے'' --- پھر نہایت حسرت سے فرمایا

''جب تک ابوطالب زندہ تھے، ایسی حرکت کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔''(۱)

واقعۂ وفات

ابوطالب کی وفات کے وقت سردارانِ قریش ان کے پاس بیٹھے تھے، جانِ دوعالم ﷺ نے ابوطالب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یَاعَمَّاہ! قُلْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَشْھَدُ لَکَ بِھَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ.''

(چچا جان! لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دیجئے تاکہ میں قیامت میں آپ کے ایمان کی گواہی دے سکوں۔)

مگر ابوطالب نے اس وقت کلمہ نہ پڑھا اور کہا کہ اس گھڑی کلمہ پڑھنے سے قریش یہ کہنے لگیں گے کہ ابوطالب نے موت کے ڈر سے کلمہ پڑھ لیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی میرے بھتیجے! تو میں یہ کلمہ پڑھ کر تیری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا --- محض تیری خوشنودی کی خاطر۔

اس پر یہ آیت اتری۔ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ. (آپ اس انسان کو ہدایت نہیں دے سکتے جس کے ساتھ محبت رکھتے ہیں، یہ تو اللہ کی مرضی ہے، جسے چاہے ہدایت دے دے۔)

بخاری و مسلم اور احادیث کی تمام کتابوں میں تھوڑے بہت لفظی تغیر کے ساتھ یہ روایت اسی حد تک پائی جاتی ہے؛ البتہ محمد ابن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جب ابوطالب کی بالکل آخری گھڑیاں آ پہنچیں تو جانِ دوعالم ﷺ کے دوسرے چچا، عباسؓ

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج۳، ص ۱۲۲، تاریخ طبری ج۲، ص ۲۲۹، سیرت ابن ھشام ج۱، ص ۲۵۸۔

نے دیکھا کہ ابوطالب کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ انہوں نے غور سے سنا تو جانِ دوعالم ﷺ کو بتایا کہ بھتیجے! اللہ کی قسم، میرے بھائی نے وہ کلمہ پڑھ لیا ہے، جس کا تم نے اس کو کہا تھا۔

جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا۔ لَمْ اَسْمَعْ (میں نے نہیں سنا۔)(۱)

---

(۱) سیرت ابن هشام ج ۱، ص ۲۶۰، البدایه والنهایه ج ۳، ص ۱۲۳۔

ابوطالب مومن تھے یا نہیں؟--- یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، مفسرین، محدثین اور علماء ملت اسلامیہ کی عظیم اکثریت ان کے عدم ایمان پر متفق ہے، لیکن کچھ علماء ان کے ایمان کے بھی قائل ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ تعداد میں بہت تھوڑے ہیں، مگر ان میں علامہ سحیمی، علامہ سبکی، علامہ نبہانی، علامہ شعرانی اور علامہ قرطبی جیسے تاجدارانِ علم وفضل بھی شامل ہیں۔ متاخرین میں بعض اہل علم نے ایمانِ ابوطالب پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ قاضی احمد زینی دحلان، مفتی مکہ مکرمہ کی ''اسنی المطالب فی ایمان ابی طالب'' اور محمد برخوردار محشی شرح عقائد کی ''القول الجلی فی نجاۃ عم النبی'' اس موضوع پر لکھی گئی مشہور کتابیں ہیں۔ اسی طرح کفر ابوطالب پر بھی متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں۔ خصوصاً اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کی کتاب ''شرح المطالب فی مبحث ابی طالب'' اس موضوع پر نہایت ہی محققانہ اور فاضلانہ تصنیف ہے۔

جہاں تک روایات کا تعلق ہے تو کفر ابوطالب پر بخاری ومسلم اور حدیث کی دیگر کتابوں میں کئی روایات موجود ہیں، جو سند کے اعتبار سے بہت قوی اور مضبوط ہیں؛ جبکہ ایمان ابوطالب پر اولاً تو روایات ہی کم ہیں اور جو چند روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی بلحاظ سند خاصی کمزور ہیں اور بخاری مسلم کی مستند روایات کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لئے محدثانہ نکتۂ نظر سے ایمان ابوطالب ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ البتہ ابوطالب کے ان قصائد سے جو انہوں نے جانِ دوعالم ﷺ کی مدح ونعت میں لکھے، ان کا مومن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چند جھلکیاں ملاحظہ فرمایئے۔

اَلا اِنَّ خَیْرًا النَّاسِ نَفْسًا وَّ وَالِدًا اِذَا عُدَّ سَادَاتُ الْبَرِیَّۃِ اَحْمَدُ

نَبِیُّ الْاِلٰہِ وَالْکَرِیْمُ بِاَصْلِہٖ وَاَخْلَاقِہٖ وَھُوَالرَّشِیْدُ الْمُؤَیَّدُ

(الاستیعاب ج ۲، ص ۹۲، سیرتِ ابن هشام ج ۲، ص ۸۸) ☜

وصالِ اُمّ المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ

ابھی ابوطالب کی وفات کا صدمہ تازہ ہی تھا کہ غم کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا یعنی

(آگاہ رہو کہ جب بھی دنیا کے سرداروں کا تذکرہ کیا جائے گا، تو ان سب میں اپنے نفس کے لحاظ سے اور والد کے لحاظ سے بہترین انسان احمد ہوگا۔

وہ اللہ کا نبی ہے، نسب اور اخلاق کے اعتبار سے شریف ہے، ہدایت یافتہ ہے اور (من جانب اللہ) مؤید ہے۔) (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمْ)

اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّا وَجَدْنَا مُحَمَّدًا نَبِیًّا کَمُوْسٰی خُطَّ فِیْ اَوَّلِ الْکُتُبِ

(البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۸۷، سیرتِ ابن ھشام ج ۱، ص ۳۲۰)

(کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہم نے محمد کو موسیٰ کی طرح نبی پایا، جس کا تذکرہ پہلی کتابوں میں موجود ہے۔)

لَقَدْ اَکْرَمَ اللّٰہُ النَّبِیَّ مُحَمَّدًا فَاَکْرَمُ خَلْقِ اللّٰہِ فِی النَّاسِ اَحْمَد

(بلاشبہ اللہ نے نبی محمد کو اعزاز عطا فرمایا ہے۔ اب تمام مخلوقات سے معزز احمد ہیں۔)

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے، کس طرح کھل کر محمد ﷺ کی نبوت کا اقرار کر رہے ہیں۔

جب جانِ دو عالم ﷺ کو موسیٰ کی طرح نبی مان لیا، سردار مان لیا، شریف، رشید اور مؤید مان لیا اور ساری کائنات سے افضل و اعلیٰ مان لیا تو پھر باقی کیا رہ گیا؟

ان قصائد کے علاوہ ابوطالب نے آخری وقت جو وصیت کی تھی، اس میں اپنے خاندان کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''لَنْ تَزَالُوْا بِخَیْرٍ مَاسَمِعْتُمْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَاتَّبَعْتُمْ اَمْرَہٗ فَاتَّبِعُوْہُ وَاَعِیْنُوْہُ تَرْشُدُوْا ...... (جب تک تم لوگ محمد کی باتیں مانتے رہو گے اور اس کی اتباع کرتے رہو گے بھلائی پر رہو گے۔ اس لئے اس کی پیروی کرو اور اس کی امداد کرو، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔) (طبقات ابن سعد ج ۱، ص ۱۱۲، تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۳۹)

اس وصیت سے پتہ چلتا ہے کہ ابوطالب نہ صرف یہ کہ خود مؤمن تھے؛ بلکہ دوسروں کو بھی اتباعِ مصطفیٰ اور اعانتِ مصطفیٰ کی تلقین کرنے والے تھے --- لیکن یہ وصیت بھی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے ☜

جانِ دو عالم ﷺ کی اولین رفیقۂ حیات اُمّ المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ پچیس سالہ خوشگوار رفاقت کے بعد آپ کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ O (۱)

چونکہ یہ دونوں واقعات --- ابو طالب کی وفات اور اُمّ المؤمنین کا وصال --- نبوت کے دسویں سال وقوع پذیر ہوئے تھے اور دونوں ہی صدمے جانِ دو عالم ﷺ کے لئے غیر معمولی تھے، اس لئے آپ نے اس سال کا نام ہی عَامُ الْحُزْنِ رکھ دیا یعنی غم کا سال۔

اگرچہ مادی طور پر یہ سال انتہائی غم ریز تھا، مگر روحانیت کے اعتبار سے انتہائی مبارک ثابت ہوا اور اس میں جانِ دو عالم ﷺ کو وہ رفیع القدر اور عظیم الشان مرتبہ ملا جس کے آگے تمام کائنات کی رفعتیں اور عظمتیں سرنگوں ہو گئیں۔ یعنی محبوبیت کی معراج ---

---

بہر حال ہمارا مقصد ابو طالب کو مومن ثابت کرنا نہیں، ہم نے تصویر کے دونوں رخ پوری غیر جانبداری سے قارئین کے سامنے پیش کر دیئے ہیں، ہماری رائے میں اس مقام پر سکوت کرنا ہی اچھا ہے، کیونکہ اگر بخاری و مسلم کی صحیح روایات کی وجہ سے ابو طالب کو مومن ثابت کرنا مشکل ہے تو ابو طالب جیسے عقائد رکھنے والے انسان کو بے دھڑک کافر قرار دے دینا بھی آسان نہیں ہے۔ علامہ شبلی کی یہ بات آدمی کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ --- ''ابو طالب نے آنحضرت ﷺ کے لئے جو جاں نثاریاں کیں اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ اپنے جگر گوشوں تک کو آپ پر نثار کرتے تھے۔ آپ کی محبت میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا۔ آپ کی خاطر محصور ہوئے، فاقے اُٹھائے، شہر سے نکالے گئے، تین تین برس تک آب و دانہ بند رہا۔ کیا یہ محبت، یہ جوش، یہ جاں نثاریاں سب ضائع جائیں گی؟'' (سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲۳۵)

مگر جو اہل علم ان کے ایمان نہ لانے کے قائل ہیں وہ یہ جواب دے سکتے ہیں کہ ابو طالب کی جاں نثاریاں ضائع تو نہیں گئیں؛ بلکہ ان کے عوض ابو طالب کے عذاب میں تخفیف ہو گئی اور صحیح حدیث کے مطابق وہ اہل جہنم میں سب سے کم عذاب والے ہوں گے؛ البتہ عذاب سے مکمل نجات صرف ایمان کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

وَالْعِلْمُ عِنْدَ الْعَلِیْمِ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ

(۱) حضرت خدیجہؓ کے مفصل حالات جلد سوم، باب ازواجِ مطہرات میں ملاحظہ فرمائیے!

محبوب ومحب کا وصال۔(۱)

اسی سال آپ کے عقد میں دوخوش نصیب خواتین آئیں۔ایک اُمّ المؤمنین سودہؓ بنت زمعہ اور دوسری اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہؓ بنتِ صدیق اکبرؓ (۲)

طائف کے بازار میں

پہلے گزر چکا ہے کہ ابوطالب کے انتقال کے بعد جانِ دوعالم ﷺ کو مزید ستایا جانے لگا۔ایک دن جب آپ اہل مکہ کے طرزِ عمل سے عموماً اور ابولہب کی بیہودہ باتوں سے خصوصاً نہایت آزردہ خاطر ہوئے تو طائف جانے کا ارادہ فرمایا کہ شاید وہاں کوئی بندۂ خدا حق کی بات سننے پر آمادہ ہو جائے۔آپ کے متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) زید بن حارثہؓ بھی ساتھ تھے۔طائف میں قبیلہ ثقیف کے سرداروں عبد یالیل، مسعود اور حبیب کو آپ نے دعوت اسلام دی۔یہ تینوں بھائی ایک دوسرے سے بڑھ کر سنگدل اور شقی القلب تھے۔ انہوں نے آپ کا مذاق اڑایا اور پھبتیاں کسیں۔

ایک نے کہا ''اللہ کو رسول بنانے کے لئے تمہارے علاوہ کوئی آدمی نہیں ملا تھا؟''

دوسرے نے کہا ''میں تو تمہارے ساتھ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ اگر تم واقعی رسول ہو تو پھر ہم جیسے کمتر لوگ تم سے مخاطب ہونے کا شرف کب حاصل کر سکتے ہیں؟ اور اگر تم جھوٹے ہو تو جھوٹے آدمی کے منہ لگنے سے کیا فائدہ؟''

اس طرح کی دلآزار باتیں کرنے کے بعد انہوں نے مزید فرعونیت کا مظاہرہ کیا اور کہا۔''اُخْرُجْ مِنْ بَلَدِنَا'' (نکل جاؤ ہمارے شہر سے۔)

جانِ دوعالم ﷺ دل شکستہ وافسردہ وہاں سے اٹھ آئے، مگر طنز و تشنیع کے تیروں سے آپ کا کلیجہ چھلنی کرنے والوں کی ابھی تسلی نہیں ہوئی تھی، اس لئے انہوں نے اوباش قسم

---

(۱) واقعۂ معراج کی تفصیل جلد سوم، باب معراج شریف میں دیکھئے!

(۲) دونوں کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ جلد سوم، باب ازواجِ مطہرات میں آئے گا۔

کے لوگوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ اخلاق و شرافت سے عاری یہ لوگ چیختے چلاتے اور گالیاں بکتے ہوئے آپ کی راہ گزر کے دونوں جانب صفیں بنا کر کھڑے ہو گئے اور آپ پر پتھر برسانے لگے۔ ریشم سے زیادہ نرم و نازک جسم، پتھروں کی بوچھاڑ سے لہولہان ہو گیا۔ قساوتِ قلبی کی انتہا یہ کہ جب سنگباری کی شدت سے آپ نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے تو ظالم کندھوں سے پکڑ کر دوبارہ کھڑا کر دیتے اور چلنے پر مجبور کرتے۔ حضرت زیدؓ نے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر اکیلا آدمی چاروں طرف سے آتے ہوئے پتھروں کو کب روک سکتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت زیدؓ بھی شدید زخمی ہو گئے۔ جانِ دو عالم ﷺ کی اپنی حالت یہ تھی کہ تنِ دریدہ پر خون کی لکیریں رواں تھیں اور جوتے لہو سے بھر چکے تھے۔ اچانک آپ کی نظر انگوروں کے ایک باغ پر پڑی اور آپ اس پناہ گاہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس میں داخل ہو گئے۔

آپ کو وہاں پناہ گزیں ہوتے دیکھ کر اوباشوں کا ہجوم واپس چلا گیا تو آپ انگوروں کی ایک سایہ دار بیل کے نیچے ستانے کے لئے بیٹھ گئے اور بدن مبارک سے خون صاف کرنے لگے۔ اَللّٰہُ الصَّمَدُ.

عجیب دُعا

حزن و ملال اور بے سروسامانی کے اس عالم میں بھی گوشۂ چشم آرزو کسی دنیاوی طاقت سے استمداد و استعانت کے لئے نہیں وا ہوا؛ بلکہ نگہِ التجا اسی بارگاہِ صمدیت کی طرف اٹھی، جو ہر بے کس و ناتواں کا سہارا اور ہر ضعیف و درماندہ کا آسرا ہے اور عرض کی۔

"......... اِلٰھِی! اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ. یَااَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ! اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ..... اِنْ لَّمْ یَکُنْ بِکَ غَضَبٌ عَلَیَّ فَلَا اُبَالِیْ.........." (۱)

---

(۱) یہ دعا تاریخ میں دعائے طائف کے نام سے مشہور ہے۔ دعا طویل ہے۔ ہم نے صرف چند جملے نقل کئے ہیں۔ علامہ زرقانی نے شرح مواہب جلد اول میں اس کی بہت عمدہ شرح کی ہے ج۱ ص ۳۶۶ تا ۳۶۸۔

(الٰہی! میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کے حقارت آمیز سلوک کی تجھ ہی سے فریاد کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی ضعیفوں کا رب ہے اور میرا بھی ..... اگر تو مجھ سے راضی رہے تو مجھے ان تکلیفوں کی کوئی پرواہ نہیں ....)

رَءُوفٌ رَّحِیْم

بلاشبہ ایسی جانگسل اذیتیں برداشت کرنا محض رب کی رضا جوئی کی خاطر تھا، ورنہ شہنشاہِ کونین کے اختیار میں کیا نہیں تھا! آپ کے لبوں کی ایک جنبش سے طائف کی بستی تہہ د بالا ہوسکتی تھی مگر ان ظالموں کے خلاف ایک لفظ بھی زبان حق ترجمان سے نہیں نکلا۔ حالانکہ جبریل امین پاس کھڑے عرض کر رہے تھے کہ یا رسول اللہ! یہ ملک الجبال (پہاڑوں کا مؤکل فرشتہ) حاضر خدمت ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے اور آپ کی مکمل اطاعت کا حکم دیا ہے۔ ملک الجبال بھی عرض گزار تھا کہ یا حبیب اللہ! اگر اجازت ہو تو میں طائف کے دونوں طرف جو پہاڑ ہیں ان کو آپس میں ٹکرا کر اہل طائف کا کچومر نکال دوں۔

آپ خود سوچئے کہ اگر جانِ دو عالم ﷺ ''ہاں'' کہہ دیتے تو طائف والوں کا کیا حشر ہوتا!! مگر کروڑوں درود ہوں صبر واستقامت کے اس کوہ گراں پر اور عفو و کرم کے اس بحر ذخار پر جس نے ملک الجبال کو یہ جواب دیا۔

''نہیں --- میں ان کو تباہ و برباد کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر انہوں نے میری بات نہیں مانی تو کیا ہوا۔ اَرْجُوْاَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ اَصْلَابِهِمْ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ لَايُشْرِكُ بِهٖ شَيْئاً. ہوسکتا ہے کہ ان کی اولاد سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگ پیدا کردے جو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنے والے ہوں۔''

اللہ اللہ! کیا شانِ رحمت ہے! --- جن کے ہاتھوں سے لگائے ہوئے زخموں سے ابھی تک خون رس رہا تھا ان پر بھی ردائے رحمت تان دی ہے اور ان کو عذاب الٰہی سے بچالیا ہے۔

ملک الجبال نے آپ کا یہ رحیمانہ جواب سنا تو کہا۔ اَنْتَ كَمَا سَمَّاكَ اللّٰهُ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (آپ کو جو اللہ نے رءوف رحیم کہا ہے، تو واقعی آپ اسم بامسمّٰی ہیں۔)

جس کی دو بوند ہیں کوثر و سلسبیل

ہے وہ رحمت کا دریا ہمارا نبی

شریف دشمن

جس تاکستان میں جانِ دو عالم ﷺ داخل ہوئے تھے، وہ عتبہ اور شیبہ دو بھائیوں کی ملکیت تھا۔ یہ دونوں بھی اسلام کے شدید مخالف تھے۔ اس لئے ان کو دیکھ کر جانِ دو عالم ﷺ پھر پریشان ہو گئے کہ اللہ جانے یہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں، مگر دشمن ہونے کے باوجود ان میں شرافت کی رمق موجود تھی۔ انہوں نے آپ کو اس حالت میں دیکھا تو ان کا دل پسیج گیا اور آپ کو کوئی ایذا پہنچانے کے بجائے اپنے غلام عداس کو انگور دے کر بھیجا کہ جاؤ، اس زخمی شخص کو کھلاؤ۔ عداس نے انگوروں سے بھرا طباق آپ کے سامنے لا کر رکھا اور کہا ''کھائیے!''

جانِ دو عالم ﷺ کھانے لگے تو حسب معمول بسم اللہ پڑھی۔ عداس دیکھ رہا تھا۔ حیرت سے بولا۔

''اس علاقے کے لوگ تو کھاتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے!''

جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا ''تو کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور کس علاقے کا ہے؟''

''عیسائی ہوں اور نینوی (۱) کا رہنے والا ہوں۔'' عداس نے بتایا۔

''اچھا! تم مرد صالح یونس کے گاؤں کے ہو؟'' جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''مگر آپ یونس کو کیا جانیں کیونکہ جب میں وہاں سے چلا تھا تو خود اس گاؤں کے لوگ بھی یونس کو بھلا چکے تھے اور دس پندرہ افراد کے علاوہ کوئی ان کے نام سے بھی آگاہ نہیں تھا --- پھر آپ ان سے کس طرح واقف ہیں؟'' عداس نے نہایت معقول سوال کیا۔

---

(۱) سرزمین موصل میں دریائے دجلہ کے کنارے آباد ایک بڑی بستی کا نام۔ ان لوگوں کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت یونسؑ کو نبوت عطا فرمائی تھی۔

''دراصل وہ بھی اللہ کے رسول تھے اور میں بھی اللہ کا رسول ہوں، اس لحاظ سے ہم دونوں بھائی ہیں اور ان کے بارے میں میرے رب نے مجھے مطلع کیا ہے۔''

یہ سنتے ہی عداس آپ کے پاؤں پڑ گیا۔ پھر آپ کے ہاتھوں اور پیشانی پر بوسہ دیا اور اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتا ہوا واپس چلا گیا۔

عتبہ نے پوچھا---''ارے تو کیوں اس شخص کے آگے سجدہ ریز ہو رہا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں چوم رہا تھا؟''

عداسؓ نے کہا---''اس وقت روئے زمین پر ان سے بہتر کوئی انسان نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے اس رسول کے بارے میں بتایا ہے جو ہمارے علاقے میں آئے تھے اور ایسی بات کوئی نبی ہی بتا سکتا ہے۔''

عتبہ وشیبہ دونوں ہنس پڑے اور کہنے لگے---''خیال رکھنا کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کر دے---تیرا دین اس کے دین سے بدرجہا بہتر ہے۔(۱)

ضماد ازدی

حضرت عداسؓ کو جانِ دو عالم ﷺ نے اسلام کی دعوت دی تھی، نہ ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی تھی، صرف یونس علیہ السلام کے بارے میں بات چیت کی تھی اور وہ اس گفتگو سے ہی سمجھ گئے تھے کہ آپ اللہ کے فرستادہ ہیں۔

اسی طرح جن لوگوں کے دل کی آنکھیں بالکل ہی اندھی نہیں ہوئی تھیں، وہ افصح العرب کا اپنا کلام سن کر ہی گرویدہ ہو جایا کرتے تھے۔ پھر نہ وہ کسی معجزے کا مطالبہ کرتے تھے، نہ اس بات کا انتظار کرتے تھے کہ جانِ دو عالم ﷺ ان کو اسلام کی دعوت دیں؛ بلکہ از خود دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لئے بے تاب ہو جایا کرتے تھے۔

---

(۱) طائف کا یہ سارا واقعہ مندرجہ ذیل کتابوں سے ماخوذ ہے۔ البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۱۳۵ تا ۱۳۷، تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۳۰، سیرت ابن ھشام ج ۱، ص ۱۶۰، ۱۶۲، الزرقانی ج ۱، ص ۳۵۸ تا ۳۶۲

قبیلہ ازد سے تعلق رکھنے والا ضماد بھی ایسے ہی حقیقت شناس لوگوں میں سے تھا۔ وہ جھاڑ پھونک کیا کرتا تھا اور آسیب وغیرہ دور کرنے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ مکہ مکرمہ آیا تو کچھ لوگوں سے سنا کہ محمد پر بھی جنات وغیرہ کا اثر ہے۔ اس نے سوچا کیوں نہ میں جا کر محمد کو بھی دم کروں۔ شاید اس طرح اسے اس تکلیف سے نجات مل جائے۔ چنانچہ وہ جانِ دو عالم ﷺ کے پاس آیا اور کہا---"یا محمد! میں ازالۂ آسیب کے لئے دم کرتا ہوں---اگر اجازت ہو تو تم کو بھی دم کر دوں۔"

جانِ دو عالم ﷺ نے اس کو کوئی جواب دینے کی بجائے اپنی زبانِ حق ترجمان سے وہ مشہورِ عالم کلمات ادا فرمائے، جو ہر خطیب جمعے کے خطبے میں پڑھتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِیْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ......... الخ

بے شعور سامعین پر بے کیف خطیب کے منہ سے نکلے ہوئے یہ جملے کوئی اثر نہیں کرتے، لیکن یہی الفاظ جب زبانِ مصطفےٰ ﷺ سے ادا ہوئے اور ضماد ازدی جیسے زبان و بیان کی حلاوتوں سے آشنا شخص نے سنے تو پھڑک اٹھا، کہنے لگا۔

"اَعِدْ عَلَیَّ کَلِمَاتِکَ هٰؤُلَآءِ." (اپنے یہ جملے ذرا ایک بار پھر دہرایئے۔)

جانِ دو عالم ﷺ نے دوبارہ سنائے۔ اس نے اصرار کیا کہ ایک بار اور۔ جب آپ نے تیسری مرتبہ سنا دیئے تو اس نے حقیقت کا اعتراف کرنے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لیا اور کہا۔

"میں نے کاہنوں، ساحروں اور شاعروں کا کلام بارہا سنا ہے، مگر ایسے خوبصورت اور اثر انگیز جملے سننے سے میرے کان آج تک محروم رہے ہیں۔ هَاتِ یَدَکَ اُبَایِعُکَ عَلَی الْاِسْلَامِ. (لایئے ہاتھ! میں اسلام پر بیعت کرنا چاہتا ہوں۔)

جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا "وَعَلٰی قَوْمِکَ؟" (قوم کی طرف سے بھی؟)

ضمادؓ نے کہا "وَعَلٰی قَوْمِیْ." (قوم کی طرف سے بھی!)

جانِ دو عالم ﷺ نے اسی وقت اس کو بیعت کر کے زمرۂ غلاماں میں شامل کر لیا۔ (۱)

---

(۱) الوفاء باحوال المصطفیٰ ج ۱، ص ۲۰۰

قبائل عرب کو دعوت

حج کے موسم میں عرب کے گوشے گوشے سے مختلف قبائل مکہ مکرمہ آیا کرتے تھے۔
جب طائف والوں نے آپ کی دعوت کو رد کر دیا تو آپ نے ایام حج میں جمع ہونے والے قبائل کو پیغام حق سنانے پر خصوصی توجہ مبذول فرمانا شروع کر دی کہ اتنے بے شمار لوگوں میں سے کوئی تو جادۂ حق پر چلنے کے لئے تیار ہو ہی جائے گا۔

اس سلسلے میں آپ ایک ایک قبیلے کی خیمہ گاہ پر بنفس نفیس تشریف لے جاتے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اپنی رسالت سے آگاہ فرماتے۔ اگر ابولہب آپ کی مخالفت پر کمر بستہ نہ ہوتا تو یقیناً آپ کو بہت کامیابی حاصل ہوتی، مگر افسوس کہ یہ دشمنِ دین وایمان ہر جگہ سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگا رہتا اور جب بھی آپ توحید و رسالت کی بات کرتے تو وہ چیخ پڑتا کہ اس کی باتیں ہرگز نہ سننا، یہ تمہیں آباء و اجداد کے دین سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے اور لات وعزیٰ کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے۔ (۱)

جن لوگوں کی نس نس میں شرک و بت پرستی اور آباء کی اندھی تقلید رچی ہوئی تھی، ان کے لئے اتنی بات کافی ہوتی تھی، چنانچہ وہ انتہائی ترش روئی سے آپ کا پیغام رد کر دیتے اور کہتے۔

''جس شخص کو اپنی ہی قوم نے مسترد کر دیا ہو، اس کی بات ہم کیوں مانیں؟''

بعض لوگ آپ کا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتے، مگر اپنی شرائط پر۔ مثلاً ایک قبیلے کے سردار نے کہا---''اگر ہم تمہارے ساتھ تعاون کریں، تو تمہاری وفات کے بعد بادشاہی ہم کو ملے گی؟''

اس طرح کے جاہ و اقتدار کے رسیا افراد آپ کے کسی کام کے نہیں تھے---آپ کو تو ایسے اربابِ وفا کی ضرورت تھی جو آپ کے ہر حکم پر بے چون و چرا سر تسلیم خم کرنے والے ہوں، اس لئے آپ نے یہ شرط مسترد کر دی اور فرمایا۔

---

(۱) تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۳۲، طبقات ابن سعد ج ۱، ص ۱۴۱۔

''بادشاہی اللہ کی ہے، وہ جسے چاہے نواز دے۔''

سردار نے کہا---''پھر ہم ساتھ دینے سے معذور ہیں---یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری خاطر پورے عرب سے ٹکر لیں اور مشکلات و مصائب سے گزرنے کے بعد جب کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہونے کا وقت آئے تو بادشاہی کسی اور کو مل جائے؟ (۱)

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو دل سے اسلام کی حقانیت کے قائل ہو جاتے تھے، مگر قوم قبیلے کے خوف سے اظہار کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً میسرہ ابن مسروق کو جب آپ نے دعوت اسلام دی تو وہ بے حد متاثر ہوا اور اپنی قوم سے کہا۔

''خدا کی قسم! اگر ہم اس ہستی کی تصدیق کریں اور اس کو اپنے ساتھ لے جائیں تو یہ ایک عقلمندانہ اقدام ہوگا کیونکہ جو دین یہ پیش کر رہے ہیں وہ بالآخر غالب آ کر رہے گا اور دور دور تک پھیلے گا۔''

مگر قوم نے میسرہ کے ساتھ اتفاق نہ کیا۔ میسرہ مجبور ہو گیا اور جانِ دو عالم ﷺ سے معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوا کہ آپ کا بیان بلاشبہ بہت عمدہ اور نورانی ہے، مگر میری قوم کو اس سے اختلاف ہے اور آدمی کی قوت تو اس کی قوم ہوتی ہے، وہی تعاون نہ کرے تو

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۱۳۹، ۱۴۰، تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۳۲.

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں اور روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ حصول اقتدار کے خواہاں لیڈر اور قائد اپنی جدوجہد کے ابتدائی مراحل میں لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے وعدے کر لیتے ہیں، لیکن جب لیلائے اقتدار سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں تو تمام وعدے اور قسمیں یکسر بھول جاتے ہیں۔ مگر اللہ اللہ!---آمنہ کے دریتیم کا کردار ملاحظہ ہو کہ مصائب و آلام کے تلاطم خیز طوفاں میں گھرا ہونے کے باوجود غلط وعدہ کرنا تو کجا، اس نے گول مول بات کرنا بھی گوارا نہ کیا اور لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ بادشاہی صرف اللہ کی ہے، وہ جسے چاہے نواز دے۔ اس طرح اگرچہ ایک بڑا قبیلہ تعاون سے دستکش ہو گیا، مگر رفعتِ کردار اور صداقتِ گفتار کا علم آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا۔

فَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مَنْ لَّا يَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا

دوسرے لوگ کیا ساتھ دیں گے۔(۱)

قارئین کرام! یہ تھے وہ صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات جن میں جانِ دو عالم ﷺ اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے۔قبائل کی بے رخی اور بے اعتنائی کے باوجود آپ ایک ایک قبیلے کے پاس جاتے رہے اور پیغام حق سناتے رہے۔ بالآخر آپ کی شبانہ روز کوششیں بار آور ہوئیں اور یثرب سے آئے ہوئے قبیلہ خزرج کے چھ افراد نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور اسلام قبول کرلیا۔

جانِ دو عالم ﷺ کے ایک اشارے پر جان و مال قربان کر دینے والے عاشقوں کے دو ہی مشہور طبقے ہیں---مہاجرین اور انصار۔

مہاجرین---وہ باوفا اور مخلص لوگ جنہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کی رفاقت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ تج دیا۔

انصار---وہ فراخ دل اور پاک باطن لوگ، جن کو خدا کے آخری رسول اور

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۱۴۵.

اگرچہ اس وقت میسرہ کو اسلام لانے کی سعادت حاصل نہ ہوسکی، مگر کافی عرصہ (تقریباً بارہ سال) بعد حجۃ الوداع کے موقع پر میسرہ کی جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ دوبارہ ملاقات ہوگئی۔ میسرہ نے عرض کی۔

''یارسول اللہ! میں اس دن سے آپ کی پیروی کا مشتاق ہوں، جب آپ پہلی دفعہ تبلیغ کے لئے ہمارے خیموں میں تشریف لائے تھے۔شاید خدا کو میرا جلدی اسلام لانا منظور نہیں تھا، اس لئے اتنی تاخیر ہوگئی۔اس زمانے میں جو لوگ میرے ساتھ تھے، ان میں سے بیشتر کا انتقال ہو چکا ہے---یارسول اللہ! ان کا کیا انجام ہوگا؟''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا''جس کا خاتمہ کفر پر ہوا، وہ جہنم میں جائے گا۔''

''الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جہنم سے نجات دے دی ہے۔''میسرہ نے کہا اور اسلام قبول کر لیا۔(البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۱۴۶)

سینکڑوں مہاجرین کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا اور انہوں نے اس انداز سے مہمان نوازی کی کہ اس کی نظیر سے تاریخ عالم کے اوراق یکسر خالی ہیں۔

یثرب کے جن چھ خوش نصیبوں کو سب سے پہلے اسلام کی سعادت حاصل ہوئی، وہ انصار کے دو مشہور قبیلوں میں سے ایک کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔

انصار کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے واقعات ذکر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انصار کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔

انصار

تمام انصار دو بھائیوں --- اوس اور خزرج --- کی اولاد ہیں اور انصار کے دو مشہور قبیلے اپنے اپنے مورثِ اعلیٰ کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ دونوں بھائی دراصل یمن کے رہنے والے تھے۔ جب یمن میں وہ مشہور سیلاب آیا، جس کا تذکرہ قرآن کریم نے "سَیْلَ الْعَرِمْ" کے نام سے کیا ہے تو یہ دونوں بھائی وہاں سے جان بچا کر نکلے اور یثرب میں آ کر آباد ہو گئے۔ یثرب میں یہودیوں کا زور تھا۔ وہ مالی لحاظ سے بھی مستحکم تھے اور عددی اکثریت بھی ان کو حاصل تھی، مگر رفتہ رفتہ اوس وخزرج کی اولاد کو بھی خاصا فروغ حاصل ہوگیا؛ تاہم یہودیوں سے وہ پھر بھی کمزور تھے، اس لئے یہودیوں کے زیر سایہ رہنے اور چار و ناچار ان کا ہر حکم ماننے پر مجبور تھے۔ کچھ عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا مگر جب فطیون یہودیوں کا سردار بنا تو اختلافات کا آغاز ہوگیا، کیونکہ فطیون انتہائی بدکار اور عیاش انسان تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ یثرب میں جس دوشیزہ کی بھی شادی ہوگی، وہ پہلی رات میرے خلوت کدے میں بسر کیا کرے گی۔ یہودی تو فطرتاً بے غیرت اور کمینہ خصلت لوگ تھے، اس لئے انہوں نے بے چون وچرا اس رسوا کن حکم کو تسلیم کر لیا اور اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کے حوالے کرنے سے پہلے فطیون کے عشرت کدے میں پہنچانا شروع کر دیا۔ مگر انصار غیرت مند لوگ تھے۔ وہ اس ذلت کو بخوشی تو قبول کر ہی نہیں سکتے تھے؛ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ اپنی مجبوریوں کے پیش نظر با دلِ نخواستہ یہ کڑوا گھونٹ پی لیتے، لیکن ایک جرأتمند لڑکی نے ان کی غیرت پر ایسا تازیانہ رسید کیا کہ معاملہ ان کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ یہ باہمت

لڑکی مالک ابن عجلان انصاری کی بہن تھی۔ اس کی شادی ہو رہی تھی اور حسب دستور اس کو بھی فطیون کی خوابگاہ میں پہنچانے کی باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ بالکل عریاں حالت میں بھائی کے سامنے آ گئی۔ بھائی کو بہت غصہ آیا اور بہن کو اس بے ہودہ حرکت پر سخت سست کہنے اور ملامت کرنے لگا۔ بہن نے کہا۔

''آج تو تمہاری غیرت بڑا جوش مار رہی ہے، مگر کل فطیون کی عشرت گاہ میں میرے ساتھ جو کچھ ہوگا، وہ اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہوگا۔''

یہ سن کر مالک خاموش ہو گیا، مگر دل ہی دل میں اپنی بہن کو اس بدقماش یہودی کی دستبرد سے بچانے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ جب اس کی بہن کو دلہن بنا کر فطیون کی جائے نشاط کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو وہ بھی زنانہ بھیس میں سہیلی بن کر ساتھ چلا گیا اور رات کو جب فطیون دادِ عیش دینے کے لئے اپنے عشرت کدے میں داخل ہوا تو مالک نے اس کو قتل کر دیا اور خود شام کی طرف بھاگ گیا۔ ان دنوں شام میں غسانیوں کی حکومت تھی اور ان کی طرف سے ابوجبلہ وہاں کا حاکم تھا۔ مالک اس سے ملا اور اپنی روداد غم سنائی۔ ابوجبلہ یہودیوں کی چیرہ دستیوں کی داستان سن کر اتنا متاثر ہوا کہ ایک لشکر جرار لے کر یثرب کو روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے یہودیوں کے شیطان صفت سرداروں کو لشکرگاہ میں بلایا اور یکے بعد دیگرے سب کو تہ تیغ کر دیا۔ اس طرح یہودیوں کا زور ٹوٹ گیا اور انصار کو ان کے چنگل سے رہائی نصیب ہو گئی۔

اس واقعہ کے بعد کچھ زمانے تک اوس و خزرج باہم متحد رہے پھر --- جیسا کہ عربوں کی عادت تھی --- آپس میں لڑنے لگے۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں تو روز ہوتی رہتی تھیں، مگر جانِ دوعالم ﷺ کی ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے دونوں میں معرکے کا رن پڑا، جو تاریخ میں جنگ بعاث (۱) کے نام سے مشہور ہے۔ اس لڑائی میں دونوں طرف سے بڑے

---

(۱) بُعَاث، شہر یثرب سے دو میل کے فاصلے پر ایک میدان کا نام تھا، جہاں یہ لڑائی لڑی گئی۔ اس جنگ کا سبب یہ بنا کہ عرب میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے تھے --- اصیل اور حلیف --- اصیل ان طاقتور قبیلوں کو کہا جاتا تھا جو اپنے دفاع کی خود استطاعت رکھتے تھے اور حلیف وہ کمزور لوگ ☜

بڑے جنگجو اور بہادر مارے گئے اور فریقین کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ (۱)

جنگ کے خاتمے کے بعد قبیلہ خزرج کے چھ افراد حج کے لئے گئے تو جانِ دو عالم ﷺ نے حسب معمول ان کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ یہ لوگ اگرچہ بت پرست تھے مگر انہوں نے یہودیوں سے سن رکھا تھا کہ عنقریب ایک عظیم الشان نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ چنانچہ جب آپ نے ان کو اللہ کی وحدانیت اور اپنی رسالت کے بارے میں بتایا، تو ان کو یقین ہوگیا کہ یہی وہ نبی معہود ہیں، جن کا تذکرہ سابقہ کتابوں میں پایا جاتا ہے، اس لئے بلاتاخیر آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوگئے۔ (۲)

جانِ دو عالم ﷺ نے ان سے کہا کہ مجھے ایسے جاں نثاروں کی ضرورت ہے، جو میرے ساتھ بھرپور تعاون کرسکیں اور میں ان کے پاس رہ کر دینِ حق کے فروغ واشاعت کا

ہوتے تھے جو اپنے دفاع کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے کسی اصیل قبیلے کے زیر اثر رہتے تھے اور ان کا دفاع اس اصیل قبیلے کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ عرب روایات کے مطابق اگر کوئی اصیل شخص قتل ہوجاتا تو اس کے بدلے اصیل قتل کیا جاتا تھا، لیکن اگر اصیل کے ہاتھوں کوئی حلیف شخص مارا جاتا تو اس کے عوض اصیل کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔

انصار کے دو ہی زور آور قبیلے تھے۔ یعنی اوس اور خزرج۔ باقی لوگ زیادہ تر ان میں سے کسی ایک کے حلیف تھے۔ ایک دفعہ کسی اوسی نے خزرجیوں کے ایک حلیف کو مار ڈالا۔ خزرجیوں نے مطالبہ کیا کہ ہمارے حلیف کے قاتل کو ہمارے حوالے کیا جائے، تاکہ اس کو قصاص میں قتل کیا جائے، مگر اوسیوں نے مطالبہ نہ مانا اور کہا کہ قاتل اصیل ہے، اس کو حلیف کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاسکتا۔ اس پر دونوں قبیلوں میں جنگ چھڑ گئی، جو فریقین کے بیشتر اہم لوگوں کے خاتمے پر منتج ہوئی۔ (زرقانی ج ۱، ص ۳۱۶)

(۱) انصار کے یہ تمام حالات وفاء الوفا جلد اول ص ۱۱۶ تا ۱۵۲ سے بطور اختصار ذکر کیے گئے ہیں۔

(۲) یہ بیعت مقامِ عقبہ میں ہوئی تھی۔ اس جگہ یکے بعد دیگرے انصار کی تین بیعتیں ہوئیں۔ جو تاریخ میں علی الترتیب بیعۃ العقبۃ الاولیٰ، بیعۃ العقبۃ الثانیۃ اور بیعۃ العقبۃ الثالثۃ سے موسوم ہیں۔

کام دل جمعی سے کرسکوں۔

انہوں نے کہا---''ہمارے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوسکتی ہے مگر فی الحال آپ کا وہاں تشریف لے جانا خاص مفید نہیں ہوگا، کیونکہ ابھی سال بھر پہلے ہمارے درمیان جنگِ بعاث ہوئی ہے، جس میں بڑے بڑے سورما مارے گئے ہیں اور باہمی اختلافات کی وجہ سے ہماری قوت گھٹ گئی ہے اور جمعیت پارہ پارہ ہوچکی ہے؛ البتہ ہم واپس جاکر دوسرے لوگوں سے بات چیت کریں گے، اگر وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوگئے تو ہمارے دیدۂ و دل آپ کے لئے فرشِ راہ ہوں گے۔ شاید آپ کے دم قدم سے اللہ تعالٰی ہمارے اختلافات دور فرمادے۔ ہم آئندہ سال حج کے موقع پر پھر حاضر ہوں گے اور آپ کو وہاں کے مفصل حالات سے آگاہ کریں گے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور یثرب کے یہ چھ اوّلین مؤمن اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ (۱)

---

(۱) زرقانی ج ۱، ص ۳۷۶، البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۱۴۹، طبقاتِ ابن سعد ج ۱، ص ۱۳۷۔

ان چھ بیدار بختوں کے مختصر حالات درج ذیل ہیں۔

۱--- اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ

کہا جاتا ہے کہ چھ آدمیوں میں سب سے پہلے بیعت کرنے والے یہی حضرت اسعدؓ ہیں بیعت کرتے وقت جب حضرت اسعدؓ نے جانِ دو عالم ﷺ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوکر کہا۔

''لوگو! تمہیں پتہ بھی ہے کہ تم کس چیز پر محمد ﷺ کی بیعت کرنے لگے ہو---؟ یہ تو عرب و عجم اور جن وانس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔''

ساتھیوں نے پر جوش انداز میں کہا ---''نَحْنُ حَرْبٌ لِمَنْ حَارَبَ وَ سَلْمٌ لِمَنْ سَالَمَ.'' جس سے محمد ﷺ کی جنگ ہے، اس سے ہماری بھی جنگ ہے۔ جس سے محمد ﷺ کی صلح ہے، ☜

دوبارہ حاضری

جب یہ چھ سعادت مند دولتِ اسلام سے بہرہ ور ہو کر واپس یثرب پہنچے تو باقی

اس سے ہماری بھی صلح ہے۔

ساتھیوں کی یہ بھرپور تائید پا کر حضرت اسعدؓ نے عرض کی---''یارسول اللہ! ہمیں اس بیعت کی شرائط سے آگاہ فرمادیجئے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے بعد تم کو صوم و صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی ادائیگی پابندی سے کرنا پڑے گی اور میرے تمام احکامات کی اطاعت کرنا ہوگی۔ اگر میں کسی کو امیر یا سردار مقرر کروں تو تم کو اختلاف و نزاع کی اجازت نہیں ہوگی اور میری اسی طرح حفاظت کرنا ہوگی جس طرح تم اپنی جانوں کی حفاظت کرتے ہو۔''

حضرت اسعدؓ سمیت سب نے کہا---''ہمیں یہ تمام شرائط منظور ہیں، مگر اس کے صلے میں ہم کو کیا ملے گا؟''

''دنیا میں میری نصرت کا شرف اور آخرت میں جنت کا اعزاز'' جانِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا۔

پھر اسی پر سب کی بیعت ہوئی۔ (طبقاتِ ابن سعد ج۳، ص ۱۳۹)

جانِ دو عالم ﷺ کی ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ میں امامت کے فرائض حضرت مصعب بن عمیرؓ انجام دیا کرتے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں حضرت اسعدؓ امام ہوا کرتے تھے۔

(حضرت مصعب کے حالات کے لئے سیدالوریٰ، ج ۱، ص ۲۱۵ ملاحظہ کیجئے)

افسوس کہ ان کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی اور ہجرت کے نویں مہینے میں ان کا وصال ہو گیا۔ انصار کی یہ پہلی میت تھی جس کی نماز جنازہ جانِ دو عالم ﷺ نے بنفس نفیس پڑھائی۔

• وفات سے پہلے اپنی دو بیٹیوں پر خصوصی شفقت کرنے کی جانِ دو عالم ﷺ کو وصیت کی تھی، اس لئے آپ ان بچیوں کا بہت خیال رکھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کو سونے کی بالیاں بھی عنایت فرمائی تھیں جن میں موتی جڑے ہوئے تھے۔

حضرت اسعدؓ چونکہ اپنی قوم بنی نجار کے سردار تھے، اس لئے ان کے انتقال کے بعد بنو نجار جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہمارا سردار مقرر فرما دیجئے۔ ☜

لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے لگے۔ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر متعدد افراد ایمان لے آئے

آپ نے کسی اور کو ان کا سردار بنانے کے بجائے ارشاد فرمایا۔

''اَنَا نَقِیْبُکُمْ'' (میں تمہارا سردار ہوں۔) الاصابہ ج ۱، ص ۳۴۔

سبحان اللہ! بنونجار کی خوش نصیبی کا کیا کہنا! کہ ان کی سردار وہ ذاتِ اقدس بن گئی جو درحقیقت ساری کائنات کی سردار ہے۔

۲--- قطبہ ابن عامرؓ

جانِ دو عالم ﷺ کے مشہور تیر اندازوں میں سے ایک ہیں۔تمام غزوات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور کسی بھی موقع پر ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔

غزوہ بدر میں انہوں نے ایک پتھر اٹھا کر مشرکین کی صفوں کے درمیان پھینکا اور کہا۔

''لَا اَفِرُّ حَتّٰی یَفِرَّ هٰذَا الْحَجَرُ.'' (جب تک یہ پتھر نہیں بھاگے گا میں بھی لڑائی سے منہ نہیں موڑوں گا۔) ظاہر ہے کہ پتھر کا بھاگنا ممکن نہ تھا، اس لئے حضرت قطبہ کے منہ پھیر لینے کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔

غزوہ احد میں ان کو نو [۹] گہرے زخم آئے، مگر ان کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہ آیا۔

فتح مکہ کے دن بنی سلمہ کا علم انہی کے ہاتھ میں تھا، جسے لہراتے ہوئے فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے۔

قبیلہ خثعم کی تسخیر کے لئے جانِ دو عالم ﷺ نے جو سریہ (وہ فوجی مہم جس میں آپ خود شامل نہ ہوں) روانہ فرمایا تھا، اس کے قائد و سالار بھی حضرت قطبہؓ تھے۔خثعم نے سخت مقابلہ کیا اور خونریز لڑائی ہوئی، مگر آخر کار مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی اور مالِ غنیمت میں اتنے اونٹ اور بکریاں ہاتھ آئیں کہ خمس نکالنے کے بعد بھی ہر غازی کو چار اونٹ یا بیس بکریاں ملیں۔

(طبقاتِ ابن سعد ج۳، حصہ دوم ص ۱۱۷)

عربوں میں پرانا دستور تھا کہ حالتِ احرام میں دروازے کی طرف سے مکان میں نہ داخل ہوتے تھے، نہ باہر نکلتے تھے؛ بلکہ یا تو دیوار پھاند کر آتے جاتے تھے یا عقبی دیوار توڑ کر سوراخ کر لیتے تھے

اور یہ لوگ حسب وعدہ اگلے سال پھر جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس

اور اس سے آمد و رفت رکھتے تھے۔ ابتداء میں عام مسلمان بھی یہ پابندی کیا کرتے تھے اور اس کو نیکی تصور کرتے تھے؛ البتہ ان رسوم کی قریش زیادہ پرواہ نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کو اَحْمَسْ (نڈر) کہا جاتا تھا۔

ایک دفعہ جانِ دو عالم ﷺ ایک حویلی سے دروازے کی طرف سے باہر تشریف لائے تو حضرت قطبہؓ بھی آپ کے ساتھ ساتھ دروازے سے نکل آئے۔ اگر چہ دونوں حالت احرام میں تھے، مگر آپ چونکہ قریشی تھے، اس لئے آپ کے اس عمل سے تو کسی کو اچنبھا نہ ہوا؛ البتہ حضرت قطبہؓ کی یہ حرکت لوگوں کو ناگوار گزری اور انہوں نے کہا---''یارسول اللہ! قطبہ نے نافرمانی کی ہے اور حالتِ احرام میں دروازے سے برآمد ہوا ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت قطبہؓ سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ یارسول اللہ! چونکہ آپ دروازے کے راستے سے باہر نکلے تھے، اس لئے میں بھی آپ کے اتباع میں ادھر ہی سے نکل آیا۔

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ میں تو ''اَحْمَسْ'' ہوں۔

''اور میں آپ کا پیروکار ہوں۔'' حضرت قطبہؓ نے برجستہ کہا ''جو دین آپ کا وہی میرا۔''

اللہ تعالیٰ کو حضرت قطبہ کا یہ انداز اتباع اتنا پسند آیا کہ اس نے اس رسم کو ہی ختم کر دیا اور حکم دے دیا کہ آئندہ گھروں میں سیدھے راستے سے داخل ہوا کرو۔ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا.

تفسیر درمنثور ج اوّل، ص ۲۰۴۔

یوں حضرت قطبہؓ کے طفیل تمام مسلمان اس پابندی سے آزاد ہوگئے۔

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں حضرت قطبہؓ کا وصال ہوا۔ رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ

۳---رافع بن مالک رضی اللہ عنہ

قبیلہ خزرج کی ایک شاخ بنوزریق سے تعلق رکھتے تھے اور ان باکمال لوگوں میں سے تھے جن کو ''کامل'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا---کامل، زمانہ جاہلیت میں اس شخص کو کہا جاتا تھا جو کتابت جانتا ہو، تیر اندازی کا ماہر ہو اور تیراک بھی اعلیٰ درجے کا ہو۔ (طبقاتِ ابن سعد ج ۳،

دفعہ ان کی تعداد بارہ [۱۲] تھی۔ سب نے مندرجہ ذیل امور پر بیعت کی۔

حصہ دوم، ص ۱۴۸)

ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ جب یہ اسلام لائے تو جانِ دو عالم ﷺ نے اس وقت تک نازل شدہ تمام قرآن ان کو عطا فرما دیا۔ چنانچہ انہوں نے مدینہ واپس جا کر اپنی قوم کو جمع کیا اور اللہ کا کلام سنایا۔ اسی بنا پر مؤرخین لکھتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں پہلی مرتبہ قرآن بنو زریق کی مسجد میں پڑھا گیا۔

(زرقانی ج ۱، ص ۲۷۴)

طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ ان کو غزوۂ بدر میں شمولیت کی سعادت حاصل نہیں ہوئی، حالانکہ مستدرک حاکم میں حضرت رافع ؓ کی اپنی زبانی دو روایات بیان کی گئی ہیں جن میں تین واقعات مذکور ہیں اور تینوں کا تعلق غزوۂ بدر سے ہے۔

پہلی روایت (پہلا واقعہ)

حضرت رافع فرماتے ہیں کہ میں نے غزوہ بدر میں ایک جگہ لوگوں کا جمگھٹا دیکھا۔ تحقیق حال کے لئے قریب گیا تو پتہ چلا کہ مشہور کافر اور دشمن رسول امیہ ابن خلف کے گرد مسلمانوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ اچانک میری نظر اس کی زرہ پر پڑی جو بغل کے قریب سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ٹوٹی ہوئی جگہ سے تلوار گھسیڑ کر اس کا کام تمام کر دیا۔

(دوسرا واقعہ)

اسی غزوہ میں میری آنکھ میں ایک تیر آ کر لگا جس سے آنکھ باہر نکل آئی۔ رسول اللہ ﷺ نے زخمی آنکھ پر اپنا لعاب دہن لگایا اور میرے لئے دعا فرمائی، اس کے بعد مجھے ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

دوسری روایت (تیسرا واقعہ)

غزوۂ بدر میں ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہمیں اس سے سخت تشویش لاحق ہو گئی اور دوستوں نے ایک دوسرے کو پکار کر پوچھنا شروع کر دیا۔

''اَفِیْکُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ؟'' (کیا رسول اللہ تمہارے پاس ہیں؟)

تھوڑی دیر بعد ایک طرف سے رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے نظر آئے۔ آپ کے ساتھ ☜

شرک نہیں کریں گے، چوری نہیں کریں گے، اپنی اولاد کو زندہ درگور نہیں کریں گے، بہتان نہیں باندھیں گے اور کسی بھی کارِ خیر میں رسول اللہ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

حضرت علی بھی تھے۔ ہم نے بے تابی سے پوچھا ''یارسول اللہ! ہم نے آپ کو بہت تلاش کیا --- آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟''

آپ نے فرمایا ''ابوالحسن (حضرت علی) کے پیٹ میں کچھ تکلیف ہوگئی تھی۔ اس لئے میں اس کے پاس ٹھہر گیا تھا۔'' (مستدرک حاکم ج ۳، ص ۲۳۲)

ان دو روایات میں سے پہلی روایت کے ایک راوی کو اگرچہ علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں ضعیف قرار دیا ہے، مگر اہل علم جانتے ہیں کہ صرف ایک راوی کے ضعیف ہونے سے روایت میں جو معمولی سا ضعف پیدا ہوتا ہے، وہ محدثین کے نزدیک احادیثِ فضائل کی قبولیت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں دوسری روایت پر تو علامہ ذہبی نے سکوت اختیار کیا ہے اور ذہبی کا سکوت روایت کے صحیح ہونے کی سند ہے۔

تعجب ہے کہ ان روایات کے ہوتے ہوئے بعض مؤرخین کو یہ شبہ کیسے ہوگیا کہ حضرت رافعؓ بدر میں شریک نہیں ہوئے!!

جانِ دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی کو چھینک آئے تو اسے چاہئے کہ الحمدللہ کہے۔

ایک دفعہ حضرت رافعؓ کو جانِ دوعالم ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کے دوران چھینک آئی تو انہوں نے الحمدللہ پر چند الفاظ کا اضافہ کر دیا اور نماز کے اندر ہی بلند آواز سے کہا۔

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا فِیْہِ مُبَارَکًا عَلَیْہِ کَمَا یُحِبُّ رَبُّنَا وَیَرْضٰی ''

سلام پھیرنے کے بعد جانِ دوعالم ﷺ نے پوچھا --- ''نماز میں کس نے کچھ کہا تھا؟''

''میں نے یارسول اللہ!'' حضرت رافعؓ نے جواب دیا۔

''کیا کہا تھا --- ؟ ذرا پھر دہراؤ!''

حضرت رافعؓ نے دوبارہ وہی کلمات ادا کئے۔ اس پر جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا۔

''اللہ کی قسم! میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا جو ان کلمات کو حاصل کرنے

بیعت کے بعد جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا---''اگر ان تمام چیزوں کو تم لوگوں نے پورا کیا تو تم یقینی طور پر جنتی ہوگے اور اگر ان میں کوتاہی کی اور دنیا میں سزا پائی تو یہ سزا

کے لئے لپک رہے تھے، ہر ایک کی خواہش تھی کہ ان مبارک کلمات کو اوپر لے جانے کی سعادت مجھے حاصل ہو۔''

(متدرک ج ۳، ص ۲۳۲)

(واضح رہے کہ یہ حضرت رافعؓ کی کوئی خصوصی باطنی کیفیت تھی، جس کے تحت بے ساختہ یہ الفاظ زبان پر آ گئے۔ ورنہ عام حالات میں نماز کے دوران چھینک آئے تو اس طرح کلمات ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔)

غزوہ احد میں حضرت رافعؓ عروسِ شہادت سے ہمکنار ہوگئے۔ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ

۴--- عوف ابن الحارث رضی اللہ عنہ

یہ معاذؓ اور معوذؓ کے بھائی ہیں۔ معاذؓ و معوذؓ وہ دو مشہور نوجوان ہیں جنہوں نے غزوہ بدر میں ابوجہل جیسے دشمنِ اسلام کو واصل جہنم کیا تھا۔ حضرت عوفؓ بھی اسی غزوہ میں شامل تھے۔ جب گھمسان کا رن پڑا تو آپ نے جانِ دوعالم ﷺ سے پوچھا۔

''یَارَسُوْلَ اللہِ! مَایُضْحِکُ الرَّبُّ مِنْ عَبْدِہٖ.'' (یارسول اللہ! بندے کے کس عمل سے اس کا رب اتنا خوش ہوتا ہے کہ ہنس پڑتا ہے۔)

جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا ''اَنْ یَرَاہُ قَدْ غَمَسَ یَدَیْہِ فِی الْقِتَالِ حَاسِرًا.'' (جب اس کا رب دیکھے کہ بندہ جسم پر زرہ وغیرہ نہ ہونے کے باوجود جہاد میں کود پڑا ہے۔)

یہ سنتے ہی حضرت عوفؓ نے وہ زرہ جو پہن رکھی تھی، اتار پھینکی اور دشمنوں کی صفوں میں بے محابا گھس گئے۔ لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہوگئے اور بالآخر شہادت کی آغوش میں پہنچ گئے۔

(الاصابہ، ذکرِ عوف ابن الحارث)

ان کی بے جگری، سرفروشی اور جاں نثاری دیکھ کر بلاشبہ رب العلمین ہنس پڑا ہوگا۔

رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ

۵--- عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ اور ۶--- جابر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ

ان دونوں حضرات کے مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

اس کوتاہی کا کفارہ ہو جائے گی، ورنہ قیامت میں حساب ہوگا۔ پھر اللہ کی مرضی پر منحصر ہے، چاہے سزا دے، چاہے معاف فرمادے۔''

یثرب میں اشاعت اسلام

ان لوگوں کی شبانہ روز کوششوں سے یثرب میں مسلمانوں کی تعداد خاصی ہوگئی۔ اب کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو تعلیمات اسلام سے پوری طرح آگاہ ہو، کیونکہ یہ سب لوگ نومسلم تھے اور دائرہ اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کی پوری طرح تشفی نہیں کر پاتے تھے، اس لئے انہوں نے جانِ دوعالم ﷺ سے التماس کی کہ کوئی مبلغ بھیجا جائے۔ آپ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ (۱) کو بھیج دیا۔ حضرت مصعبؓ نے حضرت اسعد ابن زرارہؓ کے ہاں قیام کیا اور بھرپور انداز میں تبلیغی کام شروع کر دیا۔ ان کی پُر اثر گفتگو نے لوگوں کے دل موہ لئے اور بہت سے ذی حیثیت لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اسلامِ سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ

سعد ابن معاذ حضرت اسعد کا خالہ زاد تھا اور بنی عبدالاشہل کا سردار تھا۔ ایک دن حضرت اسعدؓ اور حضرت مصعبؓ نے بنی عبدالاشہل کو دعوتِ اسلام دینے کا پروگرام بنایا۔ ان کی آبادی کو جاتے ہوئے راستے میں ایک چاردیواری پڑتی تھی جس میں ایک کنواں تھا۔ یہ دونوں کنویں کے پاس بیٹھ گئے اور آپس میں بات چیت کرنے لگے۔ ان کو وہاں بیٹھا دیکھ کر کچھ اور مسلمان بھی اِدھر اُدھر سے اکٹھے ہو گئے اور محفل جم گئی۔ کسی نے سعد ابن معاذ کو اس اجتماع کی اطلاع دے دی۔ اسے بہت غصہ آیا کہ یہ لوگ میرے علاقے میں آکر نئے دین کو پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی قوم کے ایک ممتاز فرد اُسید سے کہا کہ تم جا کر ان لوگوں کو یہاں سے نکال باہر کرو اور انہیں سمجھا دو کہ دوبارہ اس طرف آنے کی جرأت نہ کریں--- اگر اسعد میرا خالہ زاد نہ ہوتا تو میں خود یہ کام کرتا، مگر رشتہ داری کی وجہ سے مجبور ہوں۔

اُسید اسی وقت اٹھ کر ان کی طرف چل پڑا۔ اس کو آتا دیکھ کر حضرت اسعدؓ نے

---

(۱) حضرت مصعبؓ کے حالات ص ۲۱۵ پر گزر چکے ہیں۔

حضرت مصعبؓ سے کہا کہ یہ شخص اپنی قوم میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اگر یہ مسلمان ہو جائے تو بہت فائدہ ہوگا۔ اتنے میں اُسید بھی ان کے پاس پہنچ گیا اور ان کو سب وشتم کرنے کے بعد کہنے لگا---''اگر تم کو اپنی جان پیاری ہے تو ابھی اٹھو اور یہاں سے نکل جاؤ!''

حضرت مصعبؓ نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

''آپ تھوڑا سا ہمارے پاس بیٹھئے اور ہم جو کچھ کہتے ہیں، اسے سن لیجئے۔ اگر ہماری باتیں آپ کو پسند آئیں تو آپ بھی ہمارے ساتھ متفق ہو جایئے، ورنہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ یہاں سے چلے جائیں گے اور آپ کو ہرگز پریشان نہیں کریں گے۔''

اُسید نے کہا---''معقول بات ہے''---اور بیٹھ گیا۔

حضرت مصعبؓ نے پہلے قرآن کریم کی تلاوت کی، پھر اسلام کی حقانیت بیان کرنا شروع کی۔ اسید اس حسین گفتگو کا اسیر ہو گیا اور ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا۔ جب حضرت مصعبؓ کا بیان ختم ہوا تو اُسید کی کایا پلٹ چکی تھی۔ کہنے لگا---''کتنی عمدہ باتیں کی ہیں تم نے---! اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے دین میں داخل ہونے کے لئے کیا کرنا پڑتا ہے؟''

حضرت مصعبؓ نے فرمایا---''غسل کیجئے، پاک کپڑے پہنئے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت کا اقرار کیجئے۔ بس آپ مسلمان ہیں۔''

اُسید نے اسی وقت غسل کر کے پاک صاف کپڑے پہنے اور مسلمان ہو گئے۔ پھر کہنے لگے---''میرے علاوہ ایک اور شخص ہے، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو بنی عبد الاشہل کا کوئی بھی فرد غیر مسلم نہیں رہے گا۔ میں جا کر اسے بھیجتا ہوں۔''

اُسیدؓ واپس گئے تو سعد ان کا منتظر تھا۔ اس نے اُسیدؓ سے پوچھا---''کیسا رہا؟''

اُسیدؓ نے کہا---''میں نے ان لوگوں سے بات چیت کی ہے، مجھے تو ان میں کوئی خرابی محسوس نہیں ہوئی؛ البتہ مجھے پتہ چلا ہے کہ بنی حارثہ تمہارے خالہ زاد بھائی اسعد کو قتل کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ذرا سوچو---! اگر انہوں نے تمہارے بھائی کو تمہارے ہی علاقہ میں قتل کر دیا تو تمہاری کیا عزت رہ جائے گی!''

یہ سنتے ہی سعد کی قومی عصبیت بیدار ہو گئی اور حضرت اسعدؓ کو بچانے کے لئے دوڑ

پڑا۔ وہاں جا کر دیکھا تو حضرت اسعدؓ مطمئن بیٹھے تھے اور بنی حارثہ کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ سعد سمجھ گیا کہ اسید نے غلط بیانی کی ہے اور اسی بہانے مجھے ان کی طرف بھیج دیا ہے۔ یہ سوچ کر اس کا پارہ چڑھ گیا اور رشتہ داری کا خیال کیے بغیر ان کو برا بھلا کہنے لگا۔ حضرت مصعبؓ نے اس کو بھی یہی جواب دیا کہ آپ ہماری باتیں سن لیں۔ اگر آپ کو پسند نہ آئیں تو ہم واپس چلے جائیں گے۔

سعد نے کہا---''منصفانہ بات ہے''---اور بیٹھ گیا۔ حضرت مصعبؓ کی گفتگو نے اس کی دنیائے دل کو بھی تہہ وبالا کر دیا اور وہ اسلام لانے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ چنانچہ حضرت مصعبؓ نے اس کو بھی دائرہ اسلام میں داخل کر لیا۔

حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد سعدؓ اپنی قوم کی طرف واپس گئے اور ان سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''میرے بارے میں تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟''

سب نے کہا---''آپ ہمارے سردار ہیں اور فہم ودانش میں ہم سب سے برتر و فائق ہیں۔''

سعدؓ نے کہا---''تو سن لو کہ میں ایمان لے آیا ہوں اور جب تک تم سب بھی اسلام نہیں لاؤ گے میری بول چال تم سے بند رہے گی۔''

حضرت سعدؓ کا یہ اعلان سن کر بنی عبدالاشہل کے تمام مرد وزن مسلمان ہو گئے اور جمعیت اہلِ اسلام میں یکلخت خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ (۱)

---

(۱) حضرت اسیدؓ اور حضرت سعدؓ کی تابناک زندگیوں کے مختصر حالات درج ذیل ہیں۔

اُسید ابن حضیرؓ

ان کا باپ حضیر پڑھا لکھا انسان تھا اور اپنی قوم کا سردار تھا۔ اس کی تربیت سے اُسید بھی لکھ پڑھ گئے اور اپنی قوم کے سربرآوردہ اور ممتاز افراد میں شمار ہونے لگے۔ اسلام لانے کے بعد پوری تن دہی کے ساتھ فروغ اسلام میں حصہ لینے لگے گھروں میں رکھے ہوئے وہی بت جو کل تک معبود تھے، اب ☜

دعوتِ ہجرت

جب یثرب میں ایمان خاصا پھیل گیا اور مسلمانوں کی تعداد کافی ہوگئی تو ان کو

توڑے جانے لگے۔ حضرت اسیدؓ نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی قوم کے گھروں سے بت نکالے اور ریزہ ریزہ کر دیے۔

غزوۂ بدر میں شامل نہ ہو سکے --- آپ کی طرح اور بھی کئی صحابہ شریک نہیں ہوئے ---

دراصل یہ جنگ اتفاقی طور پر پیش آ گئی تھی، کیونکہ مدینہ طیبہ سے تو جانِ دو عالم ﷺ ابوسفیان کے اس قافلہ کو روکنے کے لئے تشریف لے گئے تھے جو مشرکین کے لئے اسلحہ لا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی خطرناک مہم نہ تھی کہ مدینہ کا ہر فرد روانہ ہو جاتا، لیکن جب قافلہ ہاتھ نہ آیا اور دوسری طرف مشرکین پوری تیاری کے ساتھ حملہ آور ہو گئے تو جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ رہا اور یوں بغیر کسی تیاری کے لڑائی شروع ہو گئی۔

جب جانِ دو عالم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فتح مبین عطا فرمائی اور آپ واپس مدینہ طیبہ پہنچے تو اُسیدؓ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی۔

''یارسول اللہ! الحمدللہ کہ رب تعالیٰ نے آپ کو فتح وظفر سے ہمکنار کیا اور آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی۔ یارسول اللہ! میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ قافلے کو روکنے کی مہم اس طرح اچانک ہولناک جنگ میں بدل جائے گی۔ اگر مجھے یہ خیال ہوتا تو میں کبھی پیچھے نہ رہتا۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ''صَدَقْتَ'' (تم سچ کہتے ہو۔)

بدر کے علاوہ تمام غزوات میں بھرپور شرکت کی اور احد کے دن ثابت قدم رہ کر جانِ دو عالم ﷺ کا دفاع کرتے رہے۔

مزاج میں خوش طبعی کا عنصر زیادہ تھا۔ جانِ دو عالم ﷺ کی محفل میں بھی ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ اسی طرح کی محفل میں مصروف گفتگو تھے اور اہلِ محفل آپ کی دلچسپ باتوں پر ہنس رہے تھے۔ اس وقت آپ کے بدن پر قمیص نہ تھا۔ اچانک جانِ دو عالم ﷺ نے آپ کو زور کا ٹھوکا دیا۔ (یعنی بس بھی کرو۔)

انہوں نے کہا--- ''یارسول اللہ! آپ نے تو مجھے دُکھا دیا ہے۔''

''بدلہ لے لو۔'' جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔

خیال آیا کہ اب رسول اللہ کو یہاں آنے کی دعوت دینا چاہیے۔ چنانچہ ایام حج میں ۷۳ افراد

''مگر کیسے، یارسول اللہ---؟ میں تو ننگا تھا؛ جبکہ آپ نے قمیص پہن رکھا ہے!''

جانِ دو عالم ﷺ نے یہ سن کر اپنا قمیص اٹھا دیا اور کہا۔

''لو، اب بدلہ لے لو۔''

آپ کے نورانی پہلو کو دیکھتے ہی، وہ آپ سے لپٹ گئے اور پہلوئے انور پر بوسوں کی بارش کر دی۔ پھر عرض کی۔

بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! --- اِنِّیْ اَرَدْتُّ ھٰذَا۔

(یارسول اللہ! میرے ماں باپ قربان، میں یہی کچھ کرنا چاہتا تھا۔)

کیسے خوش نصیب ہونٹ تھے جو پہلوئے اقدس کے لمس سے فیضیاب ہوئے---!!

آواز اتنی دلکش تھی کہ آپ کی تلاوت سننے کے لئے فرشتے اتر آتے تھے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں تلاوت کر رہا تھا تو مجھے بادل نے ڈھانپ لیا۔ میں بہت حیران ہوا اور یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے گوش گزار کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

''وہ فرشتہ تھا، تیری قرأت سننے آ گیا تھا۔''

حضرت اُسیدؓ کی زندگی کا حیران کن واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ اور حضرت عباد بن بشیرؓ رات کو دیر تک جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے رہے۔ جب جانے لگے تو سخت اندھیرا تھا اور راستہ نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں سے کسی ایک کی لاٹھی کو منور کر دیا اور وہ اس کی روشنی میں چل پڑے۔ آگے جا کر دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں تو دوسرے کی لاٹھی بھی روشن ہو گئی اور دونوں بآسانی اپنے اپنے گھروں تک پہنچ گئے۔

کتنا خیال رکھتا تھا اللہ تعالیٰ، اپنے محبوب کی خدمت میں بیٹھنے والوں کی آسائش کا!

۲۰ ھ میں آپ نے وفات پائی۔ فاروق اعظمؓ نے جنازے کو کندھا دیا اور نماز جنازہ پڑھائی، جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

اس غرض سے مکہ مکرمہ گئے اور آپ سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات بھی مقامِ عقبہ

سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ

حضرت سعدؓ نے اسلام لانے کے ساتھ ہی جس جوش و ولولہ کا مظاہرہ کیا اور اپنی ساری قوم کو حلقہ بگوشِ اسلام کر دیا تا دمِ واپسیں آپ کا وہی جوش و خروش برقرار رہا۔

غزوۂ بدر سے ذرا پہلے جانِ دو عالم ﷺ نے اس جنگ کے بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا۔ اس وقت انصار کی ترجمانی کرتے ہوئے حضرت سعدؓ نے جو ولولہ انگیز گفتگو کی، اس کی تفصیل تو غزوہ بدر کے بیان میں آئے گی؛ تاہم آپ کے کیفِ دروں کے غماز چند زریں جملے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

آپ نے کہا۔

"یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! صِلْ حِبَالَ مَنْ شِئْتَ وَاقْطَعْ حِبَالَ مَنْ شِئْتَ وَسَالِمْ مَنْ شِئْتَ وَحَارِبْ مَنْ شِئْتَ وَخُذْ مِنْ اَمْوَالِنَا مَاشِئْتَ وَاَعْطِنَا مَا شِئْتَ........."

(یارسول اللہ! جس سے جی چاہے تعلق قائم کر لیجئے اور جس سے جی چاہے قطع تعلق کر لیجئے۔ جس سے صلح کرنا چاہیں، صلح کیجئے اور جس کے ساتھ جنگ کرنا چاہیں جنگ کیجئے، ہمارا جس قدر مال ضرورت ہو، بے تکلف لے لیجئے اور اگر ہمیں کچھ دینے کا ارادہ ہو عطا فرما دیجئے۔ غرضیکہ آپ کا جو جی چاہے، کیجئے ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں۔)

خود سپردگی کی یہ والہانہ کیفیت دیکھ کر جانِ دو عالم ﷺ کا روئے انور مسرت سے دمکنے لگا۔

(الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۴۳۰)

غزوۂ احزاب تک تمام غزوات میں شامل رہے۔ غزوۂ احزاب میں ایک تیر لگنے سے ان کے بازو کی ایک رگ کٹ گئی اور خون فوارے کی طرح ابلنے لگا۔ اس وقت انہوں نے دعا کی۔

"الٰہی! مجھے اس وقت تک نہ مارنا، جب تک میں اپنی آنکھوں سے بنو قریظہ کا انجام نہ دیکھ لوں۔"

خدا کی شان کہ اسی وقت خون نکلنا بند ہو گیا اور آپ کی گرتی ہوئی توانائی کو سہارا مل گیا۔

(بنو قریظہ مدینہ کے یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا۔ اسلام لانے سے پہلے حضرت سعدؓ کے ان کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے اور ان لوگوں نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی لشکر حملہ آور

میں ہوئی۔اس وقت جانِ دو عالم ﷺ کے چچا عباس بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ وہ اگر چہ اس

ہوا تو ہم اس کا ساتھ نہیں دیں گے، مگر انہوں نے بدعہدی کی اور مشرکین سے مل گئے۔ ان کی اس حرکت سے حضرت سعد کو بہت دکھ پہنچا تھا، اس لئے مندرجہ بالا دعا کی تھی۔)

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا منظور فرمالی اور بنو قریظہ کے عبرت ناک انجام تک زخم بند رہا۔ (تفصیل غزوہ احزاب میں آئے گی۔)

بنو قریظہ کی قسمت کا فیصلہ ہوتے ہی ان کا زخم پھر کھل گیا۔ خون بہنے لگا اور وہ لحہ بہ لحہ موت کے قریب ہونے لگے۔ نزع سے ذرا پہلے جانِ دو عالم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور ان کا سر اپنی آغوش میں رکھ کر بیٹھ گئے۔ پھر دعا فرمائی۔

''الٰہی! سعد نے تیرے رسول کی تصدیق کی اور تیری راہ میں اس طرح جہاد کیا کہ حق ادا کر دیا۔ الٰہی اس کی روح کو اس طرح قبول فرما، جس طرح تو کسی بہترین انسان کی روح قبول فرماتا ہے۔''

یہ سرور انگیز جملے سن کر حضرت سعدؓ نے آنکھیں کھولیں، آقا کے روئے زیبا پر نظر ڈالی اور آخری سلام پیش کیا۔

''اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللہِ، اَشْھَدُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللہِ۔''

پھر جانِ دو عالم ﷺ حضرت سعدؓ کے ساتھ لپٹ گئے اور ان کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا، ان کے زخم سے خون ابل رہا تھا اور آپ کے روئے اقدس پر پڑ رہا تھا مگر آپ نے کوئی پرواہ نہ کی اور اس وقت تک ان کو سینے سے لگائے رکھا، جب تک ان کی روح سوئے عرشِ بریں پرواز نہ کر گئی۔

اللہ اکبر! جس ذاتِ اقدس کے قدموں پر جان دینا معراجِ سعادت ہو، حضرت سعدؓ کو اس کی گود میں دم دینے کا شرف حاصل ہو گیا --- اور وہ بھی اس حال میں کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ ذٰلِکَ ھُوَالْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○

پھر ایسی وجد آفریں موت پر عرشِ الٰہی کیوں نہ وجد میں آئے، چنانچہ حدیث پاک میں آیا ہے۔

''اِھْتَزَّ الْعَرْشُ لِمَوْتِ سَعْدِ بْنِ مَعَاذٍ۔''

وقت تک اسلام نہیں لائے تھے؛ تاہم اپنے بھتیجے کے خیر خواہ تھے۔ گفتگو کا آغاز بھی انہوں نے کیا اور انصار سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اے قبیلہ خزرج کے لوگو! جیسا کہ تم جانتے ہو، محمد ایک نہایت ہی معزز گھرانے کا فرد ہے۔ یہاں اگرچہ اس کی مخالفت کافی ہے مگر پھر بھی وہ اپنے شہر اور اپنے گھر میں باعزت طریقے سے رہ رہا ہے۔ اب مخالفت کا زور بھی کسی حد تک ٹوٹ چکا ہے اور حالات دن بدن بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔

(سعد ابن معاذ کی موت پر عرشِ عظیم جھوم اٹھا۔)

جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو وہ نہایت ہی ہلکا پھلکا تھا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کیونکہ حضرت سعد جسیم اور قد آور تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔

''جنازہ ہلکا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سعد کی میت کو کندھا دینے کے لئے ستر ہزار فرشتے آئے ہوئے ہیں، جو اس سے پہلے زمین پر نازل نہیں ہوئے۔''

جب ان کو لحد میں رکھا گیا تو جانِ دو عالم ﷺ بنفس نفیس قبر میں اترے اور دیر تک کھڑے رہے۔ بعد میں آپ نے فرمایا۔

''سعد کے لئے قبر تنگ ہونے لگی تھی، میں نے دعا کی تو کشادہ ہو گئی۔''

شاید قبر بھی آپ کو سینے سے لگانے کے لئے بے تاب ہو رہی ہوگی۔

تدفین کے بعد جانِ دو عالم ﷺ نے ان کی قبر پر کھڑے ہو کر ایک مرتبہ پھر دعا کی اور واپس تشریف لے آئے۔

حضرت سعدؓ کی والدہ بہت دکھیا تھیں۔ رو رو کر ان کا برا حال تھا۔ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

''کیا تیری تسکین کے لئے یہ مژدہ کافی نہیں ہے کہ تیرا بیٹا وہ پہلا شخص ہے جس کے ساتھ اس کے رب نے ہنستے ہوئے ملاقات کی ہے۔''

یہ سن کر امِ سعدؓ کو قرار آ گیا۔ ☜

اس لئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ محمد ہمارے ہی پاس رہے، مگر یہ ہماری بات ماننے پر تیار نہیں ہے۔ یہ تمہارے پاس جانا چاہتا ہے اور وہیں قیام کرنا چاہتا ہے۔

اب اگر تم اس کا بھرپور ساتھ دے سکو اور مکمل طور پر اس کی اعانت و حفاظت کر سکو تو پھر اسے وہاں جانے کی ضرور دعوت دو، لیکن اگر وہاں لے جا کر تم اس کی حمایت سے دستکش ہو جاؤ اور اسے بے یار و مددگار چھوڑ دو تو پھر بہتر یہ ہے کہ ابھی سے کنارہ کش ہو جاؤ اور اسے وہاں لے جانے کی خواہش چھوڑ دو کیونکہ یہاں بہر حال اس کا ایک اعزاز اور مقام ہے۔''

حضرت عباس کی یہ پُر اثر تقریر سن کر انصار نے کہا --- ''ہم نے آپ کی باتیں سن لی ہیں۔ اب آپ بات کریں، یارسول اللہ! اور ہم سے جو عہد لینا چاہیں، لے لیں۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے پہلے چند آیات پڑھ کر ان کو سنائیں، پھر اسلام کی حقانیت بیان فرمائی اور اس کی طرف ترغیب دلائی اور آخر میں ارشاد فرمایا --- ''میں تم سے بیعت لینا چاہتا ہوں اس بات پر کہ تم میری اسی طرح حفاظت کرو گے جس طرح اپنے اہل و عیال

حضرت سعدؓ کی قبر کھودنے والوں کا بیان ہے کہ

''کھدائی کے دوران اوّل سے آخر تک ہر کدال پر کستوری کی خوشبو پھوٹتی رہی۔ تدفین کے بعد ایک شخص نے آپ کی قبر سے مٹی اٹھائی تو وہ بھی کستوری کی طرح مہک رہی تھی۔''

فردوس بریں میں ان کو جو پُر آسائش زندگی نصیب ہوئی، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک دفعہ جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں نہایت ہی نفیس ریشمی جبہ پیش کیا گیا۔ صحابہ کرامؓ اس کو حیرت سے دیکھتے اور اس پر ہاتھ پھیر کر اس کی نرمی و ملائمت پر تعجب کا اظہار کرتے۔ یہ دیکھ کر جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔

''تمہیں اس کی لطافت و نفاست پر حیرت ہو رہی ہے، حالانکہ جنت میں سعد ابن معاذ کے تولئے بھی اس سے زیادہ نفیس ہیں۔''

رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْهُ

(حضرت اسیدؓ اور حضرت سعدؓ کے بیشتر حالات طبقات ابن سعد، مستدرک، اصابہ اور اسد الغابہ سے ماخوذ ہیں۔)

کی کرتے ہو۔''

اس پر حضرت براء ابن معرورؓ نے جانِ دو عالم ﷺ کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا۔

''اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو سچا رسول بنایا ہے، ہم آپ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنی جانوں کی کرتے ہیں۔''(۱)

اچانک حضرت ابوالہیثمؓ (۲) آگے بڑھے اور عرض کی---''یارسول اللہ! یہودیوں اور دیگر مشرکین کے ساتھ ہمارے پرانے تعلقات ہیں۔ظاہر ہے کہ آپ کا ساتھ

---

(۱) آہ! کہ اس پرجوش انداز میں جانِ دو عالم ﷺ کی حمایت کا اعلان کرنے والے حضرت براءؓ کی زندگی نے وفا نہ کی اور جانِ دو عالم ﷺ کا مدینہ منورہ میں استقبال کرنے کی حسرت دل ہی میں لئے ہجرت سے ایک ماہ پہلے انتقال کر گئے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنo

(۲) حضرت ابوالہیثمؓ کا اصلی نام مالک تھا۔مدینہ منورہ میں جانِ دو عالم ﷺ کے خارص تھے، یعنی تخمینہ لگانے والے۔کھجوروں کے باغات کا معائنہ کر کے پھل کا تخمینہ لگاتے تھے اور آپ کو اس کی مقدار سے مطلع کیا کرتے تھے، تاکہ اس حساب سے عشر وغیرہ وصول کیا جا سکے۔

جانِ دو عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت صدیقؓ نے بھی ان کو خارص بنانا چاہا مگر انہوں نے معذرت کر لی۔صدیق اکبرؓ نے فرمایا---''مگر رسول اللہ کے زمانے میں تو تم یہ کام کیا کرتے تھے، اب کیوں انکار کر رہے ہو؟''

''اس کی وجہ یہ ہے''ابوالہیثمؓ نے جواب دیا''کہ اس دور میں جب میں تخمینہ لگا کر واپس آتا تھا اور رسول اللہ ﷺ کو مطلع کرتا تھا تو آپ میرے لئے دعا فرمایا کرتے تھے۔محض اس دعا کی خاطر میں یہ فریضہ انجام دیا کرتا تھا---اب وہ باتیں کہاں؟''(طبقات، ج ۳، حصہ دوم، ص ۲۲)

تمام غزوات میں جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ جہاد میں شامل رہے۔۲۰ھ کو فاروق اعظمؓ کے دور خلافت میں ان کا انتقال ہو گیا۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

دینے کی صورت میں ہمیں وہ تمام روابط اور دوستیاں منقطع کرنا پڑیں گی اور ہم اس کے لئے تیار ہیں --- مگر کہیں ایسا نہ ہو، یارسول اللہ! کہ جب آپ کو کامیابی اور غلبہ حاصل ہو جائے تو آپ ہمیں چھوڑ دیں اور دوبارہ اپنی قوم کے پاس واپس چلے آئیں۔"

یہ محبت بھری گفتگو سن کر جانِ دو عالم ﷺ مسکرائے اور فرمایا --- "نہیں، اب میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ اَنَا مِنۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ مِنِّیۡ جس سے تمہاری مخالفت، میری بھی مخالفت اور جس سے تمہاری صلح، میری بھی صلح۔"

یہ مژدہ جانفزا سن کر وارفتۂ محبت ابوالہیثم ؓ کو قرار آ گیا اور خاموش ہو گئے۔

پھر جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا --- "تم اپنے بارہ آدمی منتخب کر لو، جن کو میں تمہارا سردار بنا دوں۔"

سب نے متفقہ طور پر بارہ آدمی منتخب کر لئے --- نو خزرج کے اور تین اوس کے۔ (۱) پھر سب نے بیعت کی۔ سب سے پہلے حضرت براءؓ نے بیعت کی۔ بعد میں دیگر ۷۲ سعادت مندوں نے یہ شرف حاصل کیا۔ (۲)

آغاز ہجرت

جب اہل یثرب کی طرف سے دعوتِ ہجرت مل گئی تو جانِ دو عالم ﷺ نے اپنے اصحاب سے کہا کہ اب اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھائی بھی دے دیئے ہیں اور ایک ایسا خطہ بھی میسر آ گیا ہے، جہاں تم پُرامن طور پر رہ سکتے ہو۔ اس لئے آہستہ آہستہ ادھر روانہ ہوتے جاؤ۔

مشرکین مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے اہل ایمان کے لئے یہ اجازت ایک

---

(۱) ان بارہ خوش نصیبوں کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

۱- اسید بن حضیر ۲- ابوالہیثم ۳- سعد ابن خیثمہ ۴- اسعد ابن زرارہ ۵- سعد ابن ربیع ۶- عبداللہ ابن رواحہ ۷- سعد ابن عبادہ ۸- منذر ابن عمرو ۹- براء ابن معرور ۱۰- عبداللہ ابن عمرو ۱۱- عبادہ ابن صامت ۱۲- رافع ابن مالک۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ۔

(۲) سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۲۷۵، الوفاء باحوال المصطفیٰ ج ۱، ص ۲۲۵۔

نعمت غیر مترقبہ تھی---اگرچہ یہاں سے جانے کی صورت میں اہل و عیال سے، گھربار سے اور مال و متاع سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے، مگر ان اہل وفا کو ان چیزوں کی پرواہی کب تھی!---چنانچہ لوگوں نے چپکے چپکے یثرب کی طرف جانا شروع کر دیا۔ جو لوگ چھپ چھپا کر نکل جاتے، وہ تو بچ جاتے مگر جن کی روانگی کی بھنک مشرکین کے کانوں میں پڑ جاتی، انہیں بے انتہا مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا۔

سب سے پہلے مہاجر ابوسلمہؓ (۱) ہیں۔ وہ جب اپنی بیوی ام سلمہؓ اور ننھے بیٹے سلمہ کو ساتھ لے کر ہجرت کے لئے روانہ ہوئے تو بنو مغیرہ اور بنو عبدالاسد نے آ کر ان کو روک لیا۔ بنو مغیرہ، ام سلمہ کا قبیلہ تھا اور بنو عبدالاسد ابوسلمہ کا۔ بنو مغیرہ نے ابوسلمہ سے کہا---''اگر تو جانے پر بضد ہے تو چلا جا، مگر ہم اپنے قبیلہ کی لڑکی کو ساتھ نہیں لے جانے دیں گے۔''

بنو عبدالاسد نے کہا---''ابوسلمہ! تیرا بیٹا ہمارے قبیلے کا بچہ ہے، اگر تو جانا چاہتا ہے تو جا، یہ بچہ ہم اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔''

چنانچہ انہوں نے ام سلمہؓ کی گود سے بچہ چھین لیا اور اسے لے کر چلتے بنے۔ ابوسلمہؓ اکیلے رہ گئے۔ قبیلے والوں کا خیال ہوگا کہ بیوی اور بیٹے کی محبت ابوسلمہؓ کے پاؤں کی زنجیر بن جائے گی۔ مگر جن کے دلوں میں اللہ رسول کی محبت گھر کر چکی ہو، ان کی راہ میں فانی محبتیں کب رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ چنانچہ ابوسلمہؓ بیوی بچوں کو وہیں چھوڑ کر اکیلے چلے گئے۔ (۲)

ہجرت کر کے یثرب پہنچ جانے والوں کو دوبارہ واپس لانے کی کوششیں بھی کی جاتیں اور اس سلسلے میں ہر طرح کے مکر و فریب کو روا رکھا جاتا۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ آمادۂ ہجرت ہوئے تو دو اور افراد---حضرت ہشامؓ اور حضرت عیاشؓ---بھی آپ کے ساتھ

---

(۱) ان کا تذکرہ سیدالورٰی، ج ۱، ص ۲۲۹ پر گزر چکا ہے۔

(۲) حضرت ابوسلمہؓ کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کی اہلیہ کو ناقابلِ برداشت مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بڑی مشکل سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں۔ تفصیل جاننے کے لئے سیّدالورٰی، ج ۳، باب ازواجِ مطہرات، ذکرِ اُمّ المؤمنین اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا مطالعہ کیجئے!

جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ طے یہ ہوا کہ فلاں جگہ، فلاں وقت تینوں اکٹھے ہوں گے اور ساتھ چلیں گے۔ اگر مقررہ وقت تک کوئی نہ پہنچ سکا تو سمجھ لیا جائے کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے اور وہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ کو تو کوئی فکر نہ تھی کیونکہ آپ نے خفیہ ہجرت کی ہی نہیں۔ آپ نے تو کفار کے بھرے مجمع میں اعلان کیا تھا کہ میں ہجرت کر کے جا رہا ہوں۔ اگر تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو بیوہ اور اولاد کو یتیم کرنا چاہے تو بے شک مجھے روکنے کی کوشش کرے۔

یہ ہیبت ناک اعلان سن کر مشرکین اتنے دہشت زدہ ہوئے کہ کسی نے آپ کو روکنے کی جرأت نہ کی اور آپ علانیہ روانہ ہو گئے۔ مقررہ جگہ پہنچے تو حضرت ہشامؓ وہاں موجود نہ تھے، کیونکہ ان کا راز کھل گیا تھا اور مشرکین نے انہیں قید کر دیا تھا۔ حضرت عیاشؓ البتہ آئے ہوئے تھے۔ وہ آپ کے ہمسفر ہو گئے اور دونوں یثرب پہنچ گئے۔

چند دنوں کے بعد ابوجہل اور اس کا بھائی حرث بھی یثرب آ پہنچے۔ یہ دونوں حضرت عیاشؓ کے تایا زاد بھائی تھے اور ان تینوں کی ماں ایک تھی۔ انہوں نے حضرت عیاشؓ سے ملاقات کی اور کہا کہ تمہارے فراق میں ماں کا برا حال ہے اور اس نے قسم کھائی ہے کہ جب تک میں عیاش کا منہ نہ دیکھ لوں، نہ سر میں کنگھی کروں گی، نہ سائے میں بیٹھوں گی۔ اس کی حالت زار دیکھ کر ہم سے صبر نہ ہو سکا اور تمہیں لینے چلے آئے ہیں، اس لئے فی الحال تم ہمارے ساتھ چلے چلو تاکہ ماں کی قسم پوری ہو جائے اور اس کو قرار آ جائے، بعد میں بے شک واپس چلے آنا۔

ماں کی بے تابی و بے قراری کا سن کر حضرت عیاشؓ کا دل پگھل گیا اور ان کے ساتھ جانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

حضرت عمرؓ کو پتہ چلا تو انہوں نے حضرت عیاشؓ کو سمجھایا اور کہا --- ''عیاش! مجھے تو یہ سراسر دھوکہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں تمہارا ان کے ساتھ جانا مناسب نہیں --- اور جہاں تک تمہاری ماں کی قسم کا تعلق ہے تو یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔ جب اس کے سر میں جوئیں پڑیں گی تو خود ہی کنگھی کرنے لگے گی اور جب مکے کی چلچلاتی

دھوپ اس پر پڑے گی تو خود ہی سائے میں جا بیٹھے گی۔''

حضرت عیاشؓ نے کہا---''میں ماں سے مل کر جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔''

''اگر تم جانا ہی چاہتے ہو'' حضرت عمرؓ نے کہا ''تو میرا یہ ناقہ لے جاؤ، یہ بہت توانا اور تیز رفتار ہے۔ اگر راستے میں ابوجہل اور حرث کی نیتوں میں فتور نظر آئے تو یہ سبک سیر ناقہ تمہیں بہت کام دے گا اور وہ اس کی گرد کو بھی نہ پا سکیں گے۔''

چنانچہ حضرت عیاشؓ نے ناقہ لیا اور ان دونوں کے ہمراہ مکہ روانہ ہو گئے۔

بات وہی نکلی جو فراست فاروقی نے پہلے ہی بھانپ لی تھی---مکہ کے قریب پہنچے تو ابوجہل کہنے لگا---''میرا اونٹ تو بالکل ہی بے دم ہو کر رہ گیا ہے، ذرا تم اپنا ناقہ بٹھاؤ تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ سوار ہو جاؤں۔''

حضرت عیاشؓ نے اس کے کہنے پر ناقہ بٹھا دیا۔ ابوجہل اور حرث دونوں اترے اور حضرت عیاشؓ پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت عیاش نے بھتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر ان دونوں نے مل کر انہیں باندھ لیا اور اسی طرح ان کو باندھے ہوئے مارتے پیٹتے مکہ میں داخل ہوئے۔ اس منظر کو دیکھنے کے لئے کافی لوگ اکٹھے ہو گئے تو ابوجہل نے فخریہ طور پر ان سے کہا---''دیکھا تم لوگوں نے---! ہم نے ان احمقوں کی کیا درگت بنائی ہے۔ تم بھی اپنے بے وقوفوں کے ساتھ یہی سلوک کیا کرو۔''

اس کے بعد حضرت عیاشؓ کو بھی حضرت ہشامؓ کے ساتھ بند کر دیا گیا۔(۱)

غرضیکہ ہجرت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا؛ بلکہ مال و متاع اور عزت و آبرو کو داؤ پر لگا کر یہ مہم سر کرنا پڑتی تھی---بایں ہمہ اہل شوق کسی نہ کسی طرح جاتے رہے اور یثرب میں جمع ہوتے رہے۔ رفتہ رفتہ سارے ہی مسلمان ادھر چلے گئے اور جانِ دو عالم ﷺ صدیق اکبر اور علی مرتضیٰ کے سوا کوئی مسلم مکہ میں نہ رہا---سوائے ان لوگوں کے جو پابند سلاسل تھے یا ناداری اور غلامی کی وجہ سے معذور تھے۔

---

(۱) سیرۃ حلبیہ ج ۲، ص ۲۳، ۲۴، سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۲۸۸۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی اجازت طلبی

صدیق اکبرؓ بھی ہجرت کے لئے بے تاب تھے، مگر جب جانِ دو عالم ﷺ سے اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا ---''ابوبکر! جلدی نہ کر، ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کسی اور کو بھی تیرا ہمسفر بنادے۔''

اس فرمان سے صدیق اکبرؓ کو امید لگ گئی کہ شاید آقا بذاتِ خود میرے ہمسفر بن کر مجھے لازوال اعزاز بخشنا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے آٹھ سو روپے میں دو اونٹنیاں خرید لیں اور ان کو کھلا پلا کر فربہ کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ جب سفر کا مرحلہ پیش آئے تو سواریوں کے انتظام میں کوئی دقت نہ ہو۔

اچھی دیکھ بھال اور خاطر مدارات سے اونٹنیاں چند ہی دنوں میں تگڑی تازی ہو گئیں اور اس قابل ہو گئیں کہ ان پر بے دھڑک طویل سفر کیا جا سکے۔ اب صرف اس کا انتظار تھا کہ کب جانِ دو عالم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن ہجرت ملتا ہے۔

باب ۴

ہجرتِ رسول ﷺ

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا ------- مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاع

آغازِ ہجرت سے اختتام ہجرت تک

عشق و محبت کی سحر طرازیاں
کمالاتِ نبوّت کی دلنوازیاں

اذنِ ھجرت

آخر وہ گھڑی آ پہنچی، جس کا انتظار تھا۔ ایک دن عین دوپہر کے وقت حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ نے دیکھا کہ جانِ دوعالم ﷺ ان کے گھر کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ انہوں نے صدیق اکبرؓ کو مطلع کیا۔ چونکہ آپ دوپہر کے وقت کبھی ان کے گھر نہیں گئے تھے۔ ہمیشہ صبح اور شام کو تشریف لے جایا کرتے تھے، اس لئے صدیق اکبرؓ کو تعجب ہوا اور کہنے لگے۔

''میرے ماں باپ ان پر قربان، اس گھڑی ان کی آمد کسی اہم بات کے لئے ہی ہوئی ہوگی۔''

اتنے میں جانِ دوعالم ﷺ بھی دروازے تک پہنچ گئے اور اندر آنے کی اجازت طلب فرمائی۔ صدیق اکبرؓ نے اجازت دے دی تو آپ گھر میں داخل ہوئے اور صدیق اکبرؓ سے کہا۔

''ابوبکر! تمہارے علاوہ یہاں جو کوئی بھی ہے، اس کو کہو کہ ذرا باہر چلا جائے۔'' (تاکہ تخلیہ میں بات ہو سکے۔)

اس وقت گھر میں چار ہی افراد تھے۔ صدیق اکبرؓ، ان کی اہلیہؓ اور دو بیٹیاں، عائشہؓ اور اسماءؓ۔ اس لئے صدیق اکبرؓ نے عرض کی --- ''آپ پر میرے ماں باپ فدا، یہاں سب گھر کے افراد ہیں --- غیر تو کوئی نہیں۔''

اس پر جانِ دوعالم ﷺ نے انہیں بتایا کہ مجھے ہجرت کی اجازت مل گئی ہے۔

صدیق اکبرؓ نے نہایت بے تابی سے پوچھا --- ''یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر نثار، کیا مجھے بھی ہمسفری کی سعادت حاصل ہو سکے گی؟''

''ہاں! تم میرے ساتھ ہوگے۔'' جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا۔

اللہ اللہ! صدیق جیسے عاشق صادق کے لئے اس سے بڑی نوید روح افزا اور کیا

ہو سکتی تھی۔ یہ مژدہ سن کر فرطِ فرحت اور انتہائے مسرت سے ان کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں---''میں نے اس سے پہلے خوشی سے بے قابو ہو کر روتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا تھا، اس دن پہلی مرتبہ ابا جان کو سرورِ بے پایاں سے اشکبار دیکھا تھا۔''

اس کے بعد صدیق اکبرؓ نے عرض کی---''یا رسول اللہ! ان دو اونٹنیوں میں سے ایک آپ کی نذر ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''بلا قیمت نہیں لوں گا، جتنے میں تم نے خریدی ہے اتنی رقم ادا کروں گا۔''

صدیق اکبرؓ نے کہا---''جیسے آپ کی مرضی۔''(۱)

دار الندوہ کی روئیداد

دار الندوہ (۲) میں آج خاصا اجتماع ہے۔ مختلف قبیلوں کے بیسیوں آدمی ایک ''پریشان کن مسئلے'' پر مشورے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں اور غور و خوض کر رہے ہیں۔ مسئلہ یہ درپیش ہے کہ محمد کے بیشتر ساتھی یہاں سے چلے گئے ہیں اور یثرب میں آباد ہو گئے ہیں۔

---

(۱) یہاں ایک الجھن پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ صدیق اکبرؓ تو زندگی بھر اپنا مال جانِ دو عالم ﷺ پر قربان کرتے رہے، مگر اس ایک موقع کے سوا کبھی آپ نے انکار نہیں کیا---آخر اس میں کیا راز ہے کہ آپ نے اس وقت حضرت صدیقؓ کا ہدیہ قبول نہیں فرمایا اور باقاعدہ قیمت ادا کی؟

علمائے کرام فرماتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ چاہتے تھے کہ میری ہجرت ہر لحاظ سے مکمل ہو۔ یعنی ہجرت میں صرف بدن کا حصہ نہ ہو، مال کا بھی حصہ ہو۔ اگر آپ بلا قیمت اونٹنی قبول فرما لیتے تو ہجرت میں آپ کے مال کا کوئی حصہ نہ ہوتا اور اس طرح ایک لحاظ سے ہجرت نامکمل رہ جاتی۔ مزاج شناسِ رسول---صدیق اکبر---یہ رمز سمجھ گئے تھے، اس لئے انہوں نے بھی اصرار نہیں کیا اور کہا ''جیسے آپ کی مرضی۔''

(۲) دار الندوہ اہل مکہ کا ایوان مشاورت تھا اور اس لحاظ سے تاریخی اہمیت کا حامل تھا کہ مکہ مکرمہ میں یہ پہلا مکان تھا۔ اس سے پہلے لوگ خیموں میں رہا کرتے تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ کے ☜

وہاں کے لوگ بھی ان کا بھرپور ساتھ دے رہے ہیں اور ان کی قوت دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ اگر محمد بھی نکل گیا اور جاکر ان لوگوں سے مل گیا تو پھر اس تحریک پر قابو پانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لئے کوئی ایسی تدبیر سوچی جائے جس سے مستقبل کے اس خطرے کا سدباب ہو سکے۔

شیطان کے چیلے چانٹے اتنی اہم مشاورت میں مصروف ہوں اور خود شیطان ان میں شامل نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ چنانچہ شیطان بھی حسب معمول شیخ نجدی کی صورت میں آپہنچا۔ اہلِ محفل نے ایک اجنبی کو اندر آتے دیکھا تو بہت برہم ہوئے، کیونکہ دارالندوہ میں اجنبیوں کا داخلہ ممنوع تھا، اس لئے انہوں نے انتہائی درشت لہجے میں بڈھے نجدی سے پوچھا۔

''مَنْ اَنْتَ وَمَا اَدْخَلَکَ عَلَیْنَا فِیْ خَلْوَتِنَا بِغَیْرِ اِذْنِنَا؟''

(تو کون ہے---؟ اور ہماری پرائیویٹ محفل میں بلا اجازت کیوں گھس آیا ہے؟)

شیطان پرانا خرانٹ تھا، اس نے فی الفور خوشامد اور عاجزی کا انداز اختیار کیا اور کہا

''میں نجد کا رہنے والا ہوں۔ مکہ میں آیا تو تمہارے حسین وجمیل چہرے اور مہکتے بدن دیکھ کر دل تم لوگوں کی طرف کھنچنے لگا، اس لئے چند گھڑیاں تمہاری صحبت میں گزارنے کے لئے ادھر چلا آیا ہوں۔ اگر تم کو میرا آنا ناگوار گزرا ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔''

اہل محفل پر اس کا اندازِ گفتگو اثر کر گیا، انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا۔

''خیر ہے، کوئی حرج نہیں۔ باہر کا آدمی ہے۔ اس نے ہماری بات چیت سن بھی لی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

ایک جدامجد جناب قصی نے اسے اپنے لئے بنوایا تھا، ان کے بعد اسے مشورہ گاہ بنا دیا گیا۔ یہاں صرف اس وقت اجلاس منعقد کیا جاتا تھا جب کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تھا۔ اس اجلاس میں صرف معمر اور سنجیدہ قسم کے افراد شامل ہو سکتے تھے۔ چالیس سال سے کم عمر والے کسی شخص کو اس میں شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ صرف ابوجہل اپنی ذہانت وفطانت کی وجہ سے اس قاعدہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا اور اس کو نوجوانی میں ہی دارالندوہ کا ممبر بنالیا گیا۔

جانِ دو عالم ﷺ کا وہ راستہ جس پر آپ نے سفرِ ہجرت طے کیا اور مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ پہنچے۔ سبز لکیر معروف راستہ ہے اور سرخ لکیر وہ راستہ ہے جو جانِ دو عالم ﷺ نے اختیار کیا۔

چنانچہ شیخ نجدی اپنا ریشمی جبہ سنبھالتے ہوئے ان میں آ بیٹھا۔

کاروائی کا آغاز ہوا تو ایک شخص نے اس اجتماع کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ محمد کے بڑھتے ہوئے اقتدار وعروج کو روکنے کے لئے تجاویز پیش کی جائیں۔

ایک جہاندیدہ کافر ابوالبختری نے کہا---''میرے خیال میں محمد کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنادی جائیں اور ساری عمر اس کو اسی طرح قید رکھا جائے، تا آنکہ اس کی روح پرواز کر جائے۔''

''نہیں!---یہ کوئی معقول مشورہ نہیں ہے۔'' شیخ نجدی منہ بنا کر بولا ''اس طرح تو خطرہ اور بڑھ جائے گا، کیونکہ محمد کے پیروکاروں کو جب پتہ چلے گا کہ تم لوگوں نے اس کو پابند سلاسل کر دیا ہے تو وہ تم پر چڑھ دوڑیں گے اور محمد کو چھڑا لے جائیں گے---کوئی اور تجویز سوچو۔''

اسود ابن ربیعہ بولا---''میری رائے یہ ہے کہ محمد کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ باہر جا کر اس کا جو جی چاہے کرتا پھرے، ہماری تو جان چھوٹے گی۔''

''یہ بھی کوئی صحیح رائے نہیں ہے۔'' شیخ نجدی نے ناک بھوں چڑھائی ''کیا تم نہیں جانتے کہ محمد اپنی میٹھی اور خوبصورت گفتگو سے لوگوں کے دل موہ لیتا ہے---! اگر تم نے اسے مکہ سے نکال دیا تو وہ بیرونِ مکہ آباد قبائل میں ڈیرہ لگالے گا اور ان کو اپنی جادو بیانی سے مسخر کر کے تمہارے مقابلے میں لا کھڑا کرے گا---کوئی اور تجویز پیش کرو!''

ابوجہل نے کہا---''میرے ذہن میں ایک نہایت عمدہ تجویز ہے، جو ابھی تک کسی نے پیش نہیں کی۔''

''وہ کیا ابوالحکم!؟'' حاضرین محفل نے پوچھا۔

''میرا منصوبہ یہ ہے'' ابوجہل نے بتایا ''کہ بنو ہاشم کے علاوہ ہر قبیلے میں سے معزز گھرانوں کے جوان منتخب کئے جائیں اور انہیں تلواریں دی جائیں۔ وہ سب مل کر یکبارگی محمد پر حملہ کریں اور اس کو قتل کر دیں۔ اس طرح ہماری جان بھی چھوٹ جائے گی اور بنو ہاشم قصاص کا مطالبہ بھی نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ اس حملے میں ہر قبیلے کے جوان ملوث ہوں گے اور بنو ہاشم تنہا سب کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہمیں خون بہا ادا کرنا پڑ

جائے گا اور وہ ہم ادا کر دیں گے۔"

"یہ ہوئی نا بات!" شیخ نجدی اس شیطانی منصوبے پر پھڑک اٹھا "یہ بالکل صحیح تجویز ہے، اسی پر عمل درآمد ہونا چاہئے۔"

اس پر اتفاق رائے ہو گیا اور اجلاس ختم ہو گیا۔

عمل در آمد

منصوبے کے مطابق مختلف قبائل سے سو افراد منتخب کئے گئے اور جب رات کی تاریکی محیط ہو گئی تو جانِ دو عالم ﷺ کے کاشانۂ اقدس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ مہم کی قیادت کے لئے عقبہ، امیہ اور ابو جہل جیسے ائمۃ الکفر بذات خود موجود تھے۔

جانِ دو عالم ﷺ کو جبریل امین نے کفار کے پروگرام سے مطلع کیا اور کہا کہ آج رات اپنے بستر پر استراحت نہ فرمایئے! چنانچہ آپ نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو لٹایا اور کہا---"میں ہجرت کر کے جا رہا ہوں۔ تم بے فکر ہو کر سو جاؤ، کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا اور میں تمہیں چھوڑ کر اس لئے جا رہا ہوں کہ میرے پاس لوگوں کی بہت سی امانتیں پڑی ہیں جو ان کو لوٹانی ہیں۔ تم وہ امانتیں مالکوں تک پہنچا دینا اور بعد میں ہمارے پاس چلے آنا۔"

اللہ اللہ! یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ لوگ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ ان کی امانتوں کے تحفظ کا اتنا اہتمام فرمایا کہ اپنے پیارے چچازاد بھائی کو دشمنوں کے ہجوم میں اکیلا چھوڑ گئے، تاکہ کسی کی امانت خورد برد نہ ہو جائے۔ حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ.

فَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ

کاشانۂ اطہر کا محاصرہ کرنے والے وقت گزاری کے لئے تعلیمات نبویہ کا مذاق اڑا رہے تھے اور آپس میں بات چیت کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"محمد کا خیال ہے کہ اگر تم لوگ اس کے تابع ہو جاؤ تو عرب وعجم کی بادشاہت تمہیں مل جائے گی اور مرنے کے بعد اردن کے باغوں جیسے سرسبز باغوں میں رہو گے اور اگر تم نے اس کی پیروی نہ کی تو تم ہلاک ہو جاؤ گے اور مرنے کے بعد آگ میں جلو گے۔"

جانِ دو عالم ﷺ نے ان کی باتیں سن لیں، اسی وقت باہر تشریف لائے اور فرمایا ''اَنَا اَقُوْلُ ذٰلِکَ.'' (ہاں! میں یہ ساری باتیں کہتا ہوں۔)

اس کے بعد آپ نے مٹی کی مٹھی بھری اور کافروں کی طرف پھینک دی۔ اس وقت زبان مبارک پر سورہ یٰسین کی ابتدائی آیات جاری تھیں

﴿وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۝﴾ (اور ہم نے ان کے آگے بھی بند باندھ دیا اور پیچھے بھی، پھر ہم نے ان کو یوں ڈھانپ لیا کہ ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔)

آپ کی پھینکی ہوئی مٹی معجزانہ طور پر محاصرہ کرنے والے تمام افراد کے سروں پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی جانِ دو عالم ﷺ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ چنانچہ آپ نہایت اطمینان سے نکل کر چلے گئے اور کسی کو نظر نہ آسکے۔ (۱)

تیاری اور روانگی

جانِ دو عالم ﷺ بعافیت صدیق اکبرؓ کے گھر پہنچ گئے تو روانگی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ چونکہ خفیہ طور پر جانا تھا، اس لئے سواری پر جانا ممکن نہ تھا، چنانچہ صدیق اکبرؓ نے اپنی اونٹنیاں ایک معتمد شخص عبداللہ ابن اریقط کے حوالے کیں اور اسے کہا کہ تین راتیں گزرنے کے بعد یہ اونٹنیاں غارِ ثور (۲) تک پہنچا دینا اور اپنی مزدوری لے لینا۔

صدیق اکبرؓ کی بیٹیوں، حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ نے ساتھ لے جانے کے

---

(۱) ''حضرت صدیق اکبرؓ کی اجازت طلبی'' سے یہاں تک ذکر کئے گئے واقعات تاریخ و سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہیں۔ کسی نے اختصار سے کام لیا اور کسی نے تفصیلات بیان کیں۔ ہم نے درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۲۶ تا ۳۴، زرقانی ج ۱، ص ۳۸۶ تا ۳۸۹، سیرت ابن ھشام ج ۱، ص ۲۹۰.

(۲) ثور، اصل میں اس پہاڑ کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر ہے اور انتہائی دشوار گزار ہے۔

لئے گوشت بھونا اور ایک چھوٹا سا مشکیزہ پانی کا بھرا۔ کھانے کو باندھنے اور مشکیزے کا منہ بند کرنے کے لئے اس وقت گھر میں کوئی رسی وغیرہ دستیاب نہ ہو سکی تو حضرت اسماءؓ نے اپنی کمر کے گرد لپٹا ہوا اِنطاق (۱) کھول کر درمیان سے چیر دیا اور اس کے ایک حصے سے کھانا باندھ دیا، دوسرے حصے کو مشکیزے کے منہ پر لپیٹ دیا۔

تیاری مکمل ہوگئی تو صدیق اکبرؓ نے گھر میں رکھا ہوا چھ ہزار روپیہ جیب میں ڈالا اور جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ غار کی طرف روانہ ہو گئے۔

اظہارِ غم

مکہ مکرمہ جانِ دو عالم ﷺ کا آبائی شہر تھا اور یہاں کے گلی کوچوں میں آپ کا بچپن اور جوانی گزری تھی، اس لئے آپ کو اس کے ذرے ذرے سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی بناء پر روانگی کے وقت آپ نہایت افسردہ وملول تھے اور جب اس شہرِ مقدس سے باہر نکلے تو چشمہائے نرگسیں گہر بار ہوگئیں اور آپ نے دکھ بھرے لہجے میں فرمایا۔

''اے ارضِ مکہ! میں جانتا ہوں کہ تو اللہ کی نگاہ میں ساری دنیا سے زیادہ پیاری اور محترم ہے، مگر تیرے باسیوں نے یہاں میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ اگر ان لوگوں نے مجھے نکلنے پر مجبور نہ کر دیا ہوتا تو میں کبھی بھی تجھے چھوڑ کر نہ جاتا۔'' (۲)

طوافِ شمعِ نبوت

غار کی طرف جاتے ہوئے جانِ دو عالم ﷺ نے دیکھا کہ صدیق اکبرؓ کبھی آگے ہو جاتے ہیں، کبھی پیچھے۔ کبھی دائیں چلنے لگتے ہیں، کبھی بائیں۔ آپ نے پوچھا

---

(۱) عرب میں عورتوں کے قمیص کافی لمبے ہوا کرتے تھے، چونکہ لمبا قمیص کام کاج کے دوران حارج ہوتا ہے، اس لئے اس کو کمر کے پاس سے اوپر اٹھا کر اس کے گرد ایک ازار بند سا لپیٹ دیتی تھیں، تاکہ نیچے نہ گرنے پائے۔ اس ازار بند کو ''نِطاق'' کہا جاتا تھا۔ حضرت اسماءؓ نے چونکہ شب ہجرت اپنے نطاق کو چیر کر ایک نطاق کے دو نطاق بنا لئے تھے۔ اس لئے ان کو ذات النطاقین کہا جاتا ہے۔ یعنی دو نطاقوں والی۔

(۲) زرقانی ج ۱، ص ۳۱۵، سیرت حلبیہ ج ۳، ص ۳۱۔

''ابوبکر! یہ کیا کر رہے ہو؟''

عرض کی---''یارسول اللہ! جب خیال آتا ہے کہ راستے میں کوئی دشمن گھات نہ لگائے بیٹھا ہو تو آگے ہو جاتا ہوں اور جب تعاقب کرنے والوں کا خطرہ محسوس کرتا ہوں تو پیچھے ہو جاتا ہوں، اسی طرح دائیں بائیں ہوتا رہتا ہوں تاکہ ہر طرف نگاہ رکھ سکوں اور کسی طرف سے کوئی کافر آپ کو گزند نہ پہنچا سکے۔''(۱)

زہے سعادت، صدیق اکبر! تجھے شمعِ نبوت کے گرد یہ پروانہ وار طواف مبارک۔

حُسنِ خدمت گزاری

اس خیال سے کہ آہٹ نہ ہو، جانِ دو عالم ﷺ برہنہ پا، پنجوں کے بل چل رہے تھے۔ سنگلاخ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے آپ کے حریری تلوے چھل گئے اور ان سے خون رسنے لگا۔ یہ دیکھ کر صدیق اکبرؓ تڑپ اٹھے، بے تابانہ آگے بڑھے اور جانِ دو عالم ﷺ کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔

یہ نصیب! اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے۔

باقی راستہ اسی طرح طے ہوا اور صبحدم غار تک پہنچ گئے۔(۲)

محیر العقول جان نثاری

غار میں داخل ہونے سے پہلے صدیق اکبرؓ نے عرض کی---''یارسول اللہ! آپ یہیں ٹھہریئے، میں اندر جا کر دیکھتا ہوں کہ سانپ یا بچھو وغیرہ نہ ہوں۔''

صدیق اکبرؓ نے اندر جا کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ سانپ وغیرہ تو کوئی نظر نہ آیا؛ البتہ غار میں جگہ جگہ سوراخ تھے۔ اس خطرے کے پیش نظر کہ ہو سکتا ہے ان سوراخوں میں کوئی سانپ چھپا ہو اور ناگاہ حملہ آور ہو جائے صدیق اکبرؓ نے اپنی چادر پھاڑ ڈالی اور اس کے ٹکڑوں سے سوراخ بند کرنا شروع کر دیئے۔ ٹکڑے ختم ہو گئے، مگر پھر بھی ایک

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۳، حصہ دوم، ص ۸۰، الوفاء باحوال المصطفیٰ، ج ۱، ص ۲۳۷۔

(۲) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۳۷۔

سوراخ بچ گیا۔ اس پر صدیق اکبرؓ نے اپنی ایڑی رکھ دی (۱) اور جانِ دو عالم ﷺ کو اپنی آغوش میں لٹا کر بیٹھ گئے۔

جانِ دو عالم ﷺ تھکے ہوئے تو تھے ہی، لیٹتے ہی محوِ استراحت ہو گئے۔ (۲) اتفاق دیکھئے! کہ جس سوراخ پر صدیق اکبرؓ نے ایڑی جمائی ہوئی تھی، وہی سانپ کا بل تھا۔ اس طرح بیٹھے ہوئے نہ جانے کتنا وقت گزرا ہوگا کہ ناگاہ سانپ نے صدیق اکبرؓ کی ایڑی پر کاٹ لیا۔

درد کی ایک زوردار لہر اٹھی، مگر صدیق اکبرؓ نے اس خیال سے کہ جان جائے تو جائے، محبوبِ خدا کے آرام میں خلل نہ آئے۔ اپنا پاؤں وہیں جمائے رکھا اور ذرا سی جنبش بھی نہ کی؛ تاہم تکلیف اس قدر شدید تھی کہ بے اختیار آنسو نکل آئے اور جانِ دو عالم ﷺ کے روئے اقدس پر ٹپک پڑے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے آنکھیں کھولیں تو یارِ غار کو اشکبار دیکھا، پوچھا۔

''مَالَکَ؟'' (تجھے کیا ہوا ہے۔)

عرض کی ---''یا رسول اللہ! مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے۔''

مسیحائے عالم کے لئے اس تکلیف کو دور کرنا کیا مشکل تھا! آپ نے اس جگہ جہاں سانپ نے کاٹا تھا، اپنا لعاب دہن لگایا تو اسی وقت تکلیف ختم ہو گئی اور درد کافور ہو گیا۔ (۳)

---

(۱) مشکوٰۃ المصابیح میں جو روایت ہے، اس میں اس طرح ہے کہ دو سوراخ بچ گئے تھے اور صدیق اکبرؓ نے ان پر اپنے دونوں پاؤں رکھ دیئے تھے۔ ص ۵۵۶۔ وَاللہُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ.

(۲) تھکے ہوئے تو صدیق اکبرؓ بھی کم نہ تھے کیونکہ انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کو کندھوں پر اٹھا کر یہ دشوار گزار راستہ طے کیا تھا، مگر انہوں نے اپنا آرام اپنے محبوب آقا کے آرام پر نثار کر دیا۔

(۳) زرقانی ج ۱، ص ۳۰۴، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۳۸، الوفاء باحوال المصطفیٰ ج ۱، ص ۲۳۸.

اھتمام تحفظ

حضرت یونسؑ جب مچھلی کے پیٹ سے نکلے تھے تو ان کو مکھیوں، مچھروں سے محفوظ رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس لوکی کی بیل اگادی تھی۔

﴿وَاَنۢبَتۡنَا عَلَیۡهِ شَجَرَةً مِّنۡ یَّقۡطِیۡنٍ ۝﴾ (۱)

پھر جانِ دو عالم ﷺ کے تحفظ کا کیونکر اہتمام نہ ہوتا؛ جبکہ دشمنانِ دین ان کی جان کے درپے تھے! چنانچہ اللہ تعالیٰ نے غار کے دھانے پر ایک گھنا پودا اُگادیا، جس کی وجہ سے اندر کا منظر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ علاوہ ازیں غار میں داخلے کے راستے پر جنگلی کبوتروں نے انڈے دے دیئے اور مکڑی نے پورے دھانے پر جالا تان دیا۔ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے یہ شبہ کیا ہی نہیں جاسکتا تھا کہ کوئی غار میں داخل ہوا ہوگا۔

تلاش

ادھر صبحدم جب کفار کو پتہ چلا کہ بستر پر حضرت علیؓ لیٹے ہوئے ہیں، تو وہ بہت

(تفصیل معجزات میں آئے گی۔) مولانا احمد رضا خان بریلویؒ دونوں ایمان افروز واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیا دلچسپ استنباط کرتے ہیں۔

مولیٰ علی نے واری تری نیند پر نماز
اور وہ بھی عصر، سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے

صدیق؛ بلکہ غار میں جان اس پہ دے چکے
اور حفظ جاں، تو جان فرضِ غرر کی ہے

ہاں! تو نے اِن کو جان، اُنہیں پھیر دی نماز
پر وہ تو کر چکے تھے، جو کرنی بشر کی ہے

ثابت ہوا کہ جملہ فرائض فروع ہیں
اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

(حدائق بخشش)

''اس تاجور'' کی بندگی میں گزرنے والی صدیق اکبرؓ کی یہ ایک رات فاروق اعظمؓ کی نگاہ میں اتنی معظم تھی کہ آپ صدیق اکبرؓ کو یاد کرکے رو پڑا کرتے اور فرمایا کرتے---'' کاش! میری ساری زندگی کی نیکیاں صدیق اکبر کی اس ایک رات کے مساوی ہو جائیں، جو انہوں نے غار میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گزاری تھی۔'' مشکوٰۃ ص ۵۵۶۔

(۱) سورہ ۳۷، آیت ۱۴۶۔

ٹپٹائے۔ حضرت علیؓ سے پوچھا ''اَیْنَ صَاحِبُکَ؟'' (تیرا دوست کہاں ہے؟)
حضرت علیؓ نے فرمایا ''لَا اَدْرِیْ'' (مجھے کچھ پتہ نہیں۔)
چنانچہ انہوں نے حضرت علیؓ کو چھوڑ دیا اور جانِ دو عالم ﷺ کی تلاش شروع کر دی۔ شہر بھر میں سراغ نہ مل سکا تو وہ سمجھ گئے کہ آپ مکہ چھوڑ چکے ہیں۔ چنانچہ آپ کو ڈھونڈنے کے لئے اِدھر اُدھر آدمی دوڑائے گئے، کھوجیوں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ آخر ایک کھوجی نے بتایا کہ میں نے جبل ثور پر دو آدمیوں کے نشانات تلاش کر لئے ہیں۔ اس کی رہنمائی میں سب پہاڑ پر چڑھنے لگے اور آخر اس غار تک پہنچ گئے جس میں جانِ دو عالم ﷺ مستور تھے۔ وہاں پہنچ کر کھوجی الجھ گیا اور حیرت سے کہنے لگا---''یہاں تک تو قدموں کے نشانات ملتے ہیں، اس کے بعد نہ جانے وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔''

اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا

یہی وہ لمحہ تھا جب صدیق اکبرؓ کا دل ہول رہا تھا اور غم سے ڈوبا جا رہا تھا۔
''یا رسول اللہ! وہ لوگ تو دہانے تک آپہنچے ہیں۔ اگر کسی نے جھک کر اندر جھانک لیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔''
جانِ دو عالم ﷺ نے صدیق اکبرؓ کی افسردہ وملول صورت دیکھی اور پوچھا
''ڈر گئے ہو؟''
''یا رسول اللہ! مجھے اپنی جان کا کوئی غم نہیں۔'' صدیق اکبرؓ نے کہا ''میں تو ایک عام آدمی ہوں، مارا بھی گیا تو کیا، مجھے تو آپ کا غم ہے اور آپ کے لئے پریشان ہوں۔''
جانِ دو عالم ﷺ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ''لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا'' (غم نہ کرو! اللہ ہمارے ساتھ ہے۔)
واقعی جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، خون کے پیاسے دشمن دہانے پر کھڑے حیران ہو رہے ہیں کہ وہ دونوں گئے کدھر! مگر کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ غار میں جھانک کر دیکھ لے۔ ایک نے کہا بھی کہ اندر جا کر دیکھ لینا چاہیے، مگر دوسرے نے کہا کہ غار کے اندر گھسنے کا فائدہ---؟ کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ دہانے پر جالا تنا ہوا ہے اور صحیح سالم ہے۔

غار ثور

کبوتر بھی نہایت اطمینان سے انڈوں پر بیٹھے ہیں، اگر وہ لوگ غار میں داخل ہوئے ہوتے تو جالا ٹوٹ نہ جاتا اور کبوتر اڑ نہ جاتے؟''

اس معقول دلیل کو سب نے تسلیم کر لیا اور غار میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس چلے گئے۔ ابوجہل بہت کائیاں شخص تھا، جاتے وقت نہایت شکستہ لہجے میں گویا ہوا۔

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ محمد آس پاس ہی کہیں موجود ہے، مگر اس کے جادو نے اسے ہماری نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے۔'' (۱)

عزمِ سفر

تین روز تک جانِ دو عالم ﷺ اسی غار میں مقیم رہے۔ اس عرصے میں صدیق اکبرؓ کے ایک صاحبزادے دن بھر مشرکین کی کاروائیوں پر نگاہ رکھتے اور رات کو جا کر رپورٹ پیش کر آتے۔ صدیق اکبرؓ کا ایک غلام اسی پہاڑ پر بکریاں چراتا رہتا اور شام کے وقت دودھ دوہ کر انہیں دے آتا۔ حضرت اسماءؓ رات کی تاریکی میں کھانا بھی پہنچا آتیں؛ غرضیکہ تین دن اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران جانِ دو عالم ﷺ کی تلاش کا معاملہ بھی سرد پڑ گیا، اس لئے تیسرے دن عبداللہ ابن اریقط وہ اونٹنیاں لے کر پہنچ گیا جو حضرت صدیقؓ نے مکہ سے روانگی کے وقت اس کے سپرد کی تھیں۔ چونکہ عبداللہ صحرائی راستوں کا ماہر تھا، اس لئے اس کو بھی ہمسفر بنا لیا گیا، علاوہ ازیں صدیق اکبرؓ نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام عامر ابن فہیرہؓ (۲) کو بھی خدمت وغیرہ کے لئے ساتھ لے لیا اور یوں چوتھے روز چار آدمیوں کا یہ قافلہ عازم یثرب ہو گیا۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۱۸۱، ۱۸۲۔

(۲) حضرت عامرؓ پہلے طفیل کے غلام تھے اسلام لائے تو ان پر تشدد کی انتہاء کر دی گئی مگر ان کی ثابت قدمی میں فرق نہ آیا۔ صدیق اکبرؓ نے ان کی حالت زار دیکھی تو خرید کر آزاد کر دیا۔ ہجرت مدینہ میں جانِ دو عالم ﷺ کی ہمسفری ان کا نمایاں شرف ہے۔ غزوہ بیئر معونہ میں شہادت پائی اور اتنے بڑے اعزاز سے سرفراز ہوئے کہ شہادت کے بعد ان کا جسم آسمان پر اٹھا لیا گیا، چنانچہ دشمنوں کے سردار ☜

انعام کا اعلان اور سراقہ

جانِ دو عالم ﷺ کی تلاش میں ناکامی کے بعد مشرکین نے اعلان کر دیا کہ جو شخص محمد یا ابوبکر کو قتل کرے گا یا گرفتار کر کے لائے گا، اس کو سو اونٹ بطور انعام دیئے جائیں گے۔

قبیلہ بنی مدلج کے ایک شخص سراقہ ابن مالک نے اتنے گراں بہا انعام کا اعلان سنا تو اس نے آپ کو ڈھونڈھنے کی ٹھانی۔ اسی وقت ایک آدمی نے اطلاع دی کہ میں نے چند آدمیوں کو ساحل کی طرف جاتے دیکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ محمد اور اس کے ساتھی ہوں۔

سراقہ کو یقین ہو گیا کہ وہی ہمارے مطلوبہ افراد ہیں، لیکن اس بات کا اگر باقی لوگوں کو بھی علم ہو جاتا تو سراقہ انعام حاصل نہ کر سکتا، اس لئے اس نے پرزور تردید کی اور کہا

''نہیں! وہ محمد اور اس کے رفقا نہیں ہو سکتے، فلاں اور فلاں ہوں گے، جو ہمارے روبرو اس طرف روانہ ہوئے تھے۔''

اس کے بعد سراقہ خفیہ طور پر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس شخص کی بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہو گیا۔ سراقہ کی یہ کوشش بارآور ہوئی اور وہ جانِ دو عالم ﷺ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آپ اپنے رب سے لو لگائے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر تلاوت کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ صدیق اکبرؓ نے مڑ کر دیکھا تو سراقہ کو اپنے پیچھے آتا ہوا پایا۔ عرض کی۔

''یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اُتِیْنَا'' (یا رسول اللہ! دشمن پہنچ آئے ہیں۔)

جانِ دو عالم ﷺ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''کَلَّا'' (ہرگز نہیں)

نے جب بیرِ معونہ کے دیگر شرکاء سے پوچھا۔

''تمہارے ایک ساتھی کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ قتل کے بعد اس کا جسم اوپر اٹھا لیا گیا --- وہ کون تھا؟''

سب نے کہا --- ''عامر ابن فہیرہ۔''

عامر کا قاتل جبار اسلمی تھا، مگر قتل کے بعد مقتول کی یہ کرامت دیکھ کر اسی وقت مسلمان ہو گیا۔

(ماخوذ از اصابہ و طبقات ابن سعد، ذکر عامر۔)

اس کے بعد جانِ دو عالم ﷺ نے دعا فرمائی۔ ''اَللّٰھُمَّ اکْفِنَا بِمَا شِئْتَ.''

(الٰہی! ہماری حفاظت فرما، جس طرح بھی تو چاہے۔)

اس دعا کے ساتھ ہی چشم فلک نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ سراقہ کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا۔ حفاظتِ الٰہیہ کے اس انوکھے انداز سے سراقہ دہشت زدہ ہو گیا، آدمی سمجھدار تھا، فوراً سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان لوگوں کے شاملِ حال ہے اور ان کا مقابلہ ناممکن ہے، اس لئے التماس کی۔

''یا محمد! آپ کی بددعا سے میرا گھوڑا زمین میں دھنس گیا ہے۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مصیبت سے نجات دے، میں صدق دل سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے بارے میں نہ کسی اور کو مطلع کروں گا، نہ خود کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کروں گا۔''

رحمتِ عالم کو اس کی حالتِ زار پر ترس آ گیا، دعا فرمائی اور گھوڑا باہر نکل آیا۔

اس عفو و درگزر نے سراقہ کے دل پر گہرا اثر کیا اور اس نے پیش کش کی کہ آپ کے راستے میں ایک جگہ میرے اونٹوں اور بکریوں کے ریوڑ ہیں، آپ میرا یہ تیر بطور نشانی لے لیجئے اور میرے غلام کو دکھا کر جتنے اونٹ اور بکریاں دل چاہے لے لیجئے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا--- ''ہمیں تمہارے اونٹوں بکریوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بس تم اتنا کرنا کہ ہمارے بارے میں کسی کو مطلع نہ کرنا۔''

سراقہ بہت دور رس نگاہ والا شخص تھا--- جانِ دو عالم ﷺ کا عفو و کرم اور بے مثال سیر چشمی دیکھ کر اس کو یقین ہو گیا کہ یہ عظیم انسان ایک نہ ایک دن پورے عرب کا حاکم بن جائے گا--- اس وقت نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے---! یہ سوچ کر حفظ ماتقدم کے طور پر عرض کی کہ مجھے ایک امان نامہ لکھ دیا جائے۔ آپ نے اس کی یہ تمنا بھی پوری فرما دی اور عامر سے کہا کہ اس کو امان لکھ دو۔

سراقہ نے امان نامہ سنبھالا اور واپس ہونے لگا تو جانِ دو عالم ﷺ نے اس کو مستقبل کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

''سراقہ! کیسا حیران کن دن ہوگا وہ--- جب شاہ ایران کے سونے کے کنگن

تیرے ہاتھوں میں پہنائے جائیں گے۔''

سراقہ اس بات پر حیران تو بہت ہوا کہ کہاں شاہ ایران کے کنگن اور کہاں ایک اعرابی سراقہ کے ہاتھ! مگر خاموش رہا اور واپس چلا گیا۔

چند دن بعد جب سراقہ کو یقین ہوگیا کہ اب جانِ دو عالم ﷺ اہل مکہ کی رسائی سے باہر جا چکے ہوں گے تو اس نے اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ خود لوگوں کو سنانا شروع کر دیا۔ ابوجہل کو پتہ چلا تو غصے میں بھرا ہوا سراقہ کے پاس آیا اور آپ کی گرفتاری میں ناکام ہونے پر اس کو ملامت کرنے لگا۔ سراقہ نے اس کے جواب میں چند شعر کہے اور کیا خوب کہے!

اَبَاحِکَمٍ! وَالّاَتِ لَوْکُنْتَ شَاهِدًا   لِاَمْرِ جَوَادِیْ اِذْ تَسِیْخُ قَوَائِمُه‘

عَجِبْتَ وَلَمْ تَشْکُکْ بِاَنَّ مُحَمَّدًا   نَبِیٌّ وَ بُرْهَانٌ فَمَنْ ذَایُقَاوِمُه‘؟

عَلَیْکَ بِکَفِّ الْقَوْمِ عَنْهُ فَاِنَّنِیْ   اَرٰی اَمْرَه‘ یَوْمًا سَتَبْدُوْ مَعَالِمُه‘

(ابوالحکم! قسم ہے لات کی، اگر تم اس وقت موجود ہوتے اور میرے گھوڑے کی حالت دیکھتے جب اس کے پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے تو تم حیران رہ جاتے اور تمہیں اس بات میں کوئی شک نہ رہتا کہ محمد نبی ہیں اور اللہ کی برہان --- پھر ان کے ساتھ کون مقابلہ کرسکتا ہے؟

تمہیں چاہئے کہ اپنی قوم کو ان کے تعاقب اور گرفتاری وغیرہ سے منع کرو، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ عنقریب ان کے بلند نشانات ظاہر ہوکر رہیں گے۔) (۱)

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۱۸۵، الوفاء باحوال المصطفیٰ ج ۱، ص ۲۴۱.

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کی صداقت اسی وقت سراقہ کے دل میں گھر کر چکی تھی، مگر باقاعدہ طور پر اسلام کی سعادت ۸ ھ کو حاصل ہوئی۔ جب آپ فتح مکہ کے بعد غزوہ حنین سے بھی فارغ ہو چکے تھے۔ چونکہ جانِ دو عالم ﷺ ابھی ابھی جنگ سے فارغ ہوئے تھے اور مخالفین کی سرزمین پر مقیم تھے، اس لئے صحابہ کرامؓ آپ کے تحفظ کی خاطر ہر کس و ناکس کو آپ سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ جب سراقہ نے آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو صحابہ نے اجازت نہ دی۔ ☜

کاروانِ نبوی کے پاس اس سفر میں زادِ راہ تو کچھ تھا نہیں، اس لئے جہاں کہیں بکریاں نظر آتیں وہاں چلے جاتے اور مالک کی اجازت سے دودھ دوہ کر پی لیتے۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ بیان فرماتے ہیں کہ سفر کے دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ کی تمازت بہت بڑھ گئی تو میں نے چاہا کہ کہیں سایہ مل جائے، تا کہ رسول اللہ ﷺ تھوڑی دیر آرام فرما لیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک سایہ دار چٹان نظر آ گئی۔ میں نے وہاں جا کر زمین جھاڑی اور اپنی چادر بچھا کر رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ استراحت فرمایئے۔ آپ لیٹ گئے تو میں کھانے کے لئے کسی چیز کی تلاش میں نکلا۔ قریب ہی ایک چرواہا مل گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ ایک

اچانک سراقہ کی نظر آپ پر پڑی جو اونٹنی پر سوار تھے۔ سراقہ نے جیب سے وہی امان نامہ نکالا جو ہجرت کے دوران لکھوایا تھا اور اس کو ہاتھ میں لہراتے ہوئے با آواز بلند عرض کی

''یا رسول اللہ! میں سراقہ ابن مالک ہوں، یہ دیکھئے! میرے ہاتھ میں آپ کا عطا کردہ امان نامہ موجود ہے۔''

جانِ دوعالم ﷺ کے کمع ہمایوں میں یہ آواز پڑی تو ادھر متوجہ ہوئے اور فرمایا۔

''ہاں! آج اس وعدے کو پورا کرنے کا دن ہے، میرے قریب چلے آؤ۔''

اب سراقہ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی، اس لئے بے تابانہ آگے بڑھے اور توحید ورسالت کا اقرار کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ (ابن ھشام ج ۲، ص ۶)

پھر دورِ فاروقی میں جب ایران فتح ہوا اور بے حساب مالِ غنیمت دربارِ خلافت میں پہنچا تو اس میں کسریٰ کے سونے کے کنگن بھی تھے۔ فاروق اعظمؓ نے اپنے آقا کی پیشینگوئی کی صداقت عالم آشکارا کرنے کیلئے اسی وقت حضرت سراقہؓ کو بلایا اور وہ کنگن ان کے ہاتھوں میں پہنا کر فرمایا۔۔۔''ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو دکھاؤ اور کہو ''سب تعریفیں اس اللہ کے لئے مختص ہیں جس نے یہ کنگن کسریٰ سے چھین کر ایک معمولی اعرابی کے ہاتھوں میں پہنا دیئے۔''

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے وہ کنگن توڑ دیئے اور ان کا سونا مسلمانوں میں تقسیم فرما دیا۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡهُمۡ اَجۡمَعِیۡن

(سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۴۸)

بکری کے تھن اچھی طرح صاف کرو۔ پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ نکلوا کر برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا، تاکہ گرد و غبار سے محفوظ رہے، پھر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ٹھنڈا پانی ملا کر پیش کیا۔ آپ نے نوش فرما کر پوچھا---''چلنے کا وقت نہیں ہوا؟''

چونکہ اس وقت سورج ڈھل چکا تھا اور گرمی کم ہوگئی تھی، اس لئے ہم آگے روانہ ہوگئے۔

اُمِ معبد کے پاس

ایک دن اس کاروان کا گزر اُمِ معبد پر ہوا۔ وہ ایک مستعد اور مہمان نواز خاتون تھی مگر اتفاق سے اس وقت اس کے گھر میں کچھ نہ تھا اس لئے جب ان لوگوں نے اس سے پوچھا کہ کھانے کو کچھ مل سکے گا؟ تو اس نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ گھر میں کچھ نہیں ہے۔ بکریاں چرنے کے لئے باہر گئی ہوئی ہیں۔

اچانک جانِ دو عالم ﷺ کی نظر کونے میں کھڑی ایک مریل سی بکری پر پڑی جو لاغری کی وجہ سے ریوڑ کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔ آپ نے ام معبد سے پوچھا

''کیا یہ بکری دودھ نہیں دیتی؟''

''اس میں اتنی صلاحیت ہی کہاں ہے!'' ام معبد نے کہا۔

''اگر اجازت ہو تو میں اسی سے دودھ نکال لوں۔'' جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا

''اگر نکال سکتے ہیں تو ضرور نکالئے!'' ام معبد تحیر آمیز فراخ دلی سے بولی۔

چنانچہ آپ دودھ دوہنے بیٹھ گئے اور اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ آپ کے مبارک ہاتھوں کے بابرکت لمس کا اعجاز دیکھئے کہ اسی وقت بکری کے خشک تھن دودھ سے بھر گئے۔ آپ نے برتن مانگا اور دودھ سے بھر کر ام معبد کو دیا کہ پی لے۔ وہ پی چکی تو آپ نے دوبارہ دودھ نکالا اور اپنے ایک ساتھی کو دیا۔ اسی طرح آپ دودھ نکالتے گئے اور سب کو پلاتے گئے۔ سب سیر ہوگئے تو آخر میں آپ نے خود پیا اور فرمایا سَاقِی الْقَوْمِ اٰخِرُھُمْ. (ساقی کی باری آخر میں آیا کرتی ہے۔)

اس کے بعد آپ نے مزید دودھ نکالا اور ام معبد سے کہا---''یہ اپنے خاوند کے لئے رکھ لے، بکریاں چرا کر واپس آئے گا تو پیئے گا۔''

اس کے بعد ام معبد کے یہ عجیب و غریب مہمان --- جو بطور مسافر وارد ہوئے تھے، مگر گھر کے ہر فرد کو سیراب کر کے جا رہے تھے --- رخصت ہو گئے۔

ام معبد کا خاوند ابو معبد واپس آیا تو دیکھا کہ دودھ سے برتن بھرے پڑے ہیں، بہت حیران ہوا۔ پوچھا --- ''ام معبد! یہ اتنا دودھ کہاں سے آ گیا --- ؟ گھر میں تو دودھ دینے والی کوئی بکری ہی نہ تھی!''

ام معبد نے پورا واقعہ تفصیل سے بتایا تو ابو معبد سمجھ گیا کہ اتنی برکات اسی ہستی کے دم قدم سے ہو سکتی ہیں جس کی تلاش میں کفار مارے مارے پھر رہے ہیں، کہنے لگا۔

''ام معبد! مجھے تو یہ وہی ہستی معلوم ہوتی ہے جس کو قریش ڈھونڈھ رہے ہیں۔ ذرا اس کا حلیہ تو بتانا!''

ام معبد نے جو حلیہ بتایا وہ بدوی فصاحت کا شاہکار ہے۔ ہم صرف اس کا، رواں ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ ذوقِ عربیت سے آشنا حضرات اصل کتابوں کی طرف رجوع کریں اور اس شہ پارے سے حظ اٹھائیں۔ ام معبد نے کہا۔

''میں نے ایک تاباں درخشاں انسان کو دیکھا --- دلکش چہرہ، عمدہ اخلاق --- نہ پیٹ بڑھا ہوا، نہ سر چھوٹا۔ نہایت ہی حسین و جمیل۔ آنکھوں کی سیاہی اور سفیدی دونوں نمایاں۔ دراز پلکیں، مترنم آواز، سرگیں آنکھیں، لمبی گردن، بھرپور داڑھی، گھنے اور باہم پیوستہ ابرو، باوقار خاموشی، بلند پایہ اور بہترین گفتگو --- کلام میں روانی کا یہ عالم کہ جیسے ہار کے موتی ایک تسلسل سے گر رہے ہوں، شیریں بیاں --- ایک ایک لفظ واضح اور ضرورت کے مطابق۔ نہ کم، نہ زیادہ۔ دور سے بھی خوبصورت نظر آنے والا اور قریب سے بھی حسین دکھائی دینے والا۔ درمیانہ قد --- نہ بہت لمبا کہ معیوب معلوم ہو، نہ بہت چھوٹا کہ نامناسب نظر آئے۔ اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ بارونق و شاداب --- جیسے دو شاخوں کے درمیان سے نکلتی ہوئی شاخ۔ اس کے ساتھی اس کو ہر وقت گھیرے رہتے اور اس کے گرد طواف کرتے رہتے، اس کی بات کان لگا کر سنتے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ نہ تیوریوں پر بل، نہ کسی کو ملامت کرنے کی عادت۔''

ابو معبد اس سے پہلے کہیں جانِ دو عالم ﷺ کا دیدار کر چکا تھا، اس لئے یہ مفصل حلیہ مبارک سن کر بولا ---"واللہ! یہ وہی انسان ہیں جنکی ہر طرف تلاش ہو رہی ہے، میں بھی ان کی صحبت اختیار کرنا چاہتا ہوں اور مجھے جب بھی موقع ملا، حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔"

صدائے غیب

ام معبد کے ہاں جو کچھ پیش آیا وہ ایسا ایمان افروز تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو بھی اس سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا اور ایک غیبی آواز نے اشعار میں پورا واقعہ بیان کر دیا۔ مطلع یہ ہے۔

جَزَی اللّٰہُ رَبُّ النَّاسِ خَیْرَ جَزَائِہٖ رَفِیْقَیْنِ حَلَّا خَیْمَتَیْ اُمِّ مَعْبَدٖ

(اللہ تعالیٰ، جو تمام لوگوں کا رب ہے، بہترین جزا دے ان دو ساتھیوں کو جو اُمِ معبد کے خیموں میں اترے۔)

باقی اشعار میں سارا واقعہ پوری صراحت سے مذکور ہے۔ غیبی آواز نے یہ اشعار پڑھ کر جانِ دو عالم ﷺ کی عظمت و صداقت کا ڈنکا گلی گلی بجا دیا۔ (۱)

ایک اور واقعہ

اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا کہ کوکبۂ نبوی اس کے پاس سے گزرا۔ پوچھا---"دودھ پلا سکتے ہو؟"

اس نے جواب دیا---"میرے پاس دودھ دینے والی بکری کوئی نہیں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ایک بکری دودھ دیا کرتی تھی، مگر اب وہ بھی خشک ہو چکی ہے۔"

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---"اسے ہی لے آؤ!"

چرواہا اسے پکڑ لایا تو جانِ دو عالم ﷺ نے اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیرا اور دعا فرمائی۔ وہ برکت جو ام معبد کے خیمہ میں ظاہر ہوئی تھی، یہاں بھی ظاہر ہوگئی اور بکری کے خشک تھن دودھ سے بھر گئے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے چرواہے کو بھی پلایا، اپنے ساتھیوں کو بھی پلایا اور خود بھی نوش فرمایا۔ یہ معجزہ دیکھ کر چرواہا بہت حیران ہوا اور پوچھنے لگا کہ سچ بتائیے!

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۹۳، الوفاء باحوال المصطفیٰ ج ۱، ص ۲۴۲، ۲۴۴۔

آپ کون ہیں---؟ میں نے آپ جیسا انسان آج تک نہیں دیکھا۔

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''میرے بارے میں کسی کو مطلع نہ کرنے کا وعدہ کرو، تب بتاؤں گا۔''

چرواہے نے وعدہ کر لیا تو آپ نے فرمایا---''میں محمد ہوں، اللہ کا رسول۔''

''اچھا! آپ وہی ہیں۔ جن کو قریش ''صابی'' (دین سے منحرف) کہتے ہیں۔''

''ہاں! وہ یہی کہتے ہیں۔''

''لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں کیونکہ ابھی ابھی آپ نے جو معجزہ دکھایا ہے، وہ کوئی نبی ہی دکھا سکتا ہے۔''

چرواہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے ساتھ جانے پر تیار تھا، مگر آپ نے فرمایا کہ فی الحال تم ہمارا ساتھ نہ دے سکو گے۔ ہاں! جب ہمیں غلبہ حاصل ہو گیا تو ہمارے پاس چلے آنا۔(۱)

عَلَم

اب منزل قریب آ چکی تھی۔ اگلے دن آپ نے اس شہر میں داخل ہونا تھا جس کے باسی دیدہ و دل فرشِ راہ کئے بیٹھے تھے مگر اچانک بریدہ اسلمی اسی [۸۰] آدمیوں کی معیت میں آپ کو روکنے آ پہنچا۔ وہ بھی سراقہ کی طرح سو اونٹوں کے لالچ میں آپ کو گرفتار کرنے آیا تھا، مگر اللہ جانے کیا ہوا کہ جانِ دو عالم ﷺ سے ملاقات کے بعد اس کی کایا ہی پلٹ گئی، حالانکہ آپ نے اس کو نہ کوئی وعظ و نصیحت کی، نہ کوئی معجزہ دکھایا، صرف چند سوالات کئے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''بریدہ۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے ''بریدہ'' سے برودت اور ٹھنڈک کا شگون لیا اور فرمایا۔

''بَرَدَ اَمْرُنَا'' (ہمارا معاملہ ٹھنڈک اور خنکی پر منتج ہوا۔)

پھر پوچھا---''کس قبیلے سے ہو؟''

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۱۹۳۔

''اسلم سے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے ''اسلم'' سے سلامتی کا مفہوم اخذ کیا اور فرمایا ''سَلِمْنَا'' (ہمارے لئے سلامتی ہے۔)

پھر پوچھا---''کون سا اسلم؟''

''جو بنی سہم کی ایک شاخ ہے۔'' بریدہ نے بتایا۔

''سَھْم'' حصے کو کہتے ہیں۔ جانِ دو عالم ﷺ صدیق اکبر سے مخاطب ہوئے اور مزاحاً فرمایا ''خَرَجَ سَھْمُکَ'' (تیرا حصہ تو نکل آیا۔)

بس اتنی ہی بات چیت ہوئی تھی کہ بریدہ نے پوچھا---''آپ کون ہیں؟''

''میں محمد ابن عبداللہ ہوں، اللہ کا رسول۔''

بریدہ نے کہا ''اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.''

بریدہؓ اسلام لائے تو ان کے سارے ساتھی بھی مسلمان ہوگئے اور عشاء کی نماز سب نے مل کر جانِ دو عالم ﷺ کی اقتداء میں پڑھی۔ صبح کے وقت جب آپ وہاں سے روانہ ہونے لگے تو حضرت بریدہؓ نے کہا---''یا رسول اللہ! آج آپ یثرب میں داخل ہونے والے ہیں اور میرا دل چاہتا ہے کہ آپ اس شان سے داخل ہوں کہ آگے آگے آپ کا جھنڈا لہرا رہا ہو۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی تو حضرت بریدہؓ سمجھ گئے کہ آپ اس پر راضی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا عمامہ کھولا اور اس کو ایک لمبے نیزے کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر اس کو لہراتے ہوئے آپ کے آگے آگے چل پڑے اور حدودِ یثرب تک آپ کو پہنچا کر واپس چلے گئے۔ (۱)

انتظار

اہل یثرب کئی دنوں سے جانِ دو عالم ﷺ کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ فارسی کا ایک شعر ہے۔

---

(۱) الوفاء باحوال المصطفیٰ ج ۱، ص ۲۴۷، السیرۃ الحلبیہ ج ۲، ص ۵۵

علی الصباح چو مردم بکاروبار روند
بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند

(صبح صبح، جب لوگ اپنے اپنے کاروبار کے لئے روانہ ہو رہے ہوتے ہیں، اس وقت محبت کے مارے کوئے محبوب کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔)

یثرب اور اس کی نواحی بستی قبا کے وارفتگانِ عشق کا یہی حال تھا، صبحدم گھروں سے نکل جاتے اور دوپہر تک مکہ مکرمہ کی طرف سے آنے والے راستے پر سراپا انتظار و اشتیاق بنے رہتے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا، جانِ دو عالم ﷺ کی آمد کی امیدیں ماند پڑتی جاتیں کیونکہ ان دنوں ستمبر کا مہینہ تھا اور شدید گرمی تھی۔ ایسے موسم میں دن کو سفر کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اس لئے عموماً لوگ رات کی خنکی میں سفر کیا کرتے تھے اور اگر دوپہر سے پہلے پہلے منزل مقصود تک نہ پہنچ جاتے تو کہیں پڑاؤ کر لیا کرتے تھے اور پھر شام کو روانہ ہوتے تھے۔

جب دوپہر ہو جاتی اور جانِ دو عالم ﷺ کا تاحد نظر کوئی نشان نظر نہ آتا تو امید، مایوسی سے بدل جاتی اور انتظار کرنے والے دل شکستہ و افسردہ گھروں کو لوٹ جاتے۔

ایک دن اہل قبا اسی طرح مایوس ہو کر واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی اپنے بلند و بالا قلعہ پر چڑھا۔ ناگاہ اس کی نظر مکہ کے راستے پر پڑی تو اس کو دور سے چند آدمی آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا کئی دنوں سے انتظار ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے بآواز بلند اہل قبا کو پکارا اور اطلاع دی کہ تمہاری مطلوبہ ہستی چلی آ رہی ہے۔ اس کی آواز سنتے ہی پژمردہ دلوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور چند لمحوں میں تقریباً پانچ سو اہل محبت اپنے جسموں پر ہتھیار سجا کر تیار ہو گئے اور جانِ دو عالم ﷺ کے استقبال کے لئے دوڑ پڑے۔

ملاقات و تسلیمات

اتفاق سے استقبال کے لئے جانے والوں میں کوئی بھی جانِ دو عالم ﷺ کو پہچانتا نہیں تھا، اس لئے جب یہ لوگ وہاں پہنچے جہاں جانِ دو عالم ﷺ اور صدیق اکبرؓ کھجور کے ایک درخت تلے بیٹھے ہوئے تھے تو سوچ میں پڑ گئے کہ ان میں رسول اللہ کون سے ہیں؟ اسی وقت جانِ دو عالم ﷺ پر دھوپ آ گئی تو صدیق اکبرؓ اٹھے اور آپ پر چادر تان کر کھڑے

ہوگئے۔ یہ دیکھ کر سب سمجھ گئے کہ رسول اللہ وہی ہیں، جن پر چادر تانی گئی ہے۔ چنانچہ بے تابانہ آگے بڑھے اور والہانہ انداز میں سلام پیش کرنے لگے۔ تمام افراد آداب وتسلیمات پیش کر چکے تو آپ ان کے ساتھ چل پڑے اور قبا میں کلثوم ابن ہدمؓ (۱) کے مکان پر فروکش ہوگئے۔ (۲)

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی

قبا میں قیام کے دوران جانِ دو عالم ﷺ نے اس مبارک مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا، جس کو قرآن کریم نے لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ. (ایسی مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوٰی پر رکھی گئی) قرار دیا۔

اس کی تعمیر کے لئے جب صحابہ کرام پتھر ڈھو رہے تھے تو جانِ دو عالم ﷺ بھی بنفس نفیس ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے اور بڑے بڑے پتھر اٹھا کر لا رہے تھے۔ کبھی اتنا بھاری پتھر اٹھا لیتے کہ جسم اقدس خم ہو جاتا، یہ دیکھ کر کوئی صحابی دوڑ کر آتے اور عرض کرتے۔

"یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھے دے دیجئے، میں اٹھا لیتا ہوں۔"

آپ اس محبت بھری پیش کش سے بہت خوبصورت انداز میں پہلو بچا جاتے اور کسی دوسرے پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے --- "تم اس کو اٹھا لو۔" (۳)

پتھر ڈھونے والوں میں مشہور شاعر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ (۴) بھی شامل تھے۔

---

(۱) حضرت کلثومؓ بہت مہمان نواز انسان تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ سے پہلے جو صحابہ کرام ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے، ان میں سے متعدد حضرات کلثوم ابن ہدمؓ ہی کے مہمان تھے۔ آپ کی تشریف آوری سے چند دن بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ

(۲) سیرت ابن ھشام ج ۲، ص ۱۰ زرقانی ج ۱، ص ۴۲۲.

(۳) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۶۰.

(۴) حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو اللہ تعالٰی نے فصاحت اور شجاعت دونوں بھرپور انداز میں عطا فرمائی تھیں۔ بزم اشعار ہو کہ معرکۂ کارزار، حضرت عبداللہؓ ہر جگہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ کلام ☜

مسجد قُبا
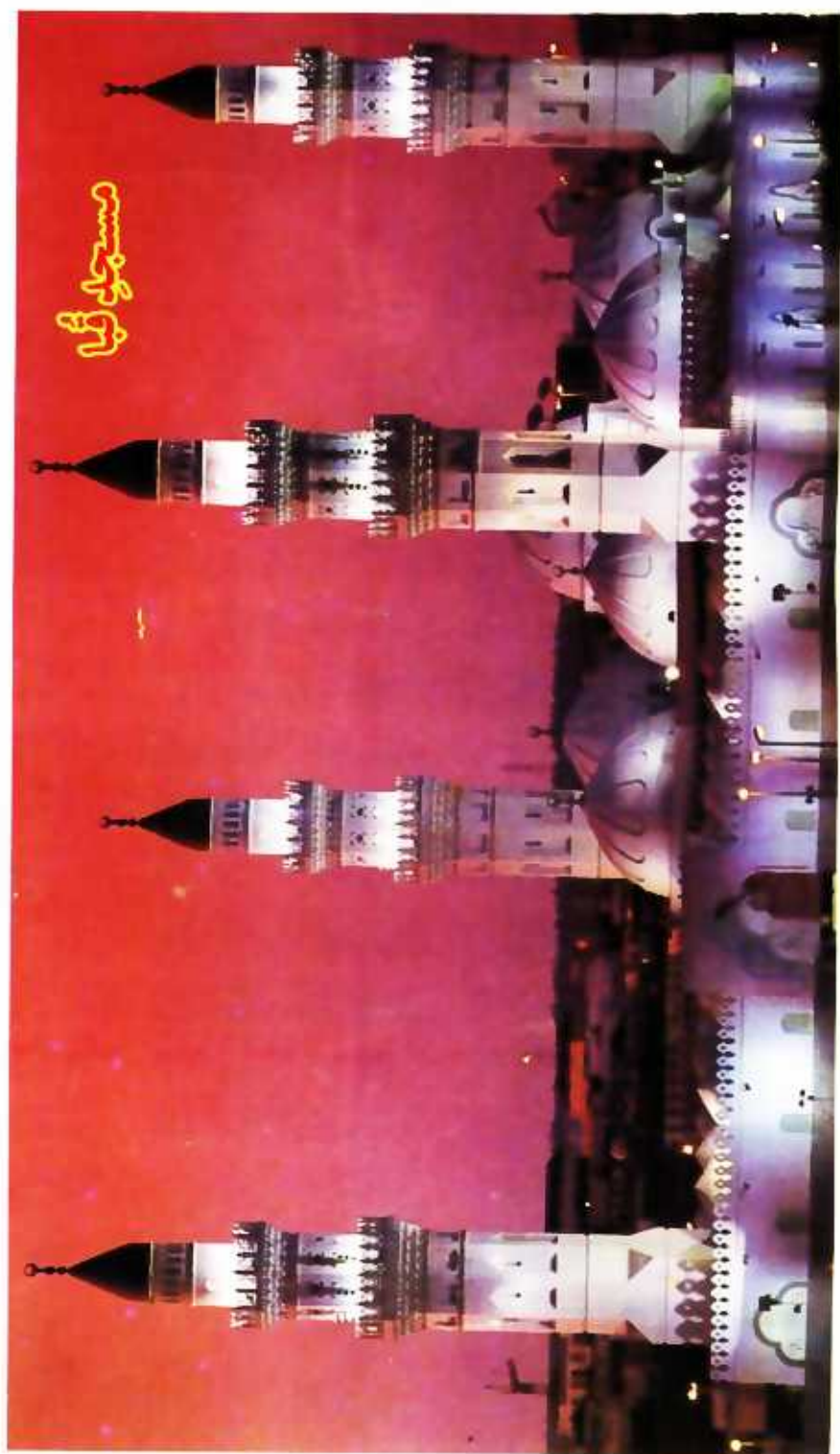
وہ بآوازِ بلند یہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ یَّعْمُرُ الْمَسَاجِدَا
وَیَقْرَأُ الْقُرْآنَ قَائِمًا وَّقَاعِدًا
وَلَا یَبِیْتُ اللَّیْلَ عَنْهُ رَاقِدًا

(یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جو مسجدیں تعمیر کرتا ہو، اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہو اور

پر ان کی قدرت کا یہ عالم تھا کہ ان کو شعر کہنے کے لیے کسی قسم کے سوچ و بچار کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ جب چاہتے فی البدیہہ پوری نظم کہہ دیتے۔ جانِ دو عالم ﷺ کو ان کی اس صلاحیت پر بہت تعجب ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ان سے فرمایا --- "تم ابھی میرے سامنے اور میرے دیکھتے دیکھتے شعر بنا کر سناؤ۔"

افصح العرب کے روبرو فی البدیہہ ایسے اشعار کہنا جو آپ کو پسند آجائیں، کوئی آسان کام نہ تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہؓ کو یہ ملکہ بدرجہ اتم عطا فرما رکھا تھا۔ انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کے روئے زیبا پر نظر ڈالی اور نہایت عمدہ و بلند پایہ نعت کہہ ڈالی۔ جب مقطع میں یہ مصرع کہا

فَثَبَّتَ اللّٰهُ مَا اٰتَاکَ مِنْ حَسَنٍ

(اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو اچھائیاں عطا کر رکھی ہیں، ان کو ہمیشہ ثابت رکھے۔)

تو جانِ دو عالم ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا --- وَاَنْتَ فَثَبَّتَکَ اللّٰهُ یَا ابْنَ رَوَاحَةَ ! (ابن رواحہ! اللہ تجھے بھی ہمیشہ ثابت رکھے۔)

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی --- وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔) تو حضرت عبداللہؓ نے فرمایا "قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ اَنِّیْ مِنْهُمْ" (اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں بھی انہی میں سے ہوں۔) اللہ تعالیٰ کو گوارا نہ ہوا کہ عبداللہ اپنے آپ کو ایسے شعراء میں شامل سمجھیں۔ چنانچہ اس نے یہ آیت نازل فرما دی۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ. الآیۃ. (یعنی جو شعراء صاحب ایمان ہوں اور نیک عمل کرنے والے ہوں، وہ ان شاعروں میں شامل نہیں ہیں جن کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔)

اور حضرت عبداللہؓ تو ایسے نیک عمل انسان ہوئے ہیں کہ ان کے صوم و صلوٰۃ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے گھر کو نماز کے ساتھ آباد کر رکھا تھا۔ جب بھی گھر سے نکلنے کا ارادہ کرتے پہلے

رات کو سویا نہ رہتا ہو۔)

جانِ دو عالم ﷺ اور دیگر صحابہ کرام بھی حضرت عبداللہؓ کی لَے میں لَے ملا کر اس گیت کو دہرا رہے تھے اور ان کی مترنم آوازوں اور خوش آہنگ صداؤں سے قبا کی فضا گونج رہی

دو رکعت نماز پڑھتے۔ واپسی پر بھی سب سے پہلے دو رکعت ادا کرتے، پھر کسی اور طرف متوجہ ہوتے۔

روزہ دار وہ ایسے تھے کہ صحابہ کرام فرماتے ہیں---''کبھی ہم شدید گرمی میں سفر کر رہے ہوتے تھے اور ہم میں سے کسی کا بھی روزہ نہیں ہوتا تھا؛ البتہ دو ہستیاں ایسی تھیں جو اس وقت بھی روزہ دار ہوتی تھیں---ایک رسول اللہ ﷺ دوسرے عبداللہ بن رواحہ۔''

فصاحت و بلاغت اور عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ شجاعت و بسالت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ شوقِ شہادت کا یہ عالم تھا کہ جب ۸ ھ میں سریہ موتہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو ان کو الوداع کرنے والوں نے وقتِ وداع کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس مہم سے بخیریت واپس لائے۔

حضرت عبداللہؓ کو---جو شوقِ شہادت سے بے تاب ہو رہے تھے---یہ دعا پسند نہ آئی اور انہوں نے چند شعر کہے، جن کا مفہوم یہ ہے کہ میں واپس نہیں آنا چاہتا۔ میں تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا طلب گار ہوں اور چاہتا ہوں کہ مجھے تلوار کا ایسا گہرا زخم لگے کہ اس سے جھاگ اڑاتا ہوا خون ابلنے لگے۔ یا نیزے کا ایسا وار ہو کہ میرے سینے میں لگے اور کلیجے سے آر پار ہو اور جب لوگ میری قبر سے گزریں تو بے اختیار کہہ اٹھیں---''واہ! کیا عمدہ اور ہدایت یافتہ غازی تھا، عبداللہ بن رواحہ۔''

پھر انہوں نے میدان کارزار میں قدم رکھا تو اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اے نفس! تجھے اس جنگ میں ضرور شریک ہونا پڑے گا، تیرا جی چاہے کہ نہ چاہے۔''

لڑائی کے دوران ان کے چچازاد بھائی نے ان کو گوشت کا ایک ٹکڑا دیا اور کہا---''یہ کھا لیجئے! تا کہ بدن میں کچھ طاقت آ جائے، آپ نے بڑی دیر سے کچھ نہیں کھایا۔''

حضرت عبداللہؓ نے وہ ٹکڑا لے کر کھانا شروع کیا تو ایک طرف سے کچھ شور اٹھا---شاید کوئی خوش نصیب شہادت سے ہمکنار ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر عبداللہؓ مزید صبر نہ کر سکے اور اپنے آپ سے کہا۔''وَاَنْتَ فِیْ الدُّنیا؟''(اور تو ابھی تک دنیا میں پھر رہا ہے؟) اس کے ساتھ ہی گوشت ہاتھ سے پھینک ☜

تھی۔(۱)

عرصۂ قیام

قبا میں جانِ دو عالم ﷺ کی تشریف آوری آٹھ ربیع الاول ۱۳ نبوی، بیس ستمبر ۶۲۲ء بروز سوموار ہوئی تھی۔ منگل، بدھ، جمعرات کو یہاں قیام فرمایا (۲) اور بارہ ربیع الاول بروز جمعہ اس شہر نگاراں کی طرف روانہ ہوئے جو اب تک یثرب تھا، مگر اب مدینۃ النبی اور طابہ وطیبہ بننے والا تھا۔

دیا اور بے محابا دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ لڑتے لڑتے آخر آپ کی آرزو پوری ہوگئی اور چور چور بدن کے ساتھ آغوشِ شہادت میں محو استراحت ہوگئے۔

''واہ! کیا ہی عمدہ اور ہدایت یافتہ غازی تھا عبداللہ بن رواحہ۔''

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُ

(تمام واقعات اصابہ، استیعاب، اسدالغابہ اور طبقاتِ ابن سعد سے ماخوذ ہیں۔)

(۱) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۶۰۔

(۲) بخاری شریف میں ہے کہ آپ نے چودہ دن قبا میں قیام فرمایا۔

(جلد اول ص ۵۶۰، باب مقدم النبی .....)

اگرچہ سند کے لحاظ سے بخاری کی روایت زیادہ صحیح مانی جاتی ہے لیکن تاریخی واقعات کے اعتبار سے یہ بات ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ قبا میں تشریف آوری کی تاریخ میں اگرچہ اختلاف ہے، مگر اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ آپ کی آمد سوموار کے دن ہوئی اور مدینہ کی طرف روانگی جمعہ کے دن --- اور سوموار سے جمعہ تک کسی طرح بھی چودہ دن نہیں بنتے، خواہ پہلا جمعہ لیا جائے یا دوسرا۔

علاوہ ازیں بخاری ہی کی ایک اور روایت میں مدت قیام چوبیس دن بتائی گئی ہے۔

(جلد اول ص ۶۱ باب ھل ینبش.....)

ظاہر ہے کہ چودہ اور چوبیس میں خاصا فرق ہے اور دونوں میں تطبیق ممکن نہیں ہے۔ اسی بناء پر اکثر مؤرخین نے مدتِ قیام وہی بتائی ہے جو ہم نے متن میں لکھی ہے اور وہی صحیح ہے۔

اہل مدینہ نے جس والہانہ انداز میں جانِ دوعالم ﷺ کا استقبال کیا، وہ تاریخ عشق و محبت کا ایک زریں باب ہے، مگر استقبالیہ مناظر کی جھلکیاں دیکھنے سے پہلے اس مقدس شہر کی عظمتوں کو اجاگر کرنے والی ایک نعت کے چند اشعار پڑھ لیجئے، تاکہ لطف وسرور دوبالا ہوجائے۔

نعت مدینہ

قاضی عبدالدائم دائمؔ

مرا ارماں مدینہ ہے، ترا ارماں مدینہ ہے — سکون دل مدینہ ہے، قرارِ جاں مدینہ ہے

امام الانبیاء کے من کو بھایا بس یہی قریہ — اسی خوش قسمتی پر آج تک نازاں مدینہ ہے

مہکتے لہلہاتے ہیں جہاں پر خلد کے باغات — وہی جانِ بہاراں، رشکِ گلزاراں مدینہ ہے

اری دنیا! بھلا ہم نے ترے شہروں سے کیا لینا! — ہماری راحت وتسکین کا ساماں مدینہ ہے

سنا دے کاش دائمؔ کو، صبا آکر یہ خوشخبری

کہ اس ''نعتِ مدینہ'' سے بڑا شاداں مدینہ ہے

اہل قبا کی پریشانی

جب آپ روانگی کے لئے اونٹنی پر سوار ہونے لگے تو اہل قبا کو خیال گزرا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم سے خدمت میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہو اور آپ ہم سے ناراض ہوکر جارہے ہوں! اس لئے عرض کی---''یارسول اللہ! کیا ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے---؟ کیا آپ ہم سے خفا ہوکر جارہے ہیں؟''

جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا---''نہیں، یہ بات نہیں ہے---دراصل مجھے ایک ایسی بستی میں قیام کا حکم دیا گیا ہے جس کے آگے سب بستیوں کی تابانیاں ماند پڑجائیں گی اور اس سلسلے میں میرے ناقہ کو حکم دے دیا گیا ہے۔(۱) (اس لئے جہاں یہ لے جائے، جانا پڑے گا۔)

اللہ اور اس کے رسول کی رضا پر سب نے سر خم کردیئے اور جانِ دوعالم ﷺ کے جلو میں سوئے مدینہ چل پڑے۔

---

(۱) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۳۹.

جانِ دو عالم ﷺ کا وہ راستہ جس پر قبا سے روانہ ہو کر آپ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر پہنچے

نمازِ جمعہ اور خطبہ

راستے میں جب جانِ دو عالم ﷺ بنی سالم کی آبادی میں پہنچے تو جمعہ کا وقت ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے مسجد بنی سالم میں جمعہ ادا فرمایا۔ ہجرت کے بعد یہ تاریخ اسلام کی پہلی نماز جمعہ تھی۔ نماز سے پہلے تقویٰ کے موضوع پر ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں متعدد آیات قرآنیہ کو اس خوبصورتی اور موزونیت سے اپنی گفتگو میں ضم فرمایا ہے کہ لگتا ہے، زریں ہار میں ہیرے جڑ دیئے ہیں۔ خطابت کا یہ شاہکار اتنا اثر انگیز اور ولولہ خیز ہے کہ اسے پڑھ کر ہی دل، آشنائے درد و اضطراب ہو جاتا ہے--- پھر جن نصیبہ وروں نے فصاحت و بلاغت کے اس آبشار کا ترنم اپنے کانوں سے سنا ہو گا ان کے جذب و سوز کا کیا عالم رہا ہو گا!

ہم جانِ دو عالم ﷺ کے اس اولین خطبے کا ترجمہ تو کر رہے ہیں، مگر وائے بے بسی کہ ہمارا قلم کلامِ افصح العرب کی ترجمانی سے مطلقاً شکستہ و قاصر ہے۔

---آپ ﷺ نے فرمایا---

(تبدیل شدہ خط آیات قرآنیہ کے اقتباسات ہیں)

"سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میں اسی کی حمد کہتا ہوں، اسی سے مدد مانگتا ہوں، اسی سے مغفرت طلب کرتا ہوں، اسی سے ہدایت چاہتا ہوں اور اسی پر ایمان لاتا ہوں۔ کبھی کفر کا مرتکب نہیں ہوا اور ہر کفر کرنے والے سے عداوت رکھتا ہوں۔

گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور نور دے کر بھیجا ہے--- ایسے دور میں جب کہ رسولوں کی آمد منقطع ہو چکی ہے--- علم کی کمی ہے اور گمراہی عام ہے، زمانہ ختم ہونے کو ہے، قیامت قریب ہے اور اس کا مقرر وقت نزدیک آ پہنچا ہے۔

جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے نافرمانی کی وہ بھٹک گیا، اس نے حد سے تجاوز کیا اور دور دراز کی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

میں تمہیں تقویٰ کی تلقین کرتا ہوں کیونکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو جو بہترین تلقین کر سکتا ہے، وہ یہی ہے کہ اس کو آخرت کی طرف متوجہ کرے اور اسے تقویٰ کی نصیحت کرے، اس لئے تمہیں چاہئے کہ جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ تم کو بچانا چاہتا ہے، ان سے بچ

کر رہو --- اس سے بہتر کوئی نصیحت نہیں، نہ اس سے بڑھ کر کوئی وعظ ہے۔

جو شخص اللہ سے ڈرتے ہوئے اور اس سے خوف کھاتے ہوئے اچھے عمل کرے گا، اس کا تقویٰ آخرت میں مطلوبہ کامیابی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔

جو شخص اپنے اور خدا کے درمیان کا معاملہ، خفیہ وظاہر، درست کرے گا، محض اس کی رضا کی خاطر، اس کا دنیا میں بھی ذکر بلند ہوگا اور روز آخرت کے لئے بھی ذخیرہ ہو جائے گا --- اس دن کے لئے جب ہر انسان آگے بھیجے ہوئے نیک اعمال کا تخت محتاج ہوگا۔

جو شخص اس راستے پر نہیں چلے گا، وہ بروز قیامت اپنی بداعمالیوں کو روبرو دیکھ کر حسرت کرے گا کہ ---- ''کاش! میرے اور ان اعمالِ بد کے درمیان طویل فاصلہ حائل ہوتا''

اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان بھی ہے، اس کی ہر بات سچی ہے اور اس کا ہر وعدہ پورا ہوتا ہے۔ وہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ خود فرماتا ہے، نہ میری بات بدلتی ہے، نہ میں اپنے بندوں پر ظلم کرتا ہوں

پس اپنے تمام موجودہ و آئندہ اور خفیہ وعلانیہ کاموں میں تقویٰ پیش نظر رکھو کیونکہ --- جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دیتا ہے، اس کو بڑا اجر عطا فرماتا ہے اور وہ عظیم کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے

تقویٰ انسان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے، اس کے عتاب سے اور اس کی سزا سے بچاتا ہے۔ تقویٰ سے قیامت کے دن چہرے منور ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور درجات بلند ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی کتاب (قرآن) کا علم دیا ہے اور صحیح راستہ دکھا دیا ہے، تاکہ پتہ چل جائے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر بے شمار احسانات کئے ہیں۔ اس لئے تم بھی اچھی روش اختیار کرو۔

اللہ کے دشمنوں سے عداوت رکھو اور راہ خدا میں اس طرح جہاد کرو،

جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تم کو (اس کام کے لئے) منتخب کیا ہے اور تمہارا نام مسلم رکھا ہے، تاکہ جس نے ہلاک ہونا ہے، وہ بھی روشن دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جس نے زندہ رہنا ہے وہ بھی واضح دلیل کے ساتھ زندہ رہے اور درحقیقت قوت وتوانائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو اور جان لو کہ اللہ کی یاد دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھے گا، اس کے دنیاوی معاملات کے لئے اللہ تعالیٰ خود کافی ہو جائے گا۔

ان تمام احکامات کی اطاعت اس لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم لوگوں پر نافذ ہوتا ہے، مگر لوگ اس پر کوئی حکم نہیں چلا سکتے، وہ سب کا مالک ہے اور اس کا مالک کوئی نہیں---اللہ سب سے بڑا ہے۔ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔"(۱)

ورود مسعود، استقبال بے مثال

آج اہل مدینہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے اور جوان فرحت ومسرت سے بے خود ہوئے جا رہے ہیں۔ جابجا، کوچہ بکوچہ نعرہ ہائے تکبیر ورسالت لگ رہے ہیں۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، یَا مُحَمَّدُ! یَا رَسُوْلَ اللهِ!(۲) اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ نوید جانفزا سنائی جا رہی ہے۔ جَآءَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ، جَآءَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ (اللہ کے رسول محمد (ﷺ) تشریف لے آئے ہیں، اللہ کے رسول محمد (ﷺ) جلوہ گر ہو گئے ہیں۔)(۳)

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ نے اس دل کش سماں کی کیا خوبصورت

---

(۱) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۴۰ تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۵۵۔

(۲) صحیح مسلم، ج ۲، ص ۴۱۹، باب فی حدیث الھجرۃ۔

(۳) صحیح بخاری، ج ۱، ص ۵۶۰ باب مقدم النبی۔

منظر کشی کی ہے!

''مدینہ طیبہ میں حضور پُر نور ﷺ کی تشریف آوری کی دھوم ہے۔ زمین و آسمان میں خیر مقدم کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ خوشی و شادمانی ہے کہ در و دیوار سے ٹپکی پڑتی ہے۔ مدینے کے ایک ایک بچے کا دمکتا چہرہ اناردانہ ہو رہا ہے۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ دل ہیں کہ سینوں میں نہیں سماتے۔ سینوں پر جامہ تنگ، جاموں میں قبائے گل کا رنگ۔ نور ہے کہ چھما چھم برس رہا ہے، فرش سے عرش تک نور کا بقعہ بنا ہے۔ پردہ نشین کنواریاں شوقِ دیدار محبوب خدا میں گاتی ہوئی آتی ہیں کہ

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا مَا دَعَا لِلّٰہِ دَاعٍ (۱)

اور چوہدری افضل حق مرحوم نے اس روح پرور نظارے کی یوں عکاسی کی ہے

''اسلامیوں کے سردار کا آج مدینہ میں داخلہ ہے۔ اس مبارک دن کی صبح کیا سہانی ہے! خوش قسمت انصار کے جوش مسرت کو دیکھو! کس طرح ہتھیار سجے، لباس بدلے، شاداں و فرحاں اِدھر اُدھر استقبال کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں۔ بچے خوشی سے پھول کی طرح ہنس رہے ہیں، بچیاں کلی کی طرح مسکراتی ہیں۔ حیا سے جھکی آنکھوں والی بیبیاں چھتوں پر انتظار میں کھڑی ہیں۔ ان کے لباس کی رنگا رنگی نے ہر چھت کو تختۂ گل بنا رکھا ہے۔ باغبانِ قدرت کے تمام گل بوٹے اپنے مہمانِ عزیز کی تشریف آوری میں نہال ہو رہے ہیں۔ قبا سے مدینہ تک لوگ دو رویہ کھڑے ہیں......شہر میں داخلے کے خوش گوار منظر کا کون سا پہلو دلچسپ نہیں! مگر اس مرغوب منظر کا وہ حصہ از بس مسرت خیز ہے، جب گل و برگ سے نازک بدن، سراپاؤں سے رشکِ چمن، مگر حیا پرور اور پاک دامن بیبیوں نے چھتوں سے دھیمے سروں میں خیر مقدم کا ترانہ گا کر جنت الفردوس کو بلانا شروع کیا۔ حیا اور عقیدت نے آواز میں وہ اثر پیدا کر دیا کہ خلد کی حوریں کان لگا کر سنتی بس نہ کرتی تھیں۔ سنو! ان نیک بیبیوں نے پاک نبی کی شان میں کیا ترانہ گایا۔

---

(۱) معارف رضا، ص ۴۵۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا — چاند نکل آیا
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ — کوہ وداع (۱) کی گھاٹیوں سے
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا — ہم پر خدا کا شکر لازم ہے
مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ — جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں (۲)

قدوم میمنت لزوم کی خوشی میں کہیں حبشہ کے کڑیل جوانوں کی ٹولی نیزہ بازی کے کرتب دکھا رہی ہے (۳) اور کہیں خاندان بنی نجار کی معصوم بچیاں، ننھے منے ہاتھوں سے دف بجا رہی ہیں اور شبنم جیسے ہونٹوں سے نغمات طرب سنا رہی ہیں۔

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِيْ النَّجَّارِ — يَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِنْ جَارٍ

(ہم لڑکیاں ہیں بنی نجار کی ---کس قدر خوشی کی بات ہے کہ محمد ہمارے ہمسائے بن گئے ہیں۔)

جانِ دو عالم ﷺ ان بچیوں سے پوچھتے ہیں---''کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے۔''

وہ معصومانہ خلوص اور سادگی سے جواب دیتی ہیں---''جی ہاں!''

جانِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں---''اللہ کی قسم! مجھے بھی تم سے محبت ہے۔'' (۴)

کتنا بڑا انعام ملا ان لڑکیوں کو بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے!!

چوہدری افضل حق لکھتے ہیں۔

''خاندانِ نجار کی بلند اقبال بیٹیو! تم کیسی خوش نصیب ہو---! فرشتوں نے تمہارے دامنوں کو آنکھوں سے لگایا ہوگا، حوروں نے تمہارے پاؤں کی خاک کو سرمہ بنایا ہوگا---بے شک جنہیں رسول کی محبت کا دعویٰ ہو اور رسول ﷺ کو جن کی محبت کا دعویٰ

---

(۱) وداع کی گھاٹیاں، مدینہ کے قریب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ اہل مدینہ جب کسی کو الوداع کیا کرتے تھے تو ان پہاڑیوں تک اس کے ساتھ آیا کرتے۔ اس بناء پر ان کا نام ثنیات الوداع پڑ گیا۔

(۲) محبوبِ خدا، ص ۱۰۸، ۱۰۹. (۳) خلاصۃ الوفاء، ص ۱۲۷.

(۴) زرقانی، ج ۱، ص ۳۳۴. سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۶۶.

ہو، وہ اپنے بخت بیدار پر جتنا فخر کریں کم ہے۔" (۱)

تمنائے میزبانی

جس جس محلے سے جانِ دو عالم ﷺ کا گزر ہوتا، وہاں کے باسی ناقہ کی مہار تھام لیتے اور بصد ادب عرض گزار ہوتے---"یا رسول اللہ! ہمارے ہاں قیام فرمائیے، ہم آپ کو نہایت عزت وتکریم سے رکھیں گے اور ہر طرح سے آپ کی حفاظت کریں گے۔"

جانِ دو عالم ﷺ اُن کے والہانہ جذبات سے مسرور ہوتے اور ان کو دعائے خیر و برکت سے نوازتے ہوئے ارشاد فرماتے---"دَعُوْهَا فَاِنَّهَا مَامُوْرَةٌ" (اونٹنی کو جانے دو، یہ حکمِ الٰہی کے ماتحت چل رہی ہے۔)

جانِ دو عالم ﷺ خود بھی اونٹنی کو کسی مخصوص سمت میں لے جانے کی کوشش نہیں کر رہے تھے؛ بلکہ مہار ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی اور وہ اپنی مرضی سے چلی جا رہی تھی۔ آخر محلہ بنی نجار میں پہنچ کر رک گئی اور جس مکان میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ رہا کرتے تھے، اس کے دروازے کے قریب بیٹھ گئی۔ ذرا سا بیٹھ کر پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور چاروں طرف گھوم پھر کر اور دیکھ بھال کر دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گئی اور اپنی گردن زمین پر ڈال دی۔ پھر دھیمی آواز نکالی---شاید عرض کی ہوگی کہ آقا! آپ کو جہاں پہنچانے کا مجھے حکم دیا گیا تھا، وہ یہی جگہ ہے۔ چنانچہ آپ اتر پڑے۔ حضرت ابو ایوبؓ نے آپ کا سامان اور کجاوہ اٹھایا اور اپنے گھر لے گئے۔ بنی نجار کے بہت سے افراد اب بھی امیدوار تھے کہ شاید آقا ہمارے ہاں قیام کرنے پر رضامند ہو جائیں مگر آپ نے یہ فرما کر کہ اَلْمَرْءُ مَعَ رَحْلِهٖ (ہر آدمی اپنے سامان کے پاس ٹھہرنا پسند کرتا ہے) ابو ایوبؓ کو اپنی میزبانی کا شرف بخشدیا۔ (۲)

---

(۱) محبوبِ خدا ۱۱۰۔

(۲) سیرت ابن ہشام حصہ دوم ص ۱۲، تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۰۶۔

بظاہر یہ بات انتہائی تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ اہل مدینہ تو جانِ دو عالم ﷺ کو اپنے پاس ٹھہرانے کے لئے قدم قدم پر التجائیں کرتے رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے قیام کے لئے مدینہ بھر ☜

حُسنِ ادب

جانِ دو عالم ﷺ کا یہ مکان دو منزلہ تھا۔ نچلی منزل میں آپ نے خود قیام فرمایا

میں صرف ابوایوبؓ کا مکان منتخب کیا!---اس میں آخر کیا حکمت ہے؟

مگر اصل بات یہ ہے قارئین کرام! کہ وہ مکان ابوایوبؓ کا تھا ہی کب---؟ وہ تو جانِ دو عالم ﷺ کا ذاتی مکان تھا جس میں ابوایوب کے آباء واجداد صدیوں سے رہتے چلے آرہے تھے۔ اس لئے درحقیقت آپ اپنے مکان پر فروکش ہوئے تھے، نہ کہ ابوایوب کے مکان پر۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کئی سو سال پیچھے جانا پڑے گا۔

جانِ دو عالم ﷺ کی ولادت سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ایک بہت بڑا بادشاہ گزرا ہے، جس کا نام تُبَّعْ ابنِ حَسّان تھا، وہ زبور کا پیروکار تھا اور بہت نیک انسان تھا۔ ایک دفعہ تقریباً اڑھائی لاکھ افراد کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ میں حاضر ہؤا اور کعبہ پر ریشمی غلاف چڑھایا۔ واپسی پر جب اس کا گزر اس جگہ سے ہؤا، جہاں اب مدینہ طیبہ آباد ہے تو اس کے ساتھ سفر کرنے والے چار سو علماء نے خواہش ظاہر کی کہ ہم یہاں مستقل طور پر قیام کرنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ ہماری مذہبی روایات کے مطابق یہ جگہ ایک عظیم نبی احمد (ﷺ) کی جلوہ گاہ بنے گی۔ ہم یہاں اس لئے رہنا چاہتے ہیں کہ شاید ہمیں اس نبی کے دیدار اور خدمت کی سعادت حاصل ہو جائے۔ نیک دل بادشاہ نے نہ صرف یہ کہ انہیں اجازت دے دی؛ بلکہ سب کے لئے مکانات بھی تعمیر کرادیئے اور رہائش کی جملہ ضروریات مہیا کر دیں۔ پھر ایک مکان خصوصی طور پر بنوایا اور آنے والے نبی کے نام ایک خط لکھا جس میں اقرار کیا کہ میں آپ پر ایمان لاچکا ہوں اور اگر آپ کا ظہور میری زندگی میں ہوگیا تو آپ کا دست و بازو بن کر رہوں گا۔

اس کے بعد یہ دونوں چیزیں---مکان اور خط---اس عالم کے حوالے کر دیں جو ان میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار تھا اور کہا کہ فی الحال تم اس مکان میں رہو اور یہ خط بھی سنبھال کر رکھو، اگر تمہاری زندگی میں اس نبی کا ظہور ہوگیا تو یہ دونوں چیزیں میری طرف سے ان کی خدمت میں پیش کر دینا، ورنہ اپنی اولاد کو یہی وصیت کر جانا، تا آنکہ یہ دونوں چیزیں اس نبی تک پہنچ جائیں۔

اس وصیت پر نسلاً بعد نسل عمل ہوتا رہا اور وہ دونوں چیزیں اس پرہیزگار انسان کی ☜

اور اوپر والی منزل حضرت ابو ایوبؓ کے لئے چھوڑ دی۔ انہوں نے عرض کی۔

اولاد میں منتقل ہوتی رہیں۔

اسی طرح ایک ہزار سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ اب اس مرد صالح کی اولاد میں سے حضرت ابو ایوب انصاری اس مکان کے محافظ و نگہبان تھے اور خط بھی انہی کے پاس محفوظ تھا۔

پھر جب اس مکان کے حقیقی مالک و وارث ﷺ، رونق آرائے بزمِ عالم ہوئے اور ابو ایوبؓ ان پر ایمان لائے تو ابو لیلیٰ کو وہ خط دے کر مکہ بھیجا کہ ان کی خدمت میں پیش کر دو۔ ابو لیلیٰ نے اس سے پہلے جانِ دو عالم ﷺ کو نہیں دیکھا تھا، مگر آپ کی نگاہوں سے تو کوئی شی اوجھل نہ تھی۔ ابو لیلیٰ پر نظر پڑتے ہی ارشاد فرمایا---''تم ابو لیلیٰ ہو اور تبع کا خط لے کر آئے ہو؟''

ابو لیلیٰ نے سوچا کہ یہ شخص شاید کوئی جادوگر ہے جس نے اپنی ساحرانہ قوتوں سے میرا نام بھی معلوم کر لیا اور یہاں آنے کے مقصد سے بھی آگاہ ہو گیا ہے۔ مگر الجھن یہ پڑ گئی کہ جس مجسمۂ حسن و جمال نے یہ بات کہی تھی، اس کی نہ تو وضع قطع ساحرانہ تھی، نہ اس کا روئے زیبا جادوگروں کے منحوس چہروں سے کوئی مشابہت رکھتا تھا۔ اس لئے ابو لیلیٰ نے پوچھا---''آپ کون ہیں اور میرے بارے میں آپ کو کیسے پتہ چل گیا جب کہ آپ کے چہرے پر جادوگروں جیسی کوئی بات ہی نہیں ہے؟''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''میں ہی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ ہوں---لاؤ، وہ خط مجھے دو۔''

ابو لیلیٰ نے خط پیش کیا تو آپ نے کھول کر پڑھوایا اور اس کے مندرجات سے اتنے مسرور ہوئے کہ تین دفعہ فرمایا---''مَرْحَبًا بِتُبَّعٍ، اَلْاَخِ الصَّالِحِ'' (میرے نیک بھائی تبع کو خوش آمدید، میرے نیک بھائی تبع کو جی آیاں نوں، میرے نیک بھائی تبع کو ہر کلہ راشہ۔) زرقانی، ج ا، ص ۳۳۲۔

اس ایمان افروز واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابو ایوب والے مکان کو اولین جلوہ گاہِ مصطفیٰ کے طور پر اس لئے منتخب فرمایا تھا کہ وہ مکان بنایا ہی آپ کے لئے گیا تھا، جو ایک ہزار سال سے اپنے حقیقی وارث کی راہ تک رہا تھا۔

اس واقعہ سے حضرت ابو ایوبؓ کا خاندانی پس منظر تو معلوم ہو گیا اور جس ادب و عقیدت سے انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کی میزبانی کی، اس کی جھلکیاں آپ متن میں پڑھ لیں گے۔ ☜

''یا نبی اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھ سے یہ بات برداشت نہیں

یہاں ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اہل محبت کی نگاہوں میں ان کے شرف میزبانی کا کتنا احترام تھا۔

حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں ایک بار ابوایوبؓ کا ہاتھ کچھ تنگ ہوگیا اور آپ بیس ہزار روپے کے مقروض ہوگئے، گھر کا اور کھیتوں کا کام کاج کرنے کے لئے کوئی غلام بھی پاس نہ رہا۔ آخر مجبور ہوکر حضرت معاویہؓ کے پاس گئے مگر چونکہ ابوایوبؓ کو حضرت عثمانؓ سے کچھ اختلافات رہے تھے: جبکہ حضرت معاویہؓ ان کے زبردست حامی تھے، اس لئے دونوں میں ہلکی سی تلخ کلامی ہوگئی اور ابوایوبؓ ناراض ہوکر بصرہ میں حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کے پاس چلے گئے۔

ابن عباسؓ نے آپ کی اتنی قدر ومنزلت کی کہ اپنا گھر آپ کے لئے خالی کردیا اور کہا

''میرا جی چاہتا ہے کہ جس طرح آپ نے رسول اللہ ﷺ کے لئے اپنا گھر خالی کردیا تھا اسی طرح میں بھی آپ کے لئے اپنا گھر خالی کردوں۔''

پھر فرمایا---''اس گھر میں جو کچھ ہے، وہ سارے کا سارا میں آپ کی نذر کرتا ہوں۔'' پھر پوچھا---''اور کوئی ضرورت؟''

ابوایوبؓ نے کہا---''مجھے چار غلام چاہئیں۔''

ابن عباسؓ نے فرمایا---''میری طرف سے بیس غلام قبول فرمایئے---! اور کچھ؟''

''میں بیس ہزار کا مقروض بھی ہوں۔'' ابوایوبؓ نے بتایا۔

''میں چالیس ہزار پیش کردیتا ہوں۔'' ابن عباسؓ نے فرمایا۔

کتنا اکرام تھا ابن عباسؓ کی نگاہ میں میزبانِ رسول کا، کہ کھڑے کھڑے مکان کا سارا ساز و سامان، بیس غلام اور چالیس ہزار روپیہ نقد ان کی میزبانی پر نچھاور کردیا---!!

۵۲ھ میں حضرت معاویہؓ نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے ایک لشکر روانہ کیا۔ چونکہ قیصر کے دارالخلافہ پر مسلمانوں کا یہ پہلا حملہ تھا اور جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا تھا کہ

''اَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ اُمَّتِیْ يَغْزُوْنَ مَدِيْنَةَ قَيْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَّهُمْ.''

(میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو قیصر کے دارالحکومت پر چڑھائی کرے گا،

ہو سکتی کہ آپ نیچے ہوں اور ہم اوپر، اس لئے مہربانی فرما کر آپ اوپر والی منزل میں قیام فرمایئے!''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''ابو ایوب! نچلی منزل میں ہمیں بھی آسانی رہے گی اور ہم سے ملاقات کے لئے آنے والوں کو بھی سہولت ہوگی، اس لئے ہمیں یہیں رہنے دو!''

ابو ایوبؓ اس وقت خاموش تو ہو گئے مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتے، جس کی ایک ایک دھڑکن میں جانِ دو عالم ﷺ کی محبت اور ادب رچا ہوا تھا۔ چنانچہ رات کو جب بالائی منزل پر چڑھے تو اپنی زوجہ سے کہا---''ہم بھلا رسول اللہ ﷺ سے اوپر کس طرح رہ سکتے ہیں---! وہ تو اتنی عظیم ہستی ہیں کہ ان پر اللہ کا کلام نازل ہوتا ہے اور ان کی بارگاہ میں ملائکہ حاضری دیتے ہیں۔''

وہ بخشا ہوا ہے۔) (بخاری شریف ج ۱، ص ۴۱۰)

اس لئے اس یقینی مغفرت کے حصول کے لئے متعدد سربرآوردہ ہستیوں نے اس مہم میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ ابو ایوبؓ بھی اس غزوہ میں شامل تھے اور خوب دادِ شجاعت دی۔ جنگ جاری تھی کہ آپ بیمار ہو گئے۔ امیرِ لشکر عیادت کے لئے آپ کے پاس آیا تو اس وقت آپ کا چل چلاؤ تھا، امیر نے کہا ''کوئی خواہش ہو تو بتایئے!''

ابو ایوبؓ نے فرمایا---''میری آخری تمنا یہی ہے کہ مرنے کے بعد میری میت کو جس حد تک آگے لے جا سکو، وہاں تک لے جانا اور وہیں مجھے دفن کر دینا۔''

احباب نے ان کی وصیت پر پورا پورا عمل کیا اور قسطنطنیہ کی فصیل کے بالکل قریب لے جا کر سپردِ لحد کیا۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ ان کی قبر اب بھی زیارت گاہِ خلائق ہے اور لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں۔ خصوصاً جب قحط پڑ جائے تو لوگ اس قبر کے وسیلے سے بارش مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بارانِ رحمت برسا دیتا ہے۔

رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ

(طبقاتِ ابن سعد، مستدرک حاکم، ذکر ابو ایوب)

بیوی نے بھی ان کی تائید کی اور دیر تک اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ خاصی رات گزر گئی تو چند لمحوں کے لئے ابو ایوبؓ کی آنکھ لگ گئی، مگر جلد ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے---''نَمْشِیْ فَوْقَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ '' (آہ! کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے اوپر چل پھر رہے ہیں!)

وہاں سے اٹھے، بیوی کو بھی اٹھایا اور ایک گوشے میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئے۔

کارکنانِ قضا وقدر بھی شاید آج کی رات ابو ایوبؓ کا امتحان لینے پر تلے ہوئے تھے، کہ اندھیرے میں ٹھوکر لگنے سے پانی کا مٹکا ٹوٹ گیا اور چھت پر پانی پھیل گیا۔ مٹی کی کچی چھت بہت پتلی سی تھی---ابو ایوبؓ کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں پانی نیچے ٹپک کر رسول اللہ ﷺ کی پریشانی کا سبب نہ بن جائے! چنانچہ انہوں نے اپنا اکلوتا لحاف اتارا اور اسے پانی پر ڈال کر سارا پانی اس میں جذب کر لیا۔

غرضیکہ پوری رات اسی پریشانی کے عالم میں گزر گئی اور دونوں میاں بیوی کو سکون کا ایک لمحہ نصیب نہ ہو سکا۔ صبح ہوئی تو ابو ایوبؓ نے پھر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ بالائی منزل پر جلوہ آرائی فرمائیں۔

جانِ دو عالم ﷺ نے وہی سابقہ وجہ بتائی اور نیچے رہنے کو ترجیح دی تو ابو ایوبؓ سے صبر نہ ہو سکا اور بصد عجز و نیاز عرض کی کہ یا رسول اللہ! ایسا نہ کیجئے---! خدا کی قسم! آپ جس مکان کی زیریں منزل میں قیام فرما ہوں، اس کی بالائی منزل پر چڑھنے کی ابو ایوب کو کبھی جرأت نہ ہو سکے گی۔ بالآخر ان کے اصرار پر آپ بالائی منزل پر منتقل ہو گئے اور نچلی منزل میں ابو ایوبؓ رہنے لگے۔ (۱)

تبرک

جانِ دو عالم ﷺ کا کھانا حضرت ابو ایوبؓ ہی پکا کر بھیجا کرتے تھے۔ آپ حسب ضرورت کھانا کھا کر جو کچھ بچ رہتا، واپس بھیج دیتے تو ابو ایوبؓ اور ان کی

(۱) زرقانی ج ۱، ص ۳۳۱، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۸۶، ۸۷

اہلیہ بڑے شوق سے وہ تبرک کھایا کرتے۔ خصوصاً جس جگہ جانِ دو عالم ﷺ کی مبارک انگلیوں کے نشانات ہوتے، اس کو بے حد رغبت سے تناول کیا کرتے۔

ایک دفعہ حسب معمول جانِ دو عالم ﷺ کا کھانا بھیجا اور خود تبرک کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد برتن واپس آئے تو ابوایوبؓ نے دیکھا کہ آج کہیں بھی انگشتہائے مبارک کے نشانات نہیں ہیں اور کھانا جس طرح گیا تھا، اسی طرح واپس آ گیا ہے۔ ابوایوب سخت خوفزدہ ہو گئے کہ نہ جانے کیا بات ہے---! کہیں رسول اللہ ﷺ ناراض تو نہیں ہو گئے! ڈرتے ڈرتے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا---"آج کے کھانے سے تھوم کی بو آ رہی تھی اور میری سرگوشیاں اتنی لطیف مزاج ہستیوں سے ہوتی ہیں کہ وہ ذرا سی بو بھی گوارا نہیں کرتیں اس لئے آج میں نے کھانا نہیں کھایا۔ تمہارے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے، تم کھا سکتے ہو۔"

اس کے بعد ابوایوبؓ نے کبھی آپ کے کھانے میں تھوم وغیرہ جیسی بدبودار چیز نہیں ڈالی۔ (۱)

مسجد نبوی کی تعمیر

جہاں جانِ دو عالم ﷺ کی اونٹنی بیٹھی تھی وہ ایک افتادہ سا قطعہ زمین تھا جس میں جا بجا گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ کھجور کے چند درخت اور پرانے زمانے کے مشرکین کی کچھ قبریں بھی تھیں۔ آپ نے اس مقام کو مسجد کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ جگہ دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی۔ آپ نے ان کو بلایا اور کہا کہ میں تم سے یہ جگہ خریدنا چاہتا ہوں، تم اس کا کیا لو گے؟

"یا رسول اللہ! ہم یہ زمین ہدیۃً خدمتِ اقدس میں پیش کرتے ہیں۔" دونوں بچوں نے معصومانہ پیش کش کی۔

مگر یتیموں کے حقوق کے نگہبان آقا نے ان کا مال بلا قیمت لینا پسند نہ فرمایا اور صدیق اکبرؓ سے دس اشرفیاں لے کر ان کو معاوضہ ادا فرما دیا۔

---

(۱) زرقانی ج ۱، ص ۴۳۱، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۸۷۔

موجودہ مسجدنبوی کاایک دلکش منظر

اسی زمین پر مسجد نبوی کی اولین بنیاد رکھی گئی اور وہی خطہ روضۃ من ریاض الجنۃ قرار پایا۔

دعائے دلنواز

یہ مسجد جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے، اس کی اولین تعمیر جانِ دو عالم علیہ السلام اور صحابہ کرام کی مشترکہ کوششوں کی مرہون منت ہے۔ صحابہ کرام پتھر اور کچی اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ آپ بھی ان کے ساتھ شامل تھے اور بآوازِ بلند یہ رجز پڑھ رہے تھے۔

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَہ

فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَہ

(الٰہی! حقیقی زندگی تو صرف آخرت کی ہے، اس لئے انصار و مہاجرین (کی وہ زندگی بہتر بنادے اور ان) کے گناہ معاف فرمادے۔)

صحابہ کرام بھی آپ کے ساتھ ہمنوا ہو کر یہ دلنواز دعا پڑھ رہے تھے۔

کیسے بلند اقبال لوگ تھے یہ، کہ جن کو جانِ دو عالم علیہ السلام کی معیت میں کام کرنے کی سعادتیں حاصل ہوا کرتی تھیں اور ان کے خلوص و سادگی اور وارفتگی کو دیکھ کر آپ کے مقدس ہونٹوں پر ان کے لئے دعائیں مچلا کرتی تھیں!!

تلخی و شیرینی

جب لوگ مل جل کر کام کرتے ہیں تو عموماً ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ اور نوک جھونک کرتے رہتے ہیں۔ مقصد کسی کی دلآزاری نہیں ہوتا؛ بلکہ ذہن کو تفریحی دلچسپیوں میں مصروف رکھ کر زیادہ سے زیادہ کام کرنا مطلوب ہوتا ہے؛ تاہم کبھی کبھار یہ شوخیاں تلخی کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔

مسجد نبوی کی تعمیر کے دوران بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

جو لوگ اینٹیں اٹھا کر لا رہے تھے، ان میں حضرت عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ وہ ایک خوش پوش انسان تھے اور طبعاً انتہائی نفاست پسند۔ جب اینٹ اٹھا کر لاتے تو

اس کو حتی الوسع اپنے کپڑوں سے دور رکھتے تاکہ لباس میلا نہ ہو اور اگر کہیں ذرا سا غبار پڑ جاتا تو نہایت اہتمام سے اس کو جھاڑتے۔

یہ دیکھ کر حضرت علیؓ کو دل لگی سوجھی۔ انہوں نے چند رجز یہ مصرے موزوں کئے اور آخری مصرعہ میں حضرت عثمانؓ کی طرف اشارہ کر دیا۔

لَا یَسْتَوِیْ مَنْ یَّعْمُرُ الْمَسَاجِدَا
وَیَدْاَبُ فِیْھَا قَائِمًا وَّقَاعِدًا
وَمَنْ یُّرٰی عَنِ التُّرَابِ حَائِدًا

(وہ شخص جو مسجدیں تعمیر کرتا ہو اور اٹھتے بیٹھتے اس سلسلہ میں جد و جہد کرتا ہو، اس کے ساتھ وہ شخص کبھی برابر نہیں ہو سکتا جو مٹی سے جان بچاتا پھرتا ہو۔)

حضرت عمار ابن یاسرؓ ایک سادہ لوح صحابی تھے۔(۱) انہوں نے حضرت علیؓ کو یہ شعر پڑھتے سنا تو خود بھی پڑھنا شروع کر دیا --- یہ جانے بغیر کہ اس میں حضرت عثمانؓ پر تعریض ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ تو خاندانی وجاہت و شرافت کے لحاظ سے ہم پلہ تھے۔ جب کہ حضرت عمارؓ ایک آزاد کردہ غلام تھے اور کسی اعتبار سے بھی حضرت عثمانؓ کے ہم مرتبہ نہ تھے، اس لئے حضرت علیؓ کی بات کا تو حضرت عثمانؓ نے برا نہ منایا مگر حضرت عمارؓ کا تعریض کرنا ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ چھڑی اٹھائی اور نہایت برافروختگی کے عالم میں حضرت عمارؓ سے گویا ہوئے۔

''یہ کس پر چوٹیں کر رہے ہو تم ---؟ اس حرکت سے باز آ جاؤ، ورنہ میں اس چھڑی سے تمہارے چہرے پر چوٹیں لگاؤں گا۔''

حضرت عمارؓ جو نادانستگی میں حضرت علیؓ کے ہمنوا ہو گئے تھے، یہ زوردار ڈانٹ سن کر یکلخت چپ ہو گئے، مگر بے کسوں اور بے بسوں کے ناز اٹھانے والے آقا کو حضرت عثمانؓ کا یہ غیظ و غضب پسند نہ آیا۔ آپ سخت ناراض ہوئے اور حضرت عمارؓ کے دل مجروح پر

---

(۱) ان کے مفصل حالات سید الوریٰ، ج ۱، ص ۲۰۸ پر گزر چکے ہیں۔

یوں مرہم رکھا کہ فرمایا۔

''عمار مجھے اپنی دونوں بھنوؤں کی درمیانی جلد کی طرح عزیز ہے۔ اگر کوئی اس کو تکلیف پہنچائے گا تو مجھے یہاں درد محسوس ہوگا۔'' (یعنی بھنوؤں کے درمیان)

جانِ دو عالم ﷺ کی ناراضگی دیکھ کر ساری شوخیاں رخصت ہوگئیں۔ سب جانتے تھے کہ آپ کی ناراضگی خدا کی ناراضگی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی ہمارے بارے میں کوئی قرآنی حکم نازل ہو جائے اور ہم کہیں کے نہ رہیں۔ اس لئے سب نے حضرت عمارؓ سے کہا کہ آج رسول اللہ محض آپ کی وجہ سے ہم سے خفا ہو گئے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟ کہیں ہمارے بارے میں وحی نہ نازل ہو جائے!

حضرت عمارؓ سادہ دل اور صاف باطن انسان تھے، لوگوں کی پریشانی دیکھ کر کہنے لگے۔

''اگر رسول اللہ میری وجہ سے ناراض ہوئے ہیں تو میں ہی آپ کو راضی بھی کرلوں گا۔''

اسی وقت جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور لہجے میں انتہائی بے چارگی سمو کر عرض کی۔

''یارسول اللہ! دیکھئے نا! آپ کے صحابی میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں!''

''کیا کرتے ہیں؟'' جانِ دو عالم ﷺ نے حیرت سے پوچھا۔

''یارسول اللہ! خود تو ایک ایک اینٹ اٹھاتے ہیں اور مجھ پر دو اینٹیں لاد دیتے ہیں، اس طرح تو یہ مجھے مار ڈالیں گے۔''

حضرت عمارؓ اپنے شوق سے دو اینٹیں اٹھاتے تھے، کوئی ان پر لادتا نہیں تھا، اس لئے گناہ بے گناہی کے اس الزام پر جانِ دو عالم ﷺ کے چہرے پر بشاشت آگئی اور حضرت عمارؓ کے بالوں سے غبار جھاڑتے ہوئے ارشاد فرمایا---''نہیں، یہ تمہیں نہیں مارنا چاہتے، تمہیں تو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔''

جانِ دو عالم ﷺ کے روئے انور سے ملال کے بادل چھٹتے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی اور دوبارہ ہمہ تن کام میں مصروف ہوگئے۔ (۱)

---

(۱) زرقانی ج ۱، ص ۳۴۳، ۳۴۴، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۴۵

خلفائے اربعہ

تعمیر شروع ہوئی تو سب سے پہلا پتھر جانِ دو عالم ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا۔ دوسرا پتھر صدیق اکبر نے، تیسرا فاروق اعظم نے، چوتھا عثمان غنی نے اور پانچواں علی مرتضیٰ نے رکھا۔ (رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْھُمْ) جب اس ترتیب کے بارے میں جانِ دو عالم ﷺ سے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا---''ھٰؤُلَآءِ الْخُلَفَآءُ مِنْ بَعْدِیْ.'' (یہ لوگ میرے بعد میرے قائم مقام ہوں گے۔(۱)

ماہر کاریگر

انہی دنوں یمامہ کا رہنے والا ایک معمار جس کا نام طلق تھا، اتفاقاً مدینہ آ گیا اور سب کو مسجد کی تعمیر میں مصروف دیکھ کر خود ہی ساتھ شامل ہو گیا۔ جانِ دو عالم ﷺ اس کے ہاتھوں کی ماہرانہ حرکت دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ کوئی اچھا راج ہے، اس لئے صحابہ کرام سے فرمایا---''اس کو کام کرنے دو، یہ مٹی کے کام کا ماہر ہے اور اچھا کاریگر نظر آتا ہے۔''(۲)

تکمیلِ کار

مسجد تیار ہوئی تو دور افتادہ دیہاتوں کی سادگی کا نمونہ تھی۔ دیواریں پتھروں، کچی اینٹوں اور گارے سے اٹھائی گئی تھیں۔ چھت پر کھجور کے پتے ڈالے گئے تھے اور کھجور ہی کے تنوں سے ستون بنائے گئے تھے۔ فرش کچا تھا۔ زوردار بارش ہوتی تو اس قدر پانی ٹپکتا کہ مسجد میں کیچڑ بن جاتا۔ بعض صحابہ نے کیچڑ سے بچاؤ کے لئے اپنی نماز کی جگہ پر کنکریاں ڈال دیں۔ جانِ دو عالم ﷺ کو یہ طریقہ پسند آیا اور آپ نے پورے فرش پر بجری ڈلوا دی۔

اصحابِ صفہ

مسجد کے ایک کونے میں مسافروں اور غریبوں مسکینوں کے لئے ایک چبوترا بھی تیار کیا گیا۔ جہاں کم و بیش ستر [۷۰] درویش منش صحابی مقیم رہتے، جو ہمہ وقت یا تو اللہ کی

---

(۱) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۴۴، سیرت حلبیہ ج ۱، ص ۷۱.

(۲) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۴۴، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۸۴.

عبادت میں مصروف رہتے یا جانِ دوعالم ﷺ کی صحبت سے فیضیاب ہوتے۔

دری قالین تو کجا، مسجد میں کوئی چٹائی تک نہ تھی۔ دوجہاں کا سلطان ننگی زمین پر بیٹھ کر اپنے اصحاب کو جہانگیری و جہانبانی کے آداب سکھاتا تھا اور اسی کنکریوں بھرے فرش پر اپنی تابناک حریری پیشانی رکھ کر گھنٹوں اپنے رب کے ساتھ مصروف راز و نیاز رہتا تھا۔

سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

حجرات

مسجد کی تعمیر سے پہلے ہی دونوں ازواج مطہرات --- حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ مدینہ طیبہ پہنچ چکی تھیں۔ اس لئے مسجد کے شمالی جانب ان کے لئے بھی دو حجرے تیار کئے گئے۔ مسجد کی طرح یہ حجرے بھی کچے تھے اور ان کی چھتیں اس قدر نیچی تھیں کہ کھڑے آدمی کا ہاتھ بآسانی چھت تک پہنچ جاتا تھا، حجرے تیار ہوگئے تو جانِ دوعالم ﷺ حضرت ابوایوبؓ کے گھر سے ان میں منتقل ہوگئے۔ (۱)

وطن کی یاد

مدینہ طیبہ کو یثرب اسی لئے کہا جاتا تھا کہ اس کی آب و ہوا انتہائی خراب اور مضر صحت تھی جو بھی اس شہر میں داخل ہوتا تھا، عموماً وبائی بخار میں مبتلا ہوجایا کرتا تھا۔

حضرت صدیقؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت عامرؓ بھی اس کی لپیٹ میں آگئے اور کئی دن تک ان کو شدید بخار آتا رہا۔ ایسے میں ان کو صاف ستھری فضا اور صحت مند آب و ہوا والا مکہ بہت یاد آیا۔ اس ارض مقدس کا ایک ایک منظر ان کے تصور میں ابھرتا اور ان کو تڑپا دیتا، جب دردِ فراق شدت اختیار کر جاتا تو پرسوز گیتوں میں ڈھل جاتا۔ سنئے! حضرت بلالؓ کس درد بھری لے میں گا رہے ہیں۔

اَلَا لَیْتَ شِعْرِیْ هَلْ اَبِیْتَنَّ لَیْلَةً
بِوَادٍ وَّحَوْلِیْ اِذْخَرٌ وَّجَلِیْلٗ

---

(۱) زرقانی ج ۱، ص ۳۴۶.

وَهَلْ اَرِدَنْ يَوْمًا مِيَاهَ مَجَنَّةٍ
وَهَلْ يَبْدُوَنْ لِيْ شَامَةٌ وَّ طَفِيْلُ

(ہائے! کاش! کیا اب کبھی مجھے وادی مکہ میں رات گزارنا نصیب ہو سکے گا --- جہاں میرے چاروں طرف اذخر اگی ہو اور جلیل کی بیلیں پھیلی ہوں۔

اور کیا اب کبھی ایسا دن آئے گا کہ میں مجنہ کے پانیوں پر جا سکوں اور شامہ و طفیل کا نظارا کر سکوں۔)(۱)

حضرت صدیقؓ اور حضرت عامرؓ نے بھی اسی سے ملتے جلتے جذبات کا اظہار کیا۔

حضرت عائشہؓ نے اس صورت حال سے جانِ دو عالم علیہ السلام کو مطلع کیا تو آپ نے دعا فرمائی

''اے الٰہ العالمین! جس طرح مکہ کی محبت ہمارے دلوں میں بسی ہوئی ہے، اسی طرح مدینہ کی محبت بھی ہمارے دلوں میں ڈال دے؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ الٰہی! مدینہ کو ہمارے لئے خوشگوار بنا دے، اس کے پیمانوں میں برکت نازل فرما دے اور اس کے بخار کو جحفہ (۲) کی طرف منتقل فرما دے۔''

آپ کی یہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ پھر ان کو کبھی مکہ کی یاد نے نہ ستایا، نہ ان میں سے کوئی مکہ کی طرف لوٹ کر گیا؛ بلکہ جو بھی ہجرت کر کے آیا، وہ عموماً یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ وبائی امراض کا بھی خاتمہ ہو گیا اور آب و ہوا بھی لطیف و خوشگوار ہو گئی۔ (۳)

---

(۱) اذخر ایک خوشبو دار گھاس، جلیل ایک خوش نما بیل، مجنہ مکہ کا ایک بازار، شامہ اور طفیل دو پہاڑوں کے نام۔ یہ تمام چیزیں سرزمین مکہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۲) مدینہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک جگہ، جو آج کل ویران ہے۔ اس زمانے میں وہاں یہودیوں کی آبادی تھی۔

(۳) زرقانی ج ۱، ص ۳۳۶، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۵۰، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۹۱.

مواخات

جانِ دو عالم ﷺ کے مدینہ طیبہ میں قرار پذیر ہونے کے بعد بہت سے لوگ ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے لگے۔ یہ لوگ چونکہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا جوئی کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے آتے تھے، اس لئے ان کے پاس مال ہوتا تھا، نہ کوئی جائیداد۔ آپ نے ان کی آباد کاری کے لئے یہ انوکھا طریقہ اختیار فرمایا کہ ہر مہاجر کو کسی نہ کسی انصاری کا بھائی بنا دیا اور چشمِ فلک نے اطاعتِ رسول اور ایثار و قربانی کا یہ حیران کن منظر دیکھا کہ ہر انصاری نے اپنے مہاجر بھائی کو پیش کش کی کہ چونکہ آج سے تم میرے بھائی ہو، اس لئے میری ہر چیز میں نصف کے حق دار ہو۔ یہ میری زمین ہے، یہ مکان ہے اور یہ باغ ہے۔ ان سب میں آدھا حصہ تمہارا، آدھا میرا۔

ہے کوئی نظیر اس بے مثال ایثار کی تاریخ عالم میں!؟

جانِ دو عالم ﷺ کا بھائی

جانِ دو عالم ﷺ جب تمام مہاجرین کو انصار کے ساتھ سلسلۂ اخوت میں منسلک فرما چکے تو حضرت علیؓ روتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی --- ''یا رسول اللہ! آپ نے سب مہاجرین کو کسی نہ کسی انصاری کا بھائی بنا دیا ہے، مگر مجھے ابھی تک کسی کا بھائی نہیں بنایا ہے۔'' آپ نے فرمایا

''اَنْتَ اَخِیْ فِیْ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ.''(۱)

(تم تو دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔)

حضرت علیؓ تو یوں بھی رشتے میں آپ کے بھائی تھے، مگر اس مواخات میں شفقت و محبت کی جو دنیا آباد ہے، اس کی بات ہی اور ہے۔

اذان کا آغاز

مدینہ میں اسلام لانے والوں کی تعداد دن بدن بڑھتی رہی، مہاجرین کی آمد سے

---

(۱) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۵۳، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۹۷

اس میں مزید اضافہ ہو گیا، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ سب کو اوقات نماز سے آگاہ کرنے کا طریقہ وضع کیا جائے۔ اس سے پہلے جب مسلمانوں کی تعداد تھوڑی تھی تو حضرت بلالؓ نماز سے پہلے بآواز بلند صرف اتنا کہہ دیا کرتے تھے، اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ (جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔) مگر جب اہل اسلام کی تعداد بڑھ گئی تو دور دراز تک آواز پہنچانے کے لئے یہ جملہ ناکافی ثابت ہوا۔ اس لئے جان دو عالم ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئے؟

کسی نے کہا بُوق بجانا چاہئے اور کسی نے ناقوس بجانے کا مشورہ دیا (۱) اور بھی متعدد رائیں پیش کی گئیں، مگر جانِ دو عالم ﷺ نے ناقوس بجانا پسند فرمایا۔ اگرچہ یہ طریقہ عیسائیوں کا تھا اور آپ اس سے پوری طرح مطمئن نہ تھے، مگر اس وقت پیش کی گئی تجاویز میں اس کا استعمال آپ کو نسبتاً بہتر معلوم ہوا، اس لئے آپ نے ناقوس بنانے کا حکم دے دیا۔

اسی رات ایک صحابی عبداللہ بن زیدؓ نے خواب دیکھا کہ ایک سبز پوش انسان ناقوس اٹھائے ہوئے ہے۔ عبداللہؓ نے اس کو آواز دی۔

''اے اللہ کے بندے! کیا یہ ناقوس فروخت نہیں کرتے ہو؟''

''تم اس کو کیا کرو گے؟'' سبز پوش نے پوچھا۔

''ہم اس کے ذریعے لوگوں کو نماز کے لئے جمع کیا کریں گے۔''

''میں تم کو اس سے بہتر طریقہ نہ بتادوں؟''

''ضرور بتاؤ!''

سبز پوش قبلہ رو ہو کر کھڑا ہو گیا اور اونچی آواز سے اذان دینے لگا۔

---

(۱) بوق، خالی سینگ کو کہا جاتا ہے، جس کو بجا کر یہودی، عبادت کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا کرتے تھے اور ناقوس پیتل وغیرہ کا بنا ہوا ایک ڈھول، جس کو بجا کر عیسائی، لوگوں کو اپنے وقتِ عبادت سے مطلع کیا کرتے تھے۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ...... لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

عبداللہؓ بیدار ہوئے تو اسی وقت جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خواب بیان کیا۔

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---"یہ سچا خواب ہے۔ تم یہ کلمات بلال کو سکھا دو، کیونکہ اس کی آواز تم سے زیادہ بلند ہے۔"

عبداللہؓ کے بتائے ہوئے الفاظ جب حضرت بلالؓ نے اونچی آواز میں کہنے شروع کئے تو حضرت عمرؓ دوڑتے ہوئے اور اپنی چادر زمین پر گھسیٹتے ہوئے آئے اور عرض کی۔

"یارسول اللہ! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا رسول بنایا ہے، مجھے بھی خواب میں بعینہ یہی کلمات کسی نے سکھائے ہیں۔"

جانِ دو عالم ﷺ مسرور ہوئے اور فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ کہہ کر اس تائید پر اللہ کا شکر ادا کیا(۱)

اس وقت سے آج تک ہر مسجد سے دن میں پانچ مرتبہ یہ سامعہ نواز ندا بلند ہوتی ہے اور اہل ایمان مسجد کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ زِدْھُمْ شَوْقًا وَّذَوْقًا۔

یہود کی عداوت

مدینہ طیبہ میں اہل اسلام اعزازی شان سے رہتے تھے اور ہر طرح کے جسمانی تشدد سے محفوظ تھے، مگر یہاں یہودیوں کے ہاتھوں انہیں طرح طرح کی ذہنی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہودی خود بھی مدتوں سے آخری نبی کے منتظر تھے اور جب تک وہ نبی آیا نہیں تھا اس کے وسیلے سے فتح و نصرت طلب کیا کرتے تھے اور اس کے مبارک نام کے صدقے فتح و کامیابی کے انعام پایا کرتے تھے۔

﴿وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَ ھُمْ مَّا

---

(۱) زرقانی ص ۳۵۳، ۳۵۴، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۵۹.

عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ o بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ

یعنی ان بدبختوں نے اس عظیم ہستی کا انکار کر دیا جس کے طفیل زندگی بھر کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کرتے رہے۔ بلاشبہ ایسے احسان فراموش کافروں پر اللہ کی لعنت اور پھٹکار ہے۔ ان کے انکار و سرکشی کی وجہ صرف یہ ہے کہ آخری نبی اولاد اسمٰعیل میں مبعوث ہوا ہے۔ جب کہ ان کے خیال میں نبوت کی حق دار صرف اولاد اسحاق ہے۔ حالانکہ نبوت و رسالت کا دار و مدار کسی خاص سلسلۂ نسب پر نہیں۔ یہ تو محض اللہ کا فضل ہے۔ وہ جس کو چاہے نواز دے۔

عبداللہ بن سلام

یہودیوں کے سربرآوردہ لوگوں میں سے صرف ایک ایسے خوش نصیب انسان ہوئے ہیں جو صدق دل سے جانِ دو عالم ﷺ پر ایمان لائے اور برملا حق کا اعتراف کیا۔ ان کا نام عبداللہ ابن سلامؓ تھا۔ یہودیوں کے عظیم علماء میں سے تھے اور تورات میں آپ کی جو علامات بیان کی گئی تھیں ان سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ابن سلامؓ حاضر خدمت ہوئے اور چند سوالات کئے۔ آپ نے تشفی بخش جواب دیئے تو مطمئن ہو گئے اور آپ کی رسالت کا اقرار کر کے اسلام میں داخل ہو گئے۔ پھر عرض کی --- "یارسول اللہ! یہودی میری علمیت اور سرداری کے معترف ہیں۔ آپ مجھے دوسرے کمرے میں بٹھا دیجئے اور یہودیوں کو بلا کر ان سے پوچھئے کہ میرے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ میری تعریف کریں گے۔ پھر ان سے کہیں کہ اگر ابن سلام ایمان لے آئے تو کیا تم اس کا اتباع کرو گے؟ چونکہ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہو گی کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں، اس لئے وہ یہی کہیں گے کہ ابن سلام ایمان لائے تو ہم بھی اس کی پیروی کریں گے۔ اس وقت میں باہر نکل آؤں گا اور ان کے روبرو آپ کی رسالت کا اقرار کروں گا --- اگرچہ یہودی ایک دغاباز قوم ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے قول سے پھر جائیں؛ تاہم ان پر حجت تو قائم ہو جائے گی۔"

جانِ دو عالم ﷺ نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور یہودیوں کو بلا بھیجا۔ وہ آئے تو آپ نے فرمایا --- ''اے گروہ یہود! اللہ سے ڈرو، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اس لئے تمہیں چاہئے کہ اسلام لے آؤ۔''

''ہمیں آپ کی نبوت وغیرہ کا کوئی علم نہیں۔'' یہودیوں نے کہا۔

''اچھا! یہ بتاؤ کہ ابن سلام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ---؟ وہ کیسا انسان ہے؟''

''وہ ہمارا سردار ہے اور سردار کا بیٹا ہے۔ بہت بڑا عالم ہے اور ایک بڑے عالم کا صاحبزادہ ہے۔ بہترین انسان ہے اور ایک اچھے آدمی کا فرزند ہے۔'' یہودیوں نے ابن سلام کی تعریفوں کا پُل باندھ دیا۔

''اگر وہ میری رسالت کی گواہی دے دے تو.....؟'' جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا۔

''تو ہم بھی اس کی پیروی کریں گے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے آواز دی --- ''ابنِ سلام! باہر آجاؤ۔''

وہ باہر آئے تو جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا --- ''ابن سلام! کیا میں وہی رسول نہیں ہوں جس کا تذکرہ تورات وانجیل میں ہے اور جس پر ایمان لانے کا تم سے سابقہ انبیاء نے عہد لیا ہے؟''

''بلاشبہ آپ وہی رسول ہیں یا رسول اللہ!'' ابن سلام نے کہا، پھر یہودیوں سے مخاطب ہوئے اور کہا --- ''اے قوم یہود! اللہ سے ڈرو اور ان پر ایمان لے آؤ۔ تم خوب جانتے ہو کہ یہ وہی رسول ہیں جن کی آمد کی بشارتیں تورات وانجیل میں موجود ہیں۔''

عبداللہ بن سلامؓ کو جانِ دو عالم ﷺ کی تعریف میں یوں رطب اللسان دیکھ کر یہودیوں کو آگ لگ گئی۔ تلملاتے ہوئے ابن سلام سے گویا ہوئے۔

''اَنْتَ شَرُّنَا وَابْنُ شَرِّنَا۔''

(تم بدترین انسان ہو اور ایک بدترین انسان کے بیٹے ہو۔)

---اور غصے میں پھنکارتے ہوئے واپس چلے گئے۔(۱)

عالم تورات

یہودیوں نے اگرچہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور عبداللہ ابن سلامؓ کی بات نہ مانی مگر عبداللہ بن سلام کے ایمان لانے سے یہ نمایاں فائدہ ہوا کہ تورات کا ایک بڑا عالم جانِ دو عالم ﷺ کا مصدق و مؤید بن گیا جس کی وجہ سے یہودیوں کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ احکامِ تورات میں حسب منشا ردو بدل کرسکیں۔

ایک دفعہ چند یہودی جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہم میں سے ایک مرد اور ایک عورت زنا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ان کے لئے کیا حکم ہے؟

اگرچہ وہ دونوں شادی شدہ تھے اور تورات کے مطابق رجم (سنگسار) کے مستحق تھے؛ تاہم یہودی ان کو اس سزا سے بچانا چاہتے تھے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے ان سے پوچھا ''تورات میں رجم کے بارے میں کیا احکام ہیں؟''

''تورات میں تو رجم کے متعلق کچھ نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا ''البتہ ہم ایسے زانیوں کو رسوا کرتے ہیں اور کوڑے بھی مارتے ہیں۔''

عبداللہ بن سلامؓ جو پاس ہی بیٹھے تھے، یہ سنتے ہی بول اٹھے۔

''تم جھوٹ بولتے ہو، تورات میں رجم کا حکم موجود ہے۔''

یہودیوں کی دیدہ دلیری دیکھئے کہ وہ تورات اٹھا لائے اور آیتِ رجم پر ہاتھ رکھ کر اس کا ماقبل اور مابعد پڑھ دیا۔عبداللہ بن سلامؓ جیسے عالمِ تورات کے سامنے یہ طفلانہ حرکتیں کیا کام دے سکتی تھیں---! انہوں نے کہا---''تم اپنا ہاتھ اٹھاؤ اور اس کے نیچے جو آیت چھپا رکھی ہے اس کو پڑھو!''

ہاتھ اٹھایا گیا تو آیتِ رجم ظاہر ہوگئی، کھسیانے ہو کر بولے---''عبداللہ ابن سلام سچ کہتا ہے یا محمد!---اس میں تو واقعی رجم کی آیت موجود ہے۔''

---

(۱) تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۴۹، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۱۹.

چنانچہ جانِ دوعالم ﷺ نے انہی کی مذہبی کتاب کے مطابق فیصلہ کر دیا اور دونوں کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیا۔(۱)

---

(۱) مشکوٰۃ ص ۳۰۹.

عبداللہ ابن سلامؓ کا سلسلہ نسب حضرت یوسفؑ سے جاملتا ہے۔ اسلام لانے سے پہلے ان کا نام حصین تھا، جانِ دوعالم ﷺ نے تبدیل کر کے عبداللہ رکھ دیا۔

ان کے اس اعزاز کا کیا کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے صداقتِ مصطفیٰ پر اپنی گواہی کے ساتھ ان کی گواہی کو بھی ذکر فرمایا اور جانِ دوعالم ﷺ سے کہا کہ کہہ دیجئے۔ یہ دونوں گواہ میرے لئے کافی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

﴿قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾

یعنی، یہودیوں سے کہہ دیجئے کہ میرے سچا ہونے اور تمہارے جھوٹا ہونے پر اللہ گواہ ہے اور وہ شخص جس کے پاس تورات کا علم ہے اور میرے لئے یہ دو گواہ کافی ہیں۔

مفسرین کرام کہتے ہیں کہ "جس کے پاس تورات کا علم ہے" سے مراد عبداللہ بن سلامؓ ہیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن کی حقانیت پر بطور گواہ پیش کیا ہے۔ ﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے قرآن کے کلام اللہ ہونے پر گواہی دی۔)

یہاں بھی شاہد بنی اسرائیل سے مراد عبداللہ ابن سلامؓ ہیں۔

جانِ دوعالم ﷺ نے بارہا ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی۔ حضرت سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک پیالہ پیش کیا گیا، جس میں کھانے کی کوئی چیز تھی۔ رسول اللہ نے تھوڑا سا کھا کر باقی چھوڑ دیا اور فرمایا۔

"ابھی ایک جنتی شخص آ کر اس کو کھائے گا۔"

حضرت سعدؓ کہتے ہیں، میں خوش ہوا کہ میرا بھائی عمیرؓ اس بشارت کا حق دار قرار پائے گا، کیونکہ میں جب گھر سے روانہ ہوا تھا، وہ وضو کر رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لئے تیار ہو رہا تھا، مگر اس کی بجائے عبداللہ ابن سلام آئے اور رسول اللہ نے وہ پیالہ ان کو عطا فرما دیا۔ ☜

رسیدہ بود بلائے.........

عبداللہ بن سلامؓ کے علاوہ یہودیوں میں سے کسی نمایاں شخصیت کا ایمان لانا صحیح روایات سے ثابت نہیں --- اور یہود کی فطرت کو دیکھتے ہوئے یہ بات تعجب خیز بھی نہیں۔ جن لوگوں نے اپنی ہی قوم (بنی اسرائیل) کے متعدد انبیاء قتل کر ڈالے ہوں، ان سے یہ توقع ہی کب کی جاسکتی ہے، کہ وہ ایک عربی نبی پر ایمان لاتے اور اس کی اطاعت اختیار کرتے۔

یہ بزدل لوگ اگرچہ کھل کر سامنے نہیں آتے تھے؛ تاہم سازشوں کے ذریعے مسلمانوں کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

ایک یہودی تھا شاس ابن قیس۔ اس کو انصار کا اتحاد واتفاق ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوششوں میں لگا رہتا تھا۔ انصار کے دو بڑے قبیلے تھے --- اوس اور خزرج۔ اسلام لانے سے پہلے ان میں شدید عداوت تھی اور دونوں میں جنگِ بعاث جیسی مہلک ترین لڑائی ہو چکی تھی مگر جانِ دو عالم ﷺ کی تعلیم و تزکیہ نے ان کی نفرتوں کو محبتوں سے اور عداوتوں کو دوستیوں سے بدل دیا تھا۔

ایک دن شاس نے اوس و خزرج کے مختلف افراد کو ایک جگہ بیٹھ کر باہم بات چیت کرتے دیکھا تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا، کہنے لگا --- "اگر انصار کے اتفاق کا یہی حال رہا تو ہمارے لئے مشکل ہو جائے گی۔"

اسی وقت ایک یہودی کو تیار کیا اور کہا کہ تم بھی جا کر انصار میں بیٹھ جاؤ اور دورانِ گفتگو کسی طرح جنگِ بُعاث کا تذکرہ نکال لو۔ پھر اس جنگ میں دونوں طرف کے شاعروں

انہی بشارتوں کی وجہ سے صحابہ کرام ان کو قطعی اور یقینی جنتی سمجھتے تھے اور کہا کرتے تھے --- مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی رَجُلٍ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی ھٰذَا۔ (جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہے، اسے چاہئے کہ عبداللہ ابن سلام کو دیکھ لے۔)

ساری عمر وعظ و تبلیغ اور دین کی خدمت میں صرف کر کے ۴۳ھ کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

(مستدرک، اصابہ، ذکر عبداللہ ابن سلام)

نے ایک دوسرے کی جو ہجو کی تھی اور برائیاں بیان کی تھیں، ان کو بیان کرو--- امید ہے کہ ماضی کی یادان کے جذبات کو بھڑکادے گی اور آپس میں لڑ پڑیں گے۔

اور یہی ہوا--- جونہی اس فتنہ پرداز نے جنگ بُعاث میں کہے گئے اشعار پڑھنا شروع کیے، اوس وخزرج ایک دوسرے پر برتری جتانے لگے۔ پھر بات بڑھتے بڑھتے اس حدتک پہنچ گئی کہ دونوں فریق چیخ چیخ کر اپنے مددگاروں کو بلانے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں دونوں قبیلے مسلح ہوکر مقابلے کے لئے صف آرا ہوگئے۔

جانِ دوعالم ﷺ کو اس صورت حال کا پتہ چلا تو چند مہاجرین کو ساتھ لے کر فوراً اس جگہ پہنچے، جہاں اوس وخزرج میں لڑائی چھڑا ہی چاہتی تھی اور فرمایا۔

''اَللّٰہَ اَللّٰہَ ......'' (اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو! یہ کیا جاہلیت کی باتیں شروع کر دی ہیں تم لوگوں نے، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں---! کیا تمہیں یاد نہیں رہا کہ اب تم اسلام لاچکے ہو اور اس کی برکت سے زمانہ جاہلیت کی دشمنیاں نیست ونابود ہوچکی ہیں۔ اب تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں محبت والفت ڈال دی ہے اور تمہیں آپس میں بھائی بھائی بنادیا ہے۔)

اللہ جانے ان الفاظ میں کیا تاثیر تھی کہ یہ تنبیہ سنتے ہی انصار کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور وہ لوگ جو چند لمحے پہلے ایک دوسرے پر پل پڑنے کے لئے تیار کھڑے تھے، اب روتے ہوئے باہم معانقے کرنے لگے۔(۱)

یوں شاس کی سازش ناکام ہوگئی اور انصار میں پھر سے محبت کی تجدید ہوگئی۔

ابنِ اُبَیّ

مدینہ منورہ میں جس شخص کے ہاتھوں جانِ دوعالم ﷺ کو حد سے زیادہ دکھ اور تکلیف اٹھانی پڑی، اس کا نام عبداللہ ابن ابی تھا--- منافقوں کا سردار، سامنے جی حضوری کرنے والا اور پس پشت انتہائی دلآزار باتیں کرنے والا، حیلوں بہانوں کا ماہر، دروغ گو،

(۱) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۱۵

چرب زبان اور جھوٹی قسمیں اٹھانے میں بے باک۔

جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ اس کی غیر معمولی عداوت کا سبب یہ تھا کہ آپ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے اہل مدینہ اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ تاج وغیرہ بن چکا تھا اور رسم تاج پوشی کی تیاری ہو رہی تھی کہ اچانک آپ کی آمد سے یہ سارا پروگرام درہم برہم ہوگیا اور سر پر تاج سجانے کی آرزو ابن ابی کے دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی، کیونکہ لوگوں نے عملاً اس بے تاج بادشاہ کو اپنا تاجدار مان لیا تھا جس کے نعلین کا نقشہ تاجوں کی زینت بنا اور شاہوں نے بصد احترام اس کو اپنے سروں پر رکھا۔

تاج وتخت سے محرومی کا صدمہ آخر تک ابن ابی کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا اور اس کو جانِ دو عالم ﷺ کی عداوت پر اکساتا رہا۔ پہلے پہل تو وہ علانیہ مخالفت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ جب آپ مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکوں کے ایک مخلوط اجتماع میں دعوت حق دینے کے لئے تشریف لے گئے تو ابن ابی نے آپ کی گفتگو سن کر نہایت گستاخانہ انداز میں کہا کہ ہمیں تمہاری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جو کچھ بیان کرتے ہو، اگر حق بھی ہو، تب بھی ہماری مجلسوں میں آ کر ہمیں نہ ستایا کرو۔ تم جا کر اپنے گھر میں بیٹھو، اگر وہاں کوئی تم سے ملنے آئے تو اس کے سامنے بے شک بیان کرتے رہو۔

حضرت عبداللہ ابن رواحہ (۱) بھی اس محفل میں موجود تھے۔ انہوں نے ابن ابی کی یاوہ گوئی سن کر کہا --- "نہیں یارسول اللہ! آپ ضرور ہماری محفلوں میں تشریف لایا کریں اور ہمیں نصیحت کیا کریں ہمیں تو آپ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

اس پر وہاں موجود لوگوں میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ بڑی مشکل سے جانِ دو عالم ﷺ نے تمام فریقوں کو ٹھنڈا کیا۔ واپس آ کر آپ نے حضرت سعد ابن معاذ سے سارا واقعہ بیان کیا تو حضرت سعد نے کہا --- "یارسول اللہ! ابن ابی سے درگزر فرما دیجئے، کیونکہ ہم لوگ اس کو بادشاہ بنانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ آپ کی تشریف آوری کی وجہ سے وہ اس اعزاز

---

(۱) ان کے حالات سیدالوریٰ، ج ۱، ص ۳۱۷ پر گزر چکے ہیں۔

سے محروم رہ گیا ہے، اس لئے ایسی باتیں کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ تو مجسمۂ رحمت تھے، اسی وقت معاف فرمادیا۔(۱)

اسی طرح ایک اور مرتبہ جانِ دو عالم ﷺ اپنے دراز گوش پر سوار ہو کر ابن ابی کو دعوتِ اسلام دینے گئے۔ آپ کے ساتھ چند صحابہ کرامؓ بھی تھے۔ ابن ابی کے پاس پہنچے تو اس نے نہایت تحقیر آمیز لہجے میں کہا---''اِلَیْکَ عَنِّیْ........'' (مجھ سے پرے ہٹو، تمہارے گدھے کی بدبو سے میرا دماغ پھٹا جارہا ہے۔)

ایک عاشق رسول انصاری نے جواب دیا ''وَاللّٰہِ لَحِمَارُ رَسُوْلِ اللّٰہِ اَطْیَبُ رِیْحًا مِنْکَ.'' (خدا کی قسم! رسول اللہ کا گدھا تجھ سے زیادہ خوشبودار ہے۔)

اس موقع پر بھی ابن اُبی کے حامیوں اور جانِ دو عالم ﷺ کے صحابیوں میں جھگڑا ہو گیا اور ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی۔

غرضیکہ ابن اُبی ابتداء میں کھل کر جانِ دو عالم ﷺ کی مخالفت کیا کرتا تھا، مگر جب اسلام کثرت سے پھیل گیا تو کھلی دشمنی برقرار رکھنے کی جرأت نہ کر سکا، اس لئے بظاہر مسلمان بن گیا اور اسلام کی آڑ میں اہل اسلام کی جڑیں کاٹنے کی کوششوں میں لگ گیا۔

مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ

عجیب بات ہے کہ ابن ابی کا بیٹا پکا سچا مومن تھا اور باپ کے کرتوتوں سے متنفر و بیزار تھا شانِ رسالت میں باپ کی گستاخیوں پر اس کا خون کھول اٹھتا اور وہ کچھ کر گزرنے کے لئے بے تاب ہو جاتا۔

ایک بار ابن ابی نے ایک گستاخانہ جملہ کہا۔ بیٹے کو پتہ چلا تو اسی وقت جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی---''یارسول اللہ! اگر اجازت ہو تو میں اپنے باپ کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں ڈال دوں۔''

اللہ اللہ!! رحمۃ للعالمین کی شانِ رحیمی و کریمی کے صدقے کہ آپ نے فرمایا---

---

(۱) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۶۹

"لَا، لٰکِنْ بَرَّ اَبَاکَ." "(نہیں، وہ تمہارا باپ ہے۔ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو۔) (۱)

ہے کوئی انتہا اس رأفت و شفقت کی---! جس شخص کی گستاخیاں اس کے حقیقی بیٹے کے لئے ناقابل برداشت تھیں، جانِ دو عالم ﷺ نہ صرف یہ کہ ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں؛ بلکہ اس کے بیٹے کو باپ سے اچھا برتاؤ کرنے کی تلقین فرماتے ہیں!! (۲)

سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں

تحویل قبلہ (۳)

۲ھ میں تحویل قبلہ (قبلہ کی تبدیلی) کا وہ فرمانِ دلنواز نازل ہوا جس سے ثابت ہوا کہ

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم خدا چاہتا ہے رضائے محمد ﷺ

جانِ دو عالم ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو یہاں اہل اسلام کے علاوہ تین

---

(۱) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۶۸۔

(۲) ابن اُبی مرتے دم تک جانِ دو عالم ﷺ کی دشمنی پر کمربستہ رہا۔ اس ظالم نے آپ کو معاذ اللہ، اَذَلّ (نہایت ذلیل انسان) تک کہا۔ (تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔) اس کے باوجود جب یہ مرگیا تو رحمتِ عالم بنفس نفیس اس کی نماز جنازہ کے لئے تشریف لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی---"یارسول اللہ! یہ تو منافق تھا اور منافقین کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے کہ ان کے لئے اگر آپ ستر مرتبہ بھی بخشش مانگیں، تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہیں بخشے گا۔

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---"میں ستر بار سے زیادہ مغفرت طلب کرلوں گا۔"

یہ توجیہہ آپ نے محض اس لئے اختیار فرمائی تھی کہ شاید اس طرح اس بدبخت کی معافی کی کوئی صورت نکل آئے مگر اللہ تعالیٰ اتنے بڑے گستاخ کو معاف کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ اسی وقت آیت اتری۔ ﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ۔ ﴾ (ان منافقوں میں سے اگر کوئی مرجائے تو آپ نہ اس کی نماز جنازہ پڑھیں، نہ اس کی قبر کے پاس کھڑے ہوں۔)

(۳) واضح رہے کہ تحویل قبلہ کا حکم چند غزوات کے بعد نازل ہوا ہے، مگر ہم نے تسلسل قائم رکھنے کے لئے ان غزوات کو غزوۂ بدر کے ساتھ ذکر کیا ہے اور تحویل قبلہ کا واقعہ پہلے بیان کردیا ہے۔

قسم کے لوگ آباد تھے۔ یہودی، عیسائی اور مشرکین۔ عبادت کے وقت مشرکین کعبہ کی طرف منہ کیا کرتے تھے اور عیسائی و یہودی بیت المقدس کی طرف۔ جانِ دو عالم ﷺ چونکہ مشرکین کی بنسبت عیسائیوں اور یہودیوں کو ترجیح دیا کرتے تھے، کیونکہ وہ بہرحال اہل کتاب تھے اور انبیاء سے ایک گونہ نسبت رکھتے تھے۔ اس بناء پر ابتداء میں آپ نے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا اور مسجد نبوی کی پہلی تعمیر اسی رخ پر کی گئی۔ یہ مصلحت بھی ملحوظ خاطر رہی ہوگی کہ اس طرح اہل کتاب کی تالیفِ قلب ہوگی اور وہ اسلام کی طرف راغب ہوں گے۔ مگر اب آپ کا دل چاہتا تھا کہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا جائے، کیونکہ مستقل طور پر اہل اسلام کا مرکز عقیدت اور مسجود الیہ اللہ کا وہی گھر بن سکتا تھا جسے آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، لیکن اگر آپ از خود کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیتے تو منافقین کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ رسول اللہ ابھی تک کوئی قبلہ ہی نہیں طے کر پائے ہیں۔ کبھی ایک طرف رخ کرنے کا حکم دیتے ہیں، کبھی دوسری طرف، قبلہ نہ ہوا تماشا ہوا۔

منافقین کی اس ممکنہ یاوہ گوئی سے بچنے کے لئے آپ چاہتے تھے کہ اس سلسلے میں باقاعدہ وحی نازل ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کعبہ کو ابدالآباد تک قبلہ قرار دے دیا جائے۔ وحی کے انتظار میں آپ بار بار اپنا روئے انور آسمان کی طرف اٹھا کر دیکھتے تھے کہ شاید جبریل علیہ السلام تحویل قبلہ کا حکم لے کر نازل ہو رہے ہوں۔ آخر آپ کی دلی تمنا بر آئی اور یہ جانفزا وحی نازل ہوئی۔

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط﴾ قرآن حکیم، سورہ ۲، آیت ۱۴۴۔

(ہم دیکھ رہے ہیں (اے حبیب) تمہارے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا، اس لئے ہم تمہیں پھیر دیتے ہیں اس قبلے کی جانب جو تمہیں پسند ہے، تو اب اپنا منہ مسجد حرام کی طرف موڑ لو۔)

اس کے بعد ہمیشہ کے لئے کعبہ مکرمہ قبلہ بن گیا۔

قارئینِ کرام! قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ---الآیۃ میں پیار و محبت کی جو دنیا آباد ہے اس کی صحیح ترجمانی کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اے میرے محبوب! میرے لئے تو دونوں سمتیں برابر ہیں---کعبہ ہو کہ بیت

المقدس مگر تمہیں چونکہ کعبہ پسند ہے اور مجھے تمہاری خوشنودی و رضا مطلوب ہے، اس لئے صرف تیری رضا کی خاطر میں نے قبلہ تبدیل کر دیا ہے۔"

واضح رہے کہ اس آیت کا ابتدائی حصہ --- قَدْ نَرٰی سے تَرْضٰهَا تک --- محض رضائے مصطفیٰ کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے نازل ہوا ہے۔ ورنہ تحویل قبلہ کے حکم کے لئے تو آیت کا آخری حصہ کافی تھا۔ یعنی ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾

رہی یہ بات کہ تحویلِ قبلہ کا حکم کس مسجد میں نازل ہوا تھا --- مسجد بنی سلمہ میں یا مسجد نبوی میں؟ وحی کا نزول کس حالت میں ہوا تھا --- نماز کے دوران یا نماز سے پہلے؟ حکم تحویل کے بعد جو پہلی نماز پڑھی گئی وہ کون سی تھی --- ظہر کی یا کسی اور وقت کی؟ تو اس سلسلے میں روایات کے اندر خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اردو زبان کے بیشتر سیرت نگاروں نے اس روایت پر انحصار کیا ہے جس کو ابنِ سعد نے واقدی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ واقدی نے تو اس کو مختصراً بیان کیا تھا مگر کچھ اور راویوں نے اس میں مزید تفصیلات کا اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے یہ واقعہ بہت دلچسپ اور مزیدار ہو گیا ہے۔

واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک روز جانِ دو عالم ﷺ حضرت بشر بن البراءؓ بن معرور کی والدہ سے ملاقات کے لئے ان کے گھر محلّہ بنی سلمہ میں تشریف لے گئے تو بشرؓ کی والدہ نے دوپہر کے کھانے کا اہتمام کر دیا۔ اسی اثناء میں نماز ظہر کا وقت ہو گیا، چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ نے قبیلہ بنی سلمہ کی مسجد میں حسبِ معمول بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ظہر پڑھانی شروع کی۔ جب دو رکعتیں پڑھا چکے تو جبرئیل امین حاضر ہوئے اور اشارہ کیا کہ کعبہ شریف کی طرف منہ پھیر کر بقیہ نماز مکمل کریں۔ حکم الٰہی ملتے ہی آپ نے نماز کی حالت میں اپنا رخ کعبہ کی طرف پھیر لیا اور آپ کی اقتداء میں تمام نمازیوں نے بھی بلا تامل اپنے منہ بیت المقدس سے پھیر کر کعبہ شریف کی طرف کر لئے۔ چونکہ مدینہ طیبہ سے بیت المقدس شمال کی جانب ہے اور کعبہ شریف اس کے بالمقابل جنوب کی طرف ہے، اس لئے اس کی تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیچھے جہاں مستورات نماز ادا کر رہی تھیں، وہاں مرد آ کر کھڑے ہو گئے اور ان کی جگہ مستورات آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں

﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ج فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴿ قرآن حکیم، سورہ ۲، آیت ۱۴۴.

(ہم دیکھ رہے ہیں (اے حبیب) تمہارے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا، اس لئے ہم تمہیں پھیر دیتے ہیں اس قبلے کی جانب جو تمہیں پسند ہے، تو اب اپنا منہ مسجد حرام کی طرف موڑلو۔)

اس لئے یہ مسجد، مسجدِ قبلتین کے نام سے مشہور ہوئی۔

[طبقات ابن سعد، ج ۱، قسم ثانی، ص ۳، ۴ اور سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۱۳۷، سے ماخوذ]

اس روایت سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ واقعہ مسجد بنی سلمہ میں پیش آیا تھا، دوسری یہ کہ وحی کا نزول نماز کے دوران ہوا تھا اور تیسری یہ کہ وہ نماز ظہر کی تھی۔ لیکن صحیح بخاری میں حضرت براءؓ ابن عازب سے اس سلسلے میں جو چار روایتیں منقول ہیں، یعنی

(۱)---ج ۱، کتاب الایمان، باب الصلوٰۃ من الایمان، ص ۱۰

(۲)---ج ۱، کتاب الصلوٰۃ، باب التوجہ نحو القبلۃ، ص ۵۷

(۳)---ج ۲، کتاب التفسیر، باب ولکل وجھۃ، ص ۶۴۵

(۴)---ج ۲، کتاب اخبار الاحاد، باب ماجاء فی اجازۃ خبر الواحد، ص ۱۰۷۷

ان روایات میں نہ تو یہ بتایا گیا ہے کہ یہ واقعہ کس مسجد میں پیش آیا تھا، نہ اس کی کوئی صراحت ہے کہ وحی کا نزول کس حالت میں ہوا تھا؛ البتہ ص ۱۰ والی روایت کے مطابق حکم تحویل نازل ہونے کے بعد جو پہلی نماز پڑھی گئی تھی وہ ظہر کی نہیں؛ بلکہ عصر کی تھی---

وَاَوَّلُ صَلٰوۃٍ صَلَّاھَا صَلٰوۃُ الْعَصْرِ.

اس تعارض کو بعض محدثین نے اس طرح دور کیا ہے کہ ''اَوَّلُ صَلٰوۃٍ'' میں صَلٰوۃ سے مراد صَلٰوۃ کاملہ ہے، یعنی پوری نماز۔ مطلب یہ کہ وحی کا نزول تو نماز ظہر ہی کے دوران ہوا تھا---جیسا کہ ابن سعد کی روایت میں ہے---مگر وہ نماز چونکہ آدھی بیت المقدس کی طرف اور آدھی کعبہ کی طرف رخ کر کے پڑھی گئی تھی اس لئے حکم تحویل کے بعد پہلی پوری نماز جو کعبہ کی سمت ادا کی گئی، وہ نماز عصر تھی۔

یہ ایک اچھی توجیہ ہے---اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ تحویلِ قبلہ کی وحی نماز ظہر کے دوران نازل ہوئی تھی، حالانکہ یہ بات صحیح روایت کے خلاف ہے۔

علامہ ابن کثیر قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ---الآیۃ کی تفسیر میں سنن نسائی کے

حوالے سے یہ روایت لائے ہیں:-

حضرت ابو سعید ابن المعلّیؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہر روز مسجد (نبوی) میں جایا کرتے تھے اور وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن حسب معمول ہم مسجد کے پاس سے گذرتے ہوئے اندر گئے تو ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہیں۔ میں نے کہا کہ آج ضرور کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے۔ جب ہم وہاں بیٹھ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ ---الآیۃ تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا--- ''آؤ! ہم دو رکعت پڑھ لیں، پہلے اس سے کہ رسول اللہ ﷺ منبر سے اُتریں۔ اس طرح ہم وہ پہلے انسان ہوں گے جنہوں نے (اس آیت کے نزول کے بعد) کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔''

چنانچہ ہم نے اوٹ میں ہو کر دو رکعتیں پڑھ لیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے اور لوگوں کو نماز ظہر پڑھائی۔ [تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۱۹۳، السنن الکبریٰ للنسائی، کتاب التفسیر، باب قولہ تعالیٰ، قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ، ج ۱۰، ص ۱۷]

سبحان اللہ! حکم الٰہی کی بلا تأخیر تعمیل کرنے میں سبقت لے جانے کی کیسی دلچسپ اور معصومانہ خواہش تھی ان دونوں دوستوں کی، جسے انہوں نے فوراً پورا بھی کر لیا---!!

رضی اللہ تعالیٰ عنہما

سنن نسائی کی اس روایت اور ابن سعد والی روایت میں صرف ایک چیز مشترک ہے کہ دونوں میں نماز ظہر کا ذکر ہے، اس کے علاوہ تمام چیزیں مختلف ہیں، کیونکہ اس روایت کے مطابق یہ واقعہ مسجد نبوی کا ہے، نہ کہ مسجد بنی سلمہ کا، کیونکہ منبر صرف مسجد نبوی میں تھا۔ اس میں یہ بھی واضح طور پر مذکور ہے کہ وحی کا نزول نماز کے دوران نہیں ہوا تھا؛ بلکہ اس سے خاصا پہلے ہو چکا تھا۔ اس کے بعد آپ نے باقاعدہ منبر پر بیٹھ کر یہ آیات حاضرین کو سنائیں، پھر اتنی دیر تک منبر پر جلوہ افروز رہے کہ ابو سعیدؓ اور ان کا دوست دو رکعتیں پڑھ کر فارغ ہو گئے، تب آپ منبر سے اُترے اور نماز پڑھائی۔

یہ صورت حال عقل و نقل کے عین مطابق ہے کیونکہ تحویلِ قبلہ کے حکم کا جانِ دو عالم ﷺ کئی دن سے انتظار فرما رہے تھے اور بار بار اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھا رہے تھے، پھر ایسی کیا ایمرجنسی پیش آ گئی تھی کہ عین حالتِ نماز میں وحی اتارنی پڑ گئی---؟! یوں

بھی اس ایک موقعہ کے علاوہ میرے علم میں کوئی ایسی وحی نہیں ہے جو عین حالتِ نماز میں اُتری ہو---اور ایسا ہونا، ہے بھی خاصا بعید از امکان۔ کیونکہ نزولِ وحی کے وقت آپ پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ عمومی حالت سے یکسر مختلف ہوتی تھی جس کی وجہ سے پاس بیٹھنے والے فوراً محسوس کر لیتے تھے کہ اس وقت آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ اس دوران آپ دنیاوی اور مادی عالم سے ایک گونہ منقطع ہو جاتے تھے اور عالمِ قدس کے ساتھ ہمہ تن مربوط ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے نماز با جماعت کے اندر ایسی کیفیت کا طاری ہو جانا بعید از فہم ہے۔ اگر ایسا کبھی ہوا ہوتا تو صحابہ کرام ضرور بیان کرتے کہ فلاں وقت اور فلاں مقام پر عین نماز کے اندر آپ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا تھا اور نماز کے بعد آپ نے بیان فرمایا تھا کہ دورانِ نماز مجھ پر یہ وحی نازل ہوئی ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ منقول نہیں ہے، تو پھر صرف تحویلِ قبلہ کے لئے یہ تخصیص کیوں---؟

اگر نماز کے اندر وحی کا نزول تسلیم بھی کر لیا جائے تو اگلا مرحلہ اس سے زیادہ ناقابلِ فہم ہے۔ کیونکہ مدینہ منورہ سے بیت المقدس شمال کی جانب ہے اور کعبہ جنوب کی طرف۔ اب ذرا تصور کیجئے کہ جانِ دوعالم ﷺ شمال کی طرف منہ کئے نماز پڑھا رہے ہیں اور آپ کے پیچھے چار پانچ صفیں مردوں کی اور تین چار صفیں عورتوں کی کھڑی ہیں۔ دستور کے مطابق ایک دو صفیں بچوں کی بھی ہوں گی۔ اب اس حالت میں اگر تحویل قبلہ کا حکم نازل ہو جائے تو کیا ہوگا؟

قارئینِ کرام!

اس کے بعد میں جو کچھ لکھنے جا رہا ہوں وہ محض عقلی احتمالات اور امکانی تصورات ہیں اور مجھے اس بات سے بہت ڈر لگتا ہے کہ جانِ دوعالم ﷺ کی طرف کوئی ایسا احتمال منسوب ہو جائے جو آپ کے شایانِ شان نہ ہو، اس لئے ادباً اور احتراماً آپ کا ذکر فی الحال موقوف کرتے ہوئے فرض کر لیجئے کہ کوئی اور امام مردوں، عورتوں اور بچوں کی آٹھ دس صفوں کو نماز پڑھا رہا ہو اور سب کو نماز کے اندر شمال سے جنوب کی طرف منہ کرنا پڑ جائے تو وہ کیا کریں گے؟

کیا امام اور مقتدی اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے رہتے ہوئے جنوب کی طرف منہ کر لیں گے یا کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے؟ پہلی صورت تو ممکن نہیں ہے کیونکہ اس طرح امام

پیچھے ہو جائے گا اور مقتدی آگے۔ یقیناً یہ ایک اُلٹی اور انوکھی امامت ہوگی ---!

بصورت دیگر امام کو شمال سے جنوب کی سمت جانا پڑے گا، تو کیا وہ صفوں کو درمیان سے چیرتا ہوا دوسری طرف جائے گا یا پہلی صف کے آگے سے گھوم کر صفوں کے کنارے کنارے چلتا ہوا عورتوں کی آخری صف سے بھی پیچھے جا کر کھڑا ہوگا ---؟ بہر حال امام تو جو طریقہ مناسب سمجھے گا اختیار کر لے گا مگر ایسی حالت میں مقتدیوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ امام یہ سارے کام نماز کے اندر کر رہا ہے؟ خصوصاً اس صورت میں، جب ان کو معلوم ہی نہ ہو کہ امام کدھر جانا چاہتا ہے اور کیوں جانا چاہتا ہے ---! وہ تو یہی سمجھیں گے کہ امام نے کسی وجہ سے نماز توڑ دی ہے اور اب کسی نہ کسی طرح مسجد سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ بھی اپنی اقتداء ختم کر دیں گے اور نماز توڑ کر حیرت سے امام کی حرکات وسکنات کو دیکھنے لگیں گے۔

اگر بالفرض مقتدی کسی ناقابلِ یقین طریقے سے آخر تک اقتداء برقرار رکھنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ مرد عورتوں کی جگہ جائیں اور عورتیں مردوں کی جگہ۔ درمیان میں بچوں کو بھی کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کرنا پڑے گا --- اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ ساری ہلچل اور چلت پھرت نماز کے اندر ہو رہی ہوگی۔ سبحان اللہ! نماز نہ ہوئی پتلی تماشا ہو گیا ---!!

الغرض یہ تمام امکانی احتمالات مضحکہ خیز ہیں اور اس قابل نہیں ہیں کہ جانِ دو عالم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی طرف ان کی نسبت کا تصور کیا جائے۔ اس لئے ہمارے خیال میں صحیح منظر وہی ہے جو نسائی کی روایت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق وحی کا نزول نماز سے کافی پہلے ہو چکا ہوگا۔ اس کے بعد جانِ دو عالم ﷺ نے منبر پر جلوہ افروز ہو کر ان آیات کی تلاوت فرمائی ہوگی اور لوگوں کو اس اہم حکم کی توضیح وتفصیل بتائی ہوگی، پھر معمولِ سابق کے برعکس بالکل مخالف سمت میں نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے ہوں گے اور آپ کے پیچھے نہایت سکون واطمینان سے پہلے مردوں، پھر بچوں اور آخر میں عورتوں نے صفیں بنا کر ظہر کی نماز ادا کی ہوگی۔

عقلی وجوہ کے علاوہ محدثانہ نقطۂ نظر سے بھی نسائی کی روایت ہی قابل ترجیح ہے کیونکہ حافظ ابو عبدالرحمٰن احمد ابن شعیب النسائی عظیم الشان محدث ومحققؒ ہیں اور ان کی سنن

کبریٰ کی تلخیص جو سنن النسائی کے نام سے معروف ہے، صحاح ستہ یعنی حدیث کی چھ صحیح کتابوں میں شامل ہے؛ جبکہ محمد ابن سعد نہ خود امام نسائی کے ہم مرتبہ ہیں، نہ ان کی کتاب طبقات کبریٰ کی وہ حیثیت ہے جو سنن نسائی کی ہے۔ پھر ابن سعد نے بشرؓ کی والدہ والا واقعہ ''یُقَالُ'' (کہا جاتا ہے) کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ صیغۂ مجہول سے بیان کردہ تعلیقات مردود ہوتی ہیں۔

علاوہ ازیں طبقات ابن سعد ہی میں ایک اور بے سند تعلیق پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ جانِ دو عالم ﷺ کی اپنی مسجد، یعنی مسجد نبوی کا ہے---وَیُقَالُ صَلّٰی رَسُوْلُ اللهِ ﷺ رَكْعَتَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ فِيْ مَسْجِدِهٖ بِالْمُسْلِمِيْنَ---الخ (اور کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مسجد میں لوگوں کو ظہر کی دو رکعتیں پڑھائیں---الخ)

ایسی متضاد اور متعارض تعلیقات پر بھلا کس طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے---!

اس لئے ہمارے خیال میں صحیح بات وہی ہے اور اتنی ہی ہے جتنی کہ نسائی کی روایت میں مذکور ہے۔ اس کے علاوہ جانِ دو عالم ﷺ کا حضرت بشرؓ کی والدہ سے ملاقات کے لئے جانا اور مسجد بنی سلمہ میں نماز پڑھانا اور عین نماز کے اندر وحی کا اُترنا اور جانِ دو عالم ﷺ کا چل کر دوسری طرف جانا اور مردوں کا عورتوں کی جگہ اور عورتوں کا مردوں کی جگہ منتقل ہونا، چند عجوبہ پسند راویوں کا تیار کردہ فسانہ عجائب ہے جو نہ عقلاً درست ہے، نہ ہی نقلاً قابلِ قبول ہے۔

قارئینِ کرام! مندرجہ بالا دلائل سے یہ بھی بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ بخاری کی صلاۃ العصر والی روایت کی جو توجیہ بعض محدثین نے بیان کی ہے، وہ درست نہیں ہے کیونکہ اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اس سے پہلے جو ظہر کی نماز پڑھی گئی تھی، وہ آدھی بیت المقدس اور آدھی کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھی گئی تھی۔ حالانکہ ایسا کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا تھا؛ بلکہ حکمِ تحویل نماز سے پہلے نازل ہو چکا تھا اور وہ نماز پوری کی پوری کعبہ کی جانب رخ کر کے ادا کی گئی تھی۔ اندریں صورت کہا جا سکتا ہے کہ صلوٰۃ العصر میں ''عصر'' کا لفظ کسی راوی کی بھول چوک ہے اور صحیح صلوٰۃ الظہر ہے۔ یعنی حکمِ تحویل کے بعد سب سے پہلی نماز جو آپ نے ادا فرمائی، وہ ظہر کی تھی۔ لیکن اس میں یہ الجھن ہے کہ

صلوٰۃ العصر میں امام بخاری منفرد نہیں ہیں؛ بلکہ ترمذی کی روایت میں بھی صلوٰۃ العصر ہی مذکور ہے۔ [ترمذی، ج ۲، تفسیر سورۃ البقرہ، ص۱۲۲]

اگر کثرت روایات کی بنا پر صلوٰۃ العصر کو ترجیح دی جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ سنن نسائی میں جو نماز ظہر کا ذکر ہے، وہ کسی راوی کا اشتباہ یا تساہل ہے اور منبر سے اُتر کر جانِ دو عالم ﷺ نے جو نماز پڑھائی تھی، وہ درحقیقت ظہر کی نہیں؛ بلکہ عصر کی تھی۔

بہرحال نماز ظہر کی ہو یا عصر کی، حکمِ تحویل اس سے پہلے نازل ہو چکا تھا اور وہ پوری نماز کعبہ کے رخ پر پڑھی گئی تھی۔

اس کے بعد ایک عجیب ایمان افروز واقعہ پیش آیا جو بخاری کی اسی ص ۱۰ والی روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا چکے تو

فَخَرَجَ رَجُلٌ مِّمَّنْ صَلّٰی مَعَهٗ فَمَرَّ عَلٰی اَهْلِ مَسْجِدٍ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ، فَقَالَ: اَشْهَدُ بِاللهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قِبَلَ مَكَّةَ، فَدَارُوْا كَمَا هُمْ قِبَلَ الْبَيْتِ.

(جن لوگوں نے آپ کے ساتھ نماز عصر پڑھی تھی، ان میں سے ایک آدمی باہر نکلا اور ایک مسجد والوں کے پاس سے گذرا جو (بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے) حالت رکوع میں تھے، یہ دیکھ کر اس آدمی نے بآواز بلند کہا---''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے (ابھی ابھی) رسول اللہ کے ساتھ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے۔'' یہ سن کر وہ جس حالت میں تھے، اسی میں گھوم کر روبکعبہ ہو گئے۔)

اللہ اکبر! کس مخدوم و مطاع کو ایسے اطاعت و اتباع کرنے والے پیروکار نصیب ہوئے ہوں گے کہ رکوع سے فارغ ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا اور جوں ہی کانوں میں یہ آواز پڑی کہ جانِ دو عالم ﷺ نے مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھائی ہے، اسی وقت حالتِ رکوع میں ہی کعبے کی طرف رخ کر لیا۔

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ.

واضح رہے کہ یہ چھوٹی سی مسجد تھی اور زیادہ تر لوگ چونکہ مسجد نبوی میں نماز پڑھتے تھے اس لئے اُس مسجد میں گنے چنے چند نمازی ہوں گے۔ اتنی مختصر سی جماعت کے مخالف سمت میں منہ پھیر لینے سے وہ اُلجھنیں پیدا نہیں ہوتیں جو مردوں، بچوں اور عورتوں کی کثیر تعداد کے رُخ بدلنے سے پیش آتی ہیں۔

بہر حال یہ لوگ بھی نماز تو عصر کی ہی پڑھ رہے تھے، جیسا کہ بخاری کی دیگر روایات میں صاف مذکور ہے؛ البتہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ مسجد کون سی تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں۔

هُوَ مَسْجِدُ بَنِیْ سَلِمَةَ، وَيُعْرَفُ بِمَسْجِدِ الْقِبْلَتَيْنِ.

[عمدة القاری، ج ۱، ص ۲۸۶]

(وہ مسجد بنی سلمہ تھی، جو مسجدِ قبلتین کے نام سے مشہور ہے)

اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تحویلِ قبلہ کا حکم مسجد بنی سلمہ میں نماز ظہر کے دوران ہرگز نازل نہیں ہوا تھا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو وہ لوگ عصر کی نماز لازماً کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھتے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم ظہر کی نماز کے دوران بنی سلمہ ہی کی مسجد میں نازل ہوا اور آدھی نماز ظہر کعبے کے رُخ پر پڑھی بھی جا چکی ہو مگر عصر کے وقت بنی سلمہ پھر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں---!!

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مسجدِ قبلتین کا یہ نام اس لئے نہیں پڑا کہ اس میں جانِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی نماز دو قبلوں کی طرف منہ کر کے پڑھی تھی؛ بلکہ خود بنی سلمہ نے یہ سن کر کہ جانِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے، نماز کے دوران ہی اپنا رُخ کعبے کی طرف کر لیا تھا۔ اگرچہ ایسے واقعات چند اور مسجدوں میں بھی پیش آئے تھے مگر سب سے پہلا واقعہ چونکہ اسی مسجد میں ظہور پذیر ہوا تھا اس لئے اس کا نام مسجدِ قبلتین پڑ گیا۔

هذا ما تبين لی والحمد لله رب العلمين.

مزید وضاحت کے لئے اگلے صفحے پر نقشہ ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ نماز کے اندر قبلہ بدل جانے کی صورت میں کیا کیا مسائل پیش آئیں گے۔

نماز کے اندر قبلہ بدل جانے کی صورت میں

اکھاڑ پچھاڑ کا امکانی نقشہ

جنوب

(نیا قبلہ)

وہ جگہ جہاں امام نے پہنچنا ہے
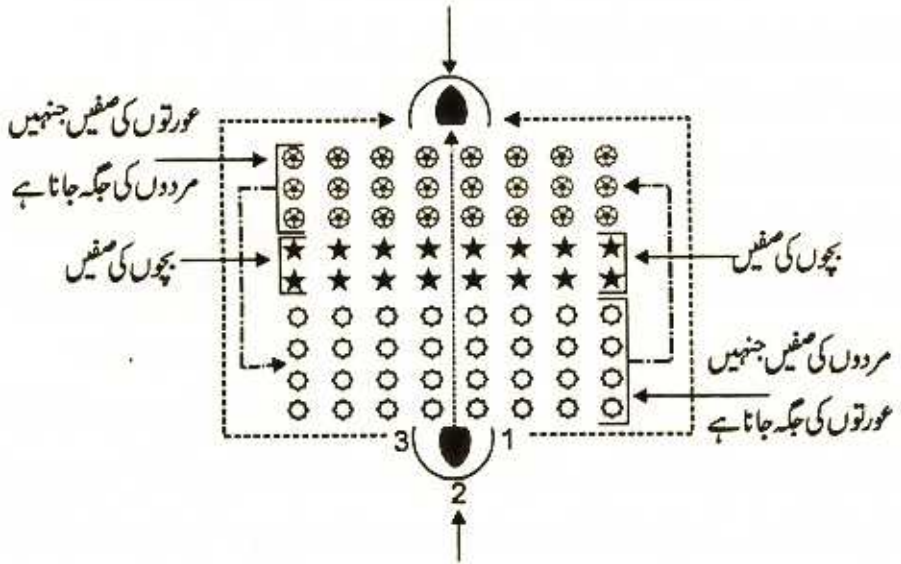
امام کے کھڑے ہونے کی جگہ اور اس کے دوسری طرف جانے کے ممکنہ راستے

(پرانا قبلہ)

شمال

اس نقشے کے مطابق سب سے زیادہ مشکل عورتوں کو پیش آئے گی کیونکہ اگر وہ شمال کی طرف رخ رکھتے ہوئے مردوں کی جگہ آئیں گی تو اس دوران، ان کے منہ قبلہ کی طرف نہیں رہیں گے کیونکہ قبلہ بدل چکا ہوگا اس صورت میں ان کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اور اگر وہ اپنی جگہوں پر جنوب کی طرف رُخ کرنے کے بعد مردوں کی جگہ آئیں گی تو انہیں اُلٹے پاؤں چل کر آنا پڑے گا اور یہ خاصا مشکل کام ہوگا؛ خصوصاً جب مردان کی جگہ منتقل ہو رہے ہوں گے اور بیچ میں بچوں کی صفیں بھی حائل ہوں گی---! اللہ ہی ان عورتوں کے حال پر رحم کرے۔

اذنِ جہاد

جانِ دو عالم ﷺ نے مکہ میں قیام کے دوران کفار کے سامنے یہ زریں اصول پیش کیا تھا کہ

کفار کو چاہئے تھا کہ اس فراخدلانہ پیش کش کو قبول کرتے ہوئے آپ کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے ---خصوصاً جب آپ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے سینکڑوں میل دور آ بسے تھے تو اب اہل مکہ کو کیا حق پہنچتا تھا کہ آپ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے اور آپ کی راہ میں روڑے اٹکاتے؟

مگر افسوس! کہ اہل مکہ نے ہجرت کے بعد بھی اپنی روش نہ بدلی اور مدینہ میں بھی آپ کو ستانے اور پریشان کرنے کی کوششوں میں لگے رہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ابو جہل نے ابن ابی کے نام ایک خط لکھا۔ ذرا اس خط کے تیور تو دیکھئے۔ لفظ لفظ سے غرور، تفاخر اور جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ بے پناہ عداوت کے بھبھوکے پھوٹتے ہیں۔

اِنَّكُمْ اٰوَيْتُمْ صَاحِبَنَا، وَاِنَّا نُقْسِمُ بِاللهِ لَتُقَاتِلُنَّهٗ وَتُخْرِجُنَّهٗ اَوْ لَنَسِيْرَنَّ اِلَيْكُمْ بِاَجْمَعِنَا حَتّٰى نَقْتُلَ مُقَاتِلَتَكُمْ وَنَسْتَبِيْحَ نِسَآءَكُمْ. (۱)

(تم نے ہمارے آدمی کو پناہ دے رکھی ہے اور ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمہیں اس کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا اور اس کو مدینہ سے نکالنا پڑے گا، ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہو کر تمہارے مردوں کو قتل کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کو اپنے استعمال میں لائیں گے۔

جانِ دو عالم ﷺ کو اس خط کا پتہ چلا تو آپ ابن ابی کے پاس تشریف لے گئے۔ (اس وقت ابن ابی نے اسلام کا لبادہ نہیں اوڑھا تھا۔) اور اسے سمجھایا کہ اگر تم ہمارے ساتھ مقابلہ کرو گے تو تمہیں اپنے ہی بھائیوں اور عزیزوں سے لڑنا پڑے گا۔

چونکہ ابن ابی کے اکثر رشتہ دار ایمان لا چکے تھے، اس لئے آپ کی بات بآسانی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یوں بھی مدینہ میں ابن ابی کی اب سنتا ہی کون تھا، اس لئے وہ مشرکین

---

(۱) ابو داؤد، ج ۲، ص ۶۷.

کے اس مطالبے کو پورا نہ کرسکا۔

یہ حربہ ناکام ہوگیا تو اہلِ مدینہ کو دہشت زدہ کرنے کے لئے مشرکین کی ٹولیاں مدینہ کے گردونواح پر حملہ آور ہوکر لوٹ مار کرنے لگیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کرز بن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کردیا اور جانِ دو عالم ﷺ کے مویشی لوٹ کرلے گیا۔ مدینہ میں اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو آپ نے چند صحابہ کی معیت میں اس کا تعاقب کیا۔ مگر دیر ہوچکی تھی اور کرز بچ کر نکل گیا تھا۔

اس زمانے میں ہروقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں مشرکین، مدینہ پر چڑھائی نہ کردیں، اس لئے صحابہ کرام رات ہو کہ دن، ہروقت مسلح رہا کرتے تھے۔

كَانُوْا لَا يَبِيْتُوْنَ اِلَّا بِالسِّلَاحِ وَلَا يُصْبِحُوْنَ اِلَّا فِيْهِ. (رات کو بھی ہتھیار بند رہا کرتے تھے اور دن کو بھی)

لیکن ابھی تک چونکہ جہاد بالسیف کی اجازت نہیں ملی تھی، اس لئے مسلمان مدینہ سے باہر نکل کر کسی پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب غریب الدیار مظلوموں کو دشمنوں پر تلوار اٹھانے کی اجازت مل گئی اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ۝﴾ (جن لوگوں کے ساتھ لڑائی کی جاتی ہے، ان کی مظلومیت کے پیشِ نظر اب ان کو بھی دشمن سے مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر یقیناً قادر ہے۔)

اس اجازت کے ساتھ ہی تاریخ اسلام ایک نئے دور میں داخل ہوگئی اور مدتوں کے ستائے ہوئے لوگ ستمگروں سے دودو ہاتھ کرنے کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ (۱)

---

(۱) آگے بڑھنے سے پہلے ایک اصولی بات کرلی جائے تاکہ سلسلۂ غزوات کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

اسلام میں جہاد کی جو اہمیت ہے، وہ ہر صاحب علم پر روشن اور واضح ہے۔ اسی جہاد کی بدولت جانِ دو عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہی عرب کا بیشتر حصہ زیرنگیں آگیا تھا۔ پھر صدیق اکبرؓ

نقشہ غزوات النبی ﷺ
ایلہ
غزوۂ موتہ
شام
جزیرہ نما
سینا
غزوۂ دومۃ الجندل
غزوۂ تبوک
بحیرہ احمر
غزوۂ خیبر
غزوۂ ذی امر
غزوۂ بنی قینقاع
غزوۂ غابہ
غزوۂ حمراء الاسد
غزوۂ احد
غزوۂ بنی نضیر
غزوۂ بدر
غزوۂ خندق
غزوۂ بدر دوم
مدینۃ المنورۃ
غزوۂ قریظہ
غزوۂ السویق
غزوۂ بنی المصطلق
غزوۂ بنی سلیم
غزوۂ بنی لحیان
غزوۂ فتح مکہ
غزوۂ حنین
غزوۂ طائف
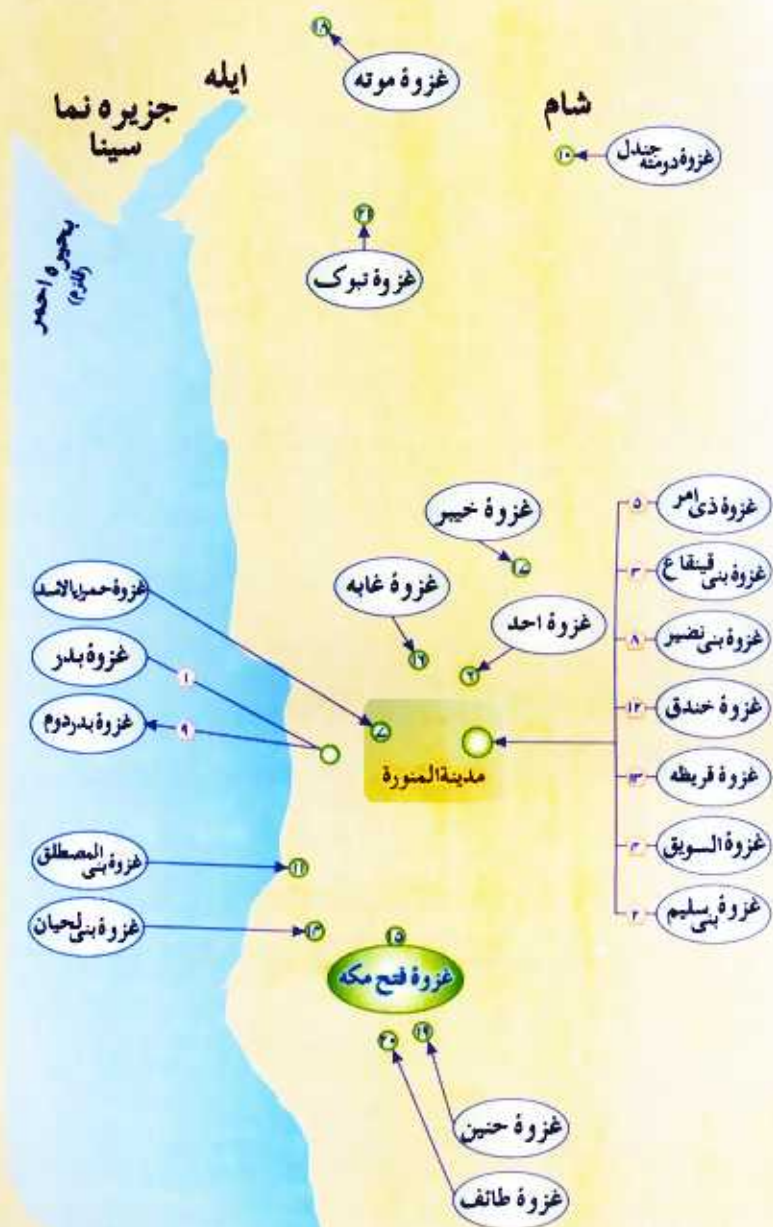
دکھتی رگ

مشرکین مکہ کی مجموعی طاقت کے مقابلے میں اہل مدینہ کی قوت نہ ہونے کے برابر تھی؛ تاہم اہل مدینہ کے ہاتھ میں مشرکین کی ایک دکھتی رگ موجود تھی اور جب بھی مشرکین مکہ، اہل مدینہ کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرتے، مدینہ والے اسی رگ پر ہاتھ رکھ دیتے

فاروق اعظمؓ اور عثمانِ غنیؓ نے اس سلسلے کو اتنا آگے بڑھایا کہ اس دور کی فتوحات پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مجاہدین اسلام ''ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ما ست'' کے جذبے سے سرشار، عرب سے نکلے اور چھوٹی موٹی ریاستوں کا تو ذکر ہی کیا، روم و ایران جیسی بظاہر ناقابل تسخیر طاقتیں ان کے عزم و ہمت کے آگے سرنگوں ہوگئیں اور ''صحرا است کہ دریا است تہہ بال وپر ماست'' کا منظر آشکارا ہوگیا۔ ہیروں سے مرصع سونے کے تاج توڑ دیئے گئے، بلند و بالا تخت پیوندِ زمین کر دیئے گئے اور جہاں تک ہوسکا، خدا کی زمین پر خدا کا قانون نافذ کر دیا گیا۔ رہی سہی کسر نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی نے پوری کردی اور آخر میں سلطان محمد عثمانی نے قسطنطنیہ فتح کر کے عیسائیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

یورپ کے مؤرخین نے جب اپنی تاریخ بد پر نظر دوڑائی اور اپنے آباء و اجداد کی شرمناک شکستوں کے حالات پڑھے تو انہیں ماضی کی اس ذلت سے نکلنے کا سوائے اس کے کوئی طریقہ نظر نہ آیا کہ اپنی مظلومیت کا رونا رویا جائے اور مسلمانوں کو خونخوار اور ظالم قوم کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مجاہدین اسلام کی ایسی لرزہ خیز تصویر بیان کی کہ ہر پڑھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ان کے نزدیک مجاہدین گویا وحشت و بربریت کے مجسمے اور سفاکی و قہرمانی کے پتلے تھے جو ہاتھوں میں خون آشام تلواریں لئے آگ اور خون کی ہولی کھیلتے ہوئے اور تہذیب و تمدن کا ہر نقش مٹاتے ہوئے دنیا بھر میں مصروف تاخت و تاراج تھے۔

اس بھیانک تصویر کا اتنا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ خود مسلمان اپنے تابناک ماضی سے محجوب و شرمندہ سے نظر آنے لگے اور اس سے گلوخلاصی کی تدبیریں کرنے لگے۔

اس دور کے اہل قلم محققین بھی اسی معاشرے کے افراد تھے، اس لئے وہ بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوگئے اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ اسلام کے دامن سے جارحیت اور پیش قدمی کا ''داغ'' کس طرح دھویا جائے۔ آخر انہوں نے یہ تدبیر کی کہ تاریخ اسلام کی تمام جنگوں کو کھینچ تان کر دفاعی

چنانچہ اسی زمانے میں حضرت سعد بن معاذؓ عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ گئے تو امیہ ابن

قرار دینا شروع کر دیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ اسلام تو ایک امن پسند مذہب ہے۔ اس کو جنگ و جدل سے کیا سروکار؟ ہاں، جب مسلمانوں پر حملے کیے گئے اور ان کو بار بار ستایا گیا تو مجبوراً انہیں بھی تلوار اٹھانا پڑی --- اور وہ بھی محض اپنے دفاع کے لئے۔

گویا سارا جھگڑا اسلامی ریاست کی بقا کا تھا، اگر کسی محدود سے خطہ زمین پر اسلامی سلطنت سلامت رہتی تو پھر دنیا بھر میں خواہ کچھ بھی ہوتا رہتا، مسلمانوں کو اس سے کوئی غرض نہ ہوتی۔ وہ اپنی عبادت و ریاضت میں مگن رہتے اور اپنی مملکت کی حدود سے ایک انچ آگے نہ سرکتے۔

اور مشرکین ساری اکڑفوں بھول جاتے۔

قارئین کرام! تصویر کے یہ دونوں رخ غلط ہیں۔ اسلام نے مجاہدین کے لئے جو ضابطۂ اخلاق مقرر کیا ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی وحشت و بربریت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ صلح و جنگ کے تفصیلی ضوابط سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہوں تو مولانا مودودی کی کتاب **الجہاد فی الاسلام** کا مطالعہ کیجئے۔

ہم یہاں صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ تاریخ اسلام کی بعض جنگیں اگرچہ دفاعی ہیں؛ تاہم تینوں خلفاء کے دور میں جو جنگیں لڑی گئیں، وہ زیادہ تر پیش قدمی کی آئینہ دار ہیں۔ ان معرکوں کی ساری تاریخ پڑھ جائیے، کہیں آپ کو یہ نظر نہیں آئے گا کہ مسلمانوں کے کسی نمائندے نے کسی دربار یا مجلسِ مذاکرات میں یہ کہا ہو کہ ہم تو محض دفاع کے لئے نکلے ہیں۔ وہ تو ایک ہی بات کہتے تھے۔ اسلام لاؤ، یا جزیہ ادا کرو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

کیا یہ انداز دفاعی جنگوں کا ہے؟

دراصل رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ دین حق کو تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے اور دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک اسلام کا پرچم لہرا دیا جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝﴾ (قرآن حکیم سورہ ۶۱، آیت ۹)

(اسی نے اپنا رسول بھیجا، ہدایت اور دین حق کے ساتھ تا کہ اس دین کو تمام ادیان پر

خلف کے ساتھ پرانی دوستی کی بنا پر اسی کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ ایک دن حضرت سعدؓ امیہ کو ساتھ لے کر طواف کے لئے نکلے، تو ابوجہل سے آمنا سامنا ہوگیا۔ ابوجہل نے امیہ سے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے بتایا کہ سعد بن معاذ ہے۔ یہ سنتے ہی ابوجہل کو غصہ آگیا اور براہِ راست حضرت سعدؓ سے گویا ہوا۔

''تم لوگوں نے ''بے دینوں'' (مسلمانوں) کو پناہ دے رکھی ہے اور ان کی ہر طرح سے امداد و تعاون کر رہے ہو! میں ہرگز یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم لوگ آ کر کعبہ کا طواف کرو۔ خدا کی قسم اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو زندہ بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔''

''اگر تم ہمیں حج اور طواف سے منع کرو گے تو ہم بھی تمہارا مدینہ والا راستہ بند کر دیں گے۔'' حضرت سعدؓ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

یہ خوفناک دھمکی سنتے ہی ابوجہل خاموش ہوگیا اور پھر کوئی بات نہ کی۔ (۱)

یہ تھی قارئین کرام! وہ دکھتی ہوئی رگ، جس پر ہاتھ دھرتے ہی ابوجہل کو چپ لگ گئی۔

غالب کر دیا جائے، اگرچہ مشرکوں کو یہ بات ناگوار گزرے۔)

اس کی مزید تشریح جانِ دو عالم ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے، جو متفق علیہ روایت سے مروی ہے۔

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَاِذَا قَالُوْهَا عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ. الحدیث

(مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لڑتا رہوں، جب تک سب لوگ لا الہ الا اللہ نہ کہہ دیں۔ جب انہوں نے یہ کلمہ پڑھ لیا تو پھر ان کے خون اور اموال محفوظ ہو جائیں گے۔)

ہاں! اگر وہ جزیہ ادا کرنے کی ذلت گوارا کرلیں --- حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ --- تو پھر بھی جان و مال محفوظ ہو جائیں گے، لیکن اس صورت میں ان سے حکومت چھن جائے گی اور انہیں محکوم و فرمانبردار ہو کر رہنا پڑے گا۔

تفصیل کا موقع نہیں ہے، ورنہ ہم اس موقف پر بیسیوں عقلی و نقلی دلائل پیش کر سکتے ہیں۔

بہرحال روحِ اسلام یہی ہے اور یہی روح بیشتر اسلامی غزوات میں کارفرما رہی۔ معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرنے سے حقیقتیں نہیں بدلا کرتیں۔

(۱) بخاری ج ۲، پہلا صفحہ۔

بات دراصل یہ ہے کہ اہل مکہ کی معیشت کا سارا دارومدار اس تجارت پر تھا جو اہل مکہ شام کے ساتھ کیا کرتے تھے، کیونکہ مکہ کی سرزمین تو ''وادی غیر ذی زرع'' (ناقابل زراعت) تھی، وہاں غلہ کی پیداوار سرے سے ہوتی ہی نہیں تھی۔ ان کی دولت اون، کھالیں اور چمڑا وغیرہ تھی۔ اہل مکہ یہ چیزیں شام لے جا کر فروخت کر دیا کرتے تھے اور وہاں سے ضروریاتِ زندگی خرید لاتے تھے۔ اس مقصد کے لئے ان کے تجارتی قافلے اکثر و بیشتر شام کی طرف آتے جاتے رہتے تھے۔ خود جانِ دوعالم ﷺ بھی ایک مرتبہ حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر شام تشریف لے گئے تھے اور شام جانے کے لئے بہر صورت مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ اگر اہل مدینہ تجارت کا یہ راستہ بند کر دیتے تو اہل مکہ فاقہ کشی پر مجبور ہو جاتے۔ ابوجہل اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا، اس لئے حضرت سعدؓ کی دھمکی سننے کے بعد اسے کچھ بولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

غزوہ اور سریہ

جانِ دوعالم ﷺ نے ایک ماہر سپہ سالار کی حیثیت سے جب حالات کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ مشرکین مکہ کی خرمستیوں کا اصل سبب ان کی معاشی آسودگی ہے جو انہیں تجارت شام کی وجہ سے حاصل ہے، اگر اس تجارت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جائیں تو ان کے غرور و تفاخر میں کافی حد تک کمی آسکتی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے آپ نے یکے بعد دیگرے متعدد مہمیں ترتیب دیں اور ان کے ذمے یہ کام لگایا کہ مکہ اور شام کے درمیان چلنے والے قافلوں پر حملے کریں اور انہیں ہراساں کریں، تاکہ مشرکین کی تجارت کا راستہ غیر محفوظ ہو جائے۔ بعض مہمات میں آپ خود بھی شریک ہوئے۔ اصطلاحاً ایسی تمام چھوٹی بڑی مہمات کو جن میں آپ خود شامل ہوئے ہوں، غزوہ کہا جاتا ہے اور جن میں آپ کی شمولیت نہ ہوئی ہو انہیں سریہ کہا جاتا ہے۔ یہ فرق ذہن نشین کر لیجیے، تاکہ آئندہ آپ کو الجھن نہ ہو۔

تین سرایا (سریہ کی جمع)

جانِ دوعالم ﷺ نے جو پہلا سریہ روانہ فرمایا، وہ تیس افراد پر مشتمل تھا اور اس کی قیادت حضرت حمزہؓ کے ہاتھ میں تھی۔ اس سریہ کا ہدف وہ تجارتی کارواں تھا جو شام سے

واپس آ رہا تھا اور اس میں ابو جہل بھی شامل تھا۔ یہ تین سو افراد پر مشتمل ایک بڑا قافلہ تھا۔ حضرت حمزہ نے ان کو ساحل سمندر کے پاس جا لیا۔ وہ بھی حضرت حمزہؓ کو دیکھ کر رک گئے اور مقابلے کے لئے صف آرا ہو گئے۔ اگر مقابلہ ہوتا تو معرکے کا رن پڑتا، کیونکہ ایک طرف اگر ابو جہل جیسا خدا اور رسول کا دشمن تھا تو دوسری جانب اللہ و رسول کا وہ شیر تھا، جس نے مکہ میں کمان مار کر ابو جہل کا سر لہولہان کر دیا تھا۔ (۱) مگر لڑائی چھڑنے سے پہلے ہی ایک مقامی شخص مجدی ابن عمر درمیان میں آ گیا اور فریقین سے لڑائی نہ کرنے کی اپیل کرنے لگا۔ مجدی اگرچہ خود مسلمان نہیں تھا، مگر مسلمانوں کے ساتھ اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ دوسری طرف اہل مکہ کے ساتھ بھی اس کی دوستی تھی۔ اب یہ اس کے اپیل کرنے کے انداز کا کرشمہ تھا یا فریقین کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ کوئی بھی اس کی بات رد نہ کر سکا اور دونوں فریق مقابلے سے دستبردار ہو گئے۔ نتیجۃً قافلہ بخیریت مکہ مکرمہ پہنچ گیا اور مسلمان مدینہ طیبہ واپس آ گئے۔ (۲)

دوسرا سریہ حضرت عبیدہؓ ابن الحارثؓ (۳) کی قیادت میں روانہ کیا گیا۔ شرکاء کی تعداد اسی [۸۰] کے لگ بھگ تھی، جن میں فاتح ایران حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ (۴) بھی

---

(۱) یہ واقعہ سید الوریٰ، ج ۱، ص ۲۰۵ پر گزر چکا ہے۔

(۲) بظاہر یہ سریہ ناکام نظر آتا ہے، لیکن بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اصل مقصد پورا ہو چکا تھا، کیونکہ سریہ کا مطمح نظر، یہ تھا ہی نہیں کہ قافلے پر بہر صورت حملہ کرنا ہے۔ وہ تو مشرکین کو صرف یہ جتانا چاہتے تھے کہ اب شام کا راستہ غیر محفوظ ہو گیا ہے اور یہ مقصد لڑائی نہ ہونے کے باوجود حاصل ہو چکا تھا۔ اسی لئے جب حضرت حمزہ نے واپسی پر رپورٹ پیش کی تو جانِ دو عالم ﷺ نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ آپ کو مجدی کی بات ماننے کی کیا ضرورت تھی؟ بلکہ آپ نے مجدی کے اس اقدام کو سراہا اور فرمایا

''مجدی ایک نیک نفس انسان ہے۔'' سیرت حلبیہ ج ۳، ص ۱۷۳۔

(۳) حضرت عبیدہؓ وہی خوش بخت صحابی ہیں کہ بوقتِ جان سپردن ان کا رخسار جانِ دو عالم ﷺ کے پائے اقدس پر رکھا ہوا تھا۔ تفصیل انشاء اللہ غزوہ بدر میں آئے گی۔

(۴) ان کا تعارف سید الوریٰ، ج ۱، ص ۱۸۳ پر گزر چکا ہے۔

شامل تھے۔ ان کا نشانہ دو سو افراد پر مشتمل وہ قافلہ تھا جو ابو سفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آرہا تھا۔ رابغ نامی جگہ میں فریقین کا تصادم ہوا، مگر معاملہ صرف تیراندازی تک محدود رہا۔

اس جنگ میں حضرت سعدؓ نے اپنے ترکش کے سارے تیر سامنے ڈھیر کر رکھے تھے اور تاک تاک کر نشانے لگا رہے تھے۔ اس دن حضرت سعدؓ کے پاس کل بیس تیر تھے، جن میں سے ایک بھی خطا نہیں ہوا۔

تیروں کی بوچھاڑ سے متعدد مشرکین بری طرح زخمی ہو گئے اور آخرکار میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے مزید تعاقب کرنا غیر ضروری سمجھا اور واپس چلے آئے۔

تیسرا سریہ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی سربراہی میں ایک اور کاروان کو دہشت زدہ کرنے کے لئے بھیجا گیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ تم نے قافلے پر اس وقت حملہ کرنا ہے جب وہ وادیٔ خرار سے گزر رہا ہو۔

حضرت سعدؓ نے خرار تک پہنچنے میں بہت احتیاط سے کام لیا اور دشمن کے مخبروں سے اوجھل رہنے کی خاطر صرف رات کی تاریکی میں دبے پاؤں سفر کیا، مگر افسوس کہ یہ ساری پیش بندی رائیگاں گئی اور حضرت سعدؓ جب وادی خرار پہنچے تو پتہ چلا کہ قافلہ ایک دن پہلے ہی وادی عبور کر چکا ہے۔ (۱)

غزوۂ ”ابواء“ یا ”ودان“ (۲)

شام کی طرف قافلہ ہائے تجارت کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع کرنا دفاعی لحاظ سے اتنی اہمیت رکھتا تھا کہ اس مقصد کے لئے ترتیب دی گئی بعض مہمات کی قیادت

---

(۱) سرایا کی ترتیب میں اختلاف ہے۔ مندرجہ بالا ترتیب علامہ قسطلانی اور دیگر کئی مؤرخین نے اختیار کی ہے اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو زرقانی ج ۱، ص ۳۶۶ تا ۳۷۴، البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۴۲ تا ۲۴۶۔

(۲) ابواء اور ودان دونوں مقامات قریب قریب ہیں۔ اس لئے بعض مؤرخین اس کو غزوہ ابواء لکھتے ہیں اور بعض ودان۔

جانِ دو عالم ﷺ نے بنفس نفیس فرمائی۔ چنانچہ پہلی مہم جس میں آپ شامل ہوئے، غزوۂ ابواء ہے۔ اس غزوہ میں صرف ساٹھ مہاجرین آپ کے ساتھ تھے۔ علم حضرت حمزہ کے ہاتھ میں تھا اور ہدف حسب سابق قریش کا ایک کاروان تھا۔ کارواں تو بچ کر نکل گیا؛ البتہ اس مہم سے یہ عظیم فائدہ حاصل ہوگیا کہ ابواء کے باشندوں سے جو بنی ضمرہ سے تعلق رکھتے تھے صلح کا معاہدہ ہوگیا۔

معاہدے کا مضمون حسب ذیل ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ

''یہ تحریر ہے محمد رسول اللہ (ﷺ) کی بنی ضمرہ کے لئے

(ا) بنی ضمرہ کے جان اور مال محفوظ ہوں گے۔

(ب) اگر بنی ضمرہ پر کوئی دشمن حملہ آور ہو، تو بنی ضمرہ کی بھرپور مدد کی جائے گی۔

(ج) بنی ضمرہ کبھی بھی اللہ کے دین کی مخالفت نہیں کریں گے۔

(د) اگر بنی ضمرہ کو رسول اللہ اپنی امداد کے لئے پکاریں تو بنی ضمرہ کے لئے آپ کی پکار پر لبیک کہنا لازمی ہوگا۔

بنی ضمرہ کے ساتھ یہ اللہ اور اس کے رسول کا عہد ہے۔''

مدینہ کے گردونواح میں آباد قبائل میں سے ایک مضبوط قبیلے کے ساتھ اس قسم کا معاہدہ ہو جانا --- اور وہ بھی کسی قسم کی لڑائی بھڑائی کے بغیر --- دفاعی نکتۂ نظر سے بلاشبہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

غزوات بواط، عشیرہ، بدرالاولیٰ

یہ تینوں غزوات تھوڑے سے عرصے میں یکے بعد دیگرے پیش آئے۔ پہلے دو غزوات کا مقصد تو وہی تھا، یعنی قافلہ ہائے تجارت پر حملے، مگر غزوہ ابواء کی طرح ان دو غزوات میں بھی دشمن سے مڈھ بھیڑ نہ ہوسکی اور جانِ دو عالم ﷺ کسی قسم کی لڑائی سے دوچار ہوئے بغیر واپس تشریف لے آئے؛ البتہ غزوہ عشیرہ میں بنی مدلج کے ساتھ ویسا ہی معاہدہ

ہو گیا، جیسا کہ بنی ضمرہ سے ہوا تھا۔

غزوہ بدر الاولیٰ کا سبب یہ ہوا کہ کرز ابن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر ڈاکا ڈالا اور مویشی لوٹ کر لے گیا، جانِ دو عالم ﷺ کو خبر پہنچی تو آپ چند اصحاب کے ساتھ اس کے تعاقب میں بدر تک تشریف لے گئے، مگر کرز کا کچھ پتہ نہ چل سکا، اس لئے واپس چلے آئے۔

سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ

مکہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ تھی جس کا نام نخلہ تھا۔ وہاں سے مشرکین کے قافلے اکثر گزرتے تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کی سرکردگی میں ایک مہم نخلہ کی طرف بھی روانہ فرمائی جو صرف بارہ افراد پر مشتمل تھی۔

ان کو روانہ کرتے وقت جانِ دو عالم ﷺ نے عبداللہ ابن جحشؓ (۱) کو ایک خط دیا

---

(۱) حضرت عبداللہ ابن جحشؓ جانِ دو عالم ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ والدہ ماجدہ کا نام امیمہ بنت عبدالمطلب ہے۔ ایک بہن سیدہ زینب بنت جحشؓ جانِ دو عالم ﷺ کی زوجہ مطہرہ اور تمام مؤمنین کی ماں ہیں۔

آپ قدیم الاسلام صحابی ہیں جو دارارقم کے زمانے سے بھی پہلے دولت اسلام سے مشرف ہو چکے تھے۔ حبشہ کی طرف دوسری ہجرت میں --- اور بقول بعض پہلی ہجرت میں بھی --- شامل تھے۔ مذکورہ بالا سریہ کا قائد بناتے وقت جانِ دو عالم ﷺ نے انہیں امیر المؤمنین کے خطاب سے نوازا تھا اور آپ کی بارگاہ سے یہ عالیشان خطاب بلاشبہ ایک عظیم اعزاز ہے۔

غزوہ احد میں لڑتے لڑتے ان کی تلوار ٹوٹ گئی تو جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو کھجور کی ایک سوکھی شاخ دی اور فرمایا --- "اس سے لڑو!"

انہوں نے وہ لکڑی ہاتھ میں لی تو مختارِ کونین آقا کا یہ حیران کن معجزہ رونما ہوا کہ وہ لکڑی ان کے ہاتھ میں جاتے ہی تیز دھار تلوار بن گئی۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ تلوار چونکہ کھجور کی ٹہنی سے بنی تھی اور کھجور کی ٹہنی کو عُرجُون کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر اس تلوار کو بھی عرجون کہا جاتا تھا۔

شہادت کے لئے ہمیشہ بے تاب رہتے تھے --- شہادت بھی کیسی --- ؟ اللہ اکبر ☜

اور فرمایا۔

''میرا یہ خط فی الحال سنبھال کر رکھ لو، دو دن بعد اس کو کھول کر دیکھنا اور اس کے

---جس کے تصور سے ہی ناتواں دل کانپ کر رہ جائے۔

غزوہ احد سے ایک دن پہلے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کے پاس گئے اور کہنے لگے

''سعد! آؤ، ایک گوشے میں بیٹھ کر دونوں دعا کریں۔ ہر شخص اپنی پسند کے مطابق دعا کرے اور دوسرا آمین کہے کہ اس طرح دعا کے قبول ہونے کا زیادہ امکان ہے۔''

حضرت سعدؓ کو بھی یہ بات پسند آئی اور دونوں ایک کونے میں بیٹھ کر دعا کرنے لگے۔

پہلے حضرت سعدؓ نے دعا کی---''یا اللہ! کل جب لڑائی شروع ہو تو میرا مقابلہ ایسے زبردست بہادر سے ہو جو مجھ پر بھرپور حملہ کرے اور میں بھی اس پر زوردار حملہ کروں، آخرکار مجھے فتح حاصل ہو جائے، میں اس کو مار ڈالوں اور اس کا مال غنیمت بھی حاصل کر لوں۔'' حضرت عبداللہؓ نے آمین کہی۔

پھر حضرت عبداللہؓ نے دعا کی---''یا اللہ! کل میرے مقابلے میں بھی کسی بڑے سورما کو بھیج، جو مجھ پر سخت حملہ کرے اور میں اس پر شدید حملہ کروں، آخر وہ مجھے قتل کر ڈالے اور میرے ناک کان بھی کاٹ لے۔ پھر قیامت کے دن جب میں تیرے روبرو پیش کیا جاؤں اور تو مجھ سے پوچھے کہ عبداللہ! تیرے ناک کان کیوں کاٹے گئے تھے؟ تو میں عرض کروں کہ باری تعالیٰ! تیرے اور تیرے رسول کے راستے میں کاٹے گئے تھے، پھر تو کہے کہ سچ ہے، میرے ہی راستے میں کاٹے گئے تھے۔''

اس دعا پر حسب وعدہ حضرت سعدؓ نے آمین کہی۔

دوسرے روز لڑائی ہوئی تو دونوں کی دعائیں ٹھیک اسی طرح قبول ہوئیں جس طرح مانگی گئی تھیں۔

حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ میری دعا سے عبداللہ کی دعا بہتر تھی، میں نے شام کو دیکھا کہ ان کے ناک کان ایک دھاگے میں پروئے ہوئے تھے۔

مطالعۂ تاریخ کے دوران میری نظر سے ایسا کوئی جیالا نہیں گزرا جس نے اس قسم کی شہادت کی تمنا کی ہو، پھر اس کے لئے دعا کا اہتمام کیا ہو اور دوسرے سے آمین کہلوائی ہو۔

اس جنگ میں ایک اور شیر مرد بھی بالکل اسی انداز سے شہید کیا گیا تھا، یعنی سید الشہداء حمزہ شاید اسی مناسبت سے دونوں جانبازوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُمَا

(تمام واقعات اصابہ، استیعاب اور طبقات ابن سعد، ذکر عبداللہ بن جحش سے ماخوذ ہیں۔)

مطابق عمل کرنا؛ البتہ اپنے ساتھیوں کو اس بات پر مجبور نہ کرنا کہ وہ بہر حال تمہارا ساتھ دیں۔' (یعنی اگر کوئی اس مہم میں شریک نہ ہونا چاہے تو اس کو واپس جانے کی اجازت دے دی جائے۔)

حضرت عبداللہؓ نے جب ارشاد دو دن کے بعد مکتوب گرامی کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ تم نخلہ میں جا کر قیام کرو اور ہمیں قریش کے حالات سے مطلع کرتے رہو۔(۱)

حضرت عبداللہؓ نے ساتھیوں کو خط کے مضمون سے آگاہ کیا اور کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کا حکم بسر و چشم قبول ہے اور میں اس پر بہر صورت عمل کروں گا، اگر تم لوگوں کے دلوں میں بھی شہادت کی تمنا اور تڑپ ہو تو میرا ساتھ دو؛ تاہم اگر کوئی واپس جانا چاہے تو جا سکتا ہے۔

وہاں پیچھے ہٹنے والا بھلا کون تھا---؟ سب نے عبداللہؓ کا ساتھ دیا اور نخلہ کی جانب سفر جاری رکھا۔

ایک دن بحران نامی جگہ پر ان لوگوں نے پڑاؤ کیا تو ایک اونٹ گم ہو گیا جس پر حضرت سعدؓ اور ایک دوسرے صحابی باری باری سفر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات تو

---

(۱) قابل غور بات یہ ہے کہ اس مکتوب میں کسی قافلے پر حملے کا کوئی حکم نہیں ہے حالانکہ اس سے پہلے تمام مہمات قافلوں پر حملوں کے لئے ہی روانہ کی جاتی رہیں!

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نخلہ دشمنوں کے ہیڈ کوارٹر مکہ کے بالکل قریب واقع تھا؛ جبکہ مدینہ سے اس کا فاصلہ کئی سو میل تھا۔ پھر اس مہم میں صرف بارہ؛ بلکہ بقول ابن ہشام صرف آٹھ افراد شامل تھے۔ اوّل تو اس مختصر سی جمعیت کا دشمن کی سرزمین میں سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے نخلہ تک پہنچنا ہی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ پھر وہاں قیام کرنا اس سے زیادہ خطرناک تھا، کیونکہ کسی بھی وقت دشمن حملہ آور ہو کر سب کو تہہ تیغ کر سکتا تھا۔ ان حالات میں کسی قافلے پر حملہ کرنا، اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس لئے ان کو صرف یہ حکم دیا گیا کہ نخلہ میں قیام کریں اور دشمن کی نقل و حرکت سے مطلع کرتے رہیں۔

اونٹ کی تلاش میں روانہ ہو گئے اور حضرت عبداللہؓ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ سفر جاری رکھتے ہوئے ماہِ رجب کے آخری ایام میں نخلہ پہنچ گئے۔

اتفاق سے انہی دنوں شامت کا مارا ایک قافلہ بھی نخلہ میں آ کر رکا۔ یہ قافلہ شام سے واپس آیا تھا اور تجارتی سامان سے لدا پھندا تھا۔ مکہ کا ایک رئیس عمر بن حضرمی بھی اس قافلے کے ہمراہ تھا۔ ان لوگوں نے جب دیکھا کہ نخلہ میں ہی کچھ اور لوگوں نے بھی ڈیرے ڈال رکھے ہیں تو خوفزدہ ہو گئے اور یہاں سے کوچ کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔

مسلمانوں نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو ان کا خوف دور کرنے کے لئے حضرت عکاشہؓ (۱) نے یہ تدبیر کی کہ اپنا سر منڈا دیا۔ عکاشہؓ کا منڈا ہوا سر دیکھ کر قافلے والوں نے سمجھا کہ

---

(۱) حضرت عکاشہؓ بہت خوبصورت انسان ہوئے ہیں۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں۔

كَانَ مِنْ اَجْمَلِ النَّاسِ. (تمام لوگوں سے زیادہ حسین و جمیل تھے۔) تلخیص المستدرک ج ۳، ص ۲۲۸.

تمام غزوات میں جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ شامل رہے۔ دورِ صدیقی میں مرتدین کے خلاف جہاد کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

ایک دن جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا --- ''میری امت میں ستر ہزار افراد بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے، ان کے چہرے چاند کی طرح تابناک ہوں گے۔''

حضرت عکاشہؓ نے فی الفور عرض کی --- ''یا رسول اللہ! دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں شامل فرما دے۔''

آپ نے فرمایا ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ مِنْهُمْ'' (اے اللہ! عکاشہ کو ان میں سے کر دے۔)

بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا ''اَنْتَ مِنْهُمْ'' (تم ان میں سے ہو۔)

حضرت عکاشہؓ کو اتنا بڑا مرتبہ ملتے دیکھ کر ایک اور شخص اٹھا اور عرض کی۔

''یا رسول اللہ! میرے لئے بھی یہی دعا فرما دیجئے۔''

آپ نے فرمایا ''سَبَقَكَ بِهَا عُكَاشَةُ.'' (عکاشہ تم سے سبقت لے گیا ہے۔)

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ.

(بخاری ج ۲، ص ۹۶۹)

یہ لوگ ابھی ابھی عمرہ کر کے واپس آ رہے ہیں، اس لئے ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ چنانچہ مطمئن ہو کر اونٹوں کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود کھانے پکانے کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔

مسلمانوں کو اگرچہ صرف قیام کرنے کا حکم دیا گیا تھا، مگر وہ لوگ قافلے کو یوں اپنی دسترس میں دیکھ کر صبر نہ کر سکے اور اس پر حملے کے لئے تیار ہو گئے، لیکن مسئلہ بیچ میں یہ آ پڑا کہ اس دن رجب کی آخری تاریخ تھی اور رجب ان چار مہینوں میں سے ایک ہے جن میں لڑائی فریقین کے نزدیک ممنوع تھی۔ (۱) اب اگر ان پر حملہ کیا جاتا تو اشہر حرم (وہ مہینے جن میں لڑائی حرام ہے۔) میں لڑائی کے گناہ کا ارتکاب لازم آتا اور اگر ایک دن تاخیر کی جاتی تاکہ رجب کا مہینہ نکل جائے تو اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ قافلے والے یہاں سے کوچ کر کے حدود حرم میں داخل ہو جاتے اور ہر خطرے سے محفوظ ہو جاتے کیونکہ حدود حرم میں بھی جنگ کرنا منع تھا۔

بہر حال صلاح مشورے کے بعد طے ہوا کہ خواہ کچھ ہو، آج حملہ ضرور کیا جائے گا۔

---

(۱) حرمت والے مہینے چار ہیں۔ تین یکجا، یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور ایک علیحدہ یعنی رجب۔

ان چار مہینوں میں لڑائی بند رہنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ حج اور عمرہ کے ایام تھے اور اہل عرب --- خصوصاً قریش چاہتے تھے کہ حج و عمرہ کے لئے آنے والوں کو راستے میں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو اور وہ پورے احساسِ تحفظ کے ساتھ سفر کر سکیں۔

حج کے لئے چونکہ لوگ بہت دور دراز سے سفر کر کے آتے تھے۔ اس لئے یہ تین مہینے امن کے قرار دیئے گئے، یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ ایک مہینہ آنے کے لئے، ایک جانے کے لئے اور ایک مکہ مکرمہ میں قیام کے لئے۔

رجب میں اہل عرب عمرہ کیا کرتے تھے، مگر اس کے لئے بہت دور سے سفر کر کے نہیں جاتے تھے۔ صرف گرد و نواح اور قریبی آبادیوں کے لوگ اس سعادت سے بہرہ مند ہوا کرتے تھے، اس لئے عمرے کے لئے صرف ایک مہینہ کافی سمجھا گیا یعنی رجب۔ چونکہ اس طریق کار سے حاجیوں کو خاصی سہولت تھی، اس لئے اسلام نے بھی ان مہینوں کی حرمت کو برقرار رکھا، تاکہ حجاج کرام پورے اطمینان سے فریضۂ حج ادا کر سکیں۔

چنانچہ حملہ کیا گیا اور بھرپور انداز میں کیا گیا۔ حملے کے دوران قافلے کا سربرآوردہ شخص عمرا ابن حضرمی مارا گیا اور عثمان ابن عبداللہ اور حکم ابن کیسان گرفتار ہو گئے۔ باقی افراد سارا مال و متاع چھوڑ کر، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور مکہ میں جا کر دم لیا۔

حضرت عبداللہ ابن جحشؓ مال غنیمت سے لدے ہوئے اونٹ اور دو قیدی لے کر شاداں و فرحاں مدینہ پہنچے، مگر آہ! کہ جس دلدار کی رضا کی خاطر جان جوکھم میں ڈال کر یہ معرکہ سر کیا تھا، وہ بجائے خوش ہونے کے الٹا برہم ہو گیا۔ اس کو نہ ان کی فتح مبین پر کوئی خوشی ہوئی، نہ مال غنیمت اور قیدیوں کو دیکھ کر اس کے روئے زیبا پر مسرت کی کوئی کرن چمکی---کیوں---؟ صرف اس لئے کہ اس کے خیال میں ان لوگوں نے رجب کی آخری تاریخ میں حملہ کر کے اشہر حرم کی حرمت و تقدس کو پائمال کر دیا تھا اور وہ کالی کملی والا سردار اپنے دشمنوں اور خون کے پیاسوں کے ساتھ بھی کوئی غیر اصولی حرکت کرنے کا روادار نہ تھا---صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ---چنانچہ اس نے ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا---"مَا اَمَرْتُكُمْ بِقِتَالٍ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ" (میں نے تمہیں اشہر حرم میں لڑائی کا ہرگز کوئی حکم نہیں دیا تھا۔)

اس نے مال غنیمت قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا اور قیدیوں کا معاملہ بھی التواء میں ڈال دیا۔

سردار عالی وقار کی ناراضگی کو دیکھ کر شرکاء سریہ غم واندوہ میں ڈوب گئے۔ وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ هَلَكُوْا، اور انہیں گمان ہوا کہ ہم ہلاک ہو گئے۔

میں نے قائی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاج یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

آخر اللہ تعالیٰ کو ان کی پریشانی اور آزردگی پر رحم آ گیا اور اس نے ایسی آیات نازل فرما دیں جن میں اشہر حرم کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی مجاہدین کے اس اقدام کو

جائز قرار دے دیا اور حضرت عبداللہ ابن جحش کے نظریے کی حرف بحرف تائید کر دی۔(۱)

قیدیوں کو چھڑانے کے لئے مشرکین نے فدیہ کی رقم بھیجی، مگر اس وقت تک وہ دو صحابی واپس نہیں آئے تھے جو اونٹ کی تلاش میں چلے گئے تھے۔ اس لئے جانِ دو عالم ﷺ

---

(۱) حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کا نظریہ یہ تھا کہ مکے کے کفار و مشرکین اس بات کے مستحق ہی نہیں ہیں کہ انہیں اشہر حرم میں تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ جب مشرکین نے خود سرزمین حرم کے تقدس کا کبھی خیال نہیں رکھا اور اس دارالامان میں ہم پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے، ہمیں وطن سے بے وطن کیا اور فتنہ و فساد کا بازار گرم کئے رکھا تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم ان کی حفاظت کی خاطر اشہر حرم کے تقدس کو ملحوظ رکھتے پھریں---! اگر یہ گناہ ہے تو مشرکین ہم سے ہزار درجہ زیادہ گناہ گار ہیں۔ کیونکہ وہ ارض مقدس کی حرمتوں کو پامال کرنے کے علاوہ اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کے بھی مجرم ہیں۔ ایسے سرکش اور نافرمان بھلا کب کسی رو رعایت کے مستحق ہوئے ہیں؟!

ملاحظہ فرمایئے! حضرت عبداللہؓ اپنے موقف کو کس خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ اس نظم کے چند شعر ہیں جو انہوں نے اس وقت کہی تھی جب مشرکین مکہ نے سارا زور اس پروپیگنڈے پر صرف کر رکھا تھا کہ محمد کے ساتھیوں نے اشہر حرم کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت عبداللہ ان کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

لَا فِی الْحَرَامِ عَظِیمَۃٌ
وَاَعْظَمُ مِنْہُ ، لَوْ یَرَی الرُّشْدَ رَاشِدٌ
صُدُوْدُ کُمْ عَمَّا یَقُوْلُ مُحَمَّدٌ
وَکُفْرٌ بِہٖ ، وَاللّٰہُ رَاءٍ وَّ شَاھِدٌ
وَاِخْرَاجُکُمْ مِنْ مَسْجِدِ اللّٰہِ اَھْلَہٗ
لِئَلَّا یُرٰی لِلّٰہِ فِی الْبَیْتِ سَاجِدٌ
سَقَیْنَا مِنَ ابْنِ الْحَضْرَمِیِّ رِمَاحَنَا
بِنَخْلَۃَ ، لَمَّا اَوْقَدَ الْحَرْبَ وَاقِدٌ

(ابن ھشام ج ۲، ص ۵۸) ☜

نے فرمایا، کہ قیدی اس وقت تک نہیں چھوڑے جائیں گے، جب تک ہمارے آدمی واپس نہ آ جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ تم لوگوں نے ان کو قتل کر دیا ہو، اس صورت میں ان کے بدلے ہم قیدیوں کو قتل کریں گے۔

(تم نے ماہ حرمت میں ایک آدمی کے قتل کو بڑا جرم سمجھ رکھا ہے، حالانکہ اگر کوئی ہدایت کا متلاشی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرے تو اس کو پتہ چلے گا کہ تم نے تو اس سے بھی بڑے جرم کر رکھے ہیں۔ تم نے محمد ﷺ کی بات نہیں مانی اور ان کے ساتھ کفر کے مرتکب ہوئے ہو۔ یقین رکھو کہ اللہ تمہاری ساری حرکتوں کو دیکھ رہا ہے اور ان پر گواہ ہے۔ تم نے اللہ کی مسجد سے مسجد والوں کو نکال باہر کیا ہے تاکہ اللہ کے گھر میں کوئی ایک بھی ایسا آدمی نظر نہ آئے جو اس وحدہٗ لاشریک کے آگے سجدہ ریز ہوتا ہو۔ ہاں! ہمیں اعتراف ہے کہ ہم نے نخلہ میں ابن حضرمی کے خون سے اپنے نیزوں کو خوب سیراب کیا --- جب ہمارے ایک ساتھی واقد نے (ابن حضرمی پر تیر چلا کر) جنگ کا آغاز کیا۔)

یہ تھا عبداللہ ابن جحشؓ کا نظریہ --- اور ان اہل وفا کے خلوص و صداقت کا اثر دیکھئے کہ بعد میں بعینہٖ یہ موقف اللہ رب العزت نے بھی اختیار فرمایا اور کہا کہ بلاشبہ اشہر حرم میں لڑائی اور قتل کرنا گناہ ہے، مگر مشرکین تو اس سے کہیں بڑے جرائم کے مرتکب ہیں، پھر وہ کس منہ سے مسلمانوں کو لڑائی اور قتل کا طعنہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ارشاد ربانی۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ط قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ط وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ق وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ج وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ط (سورۃ ۲، آیۃ ۲۱۸)

(اے نبی! تجھ سے حرمت والے مہینے میں لڑائی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہدو کہ اس میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے، لیکن اللہ کی راہ سے روکنا، کفر کرنا، مسجد حرام میں نہ جانے دینا اور اس میں عبادت کرنے والوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک لڑائی سے بھی بڑا جرم ہے اور فتنہ و فساد پھیلانا قتل سے کہیں بڑھ کر ہے۔)

دیکھا آپ نے مجاہدین کی حمایت و تائید کا یہ انوکھا انداز! --- سبحان اللہ!

مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی اور وہ دونوں بخیریت واپس آ گئے۔ چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ نے بھی فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کر دیا؛ البتہ مالِ غنیمت کا مسئلہ خاصی دیر تک التواء میں رہا۔ آخر غزوۂ بدر سے واپسی پر آپ نے وہ مال مجاہدین میں تقسیم فرما دیا۔(۱)

یہ آیت نازل ہوئی تو مجاہدین کے چہروں پر رونق اور شادمانی لوٹ آئی۔ وہ اس آیت کے بین السطور سے سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ ناراض نہیں ہے؛ تاہم یہ الجھن ان کو پریشان کر رہی تھی کہ ایسی خطرناک مہم سر کرنے پر ہمیں کوئی اجر بھی ملے گا کہ نہیں؟

اللہ تعالیٰ نے ان کی مزید دلداری کرتے ہوئے فرمایا

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (سورة ۲، آية ۲۱۹)

(جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور راہِ خدا میں جہاد کیا، وہ بلاشبہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔)

یوں ان کو اپنی بے پایاں رحمت کی امید بھی دلا دی --- وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ.

(۱) زرقانی ج ۱، ص ۴۷۸، ۴۸۱، ابنِ هشام ج ۲، ص ۵۷، ۵۸.

باب ۵

غزوۂ بدر

یَوۡمَ الۡفُرۡقَانۡ ------- یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعَانۡ

سرفروشانہ جذبوں کی لازوال داستان

غزوۂ بدر

یہ غزوہ تاریخ اسلام میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی جگمگاتی روشنیوں نے کفر و شرک کی ظلمتوں کا سینہ چاک کر دیا اور چار دانگِ عالم میں نورِ اسلام کی ضو فشانی کے لئے راہ ہموار کر دی۔

غزوۂ بدر ، وہ تاریخ کا بابِ زریں — لے کے آیا جو مسلماں کے لئے فتح مبیں
تمتما اٹھی مسرت سے مشیت کی جبیں — یوں صف آرا ہوئے آئین رسالت کے امیں
دین کی راہ میں وہ مرحلۂ جرأت و شوق — اپنی منزل کو رواں قافلۂ عزم و یقیں
سرِ میداں نکل آئے جو علی و حمزہ — تنگ یک بارہ ہوئی عتبہ و شیبہ پہ زمیں
سرفروشانہ لڑے ایسے فدایانِ رسولؐ — کہ فرشتوں کے لبوں پہ تھی صدائے تحسیں
ساز و ساماں پہ کوئی تکیہ، نہ خوفِ اعدا — فقط اللہ کا پیمان تھا وجہِ تسکیں

گر اسے بدر کا عنواں نہ میسر آتا
داستاں ملتِ بیضا کی نہ ہوتی رنگیں

حفیظ نائب

۱۷ رمضان ۲ھ میں پیش آنے والا یہ معرکہ اپنے اندر سرفروشی و جانبازی، ایثار و قربانی اور عشق و محبت کی لازوال داستانیں سمیٹے ہوئے ہے۔ افسوس! کہ اردو زبان کے بیشتر سیرت نگاروں نے اس غزوہ کے حالات بیان کرتے ہوئے نہایت اختصار سے کام لیا ہے اور بہت سے ایمان افروز اور ولولہ انگیز واقعات کو ترک کر دیا ہے۔ علامہ شبلی --- اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے --- جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں، مگر غزوہ بدر کے واقعات بیان کرنے میں انہوں نے بھی اختصار ہی ملحوظ رکھا اور زیادہ زور اس

نقشۂ میدانِ بدر
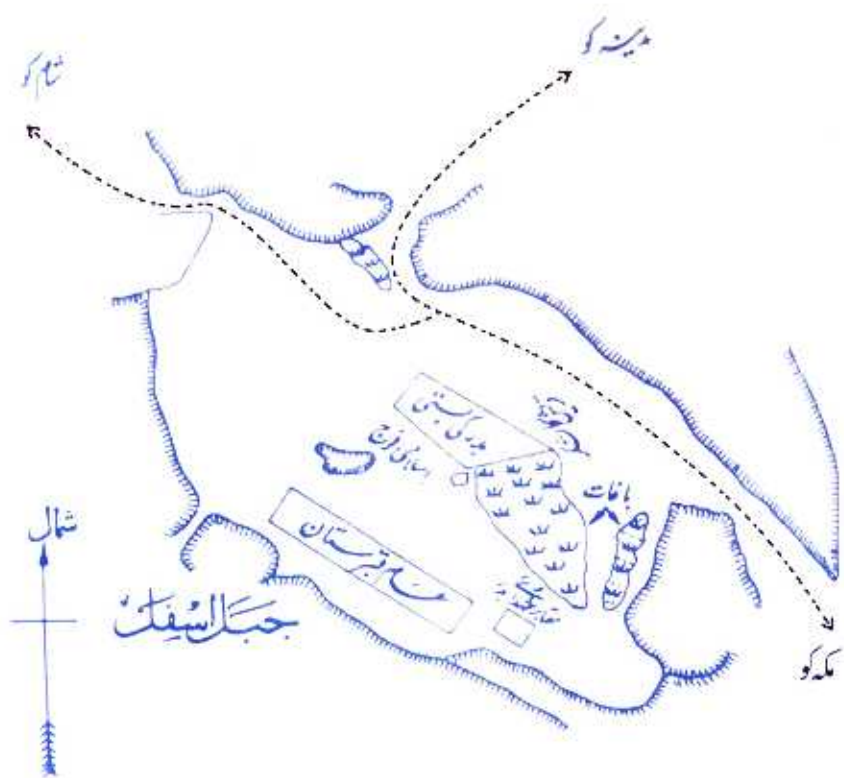
بات پر صرف کر دیا کہ یہ جنگ دفاعی تھی اور رسول اللہ ﷺ کسی قافلے پر حملہ کرنے کے لئے نہیں؛ بلکہ مشرکین کے حملے کا دفاع کرنے مدینہ منورہ سے باہر نکلے تھے۔ چونکہ یہ موقف صحیح احادیث، تاریخی روایات اور مفسرین، محدثین اور ارباب سیرت کے اجماع کے یکسر خلاف تھا، اس لئے اس کو ثابت کرنے کے لئے علامہ شبلی کو بہت محنت اور کدّ و کاوش کرنی پڑی اور بیس صفحات اس تحقیق کی نذر ہو گئے۔

بہر حال انہوں نے جس بات کو حق سمجھا، پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ پیش کر دیا۔ ہمیں ان کی ہمہ گیر علمیت اور بے مثال عظمت کا اعتراف ہے۔ ساتھ ہی اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا بھی احساس ہے، مگر بایں ہمہ ہمیں ان کے موقف سے اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح صورت حال وہی ہے، جو تمام مفسرین، محدثین اور سیرت نگاروں کے ہاں مسلم رہی ہے اور کثرتِ روایات کی بنا پر تواتر معنوی تک پہنچ چکی ہے۔ اس لئے ہم غزوۂ بدر کو اس کی اصلی صورت میں پیش کریں گے --- اس طرح اگرچہ قدرے طوالت ہو جائے گی، مگر اس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی تو نہیں، کیونکہ خاموش رہنے کی صورت میں ایک ہستی کی ذاتی رائے تاریخ کا حصہ بن جائے گی اور آنے والی نسلوں کی نگاہوں سے اس غزوہ کے صحیح خد و خال ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جائیں گے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ.

صحیح صورت حال

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مشرکین مکہ کی خرمستیوں کا اصلی سبب ان کی معاشی خوشحالی تھی جو تجارتِ شام کی وجہ سے ان کو حاصل تھی۔ چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ نے اس تجارت کا راستہ روکنے کے لئے تجارتی کاروانوں پر حملوں کی منصوبہ بندی فرمائی اور اس مقصد کے لئے متعدد مہمیں روانہ فرمائیں۔ بعض مہمات میں آپ بنفس نفیس بھی شامل ہوئے، جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

۲ھ میں آپ کو اطلاع ملی کہ ایک بڑا کاروانِ تجارت ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آ رہا ہے، چنانچہ آپ نے صحابہ کرام کو جمع کیا اور فرمایا۔

''قریش کا ایک بڑا قافلہ بہت سا مال اور سامان لے کر شام سے آ رہا ہے، اس پر حملے کی تیاری کرو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مال ومتاع اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمادے۔''

اس سے پہلے قافلوں پر حملے کے لئے جو مہمات روانہ کی جاتی رہیں، ان کے لئے آپ نے کبھی عمومی اعلان نہیں فرمایا تھا۔ صرف مہاجرین میں سے چند افراد کو منتخب کر کے روانہ فرمادیا کرتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپ نے مہاجرین وانصار دونوں کو نکلنے کا حکم دیا تھا، اس لئے انصار نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اکثریت سے شمولیت کے لئے تیار ہوگئے۔ اس طرح مجموعی تعداد تین سو سے بڑھ گئی، جن میں ساٹھ ستر مہاجرین تھے، باقی سب انصار تھے۔

چنانچہ آٹھ رمضان کو جانِ دو عالم ﷺ مدینہ سے باہر نکلے اور اس کاروانِ عشق کی قیادت فرماتے ہوئے بدر کی جانب چل پڑے، کیونکہ اطلاعات کے مطابق قافلے کا رخ اسی طرف تھا۔

ابو سفیان کی چالاکی

ابوسفیان کے مخبروں نے جب اس کو اطلاع دی کہ جانِ دو عالم ﷺ متعدد ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے ہیں تو وہ سخت خوفزدہ ہوگیا، اسی وقت ایک تیز رفتار قاصد ضمضم غفاری کو تیار کیا اور اسے ہدایت کی کہ جتنی جلدی ہوسکے، مکہ پہنچو اور اہل مکہ سے کہو کہ اگر اپنے مال واسباب کو محمد اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ لگنے سے بچانا چاہتے ہو تو فوراً پہنچو۔

ضمضم منزلوں پر منزلیں مارتا ہوا بہت جلد مکہ پہنچ گیا۔ اپنی فریاد کو مزید مؤثر بنانے کے لئے اس نے اونٹ کے ناک کان کاٹ ڈالے، کجاوہ الٹا کر دیا اور اپنا گریبان پھاڑ کر نہایت دردناک آواز میں چلانے لگا۔

''یَامَعْشَرَ قُرَیْشٍ! اَللَّطِیْمَۃُ، اَللَّطِیْمَۃُ اَمْوَالُکُمْ مَعَ اَبِیْ سُفْیَانَ قَدْ عَرَضَ لَھَا مُحَمَّدٌ فِیْ اَصْحَابِہٖ لَآ اَرٰی اَنْ تُدْرِکُوْھَا. اَلْغَوْثُ، اَلْغَوْثُ.''

(اے جماعتِ قریش! قافلے کو پہنچو، قافلے کو پہنچو۔ ابوسفیان تمہارا جو مال لے کر

آ رہا ہے، اس پر محمد اور اس کے ساتھیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ مجھے امید نہیں ہے کہ تم اس کو پہنچ سکو۔ فریاد ہے، فریاد ہے۔)

ضمضم کا واویلا سن کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور کہنے لگے۔۔۔ "محمد اور اس کے ساتھیوں نے اس قافلے کو بھی عمرابن حضرمی کے قافلے کی طرح تر نوالہ سمجھا ہوگا، مگر اس دفعہ انہیں پتہ چل جائے گا کہ معاملہ دگرگوں ہے۔"

اس طرح بظاہر تو انہوں نے شجاعت وحمیت کا مظاہرہ کر دیا، مگر اندر سے سب کے دل لرز رہے تھے، کیونکہ تین دن پہلے جانِ دو عالم علیہ السلام کی پھوپھی عاتکہ نے ایک دہشت ناک خواب دیکھا تھا۔ اگرچہ اس کی دہشت کم کرنے کے لئے ابوجہل نے استہزاء و تمسخر شروع کر دیا تھا، مگر پھر بھی سب کے دلوں میں ایک خوف سا بیٹھا ہوا تھا۔

عاتکہ کا خواب

عاتکہ نے دیکھا کہ ایک شتر سوار مکہ سے باہر کھڑا ہے اور بآوازِ بلند کہہ رہا ہے۔

"یَا اَھْلَ غُدُرٍ! اِنْفِرُوْا اِلٰی مَصَارِعِکُمْ فِیْ ثَلَاثٍ." (اے دھوکے بازو! تین دن کے بعد اس طرف روانہ ہو جاؤ، جہاں تم نے قتل ہو کر گرنا ہے۔)

اس کی آواز سن کر مجمع لگ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہاں سے چل کر وہ سوار مسجدِ حرام میں آیا اور اچانک عاتکہ نے دیکھا کہ اب وہ سوار کعبہ کی چھت پر کھڑا ہے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر وہی اعلان کر رہا ہے۔۔۔ یَا اَھْلَ غُدُرٍ!...... پھر دفعۃً وہی سوار جبل ابوقبیس پر نظر آیا اور یہی اعلان کرنے لگا۔۔۔ یَا اَھْلَ غُدُرٍ...... اس کے بعد اس نے جبل ابوقبیس کی چوٹی سے ایک پتھر نیچے کی طرف لڑھکا دیا۔ وہ پتھر تھوڑا نیچے آیا تو ٹوٹ گیا اور اس کے ٹکڑے اُڑ اُڑ کر اہل مکہ کے گھروں میں گرنے لگے۔ عاتکہ کہتی ہیں کہ مکہ کا کوئی گھر ایسا نہیں بچا جس میں اس کا کوئی ٹکڑا نہ گرا ہو۔

صبح ہوئی تو عاتکہ نے یہ خواب اپنے بھائی عباس سے بیان کیا، مگر ساتھ ہی شرط عائد کی کہ کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔ عباس نے وعدہ کر لیا، لیکن جو بات ایک دفعہ زبان سے نکل جائے، وہ پرائی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عباس نے رازداری کے وعدہ کے ساتھ یہی خواب اپنے

دوست ولید کے سامنے بیان کر دیا۔ ولید نے اپنے باپ کو بتایا اور --- کہی جو بات کان میں، چڑھی زبانِ خلق پر --- کے مطابق اس خواب کا سارے مکہ میں چرچا ہو گیا۔

ابو جہل نے یہ صورتِ حال دیکھی تو سخت چراغ پا ہوا کہ ابھی تک تو نبوت کا ایک ہی دعویدار تھا، اب اس کی پھوپھی نے بھی خواب کی شکل میں پیشینگوئیاں شروع کر دی ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن جب عباس طواف کرنے گئے تو دیکھا کہ ابو جہل کچھ لوگوں میں میرِ محفل بنا بیٹھا ہے اور اسی موضوع پر گفتگو کر رہا ہے۔ عباس کو طواف کے لئے جاتا دیکھ کر کہنے لگا --- ''ابوالفضل! (عباس کی کنیت) طواف سے فارغ ہو کر ذرا اِدھر آنا، تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

عباس کہتے ہیں کہ طواف کے بعد جب میں اس مجلس میں جا کر بیٹھا تو ابو جہل نے مجھ سے پوچھا --- ''تمہارے خاندان میں یہ ایک اور نبوت کی دعویدار کب سے پیدا ہو گئی ہے؟''

''کیا مطلب --- ؟ کس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا

''یہ عاتکہ نے جو خواب بیان کیا ہے، یہ نبوت کا مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے --- ؟ اے عبدالمطلب کے گھر والو! تمہارے خاندان کے ایک مرد نے نبوت کا جو دعویٰ کر رکھا ہے، اس سے تمہاری تسکین نہیں ہوئی کہ اب تمہاری عورتوں نے بھی نبی بننا شروع کر دیا ہے --- !؟ عاتکہ کے بیان کے مطابق کسی سوار نے اہل مکہ سے کہا ہے کہ تین دن کے بعد اس طرف روانہ ہو جاؤ، جہاں تم نے قتل ہو کر گرنا ہے۔ اب ہم تین دن تک انتظار کریں گے۔ اگر تین دنوں تک کچھ نہ ہوا تو ہم سب متفقہ طور پر تم لوگوں کے بارے میں لکھ دیں گے کہ تمہارا گھرانہ عرب کا سب سے جھوٹا گھرانہ ہے۔''

عباس نے بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اٹھ کر چلے آئے، مگر خاندانِ عبدالمطلب کی غیور عورتوں کو جب ابو جہل و عباس کی بات چیت کا پتہ چلا تو وہ غصے میں بھری ہوئی عباس کے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔

''ابو جہل ہمارے خاندان کے مردوں کے بارے میں تو پہلے ہی بکواس کرتا رہتا ہے، اب اس فاسق اور خبیث کی جرأت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ اس نے ہمارے گھرانے کی عورتوں کے متعلق بھی خرافات بکنے شروع کر دیئے ہیں --- ! اور ہمیں تو عباس! تم پر حیرت ہے کہ تم اس

کی بیہودہ باتیں اپنے کانوں سے سنتے رہے اور ذرا غیرت نہ آئی!''

عباس، عرب کے سب سے غیرت مند خاندان کے ایک فرد تھے۔ ابوجہل کے سامنے تو محض اپنے فطری تحمل کی وجہ سے خاموش رہ گئے تھے مگر اب عورتوں کے طعنے سن کر ان کا خون کھول اٹھا اور کہنے لگے---''اس وقت تو میں واقعی کوئی جواب نہیں دے سکا تھا، لیکن اب اگر ابوجہل نے اس طرح کی یاوہ گوئی کی تو میں اس کو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ آئندہ بکواس کرنے کے قابل ہی نہیں رہے گا۔''

چنانچہ تیسرے روز عباس اس ارادے سے نکلے کہ ابوجہل کے سامنے جاؤں گا اور اگر اس نے کوئی بیہودگی کی تو اگلا پچھلا حساب بے باق کر دوں گا، مگر ابھی مسجد حرام کے قریب ہی پہنچے تھے کہ ابوجہل کو مسجد سے نکل کر ایک طرف دوڑتے دیکھا۔ عباس سمجھے کہ شاید مجھ سے ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا ہے، مگر یہ بات نہیں تھی۔ وہ تو ضمضم غفاری کے نالہ وفریاد کو سن کر اس کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ عباس بھی ادھر متوجہ ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ضمضم کی حالت خستہ ہے اور وہ اپنے اونٹ پر بیٹھا گلا پھاڑ رہا ہے---''اَللَّطِیْمَةُ ، اَللَّطِیْمَةُ ...... قافلے کو پہنچو، قافلے کو پہنچو....(۱)

گویا تیسرے دن ہی عاتکہ کے خواب کی صداقت ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھی---

اسی لئے جب اہلِ مکہ ضمضم کے پاس کھڑے ہو کر شجاعت وحمیت کا مظاہرہ کر رہے تھے، اس وقت اندر سے ان کے دل لرز رہے تھے اور کانوں میں عاتکہ کے بیان کردہ خواب کے الفاظ گونج رہے تھے کہ---''دھوکے بازو! تین دن کے بعد اس طرف روانہ ہو جاؤ، جہاں تم نے مر کر گرنا ہے۔''

اہل مکہ! ابھی ابن حضرمی کے قتل کو نہیں بھولے تھے کہ اوپر سے یہ اُفتاد آ پڑی۔ اس لئے خوف وہراس کے باوجود قافلے کو بچانے اور ابن حضرمی کا انتقام لینے کے لئے ایک جمِ غفیر تیار ہو گیا، جس میں مکہ کے تقریباً تمام معززین شامل تھے۔ ابولہب؛ البتہ جان بچا گیا

---

(۱) ''صحیح صورت حال'' سے یہاں تک بیان کردہ واقعات کے حوالہ جات درج ذیل ہیں۔

سیرت ابن ھشام ج ۲، ص ۶۱، تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۷۰، ۲۷۱.

اور اپنی جگہ عاص ابن ہشام کو بھیج دیا۔ اس بے چارے نے ابولہب کا چار ہزار روپیہ دینا تھا جس کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں بن رہی تھی۔ ابولہب نے اس کو پیش کش کی کہ اگر تم میری جگہ اس جنگ میں شامل ہو جاؤ تو میں قرضہ معاف کر دوں گا۔ عاص راضی ہو گیا اور ابولہب کی جان بچ گئی۔ (۱)

امیہ ابن خلف بھی تیار نہیں تھا کیونکہ کچھ عرصہ پہلے جب حضرت سعدؓ عمرہ کرنے مکہ آئے تھے اور سابقہ دوستی کی بناء پر امیہ کے مہمان ہوئے تو ابوجہل نے حضرت سعدؓ کو دیکھ کر سخت غصے کا اظہار کیا تھا اور نامناسب باتیں کہی تھیں۔ حضرت سعدؓ کہاں خاموش رہنے والے تھے! انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا اور ابوجہل کو چپ کرا دیا تھا۔ (۲)

اس وقت امیہ بھی پاس موجود تھا، مگر اس نے اپنے مہمان دوست کی حمایت کرنے کے بجائے ابوجہل کی طرف داری کی اور حضرت سعدؓ کو مشورہ دیا کہ ابوالحکم (ابوجہل) وادیٔ بطحاء کا سردار ہے اس لئے تمہیں اس کے روبرو آواز نہیں بلند کرنا چاہئے!

یہ سن کر حضرت سعدؓ کو امیہ پر بھی غصہ آ گیا اور کہا --- ''امیہ! تم تو بات ہی نہ کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ عنقریب تمہیں مسلمان قتل کر دیں گے۔''

امیہ ڈر گیا اور پوچھنے لگا --- ''بِمَكَّةَ؟'' (کیا مسلمان مکہ میں آ کر مجھے مار ڈالیں گے؟)

حضرت سعدؓ نے کہا --- ''لَا اَدْرِیْ'' (اس بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔)

بعد میں امیہ نے اپنی اور حضرت سعدؓ کی بات چیت بیوی کو بتائی اور اس کے سامنے عہد کیا کہ آئندہ میں کبھی مکہ سے باہر نہیں نکلوں گا۔ (تاکہ مسلمان مجھ پر ہاتھ نہ ڈال سکیں۔)

مگر --- تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ --- جب ابوجہل کو پتہ چلا کہ امیہ نہیں جانا چاہتا تو وہ امیہ کے پاس گیا اور کہا --- ''امیہ! تم اس علاقے کے ایک معزز سردار ہو، اگر تم نہ گئے تو باقی لوگوں کے حوصلے بھی پست ہو جائیں گے اور وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔''

---

(۱) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۵۴، سیرت ابن ھشام ج ۲، ص ۶۲.

(۲) یہ واقعہ ص ۳۵۷ پر گزر چکا ہے۔

بہر حال ابو جہل نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کو تیار کر ہی لیا؛ تاہم روانگی سے پہلے بیوی نے اس کو یاد دلایا کہ کیا تم یثرب سے آنے والے دوست (حضرت سعدؓ) کی بات بھول گئے ہو؟

امیہ نے کہا---''میں تھوڑی ہی دور تک جاؤں گا، پھر کسی نہ کسی طرح واپس آجاؤں گا۔''

مگر امیہ کو آخر تک واپسی کا موقع نہ مل سکا اور تقدیر اس کو کشاں کشاں میدانِ بدر تک لے گئی۔(۱)

روانگی

دو تین دن تک مشرکین مکہ زور شور سے تیاریاں کرتے رہے۔ آخر نو سو سے زائد افراد جو ہر طرح کے اسلحہ سے لیس تھے، تیار ہو گئے۔ غذائی ضروریات پوری کرنے کے لئے بہت سارے اونٹ ساتھ لئے، دل بہلانے کی خاطر گانے بجانے والیوں کا انتظام کیا اور نہایت شان و شوکت اور تزک و احتشام سے روانہ ہوئے۔ جہاں پڑاؤ ہوتا اونٹ ذبح کئے جاتے، گوشت بھونا اور پکایا جاتا، شراب کا دور چلتا، گانے والیاں آواز کا جادو جگاتیں اور شجاعت و انتقام کے مضامین پر مشتمل نظمیں گا کر جذبات میں آگ لگا دیتیں۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ ہر روز دس اونٹ ذبح کئے جاتے تھے اور یہ سارا خرچہ رؤساء قریش باری باری برداشت کیا کرتے تھے۔

اہلِ ایمان کی حالت

اِدھر مشرکین کا تو یہ دھوم دھڑکا تھا اور اُدھر تھوڑے سے بے سروسامان مہاجرین و انصار تھے جن کے پاس نہ عمدہ اسلحہ تھا، نہ ضرورت کے مطابق سواریاں تھیں، نہ ہی وافر مقدار میں خورد و نوش کا انتظام تھا، کیونکہ وہ باقاعدہ جنگ کے ارادے سے نکلے ہی نہیں تھے۔ صرف ابوسفیان کے قافلے پر حملہ مقصود تھا اور اس مقصد کے لئے کسی خاص تیاری کی ضرورت

---

(۱) بخاری ج ۲، صفحہ ا۔

نہ تھی۔ اس لئے جو کچھ میسر تھا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے چل پڑے تھے۔

مدینہ سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچ کر جانِ دو عالم ﷺ نے جانبازوں کی اس جمعیت کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ کئی نوعمر لڑکے بھی شوقِ جہاد میں ساتھ چلے آئے ہیں۔ آپ نے ان کو ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا اور واپس بھیج دیا؛ البتہ عمیر ابن ابی وقاصؓ (۱) کو جب واپسی کا کہا گیا تو وہ شدتِ غم سے اشکبار ہوگئے۔ ان کا والہانہ اشتیاق دیکھ کر آپ نے ان کو ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ (۲)

اپنی غیر موجودگی میں معاملاتِ مدینہ کی دیکھ بھال کے لئے آپ نے حضرت ابولبابہؓ (۳) کو مدینہ کا نگران مقرر کیا، کچھ اور صحابہ کو مختلف ذمہ داریاں تفویض کیں اور اللہ کا نام لے کر آگے بڑھنے لگے۔

---

(۱) حضرت عمیرؓ، فاتح ایران سعد ابن ابی وقاصؓ کے چھوٹے بھائی تھے۔ جب ان کو غزوہ بدر میں شمولیت کی اجازت ملی تھی تو حضرت سعدؓ نے اپنے ہاتھ سے ان کے گلے میں تلوار حمائل کی تھی۔ جہاد و شہادت کے لئے بے تاب یہ کمسن مجاہد اسی غزوہ میں شہادت سے ہمکنار ہوگیا تھا۔ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ.

(۲) استیعاب ج ۲، ص ۴۸۲.

(۳) حضرت ابولبابہؓ کو جانِ دو عالم ﷺ نے غزوۂ سویق کے موقع پر بھی مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ باقی تمام غزوات میں آپ کے ساتھ شامل رہے۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔

مسجد نبوی میں ایک ستون ہے جس کو "اُسْطُوَانَۃُ اَبِیْ لُبَابَۃَ" اور "اُسْطُوَانَۃُ التَّوْبَۃِ" کہا جاتا ہے۔

اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب جانِ دو عالم ﷺ غزوہ تبوک کے لئے تشریف لے گئے تھے تو جو لوگ اپنی کاہلی اور سستی کی وجہ سے پیچھے رہ گئے تھے، ان میں ابولبابہؓ بھی شامل تھے۔ بعد میں ابولبابہؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک ستون کے ساتھ باندھ لیا اور عہد کیا کہ میں اس وقت تک اپنے آپ کو نہیں کھولوں گا، نہ کھانے پینے کی کوئی چیز چکھوں گا، جب تک اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول نہ فرما لے، یا اسی حالت میں مر جاؤں گا۔

چنانچہ سات دن تک آپ نے کچھ کھایا، نہ پیا۔ صرف نماز اور حوائج ضروریہ کے لئے

مُساوات

مسلمانوں کے پاس چونکہ سواریوں کی کمی تھی۔ اس لئے ایک اونٹ پر باری باری تین افراد سواری کرتے تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے اپنے آپ کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ رکھا اور حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کی باری اپنے ساتھ مقرر کر دی۔ چنانچہ ایک حد تک آپ نے خود سواری کی۔ پھر حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ اب یکے بعد دیگرے تمہاری باری ہے۔ دونوں نے عرض کی --- ''نہیں یا رسول اللہ! آپ سوار رہئے ہم آپ کے ساتھ پیادہ چلتے رہیں گے۔'' --- مگر آپ نے یہ امتیاز گوارا نہ کیا اور فرمایا۔

بیٹی کھول دیا کرتی تھی۔ باقی تمام اوقات میں بھوکے پیاسے بندھے رہتے تھے۔ آخر نقاہت سے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے حالِ زار پر رحم آ گیا اور جبریل امین ان کی توبہ قبول ہونے کی مژدہ لے کر نازل ہو گئے۔ لوگوں نے اسی وقت جا کر ابولبابہؓ کو خوشخبری سنائی اور مبارک باد دی۔ ابولبابہؓ نے کہا --- ''جب تک رسول اللہ اپنے دستِ اقدس سے مجھے نہیں کھولیں گے، میں اسی طرح بندھا رہوں گا۔''

اسیرانِ عالم کو رہائی دینے والے آقا کو پتہ چلا تو خود آ کر ان کا ایک ایک بند کھولا اور اس قیدِ خود اختیاری سے رہائی دلائی۔

قبولیت توبہ کی خوشی میں ابولبابہؓ نے اپنا سب کچھ راہِ خدا میں خیرات کرنا چاہا مگر جانِ دو عالم ﷺ نے اجازت نہ دی اور فرمایا ''یُجزِئُکَ یَا اَبَالُبَابَۃَ الثُّلُثُ.'' (ابولبابہ! تم اپنے مال کا تیسرا حصہ دے دو۔ یہ کافی ہے۔) استیعاب، ذکر ابی لبابہ

وہی ستون، جس کے ساتھ ابولبابہؓ نے اپنے آپ کو باندھا تھا۔ ''اُسطوَانَۃُ اَبِیْ لُبَابَہ'' اور ''اُسطوَانَۃُ التَّوبَۃ'' کے ناموں سے مشہور ہوا اور ابولبابہ کا نام ہمیشہ کے لئے اَمر ہو گیا۔

جانِ دو عالم ﷺ کی نگاہوں میں اس مقدس ستون کی اس قدر اہمیت تھی کہ آپ اعتکاف بھی اسی کے پاس بیٹھا کرتے تھے اور نوافل بھی یہیں ادا فرمایا کرتے تھے۔ وفاء الوفاء ج ۲، ص ۴۴۴.

اب بھی اہل محبت اس ستون کے پاس کھڑے ہو کر چپکے چپکے آنسو بہاتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہاں بہنے والے اشکہائے ندامت گناہوں کے انبار کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتے ہیں۔

''مَا اَنْتُمَا بِاَقْوٰی عَلَی الْمَشْیِ مِنِّیْ وَمَا اَنَا اَغْنٰی عَنِ الْاَجْرِ مِنْکُمَا''

(نہ تم مجھ سے زیادہ چلنے کی قوت رکھتے ہو، نہ میں ثواب سے مستغنی ہوسکتا ہوں۔)

یعنی جب میں بھی تمہاری طرح چل سکتا ہوں تو پیادہ چلنے کا ثواب کیوں نہ حاصل کروں؛ جبکہ ثواب کی مجھے بھی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح تمہیں ہے۔

سبحان اللہ! مساوات کے داعی اعظم نے عملی طور پر مساوات کا کیسا شاندار مظاہرہ فرمایا۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ. (۱)

ایک معجزہ

راستے میں ایک اونٹ تھک کر بیٹھ گیا اور کسی طرح اٹھنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس اونٹ پر سواری کرنے والوں نے عرض کی---''یارسول اللہ! ہمارا اونٹ چلنے سے رہ گیا ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے تھوڑا سا پانی منگوایا اور کلی کر کے پانی والے برتن میں ڈال دی۔ پھر فرمایا---''اونٹ کا منہ کھولو!''

منہ کھولا گیا تو آپ نے کچھ پانی اس کے منہ میں اور باقی اس کے بدن پر ڈال دیا۔ اس آبِ حیات نے ایسا اثر دکھایا کہ اونٹ کی ساری تھکاوٹ یک لخت دور ہوگئی اور اٹھ کر نہایت تیز رفتاری سے چلنے لگ گیا۔ (۲)

مشرکین کے بارے میں اطلاع

جانِ دو عالم ﷺ وادی ذفران میں پہنچے تو اطلاع ملی کہ کاروانِ ابوسفیان کو بچانے کے لئے مشرکین مکہ بڑی تعداد میں آرہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے جان نثاروں کو جمع کیا اور بتایا کہ مشرکین مکہ پوری تیاری سے آرہے ہیں۔ اب تمہاری کیا رائے ہے---؟ ابوسفیان کا تعاقب کیا جائے یا مشرکین سے مقابلہ کیا جائے---؟

---

(۱) سیرت حلبیه، ج ۲، ص ۱۵۸، تاریخ الخمیس، ج ۱، ص ۳۷۲.

(۲) سیرت حلبیه، ج ۲، ص ۱۵۸.

چونکہ صحابہ کرامؓ باقاعدہ جنگ کے لئے تیار ہوکرنہیں آئے تھے، اس لئے بعض افراد نے رائے دی کہ جنگ کرنے کے بجائے قافلے کا تعاقب کیا جائے، مگر جانِ دو عالم ﷺ کو یہ کم ہمتی پسند نہ آئی اور رُوئے انور پر ناگواری کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ یہ صورت حال دیکھ کر صدیق اکبرؓ اُٹھے اور بہت عمدہ گفتگو کی۔ پھر حضرت عمرؓ نے بہت عمدہ باتیں کیں۔ اس کے بعد حضرت مقدادؓ اُٹھے اور انتہائی پر جوش انداز میں گویا ہوئے۔

''یارسول اللہ! جو اللہ کا حکم ہو اس پر عمل کیجئے، ہم بہر حال آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم! ہم آپ کو کبھی وہ جواب نہیں دیں گے جو موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم نے دیا تھا کہ آپ اور آپ کا رب جا کر لڑیں، ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔

یارسول اللہ! ہم یہاں نہیں بیٹھیں گے؛ بلکہ جب تک دم میں دم ہے آپ کا ساتھ دیں گے۔ ہم آپ کے آگے لڑیں گے، پیچھے لڑیں گے، دائیں لڑیں گے اور بائیں لڑیں گے۔ ہمیں تو آپ اگر بَرْکُ الْغِمَادِ(۱) لے جانا چاہیں تو ہم وہاں بھی چلے چلیں گے۔''

حضرت مقدادؓ (۲) کی یہ ولولہ انگیز تقریر سن کر جانِ دو عالم ﷺ بہت خوش ہوئے

---

(۱) بَرْکُ الْغِمَادِ ملک حبشہ کا ایک شہر تھا جو اہل عرب میں دوری کے لحاظ سے ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا۔

(۲) حضرت مقدادؓ قدیم الاسلام صحابی ہیں اور نہایت فاضل و معزز ہستی ہیں۔

علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں۔

كَانَ مِنَ الْفُضَلَاءِ النُّجَبَاءِ الْكِبَارِ الْخِيَارِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ (نبی ﷺ کے ان صحابہ میں سے تھے، جو نہایت فاضل، معزز بلند مرتبہ اور پسندیدہ تھے۔)

ایک دفعہ جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا --- ''اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو سات وزراء اور رفقاء عطا فرمائے تھے اور مجھے چودہ عنائیت فرمائے ہیں۔''

ان چودہ بلند بختوں میں حضرت مقدادؓ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

وزارت ورفاقتِ مصطفیٰ سے بڑا اعزاز کیا ہوسکتا ہے، مگر حضرت مقدادؓ کو اس سے بھی بڑا

مگر ابھی کچھ اور لوگوں کے جذبات کا امتحان مقصود تھا، اس لئے آپ نے صحابہ سے دوبارہ

اعزاز حاصل ہے، یعنی اللہ اور رسول کا محبوب ہونا۔

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''اللہ نے مجھے چار افراد سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ میں بھی ان سے محبت رکھتا ہوں۔''

ان چار خوش نصیبوں میں بھی حضرت مقدادؓ کا نام نامی شامل ہے۔

جس انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ محبت رکھے اور اپنے محبوب کو حکم دے کہ تم بھی اس سے محبت رکھو، اس کی عظمتوں کا کیا کہنا---!

ان کے گھر جانِ دو عالم ﷺ کی چچا زاد ہمشیرہ تھیں جن کا نام ضباعہؓ تھا۔ وہ زبیر ابن عبدالمطلب کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت مقدادؓ کے ساتھ ان کی شادی آپ نے خود کرائی تھی۔ پہلے حضرت مقداد نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ سے ان کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا، مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ آپ کو پتہ چلا تو آپ نے فرمایا۔

''مقداد کو میں اپنی چچا زاد بہن کا رشتہ دیتا ہوں۔''

چنانچہ آپ نے محترمہ ضباعہؓ کو ان کے عقد میں دے دیا---زہے نصیب!

جانِ دو عالم ﷺ کے مشہور تیر اندازوں میں سے ایک ہیں۔ تمام غزوات میں آپ کے ساتھ نہ صرف یہ کہ شامل رہے؛ بلکہ ہر موقع پر پیش پیش رہے۔

قد آور اور جسیم انسان تھے۔ آخر عمر میں پیٹ بہت بڑھ گیا تھا۔ ان کے ایک غلام نے کہا کہ میں آپریشن کرنا جانتا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے پیٹ کا آپریشن کر کے فالتو چربی نکال دوں۔ اس طرح آپ ہلکے پھلکے ہو جائیں گے۔

انہوں نے اجازت دے دی۔ غلام نے آپریشن کیا، مگر کامیاب نہ ہو سکا اور آپ خلافتِ حضرت عثمانِ غنیؓ کے دوران ۳۳ھ میں انتقال کر گئے۔ رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ

(حالات وواقعات، استیعاب، اصابہ، طبقات ابن سعد، مستدرک حاکم اور ترمذی، ذکر مقداد سے ماخوذ ہیں۔)

مشورہ طلب کیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ ایک بار پھر اٹھے اور عرض کی --- ''یارسول اللہ! ہم قریشی لوگ ہیں۔ بات کے دھنی اور قول کے پکے۔ ہم نے کبھی ذلت کا راستہ اختیار کیا ہے، نہ آج تک ہم میں سے کوئی شخص ایمان سے منحرف ہوا ہے۔ اس لئے جس طرح بہتر سمجھتے ہیں، اس کے لئے تیاری کیجئے!''

جانِ دو عالم ﷺ اب بھی پوری طرح مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا --- ''اَشِیْرُوْا عَلَیَّ'' (مجھے مشورہ دو)

دراصل اب تک جوش و جذبے کا مظاہرہ صرف مہاجرین نے کیا تھا۔ انصار اس خیال سے خاموش بیٹھے تھے کہ ہمارے مہاجر بھائی، ہماری ترجمانی کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر جب جانِ دو عالم ﷺ نے تیسری بار مشورہ طلب کیا تو انصار سمجھ گئے کہ آقا ہماری زبان سے بھی کچھ سننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انصار کے ایک سردار حضرت سعد ابن معاذؓ (۱) اٹھے اور عرض کی --- ''یارسول اللہ! شاید آپ ہماری رائے جاننا چاہتے ہیں!''

''ہاں! یہی بات ہے'' جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔

حضرت سعدؓ نے کہا --- اور خوب کہا --- ''یارسول اللہ! ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، آپ کی تصدیق کی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ جو پیغام لائے ہیں اس کی حقانیت کی گواہی دی ہے اور ہر حال میں آپ کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کیا ہے۔ یارسول اللہ! ممکن ہے آپ کا خیال ہو کہ انصار صرف اس وقت ساتھ دینے کے پابند ہیں، جب دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو۔ (۲) لیکن میں تمام انصار کی طرف سے آپ کو یقین دلاتا

---

(۱) تعارف سید الوریٰ، ج ۱، ص ۲۸۳ پر گزر چکا ہے۔

(۲) جب جانِ دو عالم ﷺ نے انصار کی دعوت پر ہجرت کا ارادہ فرمایا تھا تو اس وقت جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں یہ شق بھی شامل تھی کہ اگر کوئی دشمن حملہ آور ہوا تو انصار جانِ دو عالم ﷺ کی اسی طرح حفاظت کریں گے، جس طرح اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔ ☜

ہوں کہ ہم بہرصورت آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ جہاں تشریف لے جانا چاہیں، جائیں، جس سے تعلق رکھنا چاہیں، رکھیں، جس سے تعلق توڑنا چاہیں، توڑیں، جس سے صلح کرنا چاہیں، صلح کریں، جس سے جنگ کرنا چاہیں، جنگ کریں۔ ہمارا جتنا مال بھی چاہے، لے لیں --- وہ مال جو آپ لیں گے، ہمیں اس مال سے زیادہ محبوب ہوگا، جو ہمارے پاس رہ جائے گا۔ غرضیکہ ہم ہر حال میں تابع فرمان رہیں گے۔ خدا کی قسم! ہم کو اگر آپ سمندر میں گھسنے کا حکم دیں گے تو ہم بے دھڑک گھس پڑیں گے۔ ہمارا کوئی ایک آدمی بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ اس لئے جنگ یا کاروان میں سے جو صورت آپ کو پسند ہو، اس کو اختیار کیجئے!

اور جہاں تک لڑنے کا تعلق ہے تو ہم لڑائی میں ثابت قدم رہنے والے اور پوری سچائی سے مقابلہ کرنے والے لوگ ہیں۔ اگر جنگ ہوئی تو انشاءاللہ ہماری جرأت و شجاعت کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ اس لئے اللہ کی رحمت و برکت کے ساتھ آگے بڑھیئے۔ ہم ہر مقام پر آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہوں گے۔"

سعد ابن معاذؓ کے اس نہایت ہی پُراثر خطاب سے جانِ دو عالم ﷺ کا روئے زیبا فرطِ مسرت سے چمک اٹھا۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا "سِیْرُوْا وَاَبْشِرُوْا.... " (آگے بڑھو، اور تم کو بشارت ہو کہ میرے رب نے دو میں سے ایک چیز کا میرے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے، یا تو قافلہ ہاتھ آئے گا یا جنگ میں فتح حاصل ہوگی --- اور میں ابھی سے دیکھ رہا ہوں کہ کس کافر نے قتل ہو کر کہاں گرنا ہے۔) (۱)

ظاہر ہے کہ اہل وعیال کے تحفظ کے لئے صرف دفاع کیا جاتا ہے، آگے بڑھ کر حملہ نہیں کیا جاتا۔ اس بناء پر جانِ دو عالم ﷺ کا خیال تھا کہ مشرکین پر حملے کے لئے پیش قدمی کرنا، شاید انصار مناسب نہ سمجھیں، مگر حضرت سعدؓ نے ہرصورت میں ساتھ دینے کا یقین دلا کر آپ کا دل خوش کر دیا۔

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۲۴، زرقانی ص ۳۹۷ تا ۳۹۹، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۵۹ تا ۱۶۱۔

ارشادِ عالی کے آخری حصے سے سب پر واضح ہوگیا کہ آپ نے قافلے کا ارادہ ترک کردیا ہے اور جنگ ناگزیر ہوچکی ہے۔

یوں بھی ابوسفیان نے مسلمانوں کے ڈر سے اپنا راستہ بدل لیا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ سفر شروع کردیا تھا؛ جبکہ مشرکینِ مکہ قریب آپہنچے تھے۔ اس لئے قافلے کا تعاقب کرنے کی بہ نسبت مشرکینِ مکہ سے دودو ہاتھ کرلینا زیادہ بہتر تھا۔

دو غلاموں کی گرفتاری

بدر کے قریب پہنچ کر جانِ دوعالم ﷺ نے چند صحابہ کو حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ لوگ پانی لے جانے والے دو غلام پکڑ لائے اور ان سے پوچھنے لگے کہ تمہارا تعلق کس سے ہے؟

انہوں نے کہا---''ہم اہل مکہ کے ساتھ ہیں اور ان کی ضروریات کے لئے پانی مہیا کرنے کی خدمت پر مامور ہیں۔''

صحابہ کرامؓ سمجھ رہے تھے کہ ان کا تعلق ابوسفیان سے ہے، اس لئے ان کو غلاموں کی بات پر یقین نہ آیا اور انہیں مارنا شروع کردیا۔ غلاموں نے جب دیکھا کہ اس طرح جان نہیں چھوٹتی تو کہنے لگے، ہم ابوسفیان کے ساتھ ہیں۔ یہ سن کر صحابہ مطمئن ہوگئے کہ ہم نے سچ اگلوالیا ہے اور مار پیٹ ترک کردی۔

جس وقت یہ پوچھ گچھ ہورہی تھی، اس وقت دلوں کا حال جاننے والے آقا نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو صحابہ کرام سے فرمایا---''جب غلام سچ بول رہے تھے تو تم نے ان کو مارنا شروع کردیا اور جب ڈر کے مارے جھوٹ بولنے لگے تو تم نے ان کو چھوڑ دیا---! اللہ کی قسم، ان کا تعلق مکے والوں سے ہی ہے۔''

پھر آپ غلاموں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا---''اہل مکہ کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو، بتاؤ!''

غلاموں نے دور ایک بڑے ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اہل مکہ اس ٹیلے کے پیچھے ہیں۔

''تھوڑے ہیں یا زیادہ؟''

''بہت زیادہ ہیں اور نہایت زورآور ہیں۔''

''صحیح تعداد کیا ہے؟''

''اس بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے بہت کوشش کی کہ وہ صحیح تعداد بتا دیں، مگر اس سلسلے میں انہوں نے لاعلمی ظاہر کی، چنانچہ آپ نے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور پوچھا۔

''روزانہ کتنے اونٹ ذبح کیے جاتے ہیں؟''

''کبھی نو، کبھی دس۔''

آپ نے فرمایا---''اس لحاظ سے ان کی تعداد نوسو اور ایک ہزار کے درمیان ہونی چاہئے!'' (غالباً ایک اونٹ اوسطاً سو آدمیوں کے لئے کافی ہوتا تھا۔)

پھر سوال کیا---''قریش کے معززین میں سے کون کون ساتھ ہیں؟''

انہوں نے بہت سارے سرداروں کے نام بتا دیئے۔

آپ نے صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

''مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے نکال کر تمہارے سامنے پھینک دیئے ہیں۔''(۱)

ایک اور خواب

جب مشرکین نے جحفہ نامی جگہ میں پڑاؤ کیا تو جہم ابن صلت نے، جو خاندان عبدالمطلب کا ایک فرد تھا، خواب میں دیکھا کہ گھوڑے پر سوار ایک شخص چلا آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک خالی اونٹ بھی آ رہا ہے۔ ایک جگہ آ کر وہ سوار ٹھہر گیا اور بہت سارے رؤسائے قریش کے نام لے لے کر بآواز بلند اعلان کرنے لگا۔

قُتِلَ عُتْبَہ وَ شَیْبَہ وَ اَبُوالْحِکَمْ وَاُمَیَّہ ......

(عتبہ، شیبہ، ابوجہل، امیہ.....سب مارے گئے۔)

---

(۱) سیرت ابن ھشام ج ۲، ص ٦٥، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ١٦١۔

یہ اعلان کرنے کے بعد سوار نے اس اونٹ کے گلے میں تلوار گھونپ دی جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور اس کو مشرکین کے لشکر کی طرف بھگا دیا۔

اب جہم نے یہ دہشتناک منظر دیکھا کہ اونٹ کٹے ہوئے گلے کے ساتھ پوری لشکر گاہ میں دوڑتا پھر رہا ہے اور فوارے کی طرح ابلتے خون کے چھینٹے خیموں میں پڑ رہے ہیں۔ کوئی خیمہ ایسا نہ رہا، جس میں لہو کے قطرے نہ گرے ہوں۔

جہم خوفزدہ ہو کر جاگ گیا اور لوگوں کو اپنے خواب کے بارے میں بتانے لگا۔

ابو جہل کو پتہ چلا تو اس خبیث نے طنزاً کہا۔

''لو! یہ خاندان عبدالمطلب میں ایک اور نبی پیدا ہوا --- کل جب مقابلہ ہوگا تو یہ خود دیکھ لے گا کہ کون مقتول ہوتا ہے --- ہم، یا محمد اور اس کے ساتھی!''(۱)

ابو جہل نے عاتکہ کے خواب کے بارے میں بھی ایسی ہی رائے ظاہر کی تھی مگر درحقیقت یہ دونوں خواب سچے تھے اور ان کی صداقت عنقریب ظاہر ہونے والی تھی۔

جنگ روکنے کی کوشش

ابو جہل کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ جنگ ہو کر رہی، ورنہ سمجھدار لوگوں نے اس کو روکنے کی بھتیری کوششیں کی تھیں۔ حتیٰ کہ ابو سفیان --- جس کے قافلے پر حملے کی اطلاعات سے یہ سارا قصہ شروع ہوا تھا --- جب حملے کی زد سے نکل گیا تو اس نے مشرکین کو پیغام بھیجا کہ تم لوگ صرف ہماری جان و مال کے تحفظ کے لئے آئے تھے، اب جب کہ ہم بخیریت بچ نکلے ہیں تو تم کو بھی واپس چلے جانا چاہئے، مگر ابو جہل نے کہا

''نہیں ---! یہ نہیں ہوسکتا۔ ہم بدر تک ضرور جائیں گے۔ وہاں اونٹ ذبح کریں گے، گوشت بانٹیں گے، ناچ گانا کرائیں گے، شراب پئیں گے اور تین دن تک ایسا جشن منائیں گے کہ سارے عرب میں اس کا چرچا پھیل جائے گا۔ اس طرح پورے عربستان پر ہماری دھاک بیٹھ جائیگی اور آئندہ کسی کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی

---

(۱) سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۱۶۲، ابن ہشام ج ۲، ص ۶۵.

جرأت نہ ہوگی۔(۱)

کنارہ کشی

لشکر میں شامل عقلمند لوگوں نے جب دیکھا کہ ابوجہل کوئی معقول بات سننے کے لئے تیار نہیں ہے تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ خود اس جنگ سے علیحدہ ہو جائیں۔ چنانچہ قبیلہ بنی زہرہ کے ساتھ وابستہ ایک شخص اخنس بن شریق نے بنی زہرہ سے کہا کہ ہم جس مقصد کے لئے آئے تھے، وہ پورا ہو چکا ہے اور قافلہ بخیریت گزر گیا ہے۔ اس لئے ہم کو اس خواہ مخواہ کی جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہئے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہمیں ابوجہل کی نکمی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے واپس لوٹ جانا چاہئے۔

بنی زہرہ نے اخنس کی تائید کی اور سب کے سب اس کے ساتھ واپس چلے گئے۔(۲)

---

(۱) ابن هشام، ج ۲، ص ۶۵. سيرت حلبيه، ج ۲، ص ۱۶۳.

(۲) ابن هشام ج ۲، ص ۶۵، سيرت حلبيه ج ۲، ص ۱۶۳.

اخنس کا اصل نام ابی تھا۔ اس واقع کی وجہ سے اخنس مشہور ہوگیا، یعنی پیچھے ہٹ جانے والا اور غائب ہو جانے والا۔ اس جنگ سے اخنس کی واپسی کا ایک سبب تو وہی تھا جو متن میں مذکور ہوا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اخنس نے ابوجہل سے تنہائی میں پوچھا تھا کہ تمہارے خیال میں محمد کیا واقعی جھوٹا ہے؟

ابوجہل نے جواب دیا---"نہیں، وہ تو شروع سے سچا ہے۔ اس نے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بنی ہاشم کو پہلے ہی متعدد اعزاز حاصل ہیں۔ حاجیوں کو پانی وہی پلاتے ہیں اور ان کی مہمان نوازی بھی وہی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں لوگ متنازعہ مسائل میں مشورہ لینے کے لئے بھی انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اب اگر نبوت بھی انہی میں چلی جائے تو پھر ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟"

یہ لایعنی جواب سن کر اخنس کو یقین ہوگیا کہ یہ جنگ کسی قومی مفاد میں نہیں لڑی جارہی ہے؛ بلکہ ابوجہل محض خاندانِ بنی ہاشم کے ساتھ اپنی اندرونی عداوت اور حسد کی بناء پر لڑائی چھیڑنے پر مصر ہے۔ اس لئے اخنس نے اپنے ساتھیوں سمیت جن کی تعداد سو سے اوپر تھی، کنارہ کشی اختیار کرلی۔

اخنس کے اسلام لانے میں شدید اختلاف ہے۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ اسلام لایا ☜

آمنے سامنے

آخر وہ دن بھی آ گیا جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کو نظر آنے لگ گئیں۔ ایک فوج نے میدان بدر کے ایک سرے پر پڑاؤ کیا اور دوسری نے دوسرے کنارے پر۔ اس میدان میں متعدد کنوئیں کھدے ہوئے تھے، مگر ان میں پانی برائے نام تھا۔ مشرکین چونکہ کچھ پہلے پہنچ گئے تھے، اس لئے نسبتاً بہتر کنوؤں پر قابض ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں جس حصے میں ان کا قیام تھا، وہاں کی زمین بھی ہموار اور سخت تھی؛ جبکہ مسلمانوں والی جانب زمین اتنی نرم تھی کہ اس میں پاؤں دھنس جاتے تھے اور نقل و حرکت میں مشکلات پیدا ہوتی تھیں۔

جانِ دو عالم ﷺ نے جس کنویں کے پاس پڑاؤ کیا تھا، وہ مشرکین کی فوج سے خاصا ہٹا ہوا تھا، اس لئے حضرت حبابؓ نے پوچھا ---"یارسول اللہ! یہاں قیام کرنے کے بارے میں کوئی حکم نازل ہوا ہے یا محض حربی نکتۂ نظر سے اس مقام کا انتخاب کیا گیا ہے؟"

"صرف جنگی تدبیر کے لحاظ سے ایسا کیا گیا ہے۔" جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا

"اگر حکم الٰہی نہیں ہے" حضرت حبابؓ نے بصد ادب کہا "تو پھر میرے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ ہم آگے بڑھ کر مشرکین کے قریب ترین جو کنواں ہے اس پر قبضہ کرلیں اور اس کے علاوہ جتنے بھی کنویں ہیں ان کو پاٹ دیں تاکہ دشمن کسی موقع پر ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔"

جانِ دو عالم ﷺ کو حضرت حبابؓ کی یہ رائے پسند آئی۔ چنانچہ آپ نے مشرکین کے قریب والے کنویں پر قبضہ کرنے کے بعد باقی کنوؤں کو بند کرنے کا حکم دے دیا۔ (۱)

ہی نہیں تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ مرتد ہونے کے بعد دوبارہ مسلمان ہو گیا تھا۔ وَاللہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

(۱) بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت حبابؓ نے جب اپنی رائے پیش کی تو جبریل امین نازل ہوئے اور عرض کی ---"یارسول اللہ! حباب کی رائے صائب اور درست ہے۔"

جبریل امین کی تائید کی بناء پر حضرت حبابؓ کی رائے پر عمل ہوا، یا جانِ دو عالم ﷺ کو از خود ان کی تجویز پسند آئی، بہر صورت حضرت حبابؓ کا یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ آپ نے ان کی رائے تسلیم کرتے ہوئے اپنی انتخاب کردہ جگہ ترک کر دی اور ان کے مشورہ پر عمل کیا، حالانکہ حباب کی عمر اس وقت ☜

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے، ان تمام کنوؤں میں پانی برائے نام تھا جو لشکروں

تینتیس (۳۳) سال تھی۔

مولوی افضل حق یہ واقع ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

''آنحضرت ﷺ صحابہ کرام کی آزادیٔ رائے کے بڑے قدردان تھے..... تدبیر کے معاملے میں مشورہ قبول فرمالیتے تھے۔ سلیم الفطرت صحابہ، وحی کے حامل پیغمبر کے حضور بڑی جرأت سے رائے دیا کرتے تھے اور سرورِ عالم ﷺ مناسب رائے کو خوشی سے قبول فرمالیا کرتے تھے۔

آج کے ہادیانِ طریقت اور حامیانِ شریعت اپنے حضور میں لب کشا ہونے کو ہی زبان درازی سمجھتے ہیں۔ بہت سے باپ ہیں جن کے سامنے اولاد دم نہیں مار سکتی۔ بہت سے جابر خاوند ایسے ہیں جن سے بیوی ڈرتے ڈرتے کلام کرتی ہے۔ گویا اس شاہِ مطلق کی موجودگی میں گھر بھر غلام زادوں کی منڈی ہے۔ لوگ ایسے گھر کو مہذب گھر سمجھتے ہیں۔ اولوالعزم پیغمبر نے اپنی امت کو آزادیٔ رائے کا سبق دیا۔ آزاد قوم پیدا ہوئی۔ ہم بیوی بچوں کی بات سننا پسند نہیں کرتے، اس سے غلامانہ ذہنیت رکھنے والی نسل کی افزائش کرتے ہیں۔'' (محبوب خدا ص ۱۲۵)

حضرت حبابؓ کو اسی اصابتِ فکر کی بناء پر ذُوالرَّاْیِ (صاحب رائے) کہا جاتا تھا، مگر انسان بہرحال انسان ہے۔ تمام تر ذہانت و فطانت کے باوجود بعض دفعہ ایسی اجتہادی غلطی کر بیٹھتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت حبابؓ جیسے بالغ نظر انسان نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جو تجویز پیش کی تھی، وہ کسی طرح بھی قابلِ عمل نہ تھی۔ انہوں نے مسئلہ خلافت کا یہ حل پیش کیا تھا کہ مِنَّا اَمِیْرٌ وَمِنْکُمْ اَمِیْرٌ (ایک امیر انصار سے اور ایک مہاجرین سے۔)

ایک مملکت کے دو بادشاہ اور ایک سلطنت کے دو حکمران نہ کبھی ہوئے ہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے اس تجویز کے ساتھ اکثریت نے اتفاق نہیں کیا اور صدیق اکبرؓ کو امیر منتخب کرلیا۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں حضرت حبابؓ واصل بحق ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر کم و بیش پچاس سال تھی۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر تھا، اس لئے فریقین کے کنوؤں میں پانی ختم ہوگیا اور پیاس کے مارے سب کا برا حال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور زوردار بارش برسادی بارش برسنے کے ساتھ ہی میدان کی نوعیت بدل گئی۔ مسلمانوں والا حصہ جو نرم ہونے کی وجہ سے باعثِ زحمت بنا ہؤا تھا، اب باعث رحمت ہوگیا، کیونکہ موسلا دھار بارش سے ایک تو نرم ریت اچھی طرح جم گئی، دوسرے نرم زمین میں مسلمانوں نے بآسانی چھوٹے چھوٹے حوض بنا کر اتنا پانی جمع کرلیا کہ ان کی ضروریات کے لئے کافی ہوگیا؛ جبکہ مشرکین والا حصہ سخت ہونے کی وجہ سے ایک تو حوض نہ بنائے جاسکے، دوسرے زمین پھسلواں ہوگئی اور اس پر چلنا خاصا مشکل ہوگیا۔

پانی نہ ملنے سے مشرکین کی حالت غیر ہوگئی، آخر مجبور ہوکر اسی کنویں پر پانی لینے آئے جس پر جانِ دو عالم ﷺ کے اصحاب کا قبضہ تھا۔ آمنے سامنے صف آرا خون کے پیاسے دشمنوں کو بھی کبھی کسی نے پانی دیا ہے---؟ مگر اس مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام، جس نے اپنے اصحاب کو یہ انوکھا حکم دیا۔

''چھوڑ دو! انہیں جی بھر کے پانی پی لینے دو!''

عین میدانِ جنگ میں اس فراخ دلی کا مظاہرہ بلاشبہ وہی ایک انسان کرسکتا تھا، جس کو اس کے رب نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمْ.

سائبان

لڑائی سے پہلے حضرت سعدؓ نے ایک بہت عمدہ اور پُرمحبت تجویز پیش کرتے ہوئے عرض کی

''یا نبی اللہ! اگر اجازت ہو تو ہم آپ کے لئے ایک سائبان بنا دیں جس میں آپ قیام فرمائیں اور ہم دشمنوں سے دو دو ہاتھ کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح دے دی تو ہمارا مقصد پورا ہوجائے گا اور اگر خدانخواستہ شکست ہوگئی تو اس صورت میں آپ واپس مدینہ چلے جائیں۔ وہاں آپ کے ساتھ بے پناہ محبت رکھنے والے بہت سے لوگ موجود ہیں--- اگر انہیں اس بات کا پتہ ہوتا کہ آپ کو جنگ کرنی پڑے گی تو وہ ضرور آپ کے

ساتھ آتے --- اگر آپ بخیریت مدینہ پہنچ گئے تو ان لوگوں کو بہت مسرت ہوگی۔ وہ آپ کا بھرپور دفاع کریں گے، مخلصانہ ساتھ دیں گے اور آپ کے شانہ بشانہ جہاد کریں گے۔"

جانِ دو عالم ﷺ نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور ایسی عمدہ رائے دینے پر حضرت سعدؓ کی بہت تعریف کی اور ان کے لئے دعا فرمائی۔ چنانچہ صحابہ کرام نے آپ کے لئے ایک چھپر سا بنا دیا جس میں آپ جنگ کے اختتام تک قیام پذیر رہے اور سربسجود ہو کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے رہے۔

بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْت

جس دن معرکہ کارزار گرم ہونا تھا، اس سے ایک رات پہلے جانِ دو عالم ﷺ نے میدانِ بدر کا معائنہ کیا اور مختلف جگہوں پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ کل یہاں فلاں کافر نے گر کر مرنا ہے اور یہاں فلاں نے --- موت اور مقام کے بارے میں یہ فیصلے اتنے اٹل اور قطعی تھے کہ حرف بحرف پورے ہوئے۔ نہ تو ان بدبختوں میں سے کوئی زندہ بچا جن کے آپ نے نام لئے تھے، نہ آپ کے مقرر کردہ مقامات سے ذرہ برابر اِدھر اُدھر ہوا۔ فَمَا مَاطَ اَحَدٌ مِنْ مَّوْضِعِ یَدِہٖ.

جنگ بندی کی مزید کوششیں

مسلمانوں کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے مشرکین نے عمیر ابن وہب کو بھیجا، اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکرِ اہل اسلام کے گرد ایک چکر لگایا اور کہا --- "یہاں پر موجود آدمی تو صرف تین سو کے لگ بھگ ہیں؛ البتہ ہو سکتا ہے کہ کچھ حصہ قدرے دور ٹھہرا ہوا ہو، اس لئے میں ذرا آگے تک دیکھ کر آتا ہوں۔"

چنانچہ اس نے دور تک دیکھا بھالا اور واپس آ کر بتایا کہ آس پاس کہیں بھی کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ بس، یہی تین سو افراد ہیں۔ لیکن اے قومِ قریش! تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان تین سو میں سے ہر فرد مجسم موت ہے اور مرنے مارنے پر تلا ہوا ہے۔ اگر لڑائی ہوئی تو ان کا ایک آدمی کم از کم ہمارے ایک آدمی کی جان تو ضرور لے لے گا۔ اب تم خود سوچو کہ اگر ہمارے اعزہ و اقارب میں سے تین سو آدمی مارے گئے تو پھر ہماری زندگی میں کیا خوشی باقی

رہ جائے گی---؟اس لئے جنگ سے پہلے اس پہلو پر بھی غور کرلو!

یہ سن کر حکیم ابن حزام نے عتبہ سے بات کی اور کہا---''ابوالولید! (عتبہ کی کنیت) آپ ایک معزز سردار ہیں۔قریش آپ کی ہر طرح اطاعت کرتے ہیں---اگر آج ایک کام کردیں تو تاابد آپ کا نام روشن ہوجائے گا اور ہمیشہ آپ کا ذکر خیر ہوتا رہے گا۔''

''ایسا کون سا کام ہے، حکیم!؟'' عتبہ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ---کہ آپ قریش کو واپس لے جائیں---رہا ابن حضرمی کے قتل (۱) کا معاملہ تو آپ خود اس کی دیت ادا کردیں اور اس کو جو مالی نقصان ہوا ہے، وہ بھی اس کے ورثاء کو اپنی طرف سے پورا کردیں۔''

عتبہ معقول انسان تھا، اس نے حکیم کی رائے کو پسند کیا اور بخوشی ابن حضرمی کی دیت ادا کرنے پر تیار ہوگیا۔پھر حکیم کو مشورہ دیا کہ تم جاکر ابوجہل سے بھی بات چیت کرلو، ایسا نہ ہو کہ وہ لوگوں کو بھڑکا کر سارا معاملہ گڑبڑ کردے۔

اس کے بعد عتبہ نے لوگوں کو قائل کرنے کے لئے ایک مختصر سی تقریر کی اور کہا۔

''سنو، اے جماعتِ قریش! محمد کے ساتھ جنگ کرنے سے تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوگا---؟خدا کی قسم! اگر تم نے محمد اور اس کے ساتھیوں کو تہ تیغ کرکے فتح بھی حاصل کرلی تو اس فتح سے تمہیں کیا مسرت ملے گی؛ جبکہ تم میں سے ہر شخص کے ہاتھ اپنے قریبی رشتہ داروں کے خون سے رنگے ہوں گے---کسی نے اپنے چچازاد کو قتل کیا ہوگا، کسی نے ماموں زاد کو اور کسی نے کسی اور قریبی عزیز کو، اس لئے میرا خیال ہے کہ تم محمد کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔وہ جانے اور باقی عرب۔اگر عرب محمد پر غالب آگئے تو از خود تمہارا مقصد پورا ہوجائے گا اور اگر محمد نے عربوں پر غلبہ پالیا تو تمہارے ساتھ بہتر سلوک کرے گا اور تم جو کچھ مراعات اس سے مانگو گے، تمہیں دے دے گا۔''

یہ بہت عمدہ مشورہ تھا، ہوسکتا تھا کہ سب اس پر متفق ہوجاتے، مگر جب حکیم نے ابوجہل

---

(۱) یہ واقعہ سریہ عبداللہ بن جحش کے تحت تفصیل سے گزر چکا ہے۔

سے ملاقات کی اور بتایا کہ مجھے عتبہ نے اس غرض سے بھیجا ہے تو ابو جہل نے جھٹ سے کہا۔

''عتبہ ڈر کر ایسی بزدلانہ باتیں کر رہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عتبہ کا بیٹا (۱) مسلمان ہو چکا ہے اور اس وقت مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ عتبہ کو یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ کہیں وہ ہمارے ہاتھوں مارا نہ جائے۔ اب پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اب اللہ تعالیٰ ہی ہمارا فیصلہ کرے گا۔''

عتبہ کی حقیقت پسندانہ تقریر کا اثر زائل کرنے کے لئے یہ الزام ہی کافی تھا کہ عتبہ محض اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے، مگر ابو جہل نے اسی پر اکتفانہ کیا؛ بلکہ مزید اشتعال پھیلانے کے لئے ایک اور چال چلی اور عمر ابن حضرمی مقتول کے بھائی عامر ابن حضرمی کو بلا کر کہا۔

''دیکھو عامر! ہم تمہارے بھائی کا انتقام لینے آئے ہیں اور جن سے انتقام لینا ہے وہ اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں، مگر تمہارا سرپرست عتبہ کہتا ہے کہ ہمیں جنگ کے بغیر واپس چلے جانا چاہیے، اس لئے تم اٹھ کر غم واندوہ کا اظہار کرو اور لوگوں کو اپنے بھائی کا قتل یاد دلاؤ!''

عامر یہ سنتے ہی اٹھا اور دردناک آواز میں نوحہ کرنے لگا ''وَاعُمَرَاہ! وَاعُمَرَاہ!'' (ہائے عمر! ہائے عمر!)

یہ المناک بین سن کر لوگوں کے انتقامی جذبات پوری شدت سے بھڑک اٹھے اور صلح کی تمام کوششوں پر پانی پھر گیا۔ (۲)

صف آرائی

۱۷، رمضان بروز جمعہ علی الصبح جانِ دو عالم ﷺ نے حربی اصولوں کے مطابق

---

(۱) یعنی ابو حذیفہ، جن کا تذکرہ ص ۲۱۷ پر گزر چکا ہے۔

(۲) ''آمنے سامنے'' سے یہاں تک کے حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔ ابن ہشام ج ۲، ص ۶۶، ۶۷، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۶۳ تا ۱۷۰، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۷۵ تا ۳۷۷، البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۲۶۷ تا ۲۷۰۔

فوج کو منظم کیا۔ مہاجرین کا علم حضرت مصعبؓ کو، خزرج کا حضرت حبابؓ کو اور اوس کا حضرت سعدؓ ابن عبادہ کو عطا فرمایا۔ مجاہدین کی صفیں قائم کیں اور بنفسِ نفیس ان کو سیدھا کیا۔ اس وقت ایک عجیب واقع پیش آیا!

جب آپ صفوں کو درست کرتے ہوئے حضرت سواد ابن غزیہؓ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ سواد صف سے کچھ آگے نکلے ہوئے ہیں۔ جانِ دو عالم ﷺ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تیر، یا چھڑی کو ان کے پیٹ پر رکھ کر ذرا سا پیچھے دھکیلا اور فرمایا

''اِسْتَوِ یَاسَوَادُ!'' (سواد! صف میں سیدھے ہو کر کھڑے ہو۔)

حضرت سوادؓ نے موقع غنیمت جانا اور کہا---''یارسول اللہ! آپ نے جہاں دباؤ ڈالا ہے، وہاں مجھے درد ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق وعدل کے ساتھ بھیجا ہے، اس لئے مجھے بدلہ لینے دیجئے!''

اَللّٰہُ اَکْبَرُ! اس انوکھے مطالبے پر حق وعدالت کے علم بردار اس عظیم سپہ سالار کی جبین پر ناگواری کی کوئی شکن نہیں ابھری؛ بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے اپنا پیٹ کھول دیا اور سواد سے کہا---''لے لو بدلہ۔''

ایک سپاہی اپنے سالار سے بدلہ لے، ایک غلام اپنے آقا سے بدلہ لے، ایک عاشق اپنے محبوب سے بدلہ لے، ایک امتی اپنے رسول سے بدلہ لے---یہ بھلا کہاں ممکن ہے! وہ تو ایک بہانہ تھا، ایک حیلہ تھا، شکم اقدس کو بے حجاب کرانے کے لئے---اور جب جانِ دو عالم ﷺ نے کپڑا ہٹا دیا تو سوادؓ والہانہ انداز میں لپٹ گئے اور آپ کے مقدس شکم پر بوسوں کی بارش کر دی۔ (۱)

---

(۱) بعینہ اس طرح کا واقعہ مدینہ منورہ میں بھی پیش آیا تھا جب جانِ دو عالم ﷺ نے ایک خوش مزاج انصاری صحابی کو ہنسنے ہنسانے پر تنبیہ کرتے ہوئے چھڑی ماری تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس صحابی کا نام بھی سواد ہی تھا؛ البتہ وہ سواد ابن عمروؓ تھے اور یہ سواد ابن غزیہؓ ہیں۔ علاوہ ازیں مدینہ والے واقعہ میں یہ اضافہ بھی ہے کہ سواد نے کہا---''یارسول اللہ! اس وقت میرے بدن کا بالائی حصہ ننگا تھا، ☜

جانِ دو عالم ﷺ نے حیرت سے پوچھا---"یہ کیا کر رہے ہو سواد؟!"

"یا رسول اللہ! جنگ کا مرحلہ درپیش ہے" حضرت سوادؓ دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے گویا ہوئے۔"ہوسکتا ہے میں اس لڑائی میں کام آ جاؤں اور میرا دل چاہتا تھا کہ آپ کے ساتھ میری آخری ملاقات اس حال میں ہو کہ میری جلد آپ کی جلد انور کے ساتھ مَس ہو رہی ہو۔"

جانِ دو عالم ﷺ ان کی اس ادا سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے لئے دعا فرمائی۔(۱)

آہ! کیا جذبے تھے، کیا ولولے تھے اور کیا تمنائیں تھیں، کیا ادائیں تھیں---محبت بھری اور پیاری پیاری۔

ایفائے عہد

عددی اعتبار سے مسلمان اتنے کم تھے کہ قباث ابن اشیم کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ مٹھی بھر لوگ ہمارا کیا مقابلہ کریں گے، ان کے مقابلے میں تو اگر مکے کی عورتیں بھی نکل آئیں تو انہیں اپنی آستینوں سے مار مار کر بھگا دیں۔(۲)

جب کہ آپ کا جسم ڈھکا ہوا ہے۔"

یہ سن کر آپ نے کپڑا اٹھا دیا تھا اور سواد ابن عمرو نے بصد اشتیاق چومنا شروع کر دیا تھا۔

اللہ اللہ! جانِ دو عالم ﷺ کے معطر بدن کو چومنے کے لئے اہل محبت کیا کیا جتن کیا کرتے تھے، رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمْ اَجْمَعِیْن.

(۱) ابن ھشام ج ۲، ص ۶۸، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۷۱، البدایہ والنھایہ ج ۲، ص ۲۷.

(۲) قباث ابن اشیم غزوہ خندق کے بعد مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے اسلام لانے کا واقعہ انہی کی زبانی سنیئے!

"میں غزوہ احزاب کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھ سے فرمایا "تو وہی ہے نا، جس نے غزوہ بدر کے دن یہ کہا تھا کہ ان کے مقابلے کے لئے اگر مکے کی عورتیں بھی نکل آئیں تو انہیں اپنی آستینوں کے ساتھ مار مار کر بھگا دیں۔!"

عددی قلت کے اس عالم میں اگر ایک دو آدمی بھی بڑھ جائیں تو کافی ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ مگر جانِ دو عالم ﷺ نے اتنی شدید ضرورت میں بھی ایفائے عہد کو مقدم رکھا اور دو صحابیوں کو جنگ میں شرکت کی اجازت نہ دی۔ یہ دو صحابی حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت حسیل (۱) تھے جو مکہ سے آتے ہوئے مشرکین کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ مشرکین

میں نے عرض کی---''یارسول اللہ! اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، یہ کلمے نہ میری زبان سے ادا ہوئے، نہ میرے لبوں تک پہنچے، نہ کسی نے مجھ سے سنے۔ یہ تو ایک خیال تھا، جو ایک لمحے کے لئے میرے دل میں گزرا تھا۔ (اور آپ اس پر بھی مطلع ہو گئے۔) اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔'' سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۶۸۔

(۱) حضرت حسیل غزوہ احد میں نادانستگی سے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ چونکہ یہ معمر انسان تھے، اس لئے جانِ دو عالم ﷺ ان کو مدینہ میں چھوڑ گئے تھے، مگر یہ صبر نہ کر سکے اور شوقِ شہادت میں میدانِ کارزار کی طرف چل پڑے۔ لیکن غلطی سے اس طرف جا گھسے جدھر مشرکین تھے۔ اس وقت عام حملہ جاری تھا۔ مسلمانوں نے انہیں بھی مشرکین کا ساتھی سمجھا اور مار ڈالا۔ آپ کو اس حادثہ پر بہت دکھ ہوا اور اپنی طرف سے ان کی دیت ادا کی۔ ان کے بیٹے حضرت حذیفہ جانتے تھے کہ اس میں قصور کسی کا نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، غلط فہمی سے ہوا ہے، اس لئے انہوں نے کمال سیر چشمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیت کی ساری رقم مسلمانوں میں بانٹ دی۔

حضرت حذیفہ دیگر تمام غزوات میں جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ شامل رہے۔ آپ کے وصال کے بعد بھی جہاد میں بھرپور شرکت کرتے رہے۔ ہمدان، رے اور دینور کا سارا علاقہ آپ ہی کے ہاتھوں فتح ہوا۔ فاروق اعظم کے دور خلافت میں مدائن کے گورنر بھی رہے۔

تکوینی معاملات کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کی وسعت علمی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ خود فرماتے ہیں۔

''لَقَدْ حَدَّثَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَةُ۔''

(مجھے رسول اللہ نے وہ بھی بتا دیا تھا، جو ہو چکا ہے اور وہ بھی جو قیامت تک ہونے والا ہے۔) ☜

نے ان سے کہا۔۔۔''اگر تم وعدہ کرو کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہمارا مقابلہ نہیں کرو گے تو ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں۔''

جو علیم و خبیر آقا اپنے غلاموں کو مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ کا علم سکھا دے، اس کی اپنی علمیت کا کیا عالم ہوگا!۔۔۔سچ ہے۔۔۔وَمِنْ عُلُوْمِکَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

صحابہ کرام اسی بناء پر آپ کو صَاحِبُ سِرِّ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ کہا کرتے تھے۔یعنی رسول اللہ کے رازوں کے امین۔

حضرت ابوالدرداء آپ کے بارے میں فرماتے ہیں ''صَاحِبُ السِّرِّ الَّذِیْ لَا یَعْلَمُہٗ غَیْرُہٗ.''(ان اسرار سے واقف، جن سے آپ کے علاوہ کوئی بھی آگاہ نہیں ہے۔)

آپ کو ہر آدمی کے متعلق پتہ ہوتا تھا کہ یہ مومن ہے یا منافق۔حضرت علیؓ فرماتے ہیں ''کَانَ اَعْلَمَ النَّاسِ بِالْمُنَافِقِیْنَ.''(منافقوں کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔)

اسی لئے جب کوئی آدمی مر جاتا تھا تو فاروق اعظم ؓ دیکھتے رہتے تھے کہ اس کے جنازے میں شرکت کے لئے حضرت حذیفہ آتے ہیں یا نہیں۔اگر آپ نہ آتے تو حضرت عمر بھی اس جنازے میں شامل نہیں ہوتے تھے۔

شہادتِ حضرت عثمان ؓ سے چالیس دن بعد ۳۶ھ میں وفات پائی۔زندگی کی آخری شب اس طرح بسر ہوئی کہ رات کے ابتدائی حصے میں غشی طاری ہوگئی۔پچھلے پہر افاقہ ہوا تو پوچھا، کیا وقت ہے؟ بتایا گیا کہ ابتدائے سحر ہے تو آپ نے دو تین دفعہ کہا ''جہنم سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، جہنم سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔'' پھر وصیت فرمائی کہ میرے کفن کے لئے معمولی کپڑے خریدنا، کیونکہ اگر میرا رب مجھ سے راضی ہوا تو مجھے اس سے بہتر پوشاک مل جائے گی اور اگر ناراض ہوا تو یہ لباس بھی چھین لیا جائے گا۔

حاضرین کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔۔۔''اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالطَّاعَۃِ لِاَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ.''

(میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہنا اور امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب کی اطاعت کرنا۔) ☜

انہوں نے وعدہ کرلیا تو مشرکین نے انہیں رہا کر دیا۔ یہ دونوں میدانِ بدر میں پہنچے اور راستے میں جو کچھ پیش آیا تھا، جانِ دو عالم ﷺ کے گوش گزار کیا۔ ان کی روئیداد سن کر آپ نے فرمایا

''ہم ہر صورت میں وعدہ وفا کریں گے، ہمیں صرف اللہ کی مدد درکار ہے۔'' (۱)

آغاز جنگ

عرب میں لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کرتا تھا کہ پہلے ایک فریق کے مشہور شجاع انفرادی طور پر سامنے آتے تھے اور اعلان کرتے تھے کہ ہے کسی میں اتنا دم خم کہ ہمارا مقابلہ

اس کے بعد آپ کا وصال ہوگیا۔ رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنہُ

(تمام واقعات، اصابہ، استیعاب، مستدرک حاکم، طبقات ابن سعد، ذکر حذیفہ سے ماخوذ ہیں۔

(۱) مستدرک ج ۳، ص ۳۷۹، صحیح مسلم ج ۲، ص ۱۰۶۔

شدید مجبوری کے عالم میں دشمن سے کیے گئے وعدے کا پاس کرنا اگرچہ ایک غیر معمولی عظمت ہے، مگر اس سے بھی زیادہ حیران کن مشرکین کا یقین واعتماد ہے کہ انہوں نے محض زبانی وعدے پر اعتبار کرکے ان کو چھوڑ دیا --- کیا انہیں یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ ہوسکتا ہے یہ لوگ وہاں جاکر اپنے وعدے سے منحرف ہو جائیں اور مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑنے لگیں؟

میں سمجھتا ہوں، انہیں یہ خیال ضرور آیا ہوگا، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہمارا مقابلہ ایک صادق الوعد انسان کے ساتھ ہے اور اس کے کردار پر انہیں اتنا بھروسہ تھا کہ انہیں یقین رہا ہوگا کہ وعدے کے بعد اگر ان لوگوں نے شرکت کی کوشش کی بھی تو وعدوں کی لاج رکھنے والا محمد انہیں کبھی شریک نہیں ہونے دے گا --- خواہ کیسی ہی اشد ضرورت کیوں نہ ہو۔

گویا تمام تر مخالفت کے باوجود مشرکین یہ تصور نہیں کرسکتے تھے کہ محمد اپنے کسی پیروکار کو وعدہ خلافی کی اجازت دے دے گا۔ وَالفَضلُ مَاشَهِدَتْ بِهِ الأعْدَاء۔

صَلَّی اللہُ عَلٰی صَادِقِ الوَعْدِ الاَمِیْنِ وَآلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۔

کرے؟ اس پر دوسرے فریق سے بھی چند بہادر شخص نکل آتے تھے اور مصروف پیکار ہو جاتے تھے۔ جب تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا، عام حملہ نہیں کیا جاتا تھا۔

غزوۂ بدر کی ابتداء بھی اسی طرح ہوئی۔ سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کے ساتھ سامنے آیا اور مبارزت طلب کی، جسے سن کر انصار میں سے تین پرجوش بھائی معاذؓ، معوذؓ، اور عوفؓ (۱) باہر نکل آئے۔ عتبہ وغیرہ نے ان سے پوچھا --- ''تم کون لوگ ہو؟''

''ہمارا تعلق انصار سے ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''ہمارا تمہارا کیا مقابلہ؟'' عتبہ اور اس کے ساتھیوں نے نخوت سے کہا ''ہم صرف اپنی حیثیت کے لوگوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔'' (۲)

پھر عتبہ نے بآواز بلند کہا --- ''اے محمد! ہمارے ساتھ معرکہ آزمائی کے لئے ہمارے جوڑ اور معیار کے آدمی بھیجو، جو ہماری قوم کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں۔''

چونکہ عتبہ اور شیبہ معمر تھے؛ جبکہ ولید نوجوان تھا، اس لئے جانِ دو عالم ﷺ کی نگاہِ انتخاب بھی بنی ہاشم کے تین ایسے ہی افراد پر پڑی جن میں سے دو بڑی عمر کے تھے، یعنی حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ اور ایک نوعمر یعنی حضرت علیؓ۔ چنانچہ آپ نے ان کو نام بنام پکارا،

قُمْ یَا عُبَیْدَہ! --- قُمْ یَا حَمْزَہ! --- قُمْ یَا عَلِی!

یہ تینوں اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے اٹھے اور دشمنوں کے روبرو جا ٹھہرے، انہوں نے پوچھا --- ''تم کون لوگ ہو؟'' (۳)

تینوں نے اپنے نام بتائے تو عتبہ وغیرہ نے کہا --- ''اب ٹھیک ہے اَکْفَاءٌ کِرَام

---

(۱) ان تینوں کا تعارف عنقریب آ رہا ہے۔

(۲) قریش، انصار کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ انصار کھیتی باڑی کرتے تھے اور قریش اسے معیوب سمجھتے تھے۔

(۳) میدان میں اترتے وقت گرد و غبار سے بچنے کے لئے عرب اپنے عمامے کے شملے سے ناک اور منہ ڈھانپ لیا کرتے تھے، اس لئے ایک دوسرے کو پہچان نہیں پاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ تم کون ہو؟

ہمارے ہمسر اور معزز لوگ ہو۔"

مقابلہ شروع ہوا۔ (۱) حمزہؓ و علیؓ تو اللہ کے شیر تھے، شیروں ہی کی طرح اپنے اپنے حریفوں پر جھپٹے اور پہلے ہی حملے میں ان کو خاک و خون میں لوٹا دیا؛ البتہ حضرت عبیدہؓ کا مقابلہ کچھ طول پکڑ گیا۔ انہوں نے اگرچہ اپنے مقابل کو خاصا زخمی کر دیا تھا مگر ساتھ ہی خود بھی شدید مجروح ہو گئے تھے اور ایک پنڈلی کٹ گئی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ ان کی امداد کے لئے آگے بڑھے اور ایک لمحے میں ان کے حریف کا کام بھی تمام کر دیا۔ پھر حضرت عبیدہؓ کو اٹھایا اور شدید زخمی حالت میں جانِ دو عالم ﷺ کے قریب لا کر ڈال دیا۔

دریدہ بدن، کٹی ہوئی پنڈلی، جس سے گودا بہہ رہا تھا، جانکنی کا عالم --- ان سارے دردوں کا مداوا جانِ دو عالم ﷺ نے یوں کیا کہ اپنا پائے اقدس ان کے چہرے کے قریب کر دیا اور انہوں نے اپنا رخسار اس مقدس پاؤں پر رکھ دیا۔

پھر جانِ دو عالم ﷺ سے پوچھا --- "اَلَسْتُ شَهِيْدًا يَارَسُوْلَ اللهِ" (یارسول اللہ! کیا میں شہید نہیں ہوں؟)

آپ نے فرمایا --- اَشْهَدُ اَنَّكَ شَهِيْدٌ (میں گواہی دیتا ہوں کہ تم شہید ہو۔)

اس کے بعد حضرت عبیدہؓ نے ابو طالب کا ایک شعر پڑھا، جو انہوں نے مشرکین مکہ کے اس مطالبے کے جواب میں کہا تھا کہ محمد کو ہمارے حوالے کر دو۔

وَنُسْلِمُهٗ حَتّٰى نُصَرَّعَ حَوْلَهٗ ۔۔۔ وَنَذْهَلُ عَنْ اَبْنَائِنَا وَالْحَلَائِلِ

(ہم محمد کو اس وقت تمہارے سپرد کریں گے، جب ہم سب اس کے گرد کٹ کٹ کر گر پڑیں گے۔ اس وقت ہم اپنے بیٹوں اور بیویوں کو بھی بھول جائیں گے۔)

یہ شعر پڑھ کر کہنے لگے --- "کاش! آج ابو طالب زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کی بہ نسبت یہ شعر ہم پر زیادہ صادق آتا ہے۔"

---

(۱) کون کس کے مقابل تھا؟ اس میں خاصا اختلاف ہے۔ ہم کوشش کے باوجود کسی رائے کو ترجیح نہ دے سکے، اس لئے اس سے صرف نظر کر لیا ہے۔

پھر دو شعر اپنی طرف سے کہے۔

فَاِنْ يَقْطَعُوْا رِجْلِىْ فَاِنِّىْ مُسْلِمٌ اَرْجُوْ بِهٖ عَيْشًا مِّنَ اللّٰهِ عَالِيًا

وَاَلْبَسَنِىَ الرَّحْمٰنُ مِنْ فَضْلِ مَنِّهٖ لِبَاسًا مِّنَ الْاِسْلَامِ غَطّٰى الْمَسَاوِيَا

(اگر دشمنوں نے میرا پاؤں کاٹ ڈالا ہے تو کیا پرواہ! میں تو مسلمان ہوں اور اس تکلیف کے عوض اللہ تعالیٰ سے بلند پایہ زندگی کا امیدوار ہوں۔ مجھے رحمٰن نے اپنے فضل و احسان سے اسلام کا جو لباس عطا کیا ہے، اس نے میرے سارے عیوب کو ڈھانپ لیا ہے)

اپنے آقا کی عظمتوں کے گیت گاتا ہوا اور اپنے رب کی حمد و ثنا کرتا ہوا یہ پروانہ شمع رسالت پر فدا ہو گیا---اس حال میں کہ اس کا رخسار پائے اطہر پر ٹکا تھا۔(۱)

چھپر تلے

اس کے بعد جانِ دو عالم ﷺ اس سائبان کے نیچے تشریف لے گئے جو آپ کے لئے بنایا گیا تھا۔ صدیق اکبرؓ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت سعد ابن معاذؓ اور چند انصاری نوجوان شمشیر بکف دروازے پر کھڑے ہو گئے، تا کہ کسی مشرک کو اس طرف آنے کی جرأت نہ ہو۔

جانِ دو عالم ﷺ کبھی ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے، کبھی سجدہ ریز ہو جاتے اور عجز و نیاز مندی

---

(۱) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۷۰، الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۴۳۶، البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۲۷۴.

تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ یہ واقعہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ استیعاب میں حضرت عبیدہؓ کے حالات میں یہ ایمان افروز روایت بھی مذکور ہے کہ ایک دفعہ جانِ دو عالم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ سفر کرتے ہوئے جب ایک مقام پر قیام پذیر ہوئے تو صحابہ کرامؓ نے حیرت سے کہا۔

''یا رسول اللہ! یہاں ہر طرف کستوری کی خوشبو مہک رہی ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ''ایسا کیوں نہ ہو؛ جبکہ یہاں قریب ہی عبیدہ کی قبر موجود ہے۔''

رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ.

کی تصویر بن کر عرض کرتے۔

''اَللّٰھُمَّ! مجھے فتح و نصرت عطا کرنے کے تو نے جو وعدے کر رکھے ہیں، آج میں ان کے پورا کیے جانے کا طلب گار ہوں۔''

پھر نیاز سے ناز کی طرف منتقل ہو جاتے اور محبوبانہ انداز میں فرماتے

''اے اللہ! اگر اہل ایمان کی اس جماعت کو تو نے ہلاک کر دیا تو---لَنْ تُعْبَدَ بَعْدَ ذٰلِکَ الْیَوْم---پھر آج کے بعد تیری عبادت کرنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ اے اللہ! اگر دشمن غالب آ گئے تو شرک مسلط ہو جائے گا اور تیرا دین کہیں بھی قائم نہیں ہو سکے گا۔''

پھر ناز سے نیاز کی جانب رجوع فرماتے اور کہتے

''اے اللہ! ہمیں فتح و ظفر عطا فرما اور شکست کی ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھ! یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ، یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ.''

اس دن جانِ دو عالم ﷺ نے یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ کا ورد اس کثرت سے کیا کہ حضرت علی فرماتے ہیں---''میں وقفے وقفے سے کئی بار میدانِ کارزار سے نکل کر رسول اللہ ﷺ کی طرف گیا اور ہر دفعہ یہی دیکھا کہ آپ سجدے میں سر رکھے محو مناجات ہیں اور انہی اسمائے حسنیٰ کو دہرا رہے ہیں---یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ، یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ.''(۱)

یہ سجدہ ریزیاں اور مناجاتیں، یہ آہ و زاریاں اور اشکوں کی برساتیں، یہ سرگوشیاں اور ناز و نیاز کی باتیں دیر تک جاری رہیں۔ شانۂ اقدس سے ردائے اطہر ڈھلک گئی، مگر آپ کی محویت و استغراق میں فرق نہ آیا۔ یہ منظر دیکھ کر عشقِ صدیق تڑپ اٹھا، مچل اٹھا۔ بے قرار ہو کر آگے بڑھے، چادر مبارک کاندھے پر درست کی اور پشتِ انور سے چمٹ کر بصد اندازِ غمگساری عرض گزار ہوئے---''اب بس بھی کیجئے یارسول اللہ! آپ نے تو الحاح و زاری کی حد کر دی ہے---اللہ تعالیٰ یقیناً اپنے تمام وعدے پورے کرے گا اور آپ کی

---

(۱)زرقانی ج ۱، ص ۵۰۵، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۷۹.

ساری تمنائیں اور مرادیں برلائے گا۔‘‘(۱)

اِدھر اللہ کا محبوب آنسوؤں کے خزانے لٹا رہا تھا، تو اُدھر اُس کے جان نثار جانوں کے نذرانے پیش کر رہے تھے اور اپنے لہو سے صحرائے بدر کو لالہ زار بنا رہے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت مہجعؓ آگے بڑھے اور عامر حضرمی کے چلائے ہوئے تیر سے شہید ہو گئے۔ یہ مہاجرین کی طرف سے خون کا پہلا نذرانہ تھا۔ اس کے بعد ایک انصاری نوجوان، حضرت حارثہؓ آغوشِ شہادت میں جا گرے۔ وہ حوض کے کنارے بیٹھے پانی پی رہے تھے کہ اچانک کسی طرف سے ایک تیر آیا اور انہیں لگ گیا۔ زخم اتنا کاری تھا کہ اسی وقت جاں بحق ہو گئے۔ (۲)

---

(۱) زرقانی ج ۱، ص ۵۰۸، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۷۳، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۷۹.

(۲) حضرت حارثہؓ اگرچہ ایک کم عمر صحابی تھے، مگر مجاہدات و مشاہدات میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک دن جانِ دو عالم ﷺ نے ان سے پوچھا۔

’’كَيْفَ اَصْبَحْتَ يَا حَارِثَه!؟‘‘

(حارثہ! آج تم نے کس حال میں صبح کی؟)

’’اس حال میں یارسول اللہ!‘‘ حارثہؓ نے پورے یقین سے جواب دیا ’’کہ میں پکا اور سچا مومن تھا۔‘‘

جانِ دو عالم ﷺ ان کے اس دعوے سے متعجب ہوئے اور فرمایا۔

’’کیا کہہ رہے ہو! ذرا سوچ لو!‘‘

حضرت حارثہؓ نے عرض کی---’’یارسول اللہ! میں دنیا سے قطع تعلق کر چکا ہوں۔ رات بھر یادِ خدا میں جاگتا ہوں اور دن بھر روزے سے ہوتا ہوں اور بھوکا پیاسا رہتا ہوں۔ اب میری یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ گویا میں عرشِ الٰہی کو اپنے روبرو پاتا ہوں۔ اہل جنت کو بہشت میں ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرتے ہوئے دیکھتا ہوں اور اہل دوزخ کی چیخیں اور فریادیں سنتا ہوں۔‘‘

جانِ دو عالم ﷺ ایک نوجوان امتی کی ان بلند پایہ کیفیات سے خوش ہوئے اور فرمایا۔ ☜

بشارت

جانِ دو عالم ﷺ دعا و مناجات سے فارغ ہوئے تو آپ کو اونگھ سی آ گئی، چند

''واقعی تیری بصیرت بہت عمدہ ہوگئی ہے، اب اس طرزِ زندگی پر ثابت قدم رہنا، بیشک اللہ تعالیٰ نے تیرے دل میں ایمان کا بیج بو دیا ہے۔''

حضرت حارثہؓ نے آقا کو فرحاں دیکھا تو دل میں دبی تمنا لبوں پر آ گئی۔ عرض کی

''یارسول اللہ! دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب فرمائے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے دعا فرمادی اور کفر و اسلام کے پہلے ہی معرکے میں اس کی قبولیت ظاہر ہوگئی۔

غزوہ بدر سے فراغت کے بعد جب جانِ دو عالم ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لائے تو حارثہ کی والدہ ماجدہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں اور عرض کی۔

''یارسول اللہ! مجھے حارثہ کے ساتھ جیسی والہانہ محبت تھی وہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اب مجھے بتائیے کہ میرا بیٹا کس حال میں ہے---؟ اگر جنت میں ہے تو میں صبر کرلوں گی اور اگر دوزخ میں ہے تو عمر بھر اس کو روتی رہوں گی۔''

پتہ نہیں حارثہؓ جیسے متقی اور صالح بیٹے کے بارے میں ان کی ماں کو یہ شبہ کیونکر ہوا کہ انہیں دوزخ میں بھی ڈالا جاسکتا ہے---؟!

شاید اس کی وجہ یہ ہو---وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ---کہ حضرت حارثہؓ لڑتے ہوئے شہید نہیں ہوئے تھے؛ بلکہ پانی پینے کے دوران ایک نامعلوم تیر لگنے سے شہادت پا گئے تھے۔ ان کی ماں نے خیال کیا ہوگا کہ ہوسکتا ہے، ایسی موت شہادت نہ شمار کی جائے؛ بلکہ حارثہ کی غفلت اور لاپرواہی قرار دی جائے اور اس بنا پر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے ماں کو یوں بے قرار دیکھا تو اتنے بلیغ انداز میں تسلی دی کہ چند لفظوں میں اس کے دل سے حزن و ملال کا ہر نقش مٹا دیا۔ فرمایا

''اَوَھَبِلْتِ یَا اُمَّ حَارِثَۃَ......؟''

(حارثہ کی ماں! تو دیوانی ہوگئی ہے کیا---؟ تو ایک جنت کی بات کرتی ہے---؟

لمحوں بعد آنکھیں کھولیں اور صدیق اکبرؓ سے فرمایا

''ابو بکر! خوش ہو جاؤ کہ اللہ کی مدد آ پہنچی ہے--- یہ سامنے جبریل اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں۔ان کے دانتوں پر غبار نظر آ رہا ہے۔''(۱)

وہاں تو کئی جنتیں ہیں اور ان میں سب سے اعلیٰ اور برتر جنت کا نام ''فردوس'' ہے۔تیرا بیٹا کسی عام جنت میں نہیں گیا؛ بلکہ فردوس اعلیٰ کا مکین بنا ہے۔)

اس سے بڑی بشارت اور کیا ہو سکتی تھی---! اُمّ حارثہؓ کا غم خوشی میں ڈھل گیا اور بے ساختہ پکار اٹھیں۔

''بَخٍ بَخٍ لَکَ یَا حَارِثَۃ!''(واہ واہ! اے حارثہ!)

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنۃُ

(ماخوذ از سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۱۷۲.)

(۱) زرقانی، ص ۵۰۶، سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۱۷۶.

جبریل امین کے علاوہ بھی ہزاروں ملائکہ نازل ہوئے تھے، جیسا کہ قرآن کریم میں مفصل بیان ہے، مگر ان کے نزول کا اصل مقصد لڑنا نہیں تھا؛ بلکہ اہل ایمان کے دلوں کو مضبوط کرنا تھا--- فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا--- اور انہیں یہ دکھانا تھا کہ کارکنانِ قضا و قدر صف بصف تمہاری امداد کے لئے کمربستہ کھڑے ہیں، اس لئے پورے اطمینان اور دلجمعی سے مقابلہ کرو--- وَمَا جَعَلَہُ اللّٰہُ اِلَّا بُشْرٰی لَکُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُکُمْ بِہٖ ط

جزوی طور پر اگرچہ بعض ملائکہ عملاً بھی جنگ میں شریک ہوئے تھے؛ تاہم یہ شرکت بہت ہی محدود پیمانے پر ہوئی تھی، کیونکہ ہزار ہا ملائکہ نے اگر باقاعدہ طریقے سے حصہ لیا ہوتا تو ایک کافر بھی بچ کر نہ جا سکتا--- بلکہ اتنے تھوڑے سے کافروں کو ہلاک کرنے کے لئے تو ایک ہی فرشتہ کافی تھا--- ہزاروں کی فوج کس لئے---؟

آپ خود ہی سوچئے! کہ تین سو تیرہ مسلمانوں کے شانہ بشانہ اگر پانچ ہزار فرشتے بھی لڑے ہوں تو اس صورت میں مسلمانوں کی فتح کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے!!! پانچ ہزار سے زائد ماورائی ☜

اس کے بعد آپ سورۂ قمر کی یہ آیت --- سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (۱) --- تلاوت فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے اور جہاد و شہادت کے فضائل بیان کر کے مجاہدین کو صبر و ثبات کی تلقین فرمانے لگے۔ آپ نے فرمایا

''آج جو شخص بھی راہ خدا میں ثابت قدمی سے لڑے گا اور پیٹھ نہیں پھیرے گا وہ

قوتوں کی حامل فوج کا ایک ہزار عام قسم کے آدمیوں پر غلبہ پالینا --- اور وہ بھی اپنے متعدد مایہ ناز بہادروں کو قربان کرنے کے بعد --- کوئی قابل افتخار کارنامہ نہیں ہے۔ اس لئے میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ مؤرخین نے ملائکہ کی باقاعدہ شرکت کے بارے میں ضعیف اور منقطع روایات کا جو انبار اکٹھا کر رکھا ہے، اس سے صرف نظر کر لیا جائے اور فتح کا تاج ملائکہ کے سر پر سجانے کے بجائے انہیں غازیوں اور شہیدوں کے فرقِ اقدس پر سجا رہنے دیا جائے جو اپنے زور بازو سے عزم و ہمت اور شجاعت و بسالت کی ایک نئی طرح ڈال گئے اور اپنے لہو کی ندیوں سے بدر کے پیاسے میدان کو سیراب کر گئے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(۱) یہ آیت مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی تھی جب مسلمان انتہائی مظلومانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس دور میں کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایک دن یہ مظلوم و بے بس لوگ نہ صرف یہ کہ مشرکین مکہ سے مقابلہ کریں گے؛ بلکہ ان کو مار بھگائیں گے اور فتح حاصل کریں گے۔ اسی لئے جب یہ پرشکوہ آیت نازل ہوئی جس کا مفہوم یہ ہے --- عنقریب یہ جماعت ہزیمت اٹھائے گی اور انہیں پیٹھ پھیر کر بھاگنا پڑے گا --- تو حضرت عمرؓ نے حیرت سے پوچھا --- ''یا رسول اللہ! یہ کس جماعت کا تذکرہ ہو رہا ہے؟''

جانِ دو عالم ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا، کیونکہ ابھی اس پیشگوئی کے ظہور میں سالوں کا عرصہ حائل تھا۔ پھر سات سال بعد جب آپ یہی آیت تلاوت فرماتے ہوئے، سائبان سے باہر تشریف لائے تو حضرت عمرؓ خود ہی سمجھ گئے کہ اس آیت میں کس جماعت کی شکست فاش کی خبر دی گئی تھی!

اعجاز قرآن کا یہ کیسا واضح اور کھلا ثبوت ہے! صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ.''

یقیناً جنت میں جائے گا --- اٹھ کھڑے ہو! اس جنت کو حاصل کرنے کے لئے جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔''

یہ سن کر حضرت عمیر ابن حمامؓ فرطِ مسرت سے پکار اٹھے ''واہ واہ!''

جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا --- ''کس بات پر واہ واہ کر رہے ہو عمیر!؟''

''اس لئے یارسول اللہ!'' حضرت عمیرؓ نے جواب دیا'' کہ امید ہے میں بھی یہ سعادت حاصل کرلوں گا۔''

اس وقت حضرت عمیرؓ کے پاس کچھ کھجوریں تھیں جنہیں وہ کھاتے جا رہے تھے، خیال تھا کہ کھجوریں ختم کر کے جہاد میں شامل ہو جاؤں گا، مگر شہادت کا شوق اتنا غلبہ کر گیا کہ اتنی تاخیر بھی انہیں ناگوار گزرنے لگی۔ کہنے لگے --- ''کھجوریں ختم ہونے تک میں زندہ رہوں ---؟ یہ تو بڑا طویل عرصہ ہے۔''

چنانچہ کھجوریں ایک طرف اچھال دیں اور تلوار لیکر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور اس وقت تک لڑتے رہے، جب تک عروسۂ شہادت سے ہمکنار نہ ہوگئے۔ (۱) رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ

شہادت حضرت عوف رضی اللہ عنہ

حضرت عوف ابن حرثؓ نے عرض کی --- ''یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے کس عمل سے اتنا خوش ہوتا ہے کہ ہنس پڑتا ہے؟''

''اس عمل سے'' جانِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا'' کہ بندہ زرہ اور خود کے بغیر ہی لڑائی میں ہاتھ ڈال دے اور اس وقت تک لڑتا رہے، جب تک شہید نہ ہو جائے۔''

یہ سنتے ہی حضرت عوفؓ نے اپنی زرہ اتار پھینکی اور بے دریغ دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ آخر لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ. (۲)

ایک طرف اگر اہل ایمان شمع ہدایت پر نثار ہو رہے تھے تو دوسری جانب مشرکین

---

(۱) سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۱۷۶، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۸۰.

(۲) سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۱۷۷، اصابہ ذکر عوف.

کے بڑے بڑے جنگ آزما اور سردار جہنم رسید ہو رہے تھے۔ عتبہ کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ امیہ ابن خلف، ابوالبختری، ابو جہل اور عبیدہ ابن سعید جیسے دشمنانِ دین ہو ایمان بھی مجاہدین کے خارا شگاف حملوں کی تاب نہ لا سکے اور ذلت آمیز موت سے ہمکنار ہو گئے۔

قتلِ امیہ

امیہ کے قتل کا واقعہ خاصا دلچسپ ہے۔ یہ امیہ وہی سنگ دل وحشی ہے جو پہلے حضرت بلالؓ کا آقا ہوا کرتا تھا اور ان پر ایسے ہولناک مظالم توڑا کرتا تھا کہ انسانیت لرز اٹھتی تھی۔

حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ (۱) بیان کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں میری اور امیہ کی دوستی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے میرا نام عبدعمر سے تبدیل کر کے عبدالرحمٰن رکھا تو امیہ نے کہا

''کیا محمد کے کہنے پر ماں باپ کا پسند کیا ہوا نام ترک کر دو گے؟''

''یقیناً ترک کر دوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن میرے لئے رَحمٰن ایک اجنبی سا لفظ ہے'' امیہ نے کہا ''اس لئے میں تجھے عبدالرحمٰن کے بجائے عبدالالٰہ کہا کروں گا۔''

اس کے بعد وہ مجھے عبدالالٰہ کہنے لگا۔

غزوۂ بدر کے دن میں مشرکین سے چھینی ہوئی چند زرہیں اٹھا کر لے جا رہا تھا کہ اچانک کسی نے پکارا --- ''اے عبدعمر!''

میرا یہ نام متروک ہو چکا تھا، اس لئے میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ تھوڑی دیر بعد پھر آواز آئی۔

''اے عبدالالٰہ!''

یہ سنتے ہی میں سمجھ گیا کہ امیہ ابن خلف پکار رہا ہے، کیونکہ یہ نام اسی نے تجویز کیا تھا۔ چنانچہ میں اُدھر متوجہ ہوا تو دیکھا کہ امیہ اپنے بیٹے علی کو ساتھ لئے میری طرف چلا آ رہا ہے۔ قریب پہنچا تو کہنے لگا --- ''چھوڑو ان زرہوں کو اور مجھے قیدی بنا کر لے چلو! میری

---

(۱) ان کا تعارف ص ۲۱۹ پر گزر چکا ہے۔

گرفتاری تمہارے لئے ان زرہوں سے بدرجہا بہتر ہے۔''

بات صحیح تھی۔ امیہ جیسے سردار کو زندہ گرفتار کر لینا واقعی بڑا کارنامہ تھا۔ چنانچہ میں نے زرہیں وہیں پھینک دیں اور باپ بیٹے کو پکڑ کر چل پڑا۔

راستے میں امیہ نے پوچھا --- ''آج جس شخص نے اپنے سینے پر شتر مرغ کا پر سجا رکھا تھا، وہ کون تھا؟''

''وہ حمزہ تھے۔'' میں نے بتایا۔

''اسی کی وجہ سے آج ہم پر یہ مصیبت ٹوٹی ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت برا کیا ہے۔'' امیہ نے بصد حسرت و یاس کہا۔

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہم چلے جارہے تھے کہ اچانک امیہ پر بلال کی نظر پڑ گئی، انہوں نے چیخ کر کہا --- ''رَأْسُ الْكُفْرِ أُمَيَّةُ ابْنُ خَلَفٍ......'' (یہ رہا، کفر کا سردار امیہ ابن خلف! اگر آج یہ بچ گیا تو میں سمجھوں گا کہ میں ناکام رہا۔)

یہ کہہ کر امیہ پر حملے کے لئے آگے بڑھے، میں نے بہتیرا کہا کہ یہ میرا قیدی ہے، اس کو کچھ نہ کہو مگر انہوں نے ایک نہ سنی؛ بلکہ بآواز بلند انصار کو اپنی مدد کے لئے بلانا شروع کر دیا۔ انصار نے امیہ کا نام سنا تو وہ بھی ہاتھوں میں برہنہ شمشیریں لئے ہماری طرف دوڑ پڑے۔ اب امیہ کو بچانا مشکل نظر آرہا تھا؛ تاہم مجھے ایک تدبیر سوجھ گئی۔ میں نے امیہ کے بیٹے کو وہیں چھوڑا اور امیہ کا ہاتھ پکڑ کے ایک طرف دوڑنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ جب تک انصار امیہ کے بیٹے کو قتل کر کے آگے بڑھیں گے، تب تک ہم کافی دور نکل چکے ہوں گے، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ انصار کی کئی تلواریں بیک وقت امیہ کے بیٹے پر پڑیں اور اس کے ٹکڑے کر گئیں۔ اپنے بیٹے کا یہ حشر دیکھ کر امیہ نے اتنی دلدوز چیخ ماری کہ میں نے اس سے پہلے ایسی دہشت میں ڈوبی ہوئی چیخ کبھی نہیں سنی تھی۔ امیہ کے بیٹے سے فارغ ہو کر انصار ہماری طرف لپکے۔ مصیبت یہ تھی کہ امیہ بہت موٹا تھا، اس لیے تیز دوڑنے سے قاصر تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انصار نے جلد ہی ہمیں آلیا۔ اب امیہ کو بچانے کی کوئی صورت نہیں تھی؛ تاہم میں نے جان کی بازی لگا دی اور امیہ سے کہا کہ جلدی سے لیٹ جاؤ۔ وہ لیٹا تو

میں اس کے اوپر اس طرح لیٹ گیا کہ اس کو نیچے چھپا لیا مگر یہ کوشش بھی کارگر نہ ہو سکی---
انصار اور بلال نے میرے نیچے دبے ہوئے امیہ کے دونوں پہلوؤں میں تلواریں گھسیڑ دیں
اور اسی حالت میں اس کا کام تمام کر دیا۔''

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ کہا کرتے تھے---''اللہ بلال پر
رحم کرے---ان کی وجہ سے اس دن میں زرہوں سے بھی محروم رہا اور امیہ کو گرفتار کرنے
میں بھی ناکام رہا۔''(۱)

قتلِ ابو البختری

ابوالبختری بھی ایک مشہور سردار تھا۔ اگرچہ دشمن تھا، مگر امیہ اور ابوجہل کی طرح
سفاک اور اذیت پسند نہیں تھا؛ بلکہ ایک معقول انسان تھا۔ جب مشرکین مکہ نے بنی ہاشم سے
مقاطعہ کیا تھا(۲) اور ان کا دانہ پانی بند کر دیا تھا تو ابوالبختری نے اس کی مخالفت کی تھی اور
اس سلسلے میں جو ظالمانہ معاہدہ تحریر کیا گیا تھا، اس کو توڑنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ جانِ دو
عالم ﷺ کو اس کے اس احسان کا اتنا پاس تھا کہ آپ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دے رکھا تھا کہ
ابوالبختری کو قتل نہ کیا جائے؛ بلکہ زندہ گرفتار کیا جائے۔ چنانچہ جب ابوالبختری اور حضرت
مجذرؓ کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت مجذرؓ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور کہا۔

''تمہیں قتل کرنے سے رسول اللہ نے ہمیں منع کر دیا ہے۔''

بدقسمتی سے ابوالبختری کے ساتھ اس کا ایک دوست جنادہ بھی تھا۔ ابوالبختری نے کہا۔

''اگر میرے ساتھ میرے دوست کی بھی جان بخشی کرو تو میں گرفتاری پیش کرنے
کے لئے تیار ہوں۔''

حضرت مجذرؓ نے کہا---''نہیں، اس کو ہم نہیں چھوڑ سکتے، کیونکہ اس کے بارے
میں رسول اللہ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔''

---

(۱) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۸۰، سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۷۰.

(۲) یہ واقعات ص ۲۴۹ پر مفصل گزر چکے ہیں۔

ابوالبختری نے کہا---"واللہ! یہ نہیں ہوسکتا، یا دونوں زندہ رہیں گے یا دونوں مارے جائیں گے ورنہ مکے کی عورتیں طعنہ دیں گی کہ ابوالبختری نے اپنی جان بچانے کی خاطر بے وفائی کی اور اپنے دوست کی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔"

پھر اس نے چند رجزیہ شعر پڑھے اور حضرت مجذرؓ پر حملہ کردیا۔ جب حضرت مجذرؓ کے لئے مقابلے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تو انہوں نے بھی اس زور سے جوابی حملہ کیا کہ ابوالبختری اور جنادہ دونوں کو مار ڈالا۔ پھر جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معذرت کرتے ہوئے عرض کی۔

"یارسول اللہ! اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی کہ ابوالبختری گرفتاری پر آمادہ ہو جائے، مگر وہ ایسا کرنے پر تیار نہ ہوا۔ الٹا مقابلے پر اتر آیا، اس لئے مجبوراً اس کو قتل کرنا پڑا۔"

جانِ دو عالم ﷺ خاموش رہے---نہ یہ کہا کہ اچھا کیا، نہ یہ کہا کہ برا کیا۔ (۱)

قتلِ ابوجہل

سب سے بڑا کارنامہ دو انصاری نوجوانوں معاذؓ اور معوذؓ (۲) نے انجام دیا۔ یعنی فرعونِ موسیٰ سے زیادہ متکبر، مغرور، خودسر اور ضدی فرعون، ابوجہل کو مار گرایا۔

ان کی ہمت ، ان کی جرأت پر سلام

---

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۷۰، سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۷۸.

(۲) یہ دونوں بھائی تھے۔ ان میں سے حضرت معوذؓ تو اسی غزوہ میں شہید ہو گئے تھے؛ البتہ حضرت معاذؓ کافی عرصہ تک زندہ رہے تھے، مگر وہ بھی اپنا ایک بازو اسی غزوہ کی نذر کر چکے تھے۔ ان پر ابوجہل کے بیٹے نے حملہ کیا تھا اور ایسا وار کیا تھا کہ کندھے کے پاس سے بازو تقریباً کٹ گیا تھا۔ حضرت معاذؓ خود بیان کرتے ہیں کہ بازو پوری طرح نہیں کٹا تھا؛ بلکہ تھوڑا سا لٹکا رہ گیا تھا، اس لئے لڑائی کے دوران اِدھر اُدھر جھولتا تھا اور جھپٹنے پلٹنے میں رکاوٹ ڈالتا تھا۔ میں نے اس سے جان چھڑانے کے لئے اس کو اپنے پاؤں کے نیچے دبایا اور کھینچ کر الگ کر دیا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۷۲) ☜

حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ بیان کرتے ہیں کہ میں بدر کے دن صفِ قتال میں کھڑا تھا کہ اچانک دو نوعمر جوان آئے اور میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ ایک نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور میرے کان میں کہا---''چچا! کیا آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں؟''

''ہاں بھتیجے! پہچانتا ہوں۔'' میں نے کہا ''مگر تمہارا اس سے کیا کام؟''

''میں نے سنا ہے کہ وہ رسول اللہ کو گالیاں دیتا ہے۔'' اس نے کہا'' اور اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر وہ مجھے نظر آ گیا تو اس کو چھوڑوں گا نہیں، یا اسے مار ڈالوں گا یا خود مر جاؤں گا۔''

پھر دوسرے نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا اور سرگوشیوں میں وہی کچھ کہا جو پہلے نے کہا تھا، ان کے چپکے چپکے سرگوشیاں کرنے سے مجھے بہت حیرت ہوئی۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ میرے عزائم سے دوسرا مطلع نہ ہو سکے اور یہ سعادت صرف مجھ کو حاصل ہو۔

بہر حال تھوڑی دیر بعد ابوجہل مجھے نظر آ گیا۔ وہ میدان میں پھر رہا تھا اور کبھی ایک طرف جاتا تھا، کبھی دوسری طرف۔ میں نے اشارے سے ان کو بتایا کہ وہ دیکھو، وہ ابوجہل ہے۔

میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ وہ دونوں شہباز کی طرح اس پر جھپٹ پڑے اور لمحوں میں اس کو خاک پر لوٹا دیا۔

پھر دونوں دوڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی

''یا رسول اللہ! ہم نے ابوجہل کو مار ڈالا ہے۔''

اللہ اکبر! کتنے بے جگر اور مضبوط دل لوگ تھے جو ادھ کٹے بازو کو اپنے ہی پاؤں تلے دبا کر الگ کر دینے کا حوصلہ رکھتے تھے!!

مزید حیرانی کی بات یہ ہے کہ حضرت معاذؓ غزوہ بدر کے بعد بھی تمام غزوات میں بھرپور انداز سے شرکت کرتے رہے اور صرف ایک بازو سے شجاعت کی انمٹ داستانیں رقم کرتے رہے۔ حضرت علیؓ کے ابتدائی دورِ خلافت میں واصل بحق ہو گئے۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

''تم دونوں میں سے کس نے اس کو قتل کیا ہے؟'' رسول اللہ نے پوچھا۔

''میں نے، یارسول اللہ!'' ایک نے کہا۔

''نہیں، یارسول اللہ! میں نے۔'' دوسرے نے جھگڑا کیا۔

رسول اللہ نے پوچھا--- ''کیا تم اپنی تلواریں صاف کر چکے ہو؟''

''نہیں، یارسول اللہ!'' دونوں نے کہا۔

رسول اللہ نے تلواروں کا معائنہ کیا تو دونوں کی تلواروں کو خون آلود پایا، فرمایا۔

''كِلَا كُمَا قَتَلَه'' (تم دونوں نے اس کو قتل کیا ہے۔)

سبحان اللہ! کیا معصومانہ جھگڑا تھا اور کیسا مشفقانہ وعادلانہ فیصلہ تھا!!

رضی اللہ تعالیٰ عنہما --- صَلَّی اللہُ تَعَالیٰ عَلَیْهِ وَ سَلَّمْ.

عبیدہ ابن سعید کا قتل

عبیدہ ایک مشہور جنگ آزما تھا۔ اس دن سر سے پیر تک لوہے میں غرق تھا۔ صرف آنکھیں آہنی خود سے جھانک رہی تھیں۔ آنکھوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ ننگا نہ تھا۔ کسی عام آدمی کے لئے اس کا مقابلہ کرنا خاصا مشکل تھا، مگر اس کی بدقسمتی کہ اس کا سامنا حضرت زبیرؓ (۱) جیسے جارحانہ مزاج رکھنے والے جنگجو سے ہوگیا۔ انہوں نے پہلے ہی حملے میں ایسی تاک کر برچھی ماری کہ اس کی آنکھ میں دور تک دھنس گئی اور پھنس گئی۔ حضرت زبیرؓ نے اس کی لاش پر پاؤں رکھ کر بڑی مشکل سے کھینچ کھانچ کر برچھی کو باہر نکالا۔ چونکہ اس برچھی کے پہلے ہی وار سے ایک بڑے سورما کا خاتمہ ہوگیا تھا، اس لئے جانِ دو عالم ﷺ نے وہ برچھی زبیر سے لے کر بطور یادگار محفوظ کر لی۔ آپ کے بعد یہ تاریخی برچھی خلفائے اربعہ میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی۔ (۲)

---

(۱) تفصیلی تعارف ص ۲۱۳ پر گزر چکا ہے۔

(۲) بخاری ج ۲، ص ۵۷۰.

وَمَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ

عددی قلت کے باوجود مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا۔ ان کا جانی نقصان بھی مشرکین کی بنسبت بہت کم ہوا تھا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اگر ایک گرتا تھا تو اس کی جگہ لینے کے لئے دو تیار کھڑے ہوتے تھے۔ آخر جانِ دو عالم ﷺ نے اپنی خداداد معجزانہ قوت کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا اور مٹھی بھر کنکریاں لے کر --- شَاھَتِ الۡوُجُوۡہُ (۱) --- کہتے ہوئے مشرکین کی طرف پھینک دیں۔ یہ کنکریاں اگرچہ تھوڑی سی تھیں، مگر ان کے پھینکنے میں دستِ اعجاز کارفرما تھا، اس لئے تمام مشرکین کی آنکھوں میں جا پڑیں اور وہ لڑائی بھول کر آنکھیں ملنے لگ گئے۔ مسلمانوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ایسا زوردار حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ستر [۷۰] کے قریب آدمی مارے گئے، اتنے ہی گرفتار ہوگئے اور باقی بری طرح شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں کے صرف چودہ [۱۴] آدمی شہادت کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔

یہ فتح مبین محض اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد سے ممکن ہوسکی ورنہ اتنے تھوڑے سے بے سروسامان افراد کا اپنے سے تین گنا زائد اور ہر طرح سے مسلح دشمن پر غلبہ پالینا بظاہر ناممکن تھا۔

اللہ تعالیٰ اسی حقیقت کو اہل ایمان کے دلوں میں راسخ کرنے کے لئے ارشاد فرماتا ہے۔

﴿وَلَقَدۡ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدۡرٍ وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّۃٌ ۚ﴾ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن تمہاری مدد کی تھی، ورنہ تم تو بہت کمزور تھے۔)

مجاہدین کے برق آسا حملوں اور جانِ دو عالم ﷺ کے کنکریاں پھینکنے کو اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا اعزاز و مرتبہ عطا کیا کہ ان دونوں کاموں کو اپنا فعل قرار دے دیا اور فرمایا کہ اس دن بظاہر تو مجاہدین کافروں کو قتل کر رہے تھے، مگر حقیقت میں انہیں میں قتل کر رہا تھا، اسی طرح دیکھنے والوں نے تو یہ دیکھا کہ میرے محبوب نے کنکریاں پھینکی ہیں۔ مگر

---

(۱) ''روسیاہ ہوگئے یہ لوگ''

درحقیقت اس نے نہیں؛ بلکہ میں نے پھینکی تھیں--- ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۝﴾

سبحان اللہ! اظہارِ یگانگت کا کیا ہی وجد آفریں انداز ہے!

ابوجہل کا آخری انجام

معاذؓ اور معوذؓ کے حملوں سے ابوجہل کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی اور زخموں سے چور ہوکر گر پڑا تھا۔ معاذؓ اور معوذؓ یہی سمجھے کہ ہم نے اسے مار ڈالا ہے، مگر درحقیقت وہ مرا نہیں تھا؛ البتہ بری طرح مجروح ہوگیا تھا۔ اس لئے جنگ کے خاتمے تک میدان میں پڑا سسکتا رہا۔ لڑائی ختم ہوئی تو جانِ دوعالم ﷺ نے صحابہ کرام سے ابوجہل کے بارے میں پوچھا، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ (۱) اس کا پتہ چلانے نکلے، دیکھا تو ایک جگہ شدید زخمی حالت میں گرا پڑا تھا۔ حضرت عبداللہؓ نے اس کی گردن پر پاؤں رکھا اور کہا--- "تو ابوجہل ہی ہے نا---! اللہ کے دشمن! دیکھ، آج خدا نے تجھے کیسا ذلیل کیا ہے۔"

اس کی سخت جانی ملاحظہ ہو کہ اس قدر مجروح ہونے کے باوجود نہ اس کے ہوش وحواس میں کوئی فرق آیا، نہ اس کے لہجے اور آہنگ پر کوئی اضمحلال طاری ہوا۔ اس نے جواب دیا "بھلا کس طرح خدا نے مجھے ذلیل کیا ہے---؟ کیا لڑائی میں قتل ہوجانا کوئی شرمندگی اور ذلت کی بات ہے---؟ میں اپنی قوم کا سردار تھا، تمہارے ہاتھوں مارا گیا تو کیا ہوا، یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ مجھے دہقانوں نے مار ڈالا۔ (۲) کاش کہ مجھے قتل کرنے والے کسی شریف خاندان کے افراد ہوتے!"

جب ابن مسعودؓ اس کا سر تن سے جدا کرنے لگے تو ان کی کند اور کمزور سی تلوار نے کام نہ کیا۔ یہ دیکھ کر ابوجہل نے اپنی تلوار ان کو دی اور کہا--- "لے، اس کے ساتھ میرا سر قلم کر اور کوشش کر کہ میری گردن جڑ سے کاٹی جائے تاکہ مرنے کے بعد بھی میرا سر اونچا نظر آئے۔"

---

(۱) تعارف ص ۲۲۳ پر گزر چکا ہے۔

(۲) یعنی انصار نے جو کھیتی باڑی کرتے تھے۔

ابن مسعودؓ نے اس کی آخری خواہش پوری کر دی اور اس کا سر لاکر جانِ دو عالم ﷺ کے قدموں میں ڈال دیا، عرض کی ---''یارسول اللہ! یہ رہا اللہ اور رسول کے دشمن ابوجہل ملعون کا سر۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے دینِ حق کی راہ میں حائل ایک بڑی رکاوٹ دور ہو جانے پر لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کہی۔(۱)

چار معجزات

اگرچہ یہ غزوہ از اول تا آخر سراپا معجزہ ہے؛ تاہم سیرت نگاروں نے بعض نمایاں معجزات کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ان میں سے دشمن کے مقتولوں کا پہلے سے نام بنام ذکر کرنے اور ان کے مرنے کی جگہیں متعین کرنے کا واقع گزر چکا ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ کا ایمان افروز بیان بھی ہو چکا ہے۔اب مزید چار معجزات پیش خدمت ہیں۔

✿ ---لڑائی کے دوران حضرت عکاشہؓ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو نہتا دیکھا تو ایک جڑ کی لکڑی ان کے ہاتھ میں تھما دی اور فرمایا ''قَاتِلْ بِهٰذَا يَا عُكَاشَةُ!'' (عکاشہ! اس کے ساتھ جنگ کرو!)

حضرت عکاشہؓ نے آپ کے ارشاد کے مطابق اس کو تلوار کی طرح لہرایا تو حیرت انگیز طور پر وہ لکڑی انتہائی تیز دھار، چمک دار اور مضبوط تلوار بن گئی۔ یہ تلوار مدتوں تک حضرت عکاشہ کی اولاد میں بطور یادگار باقی رہی۔

✿ ---اسی طرح حضرت سلمہؓ کی شمشیر شکستہ ہو گئی تو جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو کھجور کی ایک ٹہنی عطا فرمائی اور کہا ''اِضْرِبْ بِهٖ'' (اس کے ساتھ دشمنوں کو مارو۔) اس فرمان کے ساتھ ہی وہ کمزور سی ٹہنی شمشیر براں بن گئی۔

✿ ---دشمن کے ایک زور دار وار سے حضرت خبیبؓ کا پہلو کٹ گیا۔

---

(۱) سیرت حلبیہ ج ۱، ص ۱۸۳، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۸۴.

تاریخ الخمیس میں قتلِ ابوجہل کا واقعہ بہت تفصیل سے مذکور ہے۔ہم نے اس کا تھوڑا سا [illegible] لیا ہے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے کٹے ہوئے حصے کو اپنے دست مبارک سے جوڑا اور اوپر لعاب دہن لگا دیا۔ اسی وقت خون بند ہوگیا اور زخم مندمل ہوگیا۔

--- حضرت رفاعہؓ کی آنکھ میں تیر لگنے سے ڈھیلا باہر نکل آیا۔ جانِ دو عالم ﷺ نے چشم مجروح پر تھوکا اور دعا فرمائی۔ اسی وقت تکلیف جاتی رہی۔ (۱)

قلیبِ بدر

جنگ کے بعد جانِ دو عالم ﷺ کے حکم سے سردارانِ قریش کی لاشوں کو گھسیٹ کر ایک غلیظ اور تاریک کنوئیں میں پھینک دیا گیا؛ البتہ امیہ کی لاش اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ گھسیٹی نہ جاسکی، اس لئے اس کو وہیں پڑا رہنے دیا گیا۔

میدانِ جنگ مدینہ منورہ سے دور ہونے کی صورت میں جانِ دو عالم ﷺ کا معمول تھا کہ فتح کے بعد تین دن تک وہیں قیام فرماتے تھے تاکہ تھکے ماندے سپاہی آرام کرلیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کر کے واپسی کے سفر کے لئے تازہ دم ہوجائیں۔

بدر میں بھی آپ تین دن مقیم رہے۔ تیسرے دن روانگی سے پہلے اس گڑھے کے پاس تشریف لے گئے جس میں مشرکین کی لاشیں پھینکی گئی تھیں اور اس کے کنارے کھڑے ہوکر مقتولوں کو نام بنام پکارا --- "اے ابوجہل! اے عتبہ! اے فلاں! اے فلاں ---! ہمارے ساتھ ہمارے رب نے (فتح و نصرت کا) جو وعدہ کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دکھایا، تمہارے ساتھ (ذلت و رسوائی اور مبتلائے عذاب کرنے کا) جو وعدہ کیا تھا، وہ بھی پورا ہوگیا کہ نہیں ---؟ تم میرے ہم قوم تھے، مگر کیسے برے ہم قوم ---! تم نے مجھے جھٹلایا اور دوسروں نے مجھے سچا سمجھا، تم نے مجھے مکہ سے نکالا اور لوگوں نے مجھے اپنے پاس ٹھہرایا، تم مجھ سے لڑنے کے لئے چلے آئے اور اہل ایمان نے میرا بھرپور ساتھ دیا......"

حضرت عمرؓ نے جانِ دو عالم ﷺ کو مُردوں سے خطاب کرتے دیکھا تو بہت حیران ہوئے اور عرض کی --- "یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! کَیْفَ تُکَلِّمُ اَجْسَادًا لَا اَرْوَاحَ فِیْھَا؟"

---

(۱) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۷۹، ۱۸۰، الآثار المحمدیہ ج ۱، ص ۳۵۲، ۳۵۳

(یارسول اللہ! آپ بے جان جسموں سے کس لئے مخاطب ہو رہے ہیں---؟)
آپ نے فرمایا---''مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ لِمَآ اَقُوْلُ مِنْهُمْ.''(۱)(میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اِس کو تم اِن سے زیادہ نہیں سن رہے ہو۔) یعنی وہ بھی اسی طرح سن رہے ہیں جس طرح تم سن رہے ہو، لیکن وہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔''

قتل نضر ابن حارث

تین دن بعد واپسی کا سفر شروع ہوا۔ جنگ سے پہلے اپنے اصحاب کی بے سروسامانی دیکھ کر جانِ دو عالم ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ! میرے ساتھی پیدل ہیں، ان کو سواریاں عطا فرما! ان کا لباس ناکافی ہے، ان کو پوشاکیں عنایت فرما! ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں، ان کو وافر کھانا نصیب فرما!(۲)

اب واپسی کے وقت اس دعا کی اجابت کا مشاہدہ ہو رہا تھا۔ سینکڑوں اونٹ، گھوڑے، بہت سارا اسلحہ اور وسیع مقدار میں خورد و نوش کا سامان بطور مالِ غنیمت ہمراہ تھا۔ علاوہ ازیں دشمن کے ستر [۷۰] آدمی قیدی تھے، جن میں بعض بہت اہم سردار بھی شامل

---

(۱) بخاری ج ۲، ص ۵۶۶ کے علاوہ یہ روایت حدیث و تاریخ کی بیشتر کتابوں میں تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ مذکور ہے۔ لیکن اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ...... کے الفاظ کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ وہ سن رہے ہیں؛ بلکہ یہ فرمایا تھا کہ اب انہیں پتہ چل گیا ہے کہ میں جو کچھ کہا کرتا تھا وہ سچ ہے۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے یہ آیت پڑھی۔ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (بخاری ج ۲، ص ۵۶۷)

''مسئلہ سماعِ موتیٰ'' (مُردوں کا سننا) ہمارے موضوع سے خارج ہے، لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ اُمّ المؤمنین اس غزوہ میں شامل نہیں تھیں، اس لئے انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کی اجتہادی رائے ہے؛ جبکہ سماع والی روایت کے راوی اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں، اس لئے اصولی طور پر ان کے مشاہدے کو اُمّ المؤمنین کی رائے پر بہرحال ترجیح حاصل ہے۔

(۲) سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۱۶۱۔

تھے۔ مقام صفراء میں جانِ دو عالم ﷺ نے قیام فرمایا تو حضرت علیؓ کو ایک قیدی --- نضر ابن حارث --- کے قتل کا حکم دیا کیونکہ یہ بدزبان اور بے رحم شخص جانِ دو عالم ﷺ اور کلام الٰہی کے بارے میں بیہودہ باتیں کرنے کے علاوہ کمزور مسلمانوں پر ظلم و ستم کرنے میں بھی پیش پیش رہا کرتا تھا۔ آج جب اس کو موت سامنے نظر آئی تو ساری شیخی دھری رہ گئی اور لگا سفارشیں ڈھونڈھنے۔ حضرت مصعب ابن عمیرؓ (۱) سے اس کی رشتہ داری تھی۔ ان سے کہا کہ تمہارے ساتھ میری قرابتداری ہے۔ اس لئے محمد سے میری جان بخشی کرادو، مگر انہوں نے یہ کہہ کر اس کا مطالبہ مسترد کردیا کہ تم رسول اللہ ﷺ اور قرآن کے بارے میں بکواس کیا کرتے تھے اور ایمان لانے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیا کرتے تھے، اس لئے میں تمہاری سفارش نہیں کرسکتا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے حسب ارشاد اس کا سر قلم کردیا۔ (۲)

---

(۱) تعارف ص ۲۱۵ پر گزر چکا ہے۔

(۲) سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۱۹۷۔

جانِ دو عالم ﷺ نے نضر کو اس کے ناقابل معافی جرائم کی پاداش میں قتل تو کرادیا مگر شانِ رحمت دیکھئے کہ اس کی بیٹی --- یا بہن --- نے اس کا مرثیہ کہا تو اس میں یہ دو شعر بھی تھے۔

أَمُحَمَّدٌ! وَلَأَنْتَ ضِنْوُ نَجِيبَةٍ

فِيْ قَوْمِهَا وَالْفَحْلُ فَحْلٌ مُعْرِقُ

مَاكَانَ ضَرَّكَ لَوْمَنَنْتَ وَ رُبَّمَا

مَنَّ الْفَتٰى وَهُوَ الْمَغِيظُ الْمُحْنَقُ

(اے محمد! تم تو ایک شریف عورت کے بیٹے اور ایک معزز خاندان کے فرد ہو، اگر تم میرے باپ --- یا --- بھائی کو معاف کردیتے تو تمہارا کیا نقصان ہو جاتا، بارہا ایسا ہوتا ہے کہ جوانمرد آدمی ایسے شخص کو بھی معاف کردیتا ہے جس سے سخت ناراض اور غصے میں ہوتا ہے۔)

جانِ دو عالم ﷺ نے یہ شعر سنے تو اس قدر روئے کہ ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی اور فرمایا --- ''اگر یہ اشعار میں نے اس کے قتل سے پہلے سنے ہوتے تو یقیناً اس کو معاف کردیتا۔''

قتلِ عقبہ

عرق الظبیہ نامی جگہ میں آپ نے عقبہ ابن ابی معیط کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ یہ عقبہ وہی بد بخت اور شقی القلب انسان ہے جس نے ایک دفعہ عین اس وقت جب جانِ دو عالم ﷺ صحن حرم میں سجدہ ریز تھے، غلاظت سے لتھڑی ہوئی اونٹوں کی اوجھڑیاں لا کر آپ کی گردن مبارک پر رکھ دی تھیں۔ (۱) اس کے علاوہ بھی اس کے متعدد جرائم تھے۔ جب آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا تو اس نے واویلا شروع کر دیا اور دیگر قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ آخر یہ کیا دھاندلی ہے کہ تم سب کو زندہ رکھا جا رہا ہے اور مجھے قتل کیا جا رہا ہے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا ---''اس کی وجہ یہ ہے کہ تو ان سب سے زیادہ منکر اور مفتری تھا۔''--- چنانچہ حضرت علیؓ (۲) نے اس کو بھی جہنم میں پہنچا دیا۔ (۳)

نویدِ فتح

مدینہ کے قریب پہنچے تو جانِ دو عالم ﷺ نے اہل مدینہ کو فتح کی خوشخبری سنانے کے لئے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت زیدؓ کو روانہ فرمایا اور سواری کے لئے ان کو اپنی خاص اونٹنی عنایت فرمائی۔ یہ دونوں مدینہ میں داخل ہوئے تو بآواز بلند اعلان کرنے لگے--- ''یَامَعْشَرَ الْاَنْصَارِ! مبارک ہو کہ رسول اللہ بخیریت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور مشرکین کو ذلیل و رسوا کیا۔ ان کے فلاں فلاں سردار مارے گئے اور فلاں

(سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۲۹۷)

اگرچہ یہ بات ممکن نہیں تھی، کیونکہ یہ شعر مرثیے کے ہیں اور مرثیہ کسی انسان کے مرنے کے بعد کہا جاتا ہے، پہلے نہیں، لیکن جانِ دو عالم ﷺ وفورِ رحمت سے محض ایک فرضی احتمال کے پیشِ نظر آزردہ و اشک بار ہو گئے---گریہ ابرِ رحمت پہ لاکھوں سلام۔

(۱) تفصیل ص ۲۰۲ پہ گزر چکی ہے۔

(۲) بعض روایات میں حضرت عاصمؓ کا نام آیا ہے۔

(۳) زرقانی، ج ۱، ص ۵۴۱. سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۱۹۷.

فلاں گرفتار کر کے لائے جا رہے ہیں۔"

منافقین مدینہ بھی آس لگائے بیٹھے تھے کہ بدر میں مسلمانوں کا قصہ ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے گا۔ اب خلافِ توقع اہل اسلام کی کامیابی کی خبر سن کر انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، اس لئے دل کو بہلانے کی خاطر وہ اس اطلاع کو جھٹلا رہے تھے اور اطلاع دینے والوں کو پاگل قرار دے رہے تھے۔ ایک منافق نے حضرت ابولبابہؓ سے کہا ---"مسلمانوں کو شکست ہو چکی ہے اور ان کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ محمد بھی مارا گیا اور اس کے بیشتر ساتھی بھی۔ دیکھتے نہیں ہو کہ اس کی اونٹنی پر زید سوار ہے۔ (یعنی اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنی اونٹنی پر خود سوار ہوتے۔) اور یہ جو فتح کا اعلان کرتا پھر رہا ہے تو دراصل جنگ کی دہشت سے اس کا دماغ چل گیا ہے اور اسے پتہ ہی نہیں چل رہا کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے۔"

حضرت زیدؓ کے نوعمر بیٹے اسامہؓ(۱) یہ باتیں سن کر پریشان ہو گئے اور جا کر اپنے والد سے پوچھا ---"ابو! کیا واقعی مسلمانوں کو فتح ہوئی ہے---؟"

---

(۱) حضرت اسامہؓ اور ان کے والد حضرت زیدؓ دونوں جانِ دو عالم ﷺ کے لاڈلے تھے۔ حضرت زیدؓ کا تذکرہ ص ۱۷۵ پر گزر چکا ہے، حضرت اسامہؓ کے مختصر حالات پیش خدمت ہیں۔

حضرت اسامہؓ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور جانِ دو عالم ﷺ کے گھر میں پرورش پائی۔ جانِ دو عالم ﷺ کو ان کے ساتھ والہانہ پیار تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں۔ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُحِبُّہٗ حُبًّا شَدِیْدًا. (رسول اللہ ان سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔)

حسنین کریمینؓ کے ساتھ ان کو بھی جانِ دو عالم ﷺ اپنی گود میں بٹھا لیتے اور بارگاہ خداوندی میں عرض کیا کرتے ---"الٰہی میں ان سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان کے ساتھ محبت رکھ۔"

جانِ دو عالم ﷺ کے وصال کے وقت ان کی عمر ۱۸ اور ۲۰ سال کے درمیان تھی، مگر اس نو عمری کے باوجود آپ نے ان کو اپنی زندگی میں متعدد حربی مہمات کا امیر مقرر کیا۔ اسامہؓ بھی آپ کے اعتماد پر ہمیشہ پورے اترے اور جس طرف گئے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے

ایک مرتبہ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو ایک ایسے جیش کا قائد بنا دیا جس میں صدیق اکبر ☜

''ہاں بیٹے! اللہ کی قسم، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل سچ ہے۔''

فاروق اعظمؓ اور ابو عبیدہؓ ابن الجراحؓ جیسے اکابر بھی شامل تھے۔ایسے تجربہ کار اور معمر و معزز لوگوں پر ایک نوعمر لڑکے کو امیر بنا دینا بعض لوگوں کو ناگوار گزرا اور انہوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔جانِ دو عالم ﷺ کو ان باتوں کا پتہ چلا تو آپ کو اتنا غصہ آیا کہ روئے زیبا سرخ ہو گیا اور فرمایا---''جو لوگ آج اسامہ کی قیادت پر اعتراض کر رہے ہیں، وہ اس سے پہلے اس کے باپ کی امارت پر بھی نکتہ چینیاں کرتے رہے ہیں، حالانکہ خدا کی قسم وہ ہر لحاظ سے قیادت کا اہل تھا اور میں اس کو بہت محبوب رکھتا تھا۔یاد رکھو کہ اس کا یہ بیٹا بھی امیر بنائے جانے کا حقدار ہے اور میں اس کے ساتھ بھی انتہا درجے کی محبت رکھتا ہوں۔''

سوائے غزوہ بدر کے---کہ اس میں کم عمری کی وجہ سے اسامہؓ شریک نہیں ہو سکے تھے---زندگی کے ہر اہم موڑ پر اسامہؓ جانِ دو عالم ﷺ کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔فتح مکہ کے بعد جب جانِ دو عالم ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو اسامہ ساتھ تھے۔حجۃ الوداع میں جب جانِ دو عالم ﷺ اپنی اونٹنی پر بیٹھے وہ مشہور عالم تاریخی خطبہ دے رہے تھے۔جو خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے معروف ہے۔تو اسامہؓ آپ کی پشت انور سے چپکے بیٹھے تھے۔

وصال سے چند روز پہلے جانِ دو عالم ﷺ نے رومیوں کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر ترتیب دیا، تو اس کی قیادت بھی اسامہؓ کو سونپی۔ابھی یہ لشکر زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ آپ کا وصال ہو گیا۔آپ کے بعد عرب میں ارتداد کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔

حالات خراب ہونے لگے تو اکثر حضرات نے صدیق اکبرؓ کو مشورہ دیا کہ جیشِ اسامہؓ کو واپس بلا لیجئے، کیونکہ موجودہ حالات میں مرکز اسلام کا قوی اور مضبوط ہونا ضروری ہے، مگر صدیق اکبرؓ نے حسب معمول عشق کو عقل پر ترجیح دی اور فرمایا۔

''میری یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ جس لشکر کو رسول اللہ ﷺ نے روانہ کیا ہو، میں اس کو واپس بلاؤں، خواہ اس کے نتیجے میں میری جان چلی جائے اور پرندے میرا گوشت نوچ کر کھا جائیں۔''

اللہ اللہ! کیا ہی سچا عشق تھا صدیق اکبر کا!

فاروق اعظمؓ اسامہؓ کا بے حد احترام کیا کرتے تھے اور ان کو بدر میں شریک ہونے والے ☜

اسامہؓ جوش میں بھرے ہوئے اسی وقت اس منافق کے پاس جا پہنچے جس نے مسلمانوں کی شکست کا دعویٰ کیا تھا اور کہا---'' ابھی تھوڑی دیر پہلے تو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کیا بکواس کر رہا تھا---؟ ذرا ان کو آنے دے، ہم تجھ کو پکڑ کر ان کی خدمت میں پیش کریں گے اور وہ تجھے قتل کرا دیں گے۔''

منافق ڈر گیا اور یہ کہہ کر پہلو بچا گیا کہ میں نے وہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تھی؛ بلکہ کچھ لوگ اس طرح کی گفتگو کر رہے تھے، میں نے ان کی باتیں ابولبابہ کے گوش گزار کی تھیں۔(۱)

صحابہ کرام جیسی عزت دیتے تھے۔ اپنے دور خلافت میں جب آپ نے صحابہ کرام کے وظائف معین کیے تو بدری صحابہ کا دوگنا وظیفہ مقرر کیا۔ اسامہؓ اور حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ دونوں بدر میں شامل نہیں تھے۔ مگر اسامہؓ کو آپ نے بدری صحابہ کے مساوی وظیفہ دیا؛ جبکہ عبداللہؓ کو اس کا نصف ملا۔ عبداللہ نے شکوہ کیا کہ ابا جان! کوئی ایسا معرکہ نہیں جس میں اسامہ ؓ شامل ہوا ہو اور میں نے شرکت نہ کی ہو---پھر آپ نے اس کو مجھ پر ترجیح کس بنا پر دی ہے؟''

''اس کی وجہ یہ ہے بیٹے!'' فاروق اعظمؓ نے جواب دیا'' کہ اسامہ کا باپ رسول اللہ ﷺ کو تیرے باپ سے زیادہ پیارا تھا اور خود اسامہ کو رسول اللہ ﷺ تجھ سے زیادہ چاہتے تھے۔''

سبحان اللہ! اسے کہتے ہیں معراج محبت---! فاروق اعظمؓ کی نگاہوں میں اپنے حقیقی بیٹے کی بنسبت ایک اجنبی غلام زادہ، زیادہ اعزاز و اکرام کا مستحق ہے، کیونکہ وہ ان کے محبوب آقا کا لاڈلا ہے۔

حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں اسامہؓ واصل بحق ہو گئے۔ وفات کے وقت تقریباً ۶۴ سال عمر تھی۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ

(تمام واقعات بخاری، اصابہ، استیعاب اور طبقات ابن سعد سے ماخوذ ہیں۔)

(۱) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۹۴.

استقبال اور مبارکبادیاں

فتح کی نویدِ جانفزا سن کر اہل مدینہ جانِ دو عالم ﷺ کے استقبال کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ آپ کو دیکھا تو بڑھ کر پُر خلوص مبارکباد پیش کی اور کہا---"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَظْفَرَکَ وَاَقَرَّ عَیْنَیْکَ." (الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیابی نصیب فرمائی اور آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔)

فتح مند مجاہدین کو بھی ہر شخص مبارک دینے لگا تو ایک خوش مزاج صحابی حضرت سلمہؓ نے مشرکین کی بزدلی اور نامردی پر طنز کرتے ہوئے کہا---"بھلا کس بات کی ہم کو مبارکیں دے رہے ہو دوستو!؟ مبارکباد کے مستحق تو ہم تب ہوتے جب ہمارا مقابلہ مضبوط اور توانا مردوں سے ہوا ہوتا۔ ہمارے سامنے تو گنجی بوڑھیاں آ گئی تھیں جو بندھے ہوئے اونٹوں کی طرح بے بس اور لاچار تھیں، چنانچہ ہم نے ان کو اسی طرح اطمینان سے ذبح کر دیا جس طرح پابستہ اونٹوں کو ذبح کیا جاتا ہے۔"

جانِ دو عالم ﷺ اس دلچسپ تمثیل سے محظوظ ہو کر مسکرائے اور فرمایا

"نہیں، وہ کوئی کمزور لوگ نہ تھے؛ بلکہ قریش کے سربرآوردہ افراد تھے، بس اللہ نے ان کو ذلیل کر دیا۔"

جب یہ مظفر و منصور لشکر مدینہ منورہ پہنچا تو ایک بار پھر وہی سماں بندھ گیا، جو جانِ دو عالم ﷺ کی مدینہ میں اوّلیں تشریف آوری کے موقع پر بندھا تھا۔ اسی طرح جابجا ننھی منی بچیوں کی ٹولیاں دف بجا رہی تھیں اور وہی ملکوتی نغمہ ان کے ہونٹوں پر مچل رہا تھا۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا

مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ (۱)

بے اعتباری

قارئین کرام! آیئے، تھوڑی دیر کے لئے مکہ مکرمہ چلتے ہیں۔

---

(۱) سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۱۹۹۔

جس طرح مدینے کے منافقین کو مسلمانوں کی فتح پر یقین نہیں آ رہا تھا، اسی طرح مکے کے مشرکین کو کفار کی شکست پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ جب ابن عبد عمر بدر سے بھاگ کر شکست خوردہ وتباہ حال، مکہ مکرمہ پہنچا اور لوگوں کو بتایا کہ ہمیں بری طرح شکست ہوگئی ہے اور فلاں فلاں سردار مارے گئے ہیں تو ایک مشہور رئیس صفوان نے کہا --- "اِنْ یُّعْقِل......" (یہ شخص ہوش میں نہیں ہے، ذرا اس سے میرے بارے میں تو پوچھو کہ بدر میں میرا کیا حشر ہوا؟)

صفوان کا خیال تھا کہ یہ میرے متعلق بھی یہی کہے گا کہ بدر میں مارا گیا ہے، مگر جب اس سے صفوان کا انجام پوچھا گیا تو اس نے کہا --- "واہ! گویا تم مجھے پاگل سمجھ رہے ہو --- ! ارے صفوان تو یہ سامنے بیٹھا ہے؛ البتہ اس کے باپ اور بھائی دونوں کو میں نے بدر میں اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے دیکھا ہے۔"

یہ سن کر صفوان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور اسے یقین آ گیا کہ یہ سچ کہہ رہا ہے اور اس کے دماغ میں کسی قسم کا فتور نہیں ہے۔ (۱)

ابولہب کا ردعمل

حضرت عباسؓ کے غلام ابورافعؓ بیان کرتے ہیں کہ میرے آقا عباس (۲) ان کی

---

(۱) سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۱۹۹ تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۸۸.

(۲) حضرت عباسؓ کے حالاتِ زندگی عنقریب آ رہے ہیں، یہاں اُمِّ فضلؓ اور ابورافعؓ کا مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔

اُمِّ فضلؓ کا نام لبابہ ہے۔ قدیمۃ الاسلام صحابیہ ہیں؛ بلکہ ابن سعد کے بقول حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلی ایمان لانے والی خاتون اُمِّ فضل ہی ہیں۔ ان کی ایک سگی بہن ام المومنین میمونہؓ جانِ دو عالم ﷺ کے عقد میں تھیں۔ اس لحاظ سے اُمِّ فضلؓ جانِ دو عالم ﷺ کی چچی ہونے کے علاوہ خواہر نسبتی بھی ہیں۔ اس دُہرے رشتے کی وجہ سے جانِ دو عالم ﷺ ان کے ساتھ بہت محبت رکھتے تھے اور اکثر ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتے تھے اور اُمِّ فضلؓ ایک مہربان

اہلیہ اُمِ فضل اور میں غزوۂ بدر سے پہلے اسلام لا چکے تھے؛ البتہ اپنے ایمان کو مصلحتاً خفیہ رکھا ہوا

ماں کی طرح آپ کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگتی تھیں۔

ایک دفعہ اُمِ فضلؓ نے خواب دیکھا کہ جانِ دو عالم ﷺ کے جسم اطہر سے ایک حصہ جدا ہو کر ان کی گود میں آ پڑا ہے۔ بظاہر بڑا دہشتناک خواب تھا، مگر جب آپ کے سامنے اس عجیب وغریب خواب کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا۔

''عمدہ خواب ہے، اس کی تعبیر یہ ہے کہ میری بیٹی فاطمہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا اور آپ اس کی رضاعی ماں بنیں گی۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب حضرت حسینؓ پیدا ہوئے تو رضاعت وتربیت کے لئے اُمِ فضلؓ کے حوالے کر دیئے گئے۔

ایک دن اُمِ فضلؓ نے حضرت حسینؓ کو جانِ دو عالم ﷺ کی گود میں لا کر ڈالا تو آپ نے اپنے نواسے کو چومنا اور پیار کرنا شروع کر دیا۔ اچانک معصوم بچے نے پیشاب کر دیا جس سے جانِ دو عالم ﷺ کے کپڑے خراب ہو گئے۔ اُمِ فضلؓ نے حضرت حسینؓ کو آپ کی گود سے اٹھایا اور ایک چپت لگا کر کہا---

''یہ کیا کر دیا ہے تو نے---! رسول اللہ کے کپڑے پلید کر دیئے ہیں اور انہیں تکلیف پہنچائی ہے۔''

ننھے حسینؓ اُمِ فضلؓ کی جھڑکی سن کر رونے لگے تو جانِ دو عالم ﷺ تڑپ اٹھے اور فرمایا۔

''اللہ آپ پر رحم کرے اُمِ فضل! آپ نے میرے بیٹے کو رلا کر مجھے دکھ پہنچایا ہے۔''

پھر پانی منگوایا اور اپنے کپڑے پاک کیے۔

آہ! کہ جس کے رونے سے جانِ دو عالم ﷺ دکھیا ہو جایا کرتے تھے، ظالموں نے دشتِ کربلا میں اس کے گلے پر چھری چلا دی!! کیا منہ دکھائیں گے وہ لوگ حسین کے نانا کو!

اَتَرْجُوْ اُمَّةٌ قَتَلَتْ حُسَيْنًا

شَفَاعَةَ جَدِّهٖ يَوْمَ الْحِسَابِ

(جن لوگوں نے حسین کا سر قلم کر دیا، کیا وہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ قیامت کے دن حسین کے نانا ان کے لئے شفاعت کریں گے!؟) ☞

تھا۔ جب مشرکین جنگ بدر کے لئے روانہ ہوئے تو میرے آقا کو بھی ساتھ لے گئے۔ کچھ

معاف کیجئے گا! میں کچھ جذباتی ہو گیا ہوں، بات ہو رہی تھی اُمِ فضلؓ کی کہ ان کے ساتھ جانِ دو عالم ﷺ کی محبت مثالی تھی اور آپ اکثر ان کے گھر جاتے تھے اور ان سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ اسی لئے ان کو بہت سی حدیثیں یاد تھیں اور بڑے بڑے صحابہ کرام ان سے احادیث سیکھا کرتے تھے۔ خود ان کے بیٹے عبداللہؓ بن عباسؓ جو علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے، ان سے حدیث کا درس لیا کرتے تھے۔

اُمِ فضلؓ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی فراست عطا فرمائی تھی کہ الجھے ہوئے مسائل کو بہت خوبصورتی سے حل کر لیا کرتی تھیں۔

جب جانِ دو عالم ﷺ حج کے لئے تشریف لے گئے تو اُمِ فضلؓ بھی ہمراہ تھیں۔ عرفہ کے دن صحابہ کرام میں اختلاف ہو گیا کہ آیا آج رسول اللہ روزے سے ہیں یا نہیں۔ لیکن کسی کو پوچھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اُمِ فضل کو صحابہ کی اس الجھن کا پتہ چلا تو انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کے لئے دودھ کا کٹورا بھیج دیا، جسے آپ نے سب کے سامنے پی لیا۔ اس طرح پوچھے بغیر سب پر واضح ہو گیا کہ آپ کا روزہ نہیں ہے۔

حضرت عثمان کے دور خلافت میں اس عالمہ و فاضلہ خاتون کا انتقال ہو گیا۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنھَا

ابورافعؓ کا نام اکثر مؤرخین کے نزدیک اسلم ہے۔ پہلے حضرت عباسؓ کے غلام تھے۔ پھر حضرت عباسؓ نے ان کو ہدیۃً جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا اور آپ نے آزاد کر دیا۔ یوں ابورافعؓ کو "مَوْلیٰ رَسُوْلِ اللّٰہِ" کہا جانے لگا۔ یعنی رسول اللہ کے آزاد کردہ۔

ان کے اسلام لانے کا واقعہ اس طرح ہے کہ غزوہ بدر سے پہلے مشرکین نے ان کو ایک خط دے کر مدینہ منورہ بھیجا۔ ابورافعؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ سے میری ملاقات ہوئی، تو اسلام میرے دل میں اتر گیا اور میں نے عرض کی۔

"یارسول اللہ! اب میں مشرکین کے پاس واپس نہیں جاؤں گا۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا---"میں نہ بدعہدی کرتا ہوں، نہ کسی نامہ بر کو یہاں رکنے کی اجازت دیتا ہوں، اس لئے فی الحال تو تم خط کا جواب لے کر واپس جاؤ اور اگر ایمان لانے کا ارادہ پختہ

دنوں بعد خبر آئی کہ مشرکین کو شکست ہوگئی ہے تو مجھے اور اُمِ فضل کو دلی مسرت ہوئی۔

ایک روز میں اور اُمِ فضل بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ابولہب بھی اس طرف آ نکلا اور ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ابن حرث بھی آ گیا۔ یہ ان لوگوں میں سے ایک تھا جو بدر سے فرار ہو کر آئے تھے۔ ابولہب نے اس سے پوچھا کہ سناؤ، بدر میں تم لوگوں پر کیا گزری؟

اس نے کہا---''بس یوں سمجھئے کہ ہم نے اپنی گردنیں اور کندھے مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیئے تھے اور وہ جسے چاہتے تھے قتل کر دیتے تھے، جسے چاہتے تھے گرفتار کر لیتے تھے، خدا کی قسم، یوں نظر آتا تھا کہ آسمان سے زمین تک ساری فضا گورے چٹے شہسواروں کے ساتھ بھری پڑی ہے---ان کے سامنے بھلا کون ٹک سکتا تھا!''

ابورافعؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا---''وَاللہِ تِلْکَ الْمَلَائِکَۃُ.'' (اللہ کی قسم وہ فرشتے تھے۔)

بھانڈا پھوٹ گیا اور ابولہب سمجھ گیا کہ میری دلی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ اس پر اس کو اتنا غصہ آیا کہ پہلے تو مجھ کو ایک زوردار تھپڑ رسید کیا پھر اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور سینے پر چڑھ بیٹھا۔ یہ دیکھ کر ام فضل کو بھی غصہ آ گیا، کہنے لگیں---''تو ابورافع پر اس لئے شیر ہو رہا ہے کہ اس کے آقا یہاں موجود نہیں ہیں---!؟''

ہوا تو دوبارہ آ جانا۔''

چنانچہ میں جواب لے کر واپس گیا۔ پھر (غزوۂ بدر کے بعد) خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور باقاعدہ مسلمان ہو گیا۔

غزوۂ بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شامل رہے اور دین حق کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔

حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں آپ کا وصال ہو گیا۔

رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ

(تمام واقعات اصابہ، استیعاب، مستدرک اور طبقات ابن سعد سے ماخوذ ہیں۔)

پھر ایک لکڑی اٹھائی اور اس زور سے ابولہب کے سر پر ماری کہ وہ بری طرح زخمی ہوگیا۔ جب اس نے ام فضل کو میری حمایت پر یوں کمربستہ دیکھا تو ساری اکڑفوں بھول گیا اور سر جھکا کر چپکے سے نکل گیا۔(۱)

جَزَاکِ اللہ، اے جانِ دوعالم ﷺ کی شیر دل چچی! ایک عورت ہوکر کفر و شرک کے گڑھ میں آپ نے جس جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس پر قارئین سیدالوریٰ آپ کی عظمتوں کو سلام کرتے ہیں۔

عمومی کیفیت

اہل مکہ کی پوری تاریخ میں یوم بدر جیسا اندوہناک حادثہ کوئی نہیں گزرا تھا، اس لئے اس خبر کے مشہور ہوتے ہی ہر طرف صف ماتم بچھ گئی اور جابجا نوحے اور بین ہونے لگے۔ شعراء نے دردناک مرثیے کہے، عورتوں نے اپنے بال کاٹ ڈالے اور سر برہنہ، پابرہنہ گلیوں میں دیوانہ وار آہ و بکا اور فریاد و ماتم کرنے لگیں۔ کبھی کسی مقتول کا گھوڑا نکالتیں، اس پر رنگ برنگی چادریں ڈالتیں اور اس کے گرد گھیرا ڈال کر روتیں اور سینہ کوبی کرتیں۔ یہ سلسلہ کئی دن رات تک جاری رہا۔ آخر کچھ لوگوں کو خیال آیا کہ اس طرح رونے پیٹنے سے ہماری کمزوری کا اظہار ہوتا ہے اور مسلمانوں کا دل ٹھنڈا ہوتا ہے، اس لئے رونا دھونا بند کیا جائے اور پوری توجہ سے مقتولین کا انتقام لینے کی تیاری کی جائے۔ اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور عہد کیا کہ آئندہ ہرگز کوئی شخص نہیں روئے گا۔(۲)

اسود ابن زمعہ کے دو بیٹے اور ایک پوتا غزوہ بدر میں مارے گئے تھے۔ وہ ان کے لئے رونا چاہتا تھا، مگر اس فیصلے کی وجہ سے رو نہیں سکتا تھا۔ ایک رات اس کے کانوں میں کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے اسی وقت اپنے غلام کو دوڑایا کہ جا کر پتہ کرو، کیا

---

(۱) سیرت ابن هشام ج ۲، ص ۷۸، سیرت حلبیه ج ۲، ص ۱۹۹، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۸۸.

(۲) سیرت حلبیه ج ۲، ص ۲۰۰.

رونے کی اجازت مل گئی ہے---؟ اگر ایسا ہے تو میں بھی رو کر دل کی بھڑاس نکال لوں۔ کیونکہ میرے سینے میں غم کی آگ جل رہی ہے۔

غلام نے واپس آ کر بتایا کہ مقتولینِ بدر کے لئے تو رونے کی اجازت نہیں ملی؛ البتہ ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے اور وہ اس کے لئے رو رہی ہے۔

اسود کو اتنی معمولی بات پر رونے سے دکھ ہوا اور اس نے چند شعر کہے جو اس کی دلی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔

اَتَبْکِیْ اَنْ یَّضِلَّ لَهَا بَعِیْرٌ وَیَمْنَعُهَا مِنَ النَّوْمِ السُّهُوْدُ

فَلَا تَبْکِیْ عَلٰی بِکْرٍ وَلٰکِنْ عَلٰی بَدْرٍ تَقَاصَرَتِ الْجُدُوْدُ

وَبَکِّیْ اِنْ بَکَیْتِ عَلٰی عَقِیْلٍ وَبَکِّیْ حَارِثًا اَسَدَ الْاُسُوْدِ

(کیا وہ اتنی سی بات کے لئے رو رہی ہے اور رات گئے تک بے خوابی میں مبتلا ہے کہ اس کا اونٹ گم ہو گیا ہے---!

(اری بے وقوف عورت!) اونٹ کے لئے مت رو؛ بلکہ بدر پر رو جہاں ہماری قسمتیں کھوئی ہو گئیں اور رونا ہی ہے تو عقیل کے لئے رو اور حارث کے لئے رو جو شیروں کا شیر تھا۔)(۱)

حسنِ سلوک

غزوۂ بدر میں جو مشرکین گرفتار کئے گئے ان کو جانِ دو عالم ﷺ نے صحابہ کرام میں بانٹ دیا اور ارشاد فرمایا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔

صحابہ کرام نے اس فرمان عالی پر جی جان سے عمل کیا اور قیدیوں کو ہر ممکن آرام بہم پہنچایا۔ ایک قیدی ابو عزیز کا بیان ہے کہ مجھے جن انصاریوں کے حوالے کیا گیا تھا وہ غریب لوگ تھے اور اتنی استطاعت نہیں رکھتے تھے کہ سب افراد کے لئے روٹی پکا سکیں،

---

(۱) سیرت ابن هشام، ج ۲، ص ۷۹، سیرت حلبیه ج ۲، ص ۲۰۰.

واضح رہے کہ عقیل، اسود کے بیٹے اور حارث، اس کے پوتے کا نام تھا۔

چنانچہ وہ جو روٹی پکاتے تھے، مجھے لا کر دے دیتے تھے اور خود صرف کھجوروں پر گزارہ کر لیتے تھے۔ مجھے اس سے بہت شرم آتی تھی اور میں کھانا واپس کرنے کی کوشش کرتا تھا، مگر وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔(۱)

اپنا پیٹ کاٹ کر جانی دشمنوں کو بہترین کھانا کھلانا بلاشبہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔

جن قیدیوں کے پاس کپڑے نہیں تھے، ان کو جانِ دو عالم ﷺ نے کپڑے بھی دلوائے تھے۔ حضرت عباس طویل قامت تھے، ان کے بدن پر کسی کا لباس پورا نہیں آتا تھا، عبداللہ ابن ابی کا قد لمبا تھا، اس نے اپنا کرتا لا کر دیا جو پورا آ گیا۔(۲)

مساوات

حسنِ سلوک کے سلسلے میں جانِ دو عالم ﷺ کی مساوات پسندی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اپنے اعزہ و اقارب کو بھی قیدیوں کی طرح رکھا اور ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ پسند نہ کیا۔

اسیرانِ بدر کی مدینہ منورہ میں پہلی رات تھی اور مسلمانوں نے انہیں خوب کس کر باندھ رکھا تھا۔ ان میں جانِ دو عالم ﷺ کے چچا حضرت عباس بھی تھے۔ وہ پروردۂ نازو نعم انسان تھے، اس لئے ہاتھ پاؤں کی بندشیں انہیں بہت تکلیف دے رہی تھیں اور وہ درد سے کراہ رہے تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ سے ان کا کراہنا برداشت نہیں ہو رہا تھا، اس لئے آپ بھی جاگ رہے تھے اور مضطرب پھر رہے تھے۔ آپ کی یہ کیفیت دیکھ کر ایک صحابی نے عرض کی---"یا رسول اللہ! مزاجِ عالی کیوں بے قرار ہے؟"

فرمایا---"عباس کی کراہوں نے بے تاب کر رکھا ہے۔"

---

(۱) سیرت ابن ھشام ج ۲، ص ۷۸، تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۷۷.

(۲) عبداللہ ابن ابی منافقین کا سردار اور جانِ دو عالم ﷺ کے خلاف خفیہ سازشیں کرنے والوں کا سرغنہ تھا۔ بایں ہمہ جب مر گیا تو جانِ دو عالم ﷺ نے اس کے کفن کے لئے اپنا قمیص عنایت فرمایا۔ حدیث میں آتا ہے کہ یہ قمیص اسی کرتے کا معاوضہ تھا جو اس نے حضرت عباسؓ کے لئے دیا تھا۔

(صحیح بخاری ج ۱، ص ۴۴۲)

وہ صحابی گئے اور چپکے سے حضرت عباس کی بندشیں ڈھیلی کر آئے۔ تھوڑی دیر بعد جانِ دو عالم ﷺ نے حیرت سے پوچھا---"کیا بات ہے---اب عباس کے کراہنے کی آواز نہیں آ رہی ہے؟"

"یارسول اللہ! میں نے ان کی بندشیں نرم کر دی ہیں۔" صحابی نے بتایا۔

"پھر اس طرح کرو" داعی مساوات نے فرمایا "کہ تمام قیدیوں کی بندشیں ڈھیلی کر دو۔"(۱)

مشاورت

اہل عرب کے حربی دستور کے مطابق جو لوگ جنگوں میں گرفتار کیے جاتے تھے، انہیں یا تو انتہائی اذیت ناک طریقے سے قتل کر دیا جاتا تھا، یا عمر بھر کے لئے غلام بنا لیا جاتا تھا اور ہر وحشیانہ سلوک روا رکھا جاتا تھا، یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جاتا تھا، یا قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جاتا تھا۔

ایک دن جانِ دو عالم ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ اسیرانِ بدر کے بارے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ صدیق اکبرؓ کی طبیعت میں رحمت و شفقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے عرض کی---"یارسول اللہ! یہ سب اپنی قوم کے لوگ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے دے اور یہ ایمان لے آئیں۔ اس لئے میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہر ایک سے کچھ رقم لے کر ان کو رہا کر دیا جائے اور حاصل شدہ رقم سے مزید اسلحہ خرید کر اپنا دفاع مستحکم کیا جائے۔"

فاروق اعظمؓ کے مزاج میں کفار پر سختی اور شدت کا غلبہ تھا، انہوں نے عرض کی

"یارسول اللہ! مجھے صدیق کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ سب کفر کے سرغنے ہیں۔ انہوں نے آپ کو اور آپ کی پیروی کرنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں اور دکھ دیئے اور حق کے مقابلے میں صف آراء ہوئے، اس لئے میرے خیال میں ان سب کے سر قلم کر دیئے جائیں اور ہم میں سے ہر شخص اپنے ہاتھ سے اپنے کسی عزیز کو قتل کرے تاکہ دنیا

---

(۱) استیعاب ذکر عباس، تاریخ الخمیس ج ۲، ص ۳۹۰۔

جان لے کہ ہمارے دلوں میں مشرکین کے لئے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں ہے، خواہ وہ کتنے ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہوں۔"

جانِ دو عالم ﷺ نے دونوں کے خیالات سنے، پھر فرمایا

"اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کے دل نرم بنائے ہوتے ہیں اور بعض کے سخت---

ابوبکر! تمہاری طبیعت ابراہیم جیسی ہے، جو نافرمانوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے بخشش اور رحمت طلب کرتے ہیں اور کہتے ہیں وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اور عمر! تمہارا مزاج حضرت نوح جیسا ہے، جو کسی کافر کو روئے زمین پر چلتا پھرتا نہیں دیکھ سکتے اور کہتے ہیں رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔"

بہر حال صدیق اکبرؓ کی رائے رحمت پر مبنی تھی۔ اس لئے رحمت عالم ﷺ کو پسند آئی اور طے ہوا کہ قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔

یادگار فدیہ

فدیہ لینے کا سلسلہ شروع ہوا، مکہ سے لوگ آتے اور حسب استطاعت اپنے عزیزوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں ساتھ لے جاتے۔

جانِ دو عالم ﷺ کی بیٹی سیدہ زینبؓ (۱) کے شوہر اور آپ کے داماد ابو العاص بھی اسیرانِ بدر میں شامل تھے۔ ان کا فدیہ ادا کرنے کے لئے سیدہ زینبؓ نے وہ ہار بھیج دیا جو خدیجہ طاہرہؓ نے رخصتی کے وقت بیٹی کو دیا تھا۔ اس ہار کو دیکھ کر جانِ دو عالم ﷺ کو خدیجہ طاہرہؓ کے ساتھ گزرے ہوئے زندگی کے حسین لمحات یاد آ گئے اور اس باوفا خاتون کی پُر خلوص رفاقت اور بے لوث محبت کا ایک ایک لمحہ نگاہوں میں پھر گیا۔ اس سے آپ پر رقت طاری ہو گئی اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں--- اللہ اکبر---! اس جذباتی عالم میں بھی آپ نے از خود کوئی فیصلہ کرنا پسند نہ کیا؛ بلکہ صحابہ کرام سے کہا--- "اگر تم لوگ مناسب سمجھو تو میری

---

(۱) ان کے حالات انشاء اللہ بنات الرسول میں آئیں گے۔ واضح رہے کہ سیدہ زینب کی ابو العاص سے شادی اس دور میں ہوئی تھی جب شادی کے بارے میں اسلامی احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔

بیٹی کا یہ ہار واپس کر دو اور ابو العاص کو ویسے ہی رہا کر دو۔ (۱)

کیسے ممکن تھا کہ جانِ دو عالم ﷺ کے اشارۂ ابرو پر جانیں وار دینے والے عشاق آپ کی اس قلبی خواہش کے پورا کرنے میں کسی تامل یا تردد کا مظاہرہ کرتے ---! انہوں نے بخوشی ابو العاص کو رہا کر دیا اور ہار بھی واپس بھیج دیا۔ (۲)

فدیہ اور معجزہ

حضرت عباس بہت مالدار آدمی تھے۔ ان کی باری آئی تو جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا

''چچا! آپ اپنا فدیہ بھی ادا کیجئے، اپنے دو بھتیجوں عقیل اور نوفل کا بھی اور اپنے دوست عتبہ کا بھی۔''

یہ خاصی بڑی رقم تھی، جو چار و ناچار حضرت عباس نے ادا تو کر دی مگر ساتھ ہی شکایت کی کہ آپ نے مجھے بالکل قلاش کر دیا ہے، اب ساری عمر لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا پھروں گا۔

''نہیں چچا'' جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ''آپ بھلا کیسے قلاش ہو سکتے ہیں؛ جبکہ مکہ سے روانگی کے وقت آپ اپنی اہلیہ کو کافی سارا سونا دے کر آئے ہیں۔ (۳) اور

---

(۱) حفیظ جالندھری مرحوم نے اس منظر کی کیا خوبصورت عکاسی کی ہے۔

نظر آیا جونہی یہ ہار، دل حضرت کا بھر آیا
سمٹ کر ابر گوہر بار پلکوں پر اتر آیا

خدیجہ طاہرہ کا ہار، مرحومہ رفیقہ کا
رسالت کی انیسہ اور امت کی شفیقہ کا

خدیجہ طاہرہ اس قلب میں آباد تھی اب تک
محبت اور نیکی اور خدمت یاد تھی اب تک

کہا ''بیٹی نے ماں کی یادگار ارسال کر دی ہے
یہ دولت بہر شوہر آج استعمال کر دی ہے

مناسب ہو تو لوٹا دو یہ پیاری یادگار اس کو
کہ بہرِ یادِ مادر، بس غنیمت ہے یہ ہار اس کو''

(شاہنامہ اسلام)

(۲) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۳۱۲، سیرت حلبیہ، ج ۲، ص ۲۰۵۔

(۳) بعض روایات میں سونا دفن کرنے کا ذکر ہے۔

وصیت کر کے آئے ہیں کہ اگر میں اس جنگ میں مارا جاؤں تو یہ سونا میرے بیٹوں میں اس حساب سے تقسیم کر دینا۔''

حضرت عباس نے بصد حیرت جانِ دو عالم ﷺ کی یہ بات سنی اور کہا---''ہاں! یقیناً ایسا ہی ہوا تھا مگر اس راز سے یا میرا خدا آگاہ تھا یا میں اور میری بیوی اور آپ اس سے بھی باخبر ہیں۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔''(۱)

---

(۱)سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۲۰۹، تاریخ الخمیس ج ۲، ص ۳۹۰۔

کلمہ شہادت پڑھنے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حضرت عباسؓ اسی وقت دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ وہ تو غزوۂ بدر سے پہلے ہی اسلام لا چکے تھے؛ البتہ اظہار نہیں کیا تھا۔ فدیہ دیتے وقت بھی انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کے عظیم معجزے پر اظہار حیرت کے طور پر کلمہ پڑھا تھا اور وہ بھی سرعام نہیں؛ بلکہ صرف آپ کے روبرو۔ لوگوں کے سامنے تو انہوں نے اپنے اسلام کا اظہار فتح مکہ کے قریب کیا تھا اور یہ سب کچھ جانِ دو عالم ﷺ کے ایماء پر ہوا تھا۔ دراصل آپ چاہتے تھے کہ مکہ میں میرا کوئی مخلص ہمنوا ہو جو مجھے مشرکین کے عزائم سے آگاہ کرتا رہے اور یہ کام حضرت عباسؓ ہی بخوبی کر سکتے تھے، کیونکہ اہل مکہ ان کا بہت احترام کرتے تھے اور کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ حضرت عباسؓ نے بہت سلیقے سے یہ خدمت انجام دی۔ جب بھی مشرکین اہل اسلام کے خلاف کوئی منصوبہ بناتے، حضرت عباسؓ آپ کو مطلع کر دیتے اور آپ بروقت دفاعی اقدامات کر لیتے۔ اسی مصلحت کے پیش نظر آپ نے ان کو ہجرت کی اجازت نہ دی، حالانکہ انہوں نے بارہا اجازت مانگی تھی۔ جانِ دو عالم ﷺ نے ہر دفعہ ان کو یہی جواب دیا کہ آپ کا وہاں رہنا یہاں آنے کی بنسبت زیادہ مفید ہے۔

جس زمانے میں وہ اسلام نہیں لائے تھے، اس دور میں بھی ان کی ہمدردیاں جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ تھیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ بیعتِ عقبہ کے موقع پر جب انصار نے جانِ دو عالم ﷺ کو مدینہ منورہ میں تشریف آوری کی پیش کش کی تھی تو اس وقت حضرت عباسؓ بھی آپ کے ساتھ تھے، انہوں نے ہی انصار کے ساتھ بات چیت کی تھی اور تمام اونچ نیچ سے خبردار کیا تھا۔ (تفصیل ص ۲۸۵ پر گزر چکی ہے۔)

سازش اور معجزہ

فدیے کی آڑ میں بعض لوگوں نے سازش کرنے کی کوشش کی، مگر جانِ دو عالم ﷺ کے معجزانہ علم کو دیکھ کر خود ہی اسیر دام الفت ہو گئے۔

ان کے ایمان لانے کا صحیح وقت تو معلوم نہیں؛ البتہ ان کے غلام حضرت ابورافعؓ کا جو بیان ص ۴۳۰ پر گزرا ہے، اس میں تصریح ہے کہ حضرت عباسؓ غزوۂ بدر سے پہلے ہی اسلام لا چکے تھے۔ غزوۂ بدر میں بادلِ نخواستہ شامل ہوئے تھے، اسی لئے جانِ دو عالم ﷺ نے جنگ سے پہلے ہدایت فرمائی تھی کہ اگر کسی کا عباس سے آمنا سامنا ہو جائے تو ان پر تلوار نہ چلائے، کیونکہ وہ خوشی سے نہیں آئے؛ بلکہ مجبور کرکے لائے گئے ہیں۔

جس مصلحت کے تحت انہوں نے طویل عرصے تک ایمان کو چھپائے رکھا تھا، وہ مصلحت فتح مکہ کے بعد باقی نہ رہی، اس لئے انہوں نے کھل کر اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد تمام غزوات میں جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ شامل رہے اور جانکاہ مراحل میں ثابت قدم رہے۔ غزوہ حنین میں دشمن نے اچانک اور خلافِ توقع اس قدر زوردار حملہ کر دیا کہ ساری فوج تتر بتر ہو گئی اور کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ اس مشکل گھڑی میں صرف سات جاں نثار ایسے تھے جو جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ ساتھ رہے۔ ان میں سے ایک حضرت عباسؓ تھے، جنہوں نے آپ کے خچر کی لگام تھام رکھی تھی اور لوگوں کو پکار پکار کر ثابت قدمی کی تلقین کر رہے تھے۔

جانِ دو عالم ﷺ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے --- ''یہ میرے چچا ہیں اور میرے لئے والد کی طرح ہیں۔''

آپ کے بعد خلفاء راشدین بھی ان کی انتہائی توقیر کیا کرتے تھے اور ان کو دیکھتے ہی اپنی سواریوں سے اتر پڑتے تھے۔

جود و سخا، فہم و تدبر اور ہمدردی و مواسات جیسی بے شمار خوبیوں سے مالا مال تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ فرمایا کرتے تھے --- ''میرے چچا تمام قریش میں سب سے زیادہ سخی اور رشتہ داروں کا نہایت خیال رکھنے والے ہیں۔ ☜

عمیر مسلمانوں کا شدید مخالف تھا اور ہمیشہ اہل ایمان کو تنگ کرنے میں پیش پیش

شاعر بھی اعلیٰ درجے کے تھے۔ غزوۂ تبوک سے جانِ دو عالم ﷺ کی واپسی پر انہوں نے جو نعتیہ قصیدہ کہا تھا، اس کے دو شعروں کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے۔

وَاَنْتَ لَمَّا وُلِدْتَ اَشْرَقَتِ الْـ ---- اَرْضُ وَضَاءَ بِنُوْرِکَ الْاُفُق"

فَنَحْنُ فِیْ ذٰلِکَ الضِّیَاءِ وَفِی النُّـ ---- وْرِ وَسُبُلِ الرَّشَادِ نَخْتَرِق'

(جب آپ پیدا ہوئے تو زمین جگمگا اٹھی اور آپ کے نور سے افق روشن ہو گیا۔ اب ہم اسی روشنی اور نور میں ہدایت کے راستوں پر چلے جا رہے ہیں۔)

باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو کمال درجے کا عطا کیا ہوا تھا۔ ایک دن بن ٹھن کر باہر نکلے تو جانِ دو عالم ﷺ ان کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ حضرت عباسؓ نے عرض کی---

''اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے، کس بات پر ہنس رہے ہیں؟''

فرمایا---''اپنے چچا کا غیر معمولی حسن و جمال دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔''

حضرت عباسؓ کا ایک لقب ''ساقی الحرمین'' بھی ہے، یعنی حرمین کو سیراب کرنے والا۔

اس لقب کا پس منظر یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ کے دورِ خلافت میں ایک دفعہ شدید قحط پڑ گیا اور پورا ملک بھوک اور پیاس کی لپیٹ میں آ گیا۔ ملک بھر میں غلہ تو کجا، کہیں سبزہ تک باقی نہ رہا۔ یہ ۱۷ھ کا واقع ہے۔ فاروق اعظمؓ رات دن اس بلائے بے درماں سے نمٹنے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے، مگر کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو رہا تھا، اس لئے سخت پریشان تھے۔ ایک دن حضرت کعب احبار نے عرض کی کہ امیر المؤمنین! بنی اسرائیل پر اگر کبھی ایسا مشکل وقت آ جاتا تھا تو وہ انبیاء کے خاندان میں سے کسی فرد کو وسیلہ بنا کر دعا مانگا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کی مشکل حل فرما دیتا تھا۔

یہ سن کر فاروق اعظمؓ کو امید کی ایک کرن نظر آئی اور فرمایا---''اگر یہ بات ہے تو ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ کے عمِ مکرم موجود ہیں، ہم ان سے التجا کرتے ہیں۔''

چنانچہ آپ اسی وقت حضرت عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قحط سے جو ناگفتہ بہ صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی وہ گوش گزار کرنے کے بعد عرض کی کہ آپ ہمارے لئے بارش کی دعا فرما دیجئے۔ ☜

رہا کرتا تھا۔ غزوۂ بدر میں اس کا بیٹا وہب گرفتار ہو گیا تو وہ بہت پریشان رہنے لگا۔ ایک دن

حضرت عباسؓ رضامند ہو گئے۔ لوگ جمع ہوئے پہلے حضرت عمرؓ نے مختصری دعا کی --- ''الٰہی! جب رسول اللہ بنفس نفیس موجود تھے تو ہم ان کو تیرے دربار میں وسیلہ بنایا کرتے تھے۔ آج ان کے عمِ مکرم عباس کو وسیلہ بنا کر حاضر ہوئے ہیں۔ الٰہی! ہم پر کرم فرمادے اور بارانِ رحمت برسادے۔''

اس کے بعد حضرت عباسؓ نے طویل دعا کی، جس کا ہر جملہ عربی ادب کا شہکار ہے اور خضوع و خشوع اور تضرع و مسکنت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ (تفصیل دیکھنی ہو تو استیعاب کا مطالعہ کیجئے۔)

ابھی یہ دعا جاری ہی تھی کہ چاروں طرف سے بادل اُمنڈ آئے اور یوں ٹوٹ کر برسے کہ عرب کے پیاسے صحرا کا ذرہ ذرہ سیراب و شاداب ہو گیا۔

یہ کرامت دیکھ کر لوگ پروانہ وار حضرت عباسؓ کے گرد اکٹھے ہو گئے اور تبرک حاصل کرنے کے لئے ان کے جسم اقدس کو چھونے لگے اور مبارکیں دینے لگے۔

''هَنِيْئًا لَّكَ يَاسَاقِيَ الْحَرَمَيْنِ''

(یہ عظمت مبارک ہو اے ساقی الحرمین!)

یہ ایک غیر معمولی کرامت تھی، اس لئے مختلف شعراء نے حضرت عباسؓ کی شان میں قصیدے کہے۔ حضرت حسانؓ کے قصیدے سے دو شعر پیش خدمت ہیں۔

سَأَلَ الْاِمَامُ وَقَدْ تَتَابَعَ جَدْبُنَا

فَسَقَى الْغَمَامُ بِغُرَّةِ الْعَبَّاسِ

اَحْيَى الْاِلٰهُ بِهِ الْبِلَادَ فَاَصْبَحَتْ

مُخْضَرَّةَ الْاَجْنَابِ بَعْدَ الْيَاسِ

(امیر المؤمنین نے مسلسل قحط کے دوران دعا مانگی تو بادلوں نے عباس کی تابناک پیشانی کے صدقے سیراب کر دیا۔

ان کے وسیلے سے اللہ نے مردہ شہروں کو پھر سے زندہ کر دیا اور مایوسی کے بعد ہر طرف سبزہ لہلہانے لگا۔) ☜

وہ اور صفوان مکہ میں بیٹھے بدر کی باتیں کر رہے تھے اور بڑے بڑے سرداروں کے مارے جانے پر افسوس ظاہر کر رہے تھے۔ صفوان بولا

''واللہ! ان عظیم سرداروں کے بعد جینے کا کوئی مزا نہیں رہا۔''

''سچ کہتے ہو۔'' عمیر نے آہ بھر کر کہا ''اگر مجھ پر قرضہ نہ ہوتا اور یہ فکر نہ ہوتی کہ میرے بعد میرے بال بچوں کا کیا ہوگا تو میں اپنے بیٹے کو چھڑانے کے بہانے مدینہ جاتا اور محمد کو قتل کر دیتا۔'' (معاذ اللہ)

صفوان کا باپ اور بھائی بھی بدر میں مارے گئے تھے۔ اس نے انتقام لینے کے لئے یہ موقع غنیمت جانا اور کہا --- ''عمیر! اگر تم یہ کام کر دو تو میں تمہارا سارا قرضہ ادا کر دوں گا اور تمہارے اہل و عیال کی بھی زندگی بھر پرورش کرتا رہوں گا۔''

عمیر تیار ہو گیا، مگر صفوان کو تاکید کی کہ اس بات کو پوشیدہ رکھنا اور کسی سے بھی ذکر نہ کرنا۔ صفوان نے رازداری کا وعدہ کیا اور محفل برخاست ہو گئی۔

مدینہ منورہ میں ایک دن حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ بیٹھے بات چیت کر رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر عمیر پر پڑی، جس کے گلے میں تلوار حمائل تھی اور وہ اپنے اونٹ کو بٹھا رہا تھا

خود فاروق اعظمؓ نے ان الفاظ میں آپ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

''هٰذَا وَاللهِ الْوَسِيْلَةُ اِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَالْمَكَانُ مِنْهُ.'' (خدا کی قسم! یہ ہے وسیلے اور قربِ الٰہی کا مقام۔)

مشکلات کے وقت لوگوں کے کام آنے والے اور بارگاہِ الٰہی میں ان کی سفارشیں کرنے والے یہ جلیل القدر دعا گو ۳۲ھ کو واصل بحق ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں مدفون ہوئے۔ کل عمر ۸۸ سال تھی۔

رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ وَبِوَسِيْلَتِهٖ عَنِّيْ وَعَنْ جَمِيْعِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ.

(یہ واقعات بخاری، استیعاب اور مستدرک سے ماخوذ ہیں۔)

فراست فاروقی معروف عالم ہے۔ عمیر کو دیکھتے ہی حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں ہے، جلدی سے اٹھ کر جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی

''یا رسول اللہ! اللہ کا دشمن عمیر آیا ہے، اس کے گلے میں تلوار لٹک رہی ہے۔''

''آیا ہے تو آنے دو۔'' جانِ دو عالم ﷺ نے بے فکری سے فرمایا۔

حضرت عمرؓ نے باہر آ کر عمیر کی گردن کو وہاں سے دبوچا جہاں تلوار کا پٹہ پڑا ہوا تھا اور کہا---''چل!''

مزید احتیاط کے طور پر وہاں موجود دیگر صحابہ کرامؓ سے کہا کہ آپ بھی اندر چلے آیئے، کیونکہ مجھے اس کی نیت میں فتور معلوم ہوتا ہے۔

جب عمیر اس حالت میں جانِ دو عالم ﷺ کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا

''عمر! اس کو چھوڑ دو!---عمیر! آگے آ جاؤ!''

عمیر آگے بڑھا اور کہا---''اَنْعِمُوْا صَبَاحًا'' (صبح بخیر۔ یہ زمانۂ جاہلیت میں صبح کا سلام تھا۔)

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''صبح بخیر، کے بجائے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے بہتر شئے عطا فرمادی ہے اور وہ سلام ہے۔ بہر حال تم بتاؤ کہ کیسے آنا ہوا؟''

''اپنے بیٹے وہب کو رہا کرانے آیا ہوں۔'' عمیر نے جواب دیا۔

''پھر یہ تلوار کس لئے اٹھائے پھرتے ہو؟''

''لعنت ہو تلوار پر---ان تلواروں نے بدر کے دن ہمیں کون سا فائدہ دیا!؟'' عمیر نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''عمیر! سچی بات بتاؤ کس لئے آئے ہو؟''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں کہ فدیہ دے کر اپنے بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔'' عمیر نے پھر وہی وجہ بتائی۔

''نہیں عمیر!'' جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ''تمہاری آمد کا یہ مقصد نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم اور صفوان فلاں جگہ بیٹھ کر بدر کی باتیں کر رہے تھے، تم نے کہا کہ اگر مجھے

قرضے اور بال بچوں کی فکر نہ ہوتی تو میں جا کر محمد کو قتل کر دیتا۔ صفوان نے کہا تیرا قرضہ میں ادا کروں گا اور تیرے اہل وعیال کی کفالت بھی کروں گا، چنانچہ تم مجھے قتل کرنے چلے آئے۔"

جانِ دو عالم ﷺ کی زبان سے اپنی خفیہ ترین سازش کی تمام تفصیلات حرف بحرف سن کر عمیر دنگ رہ گیا اور برملا پکار اٹھا---"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ اس سے پہلے ہم آپ کو وحی کے سلسلے میں جھٹلاتے رہے ہیں، مگر میری اور صفوان کی یہ گفتگو اتنی رازدارانہ تھی کہ ہم دونوں کے سوا کوئی بھی مطلع نہیں تھا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کو اس سے آگاہ کیا ہے۔ الحمدللہ کہ اس بہانے میری ہدایت کا سامان ہو گیا اور مجھ پر حق واضح ہو گیا۔"

جانِ دو عالم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا---"اب یہ تمہارا بھائی ہے۔ اس کو دین سکھاؤ اور مسائل وغیرہ سمجھاؤ!"

حضرت عمیرؓ نے عرض کی---"یا رسول اللہ! اس سے پہلے میں نے اسلام کی بہت مخالفت کی ہے۔ اب جی چاہتا ہے کہ بھرپور انداز میں تبلیغ کروں اور اہل مکہ کو ایمان کی دعوت دوں۔"

آپ نے بخوشی اجازت دے دی۔

اُدھر صفوان خوش ہو رہا تھا اور سب لوگوں سے کہتا پھر رہا تھا کہ تم لوگ عنقریب ایسی خوشخبری سنو گے کہ بدر کا سارا غم بھول جاؤ گے، مگر حضرت عمیرؓ نے واپس جا کر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی اور صفوان سے بھی کہا کہ تم ہمارے سرداروں میں سے ایک معزز سردار ہو، تم ہی بتاؤ کہ بے جان پتھروں کو پوجنے اور ان کے لئے چڑھاوے چڑھانے کی کیا تک ہے---؟ یہ بھی بھلا کوئی مذہب ہے---؟ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

صفوان کیا کر سکتا تھا، خاموشی سے سنتا رہا اور اپنی تمناؤں کا خون ہوتے دیکھتا رہا۔(۱)

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۳۱۳، ۳۱۴، سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۸۳.

بِلا فدیہ رہائی

بعض نادار قیدی فدیہ لئے بغیر بھی چھوڑ دیئے گئے۔ ابوعزہ ایک مشہور شاعر تھا۔ اس نے التجا کی کہ یارسول اللہ! آپ جانتے ہی ہیں کہ میرے پاس فدیہ دینے کے لئے مال نہیں ہے، میں ایک غریب آدمی ہوں اور پانچ بیٹیوں کا باپ ہوں۔ براہ مہربانی میری بے آسرارہ جانے والی بیٹیوں پر احسان فرمایئے اور مجھے آزاد کردیجئے۔

جانِ دوعالم ﷺ یہ سن کر بہت متاثر ہوئے اور ابوعزہ کو بغیر فدیہ کے رہا کردیا۔(۱)

---

(۱) جانِ دوعالم ﷺ کے اس فیاضانہ سلوک کو دیکھ کر اس وقت بظاہر ابوعزہ مسلمان ہوگیا تھا اور جاتے ہوئے ایک عمدہ نعت بھی کہی تھی، جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مَنْ مُّبلِغٌ عَنِّیَ الرَّسُوْلَ مُحَمَّدًا ۔۔۔ بِاَنَّکَ حَقٌّ وَّالْمَلِیْکُ حَمِیْدٌ

وَاَنْتَ امْرُاٌ تَدْعُوْ اِلَی الْحَقِّ وَالْھُدٰے ۔۔۔ عَلَیْکَ مِنَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ شَھِیْدٌ

فَاِنَّکَ مَنْ حَارَبْتَہٗ لَمُحَارَبٌ ۔۔۔ شَقِیٌّ وَمَنْ سَالَمْتَہٗ لَسَعِیْدٌ

(اللہ کے رسول محمد کو کون میرا یہ پیغام پہنچائے کہ آپ سچے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر تعریف کا مستحق ہے۔ آپ ایک ایسے انسان ہیں کہ حق وہدایت کی دعوت دیتے ہیں اور عظمتوں والا خدا آپ کی صداقت پر گواہ ہے۔ آپ جس کے ساتھ جنگ کریں، وہ بلاشبہ بد بخت ہے اور جس سے صلح کریں، وہ بالیقین نیک بخت ہے۔)

مگر افسوس کہ یہ سب کچھ اس کی لفاظی تھی اور دل میں اس وقت بھی کفر بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ جب واپس مکہ پہنچا تو اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر بڑے فخر سے اعلان کیا کہ میں محمد کو دھوکہ دے آیا ہوں۔

اس کے بعد حسب سابق اپنے شعروں سے مشرکین کے جذبات بھڑکا تا رہا اور انہیں مسلمانوں سے جنگ کرنے پر اکساتا رہا۔ غزوۂ احد میں بڑے جوش خروش سے شامل ہوا، مگر بدقسمتی سے دوبارہ گرفتار ہوگیا اور جانِ دوعالم ﷺ نے اس کے قتل کرنے کا حکم صادر فرمادیا۔ اس نے ایک بار پھر چکنی چپڑی باتیں کر کے معافی حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا---''مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ اب میں تمہیں اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ تم مکہ جاکر ڈینگیں مارتے پھرو کہ ☜

تعلیم کا اہتمام

جو نادار قیدی پڑھے لکھے تھے، ان سے وعدہ کیا گیا کہ اگر تم دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو تو رہا کر دیئے جاؤ گے۔ (۱) حضرت زید بن ثابتؓ نے --- جو بعد میں بہت بڑے عالم اور میراث کے ماہر تصور کئے جاتے تھے --- ابتدائی تعلیم انہی اسیرانِ بدر سے حاصل کی تھی۔ (۲)

تبادلہ

ان قیدیوں میں صرف ایک قیدی ایسا تھا جو تبادلے میں رہا کیا گیا۔ یہ ابوسفیان کا بیٹا عمر تھا۔ ابوسفیان نے اس کے بدلے میں ایک ضعیف العمر صحابی سعد ابن نعمانؓ کو پکڑ لیا تھا جو انہی دنوں عمرہ کے لئے مکہ گئے تھے اور مطالبہ کیا تھا کہ میرے بیٹے عمر کو رہا کرو گے تو سعد کو چھوڑوں گا، ورنہ نہیں۔

سعدؓ کے قبیلے نے جان دو عالم ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اگر آپ عمر کو ہمارے حوالے کر دیں، تو ہم اسے ابوسفیان کے سپرد کر کے اپنا آدمی چھڑا لائیں۔

آپ نے ان کا مطالبہ مان لیا اور انہوں نے عمر کے عوض سعدؓ کو رہا کرا لیا۔ (۳)

ایک عجیب روایت

قارئین کرام! بحمد اللہ غزوۂ بدر کے تمام اہم واقعات اختتام کو پہنچے، لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ایک روایت پر تبصرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور مسند احمد کے علاوہ تاریخ و سیرت کی بیشتر کتابوں میں تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ موجود

میں محمد کو دوبارہ دھوکہ دے آیا ہوں۔"

چنانچہ اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ تاریخ الخمیس ج ۱، ص ۳۹۴.

(۱) مسند امام احمد ج ۱، ص ۲۴۶.

(۲) طبقاتِ ابن سعد ج ۲، ص ۱۴.

(۳) البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۳۱۱، سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۸۰.

ہے اور مفسرین نے بھی مَا کَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى. الآیۃ. کی تفسیر وتشریح کی بنیاد اسی روایت پر رکھی ہے۔

روایت اس طرح ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کی تجویز سے صرفِ نظر کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو ترجیح دی اور فدیہ لے کر قیدی چھوڑ دیئے، تو حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت ابوبکرؓ بھی بیٹھے ہیں اور دونوں رو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا

''یارسول اللہ! آپ دونوں کس بات پر رو رہے ہیں؟ مجھے بھی بتایئے، اگر مجھے رونا آ گیا تو میں بھی آپ کے ساتھ رونے میں شامل ہو جاؤں گا۔ ورنہ رونی صورت ہی بنالوں گا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا --- ''میں اس عذاب کے خوف سے رو رہا ہوں جو تیرے دوستوں کے فدیہ لینے کی وجہ سے نازل ہونے والا تھا۔''

ایک قریبی درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید ارشاد فرمایا --- ''وہ عذاب اس درخت کے قریب میرے سامنے پیش کیا گیا تھا۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۱)

(کسی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں، تا آنکہ وہ زمین میں خونریزی نہ کرے۔ تم دنیا کو چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو پسند کرتا ہے اور اللہ عزت والا اور حکمت والا ہے۔ اگر اللہ نے پہلے سے لکھت نہ کر رکھی ہوتی تو تم نے جو کچھ لیا ہے اس پہ تم کو بڑا عذاب پہنچ چکا ہوتا۔ اب جو مالِ غنیمت تم حاصل کر چکے ہو اس کو کھاؤ، وہ حلال اور طیب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔)

---

(۱) قرآن کریم سورہ ۸، آیات ۶۷ تا ۶۹۔

مسلم کی روایت اسی قدر ہے۔ (۱) لیکن بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اگر عذاب نازل ہو جاتا تو عمر کے سوا کوئی بھی نہ بچتا۔

اس روایت کی بنا پر اکثر مفسرین و محدثین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت عمرؓ کی رائے پسند آئی تھی اور اس کی رضا اسی میں تھی کہ سب کو قتل کر دیا جاتا، کیونکہ نبی کے لئے مناسب یہی ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں تو اچھی طرح خونریزی کرے۔ جن لوگوں نے فدیے کی تجویز پیش کی تھی اور اس پر عمل کیا تھا، انہوں نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی تھی؛ جبکہ اللہ تعالیٰ آخرت کو پسند کرتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں پہلے سے یہ بات طے نہ ہوتی کہ اصحابِ بدر ہر طرح کے عذاب سے مامون و محفوظ رہیں گے --- یا یہ کہ جب تک کسی کام کی صریح ممانعت نہ ہو اس وقت تک عذاب نہیں دیا جاتا --- تو تم پر اس جرم کی پاداش میں بڑا عذاب نازل ہو چکا ہوتا۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا، اب جو مال تم لے چکے ہو اس کو استعمال میں لاؤ، وہ حلال و طیب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

یہ تفسیری خاکہ مفسرین نے مندرجہ بالا روایت کی مناسبت سے ترتیب دیا ہے، مگر ہمارے خیال میں نہ وہ روایت صحیح ہے، نہ اس کے مطابق مرتب کیا گیا تفسیری خاکہ قابل قبول ہے۔

اَوَّلاً: اس لئے کہ اس تفسیر کو مدنظر رکھتے ہوئے **مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ** کا معنیٰ یہ کرنا پڑتا ہے کہ کسی نبی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں اور وہ انہیں قتل کرنے اور اچھی طرح خونریزی کرنے کے بجائے زندہ چھوڑ دے۔ حالانکہ ان الفاظ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی نبی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں، تا آنکہ وہ خونریزی نہ کرے۔ یعنی جنگ میں اچھی طرح خونریزی کر لینے سے پہلے کسی کو قیدی بنانا مناسب نہیں ہے۔ اس سے یہ کس طرح ثابت ہو گیا کہ جنگ کے بعد بھی گرفتار شدہ لوگوں میں خونریزی کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے!؟

ثَانِیًا: اس لئے کہ اس تفسیر کی رو سے جن لوگوں نے فدیے کو ترجیح دی، انہوں نے

---

(۱) مسلم ج ۲، ص ۹۳۔

آخرت کی بجائے دنیا کو اختیار کیا اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ فدیے کی تجویز صدیق اکبرؓ نے پیش کی تھی۔ کیا صدیق اکبرؓ جیسے سراپا اخلاص وایثار انسان کے بارے میں یہ تصور بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس نے آخرت پر دنیاوی مفادات کو ترجیح دی ہوگی؟

ثَالِثًا: اس لئے کہ اس تفسیر کی زد سے اللہ کا آخری رسول بھی نہیں بچتا، کیونکہ اس نے صدیق اکبر کی رائے کو پسند کیا تھا اور اپنی نگرانی میں فدیے کا کام مکمل کرایا تھا۔ کیا فقر پر فخر کرنے والی اس ذاتِ اقدس کو بھی "تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا" میں داخل سمجھا جائے گا!؟ اَسْتَغْفِرُ اللہ۔

رَابِعًا: اس لئے کہ اس تفسیر سے یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے فدیہ لینا کوئی بہت ہی گھناؤنا جرم تھا اور اس کے مرتکب عذاب عظیم کے مستحق تھے۔ قطع نظر اس سے کہ اس "جرم" کے مرتکبین میں سرفہرست کون تھے --- یہ بات قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم نے دوسری جگہ خود ہی فدیہ لینے کی اجازت دی ہے۔ سورہ محمد میں قیدیوں کے بارے میں ارشاد ہے "فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" (۱) یعنی گرفتار کرنے کے بعد یا تو ان کو بطور احسان چھوڑ دو، یا فدیہ لو۔ گویا ایک طرف تو خود ہی فدیہ لینے کی اجازت دی جارہی ہے اور دوسری طرف فدیہ لینے والوں کو عذابِ عظیم کا حقدار قرار دیا جارہا ہے!؟

اگر کہا جائے کہ سورہ محمد والی آیت اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی تھی تو اگرچہ یہ بات درست نہیں ہے؛ تاہم اگر اسے صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو یہ چیز بھی کم تعجب خیز نہیں ہے کہ جو کام کچھ روز پہلے اللہ تعالیٰ کو اتنا ناپسند تھا کہ اس کا مرتکب بڑے عذاب کا مستحق ہو جاتا تھا، چند دن بعد وہی کام اللہ تعالیٰ کو اتنا مرغوب ومحبوب ہوگیا کہ قیامت تک کے لئے اس کی اجازت دے دی!!

خَامِسًا: اس لئے کہ ترمذی کی ایک روایت کے مطابق فدیہ لینے سے پہلے جبریل امین نازل ہوئے تھے اور جانِ دو عالم ﷺ سے کہا تھا کہ آپ کے اصحاب قیدیوں کو قتل

---

(۱) قرآن کریم سورہ ۴۷، آیت ۴۔

کرنے اور فدیہ لینے میں جو صورت چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔(۱) اور اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ اختیار کو استعمال کرتے ہوئے جب صحابہ کرامؓ نے فدیہ لینا پسند کر لیا تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ انہیں عذاب کا مستحق قرار دے دیا؛ بلکہ جانِ دو عالم ﷺ کو درخت کے قریب عذاب کا مشاہدہ بھی کرا دیا---یَالِلْعَجَبُ!!

حاصلِ کلام یہ کہ اس روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے مفسرین نے جو تفسیر کی ہے وہ ظاہر معنٰی کے خلاف ہے، شانِ صدیقیت کے منافی ہے، مقامِ رسالت کے مناقض ہے، سورہ محمد کی آیت سے معارض ہے، ترمذی کی روایت سے متصادم ہے---اس لئے قطعی طور پر ناقابلِ قبول ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ اس قسم کی تمام روایات اخبارِ آحاد ہیں جو محدثین کے ہاں بالاتفاق ظنی ہیں؛ جبکہ صدیق اکبرؓ اور رسول اللہ ﷺ کا ہر قسم کے دنیاوی لالچ سے پاک صاف ہونا قطعی ہے اور قطعیات کو ظنیات کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا---ممکن ہے کہ متشدد قسم کے روایت پرستوں اور قدامت پسندوں کو ہماری تحقیق ناگوار گزرے اور ہم سے ناراض ہو جائیں، لیکن ہم لوگوں کو راضی رکھنے کی بنسبت مقامِ مصطفیٰ اور شانِ صدیق کا تحفظ زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔

آیات کا مفہوم

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر روایتِ عذاب صحیح نہیں تو مندرجہ بالا آیاتِ قرآنیہ کا کیا مفہوم ہو گا؟ تو جواباً عرض ہے کہ ان آیات کو فدیہ کے ساتھ متعلق کرنے میں بڑا ہاتھ اسی روایت کا ہے۔ ورنہ اصل صورت حال یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں جب مشرکین کو شکست ہو گئی تو عام مجاہدین بجائے اس کے کہ ان آئمہ کفر کا تعاقب کرتے اور ان کو تہہ تیغ کر کے دم لیتے، مالِ غنیمت جمع کرنے اور بچے کھچے مشرکین کو گرفتار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ اکابر صحابہ نے اس کاروائی کو ناپسند کیا تھا اور اپنی ناگواری کا برملا اظہار کیا تھا، مگر فتح

(۱) ترمذی ص ۱۹۰۔

کے نشے میں سرشار مجاہدین کو روکنا عملاً ممکن نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رؤس الشیاطین بچ نکلے اور پھر فتح مکہ تک مسلمانوں کے لئے بار بار پریشانی کا سبب بنتے رہے۔ اگر اسی دن ان کا خاتمہ ہوگیا ہوتا تو غزوۂ احد کا المناک سانحہ رونما نہ ہوتا، کیونکہ اس میں پیش پیش وہی لوگ تھے جو بدر سے جانیں بچا کر بھاگ نکلے تھے۔

ان آیات میں روئے سخن انہی مجاہدین کی طرف ہے۔ انہیں تنبیہ کرتے ہوئے بتایا جا رہا ہے کہ نبی کا اصل مشن کفر کی جڑ کاٹنا ہے، نہ کہ مال غنیمت اکٹھا کرنا اور دشمنوں کو قیدی بنانا۔ اس لئے جب تک کفر کی طاقت مکمل طور پر کچل نہ دی جاتی، اس وقت تک تمہیں غنیمت سمیٹنے اور قیدی بنانے میں مشغول نہیں ہونا چاہئے تھا۔

تم نے دنیاوی سامان کو ترجیح دی؛ جبکہ اللہ تعالیٰ آخرت کو پسند کرتا ہے؛ تاہم چونکہ پہلے سے صریح ممانعت نہیں کی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ واضح احکام نازل کرنے سے قبل کسی کی گرفت نہیں کرتا، اس لئے تم کو کوئی سزا نہیں دی گئی، ورنہ تمہارے اس اقدام سے ملتِ اسلامیہ کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کی بنا پر تم بڑے عذاب کے مستحق تھے۔

کیسا واضح اور صاف و شفاف مفہوم ہے جس کو روایت عذاب کے سریش سے واقعۂ فدیہ کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ کیسی کیسی مقدس ہستیاں اس کی لپیٹ میں آ گئی ہیں۔

قدیم مفسرین میں سے علامہ قرطبی نے اور جدید مفسرین میں سے پیر محمد کرم شاہ الازہری اور سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ان آیات کی یہی تفسیر کی ہے۔ اور اپنے موقف کو بہت کھل کر بیان کیا ہے۔ اس لئے مزید تفصیلات کے لئے ضیاء القرآن اور تفہیم القرآن کا مطالعہ کیجئے۔ ضیاء القرآن میں تفسیر قرطبی کا پورا اقتباس بھی درج ہے؛ البتہ پیر صاحب نے روایتِ عذاب پر لب کشائی سے پہلو تہی کی ہے؛ جبکہ مودودی صاحب نے واضح طور پر اس روایت کو مسترد کیا ہے(۱) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ. رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا.

---

(۱) تفہیم القرآن ج ۲، ص ۱۵۹، ۱۶۰، ضیاء القرآن ج ۲، ص ۱۵۸۔

غزوۂ بنی سلیم

غزوۂ بدر سے صرف سات دن بعد جانِ دو عالم ﷺ قبیلہ بنی سلیم کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے اور اس چشمے پر جا کر پڑاؤ کیا، جہاں سے بنی سلیم پانی حاصل کیا کرتے تھے۔ وہاں آپ تین دن تک مقیم رہے، مگر بنی سلیم نے مقابلے پر آنے کی جرأت نہ کی۔ چنانچہ چوتھے دن آپ کسی جنگ سے دوچار ہوئے بغیر واپس مدینہ تشریف لے آئے۔(۱)

غزوۂ بنی قینقاع

بدر اور بنی سلیم کے خارجی محاذوں سے نمٹنے کے بعد ابھی جانِ دو عالم ﷺ پوری طرح آرام بھی نہیں کر پائے تھے کہ شوال ۲ھ میں اچانک ایک داخلی محاذ کھل گیا اور مدینہ کے یہودیوں نے غداری شروع کر دی۔ حالانکہ انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ پُر امن رہنے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ بنی قینقاع یہودیوں کا سب سے مالدار مسلح اور بہادر قبیلہ تھا۔ یہ لوگ پیشے کے اعتبار سے تو زرگر تھے، مگر تلوار کے بھی دھنی تھے، اس لئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنی بہادری کے گھمنڈ میں من مانی کرتے رہتے تھے۔

ایک دن ایک پردہ دار مسلمان خاتون ان کے بازار میں اپنا زیور فروخت کرنے آئی اور ایک یہودی سنار کی دکان میں بیٹھ گئی۔ اس کو تنہا دیکھ کر اوباش یہودیوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا اور مطالبہ کرنے لگے کہ چہرے سے نقاب ہٹا کر ذرا اپنا دیدار تو کراؤ۔ وہ انکار کرنے لگی، یہ اصرار کرنے لگے۔ اسی دوران ایک یہودی نے چپکے سے اس کے لمبے اور ڈھیلے ڈھالے غرارے کا پچھلا دامن ایک کانٹے کے ذریعے سے غرارے کے بالائی حصے میں ٹانک دیا اور اس بے چاری کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جب وہ اٹھی تو پچھلا دامن نیچے گرنے کے بجائے اوپر اٹھا رہ گیا، اور اسکا عقبی زیریں حصہ عریاں ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر یہودی قہقہے لگاتے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ بے بس اور لاچار عورت اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ بے اختیار چیخ پڑی اور فریادیں کرنے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر ایک مسلمان ادھر متوجہ ہو گیا اور

(۱) ابن ھشام ج ۲، ص ۱۱۹، البدایہ والنھایہ ج ۱، ص ۳۴۴.

جونہی صورت حال اس کے ذہن میں واضح ہوئی، اس کی غیرتِ ایمانی مچل اٹھی اور اگلے ہی لمحے یہودی دکاندار خاک وخون میں لوٹ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر دکاندار کے ساتھیوں نے مسلمان پر حملہ کردیا اور وہ غیرتمند انسان ایک پاکباز مومنہ کی عفت پر قربان ہوگیا۔

اس ہنگامے میں عورت تو جان بچا کر نکل گئی؛ البتہ مسلمانوں اور یہودیوں کی آپس میں ٹھن گئی اور فریقین نے اپنے اپنے حامیوں کو مدد کے لئے پکارنا شروع کردیا۔ جانِ دو عالم ﷺ کو اس سنگین صورتحال کا پتہ چلا تو آپ یہودیوں کے اس بازار میں تشریف لے گئے اور انہیں متنبہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

''اے یہودیو! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں، کیونکہ تمہاری مقدس کتاب میں میری آمد کی پیشینگوئیاں موجود ہیں، اس لئے اللہ سے ڈرو، کہیں تمہارا بھی وہی حشر نہ ہو جو بدر میں مشرکین مکہ کا ہوا۔''

انہوں نے انتہائی رعونت سے جواب دیا---''اے محمد! تمہاری قوم (یعنی قریش) کو لڑنے کا ڈھنگ ہی نہیں آتا تھا، اس لئے انہیں شکست ہوگئی۔ تم اس فتح پر یوں نہ اتراؤ، اگر ہمارے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے پڑ گئے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ لڑنے والے کیسے ہوتے ہیں۔''

مگر جب جانِ دو عالم ﷺ ان کی گوشالی کے لئے سچ مچ تیار ہوگئے تو تمام لاف و گزاف اور بہادری کے دعوے دھرے رہ گئے اور بجائے مردانہ وار مقابلہ کرنے کے ایک قلعے میں پناہ گزیں ہوگئے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے قلعے کا محاصرہ کرلیا جو پندرہ دن تک مسلسل جاری رہا۔ آخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بصد ذلت ورسوائی قلعے سے باہر نکل آئے۔ جانِ دو عالم ﷺ تو بے بس عورتوں کی عزتیں لوٹنے والے ان بدکاروں سے اللہ کی زمین کو پاک کردینا چاہتے تھے، مگر عبداللہ ابن ابی آڑے آیا اور منت سماجت کرکے ان کی جان بخشی کرادی۔ اس طرح یہ لوگ تہہ تیغ ہونے سے تو بچ گئے، مگر آئندہ کے لئے ان کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے آپ نے انہیں حکم دیا کہ تین دن کے اندر اندر اپنا تمام مال ومتاع اور اسلحہ مسلمانوں کے حوالے کردیں اور بالکل خالی ہاتھ مدینہ سے نکل جائیں۔ اس کام کی نگرانی

کے لئے آپ نے حضرت عبادہ ابن صامتؓ (۱) کو مقرر فرمایا۔ انہوں نے حسب ارشاد صرف تین دن میں تمام ہتھیار وغیرہ اپنے قبضے میں لے لئے اور بنی قینقاع کو ہمیشہ کے لئے

---

(۱) حضرت عبادہ ابن صامت انصاریؓ ان قدیم الاسلام صحابہ میں سے ہیں، جو مکہ مکرمہ جا کر ایمان لائے تھے اور جانِ دو عالم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ بنی قینقاع کے ساتھ ان کے بہت گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ مگر جب انہوں نے مندرجہ بالا حرکت کی تو حضرت عبادہؓ نے ان سے ہر قسم کا تعلق ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور بارگاہ رسالت میں عرض کی۔

''یا رسول اللہ! میں صرف اللہ، اس کے رسول اور مؤمنین کے ساتھ محبت رکھتا ہوں، آج سے میں بنی قینقاع سے تمام تعلقات منقطع کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ میں ان سے اور ان کی اس حرکت سے متنفر و بیزار ہوں۔''

جانِ دو عالم ﷺ بہت خوش ہوئے اور انہی کو اخراجِ بنی قینقاع کی کارروائی کا نگران مقرر کر دیا۔ اس کام کے لئے جانِ دو عالم ﷺ نے صرف تین دن کی مہلت دی تھی۔ جب کہ بنی قینقاع اس میں اضافہ کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عبادہؓ سے مزید مہلت مانگی۔ حضرت عبادہؓ چاہتے تو مہلت دے سکتے تھے، مگر انہیں یہودیوں کی خواہشات کی بنسبت جانِ دو عالم ﷺ کا فرمان زیادہ عزیز تھا۔ انہوں نے سابقہ تعلقات کا لحاظ کئے بغیر دوٹوک جواب دیا۔

''لَا، وَلَا سَاعَةً وَاحِدَةً'' (نہیں، تین دن پر ایک لمحے کا اضافہ بھی نہیں کروں گا۔)

بہت صاف گو اور کھرے انسان تھے، لگی لپٹی رکھے بغیر دل کی بات کہہ دیتے تھے۔ عہد فاروقی میں کچھ عرصہ تک فلسطین کے قاضی رہے تھے۔ اس کے بعد شام میں سکونت اختیار کر لی تھی، مگر وہاں ان کی حضرت معاویہؓ سے نہیں بنتی تھی اور آئے دن اختلافات ہوتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ انہوں نے شام چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا اور مدینہ منورہ چلے آئے۔ فاروق اعظمؓ کو ان کی آمد کا پتہ چلا تو ان سے شام چھوڑنے کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ سے اپنے اختلافات بتائے۔ فاروق اعظمؓ قدیم الاسلام صحابہ کی بہت عزت و توقیر کیا کرتے تھے، فرمانے لگے---''جس ملک میں آپ جیسے لوگ نہ ہوں، وہ کیسا قبیح ملک ہوگا! آپ شام ہی میں رہیں اور اس کو اپنی برکتوں سے محروم نہ ☜

مدینہ سے نکال باہر کیا۔ فَسُبْحَانَ مَنْ یُعِزُّ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (۱)

کریں۔ رہا معاویہ سے اختلاف کا مسئلہ، تو میں اسے لکھ دوں گا کہ آپ اس کی حکمرانی سے خارج ہیں۔''

یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا --- ایک شخص کو صوبائی حکومت کے جملہ قوانین سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا اور اسے مکمل شخصی آزادی کی ضمانت دے دی گئی تھی۔ چنانچہ حضرت عبادہؓ شام چلے آئے اور پھر عمر بھر وہیں رہے۔

قرآن وحدیث اور فقہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہی انہوں نے قرآن جمع کر لیا تھا۔ اِنَّهٗ مِمَّنْ جَمَعَ الْقُرْآنَ فِیْ عَهْدِ النَّبِیِّ ﷺ۔

حدیث میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ حضرت انسؓ اور حضرت جابرؓ جیسے جلیل القدر صحابہ نے ان سے روایت اخذ کی ہے اور بڑی تعداد میں تابعین بھی ان کے شاگرد ہیں۔

فقہ میں ان کے مرتبے کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت معاویہؓ بھی ان کی فقاہت کے معترف تھے، حالانکہ حضرت معاویہؓ سے اکثر ان کا اختلاف رہتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت معاویہؓ نے نماز عصر کے بعد منبر کے پاس کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا۔

''اَلْحَدِیْثُ كَمَا حَدَّثَنِیْ عُبَادَةُ فَاقْتَبِسُوْا مِنْهُ فَهُوَ اَفْقَهُ مِنِّیْ۔''

(حدیث اسی طرح ہے، جس طرح عبادہ نے میرے سامنے بیان کی ہے، تم لوگ ان سے روشنی حاصل کرو، کیونکہ یہ مجھ سے زیادہ فقیہ ہیں۔)

اللہ اللہ!! کیسے وسیع الظرف تھے یہ اصحابِ رسول ---! کہ اختلافات کے باوجود دوسرے کی عظمتوں کا اعتراف کرنے میں کسی قسم کا بخل نہیں کرتے تھے۔

کاش! ہمارے دل بھی اسی طرح کشادہ ہو جائیں۔

۳۴ھ میں بعمر بہتر (۷۲) سال یہ عظیم آفتاب ہدایت دمشق میں غروب ہو گیا۔

رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ

(تمام واقعات اصابہ، استیعاب اور مستدرک حاکم سے ماخوذ ہیں۔)

(۱) ابن هشام ج ۲، ص ۱۲۱، ۱۲۲، البدایه والنهایه ج ۲، ص ۵۷۴.

غزوہ السویق

اخراج بنی قینقاع کے بعد ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ ذوالحجہ میں ابوسفیان نے دو سو ساتھیوں کی مدد سے مضافاتِ مدینہ پر حملہ کر دیا۔ دراصل ابوسفیان نے غزوہ بدر میں مشرکین کی شکست کے بعد قسم کھائی تھی کہ جب تک میں محمد کے ساتھ جنگ نہیں کرلوں گا، غسل نہیں کروں گا۔ اسی قسم کو پورا کرنے کے لئے اس نے یہ چھاپہ مارا تھا۔ مدینہ کے یہودیوں سے اس کے مراسم تھے، اس لئے رات کی تاریکی میں مدینہ کے اندر داخل ہوا اور بنی نضیر کے ایک رئیس حیی ابن اخطب کا دروازہ کھٹکھٹایا، مگر --- نہ جانے کیوں؟ --- اس نے نہ کھولا۔ پھر ایک اور سردار سلام ابن مشکم کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے بہت پُر جوش انداز میں ابوسفیان کا استقبال کیا، کھانا کھلایا، شراب پلائی اور مدینہ کے حالات سے آگاہ کیا۔ ابوسفیان کے پاس نفری تھوڑی تھی اس لئے مدینہ پر حملہ نہیں کرسکتا تھا، لیکن قسم پوری کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا بھی ضروری تھا، چنانچہ اس نے مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹی سی مضافاتی بستی --- عریض --- پر ہلہ بول دیا۔ ایک انصاری کو قتل کیا، چند مکانات جلائے، گھاس کے ایک بڑے ڈھیر کو آگ لگائی اور واپس ہوگیا۔ اس طرح اس کے خیال میں قسم پوری ہوگئی تھی۔

صبح جانِ دو عالم ﷺ کو رات کے سانحے کا پتہ چلا تو آپ فی الفور اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے جب محسوس کیا کہ ہمارا تعاقب ہو رہا ہے تو انہوں نے اپنے سامان میں تخفیف کرنے کے لئے ستوؤں کے تھیلے گرانے شروع کر دیئے۔ اس تدبیر سے ان کے بھاگنے کی رفتار مزید تیز ہوگئی اور بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔

چونکہ اس غزوے میں بہت سارے ستو مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے اور ستوؤں کو عربی میں سویق کہتے ہیں، اس لئے اس غزوہ کا نام غزوۃ السویق پڑ گیا۔ (۱)

---

(۱) ابن ھشام ج ۲، ص ۱۱۹، البدایہ والنہایہ ج ۱، ص ۳۴۴.

ابو عفک اور عصماء کا قتل

قارئین کرام! ۲ھ میں پیش آنے والے غزوات کا سلسلہ ختم ہوا۔ اب دو ایسے واقعات باقی ہیں جن میں دو افراد نے اپنی انفرادی کوششوں سے دو دشمنانِ رسول کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ دو افراد سالمؓ اور عمیرؓ تھے۔ حضرت سالمؓ نے ابو عفک یہودی کو مار ڈالا اور حضرت عمیرؓ نے عصماء یہودن کو قتل کر دیا۔

ابو عفک ایک بوڑھا یہودی شاعر تھا جو جانِ دو عالم ﷺ سے شدید عداوت رکھتا تھا اور لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا، علاوہ ازیں اپنے اشعار میں آپ اور اسلام کی ہجو اور مذمت کیا کرتا تھا۔ آپ اس کے بیہودہ خرافات سے اس قدر تنگ آئے کہ ایک دن فرمانے لگے---''مَنْ لِیْ بِهٰذَا الْخَبِیْثِ؟''---(اس خبیث کا منہ بند کرنے کی کون ضمانت دیتا ہے؟)

حضرت سالمؓ نے عرض کی---''میں، یارسول اللہ---! یا اس کو قتل کر دوں گا یا خود مارا جاؤں گا۔''

چنانچہ ایک رات ابو عفک اپنے صحن میں سویا ہوا تھا کہ حضرت سالمؓ نے اس کے سینے پر تلوار رکھ کر آر پار کر دی---خس کم جہاں پاک۔(۱)

ابو عفک کی طرح عصماء بھی ایک شیطان عورت تھی۔ یہ بھی شاعرہ تھی اور اس کے مشاغل بھی تقریباً وہی تھے جو ابو عفک کے تھے---اسلام کے خلاف بکواس کرنا، مسلمانوں کو تنگ کرنے کے لئے مسجد بنی خطمہ میں گندے کپڑے پھینکنا، جانِ دو عالم ﷺ کی مذمت میں شعر کہنا اور لوگوں کو آپ کے قتل کی ترغیب دینا۔

جن دنوں جانِ دو عالم ﷺ غزوۂ بدر کے لئے گئے ہوئے تھے، ان ایام میں اس کی شرارتیں عروج پر تھیں کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ وہاں مسلمانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

انہی دنوں اس نے اسلام اور مسلمانوں کی ہجو میں ناقابلِ برداشت اشعار کہے،

---

(۱) زرقانی ج ۱، ص ۵۴۹، طبقات ابن سعد ج ۲، ص ۱۹.

حضرت عمیرؓ نے یہ شعر سنے تو قسم کھا کر کہا، اگر خدا نے رسول اللہ ﷺ کو بخیریت مدینہ واپس پہنچایا تو میں عصماء کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت عمیرؓ نابینا تھے، مگر جب عزائم بیدار ہوں تو ناممکن کام ممکن نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ بخیریت بدر سے واپس آگئے تو ایک رات حضرت عمیرؓ عصماء کے گھر میں داخل ہوئے۔ عصماء، خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ محوِ خواب تھی۔ حضرت عمیرؓ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگے --- کتنا خطرناک کام تھا یہ! اگر کسی کی آنکھ کھل جاتی تو عمیرؓ کے ٹکڑے اڑا دیئے جاتے، مگر وہ ان خطرات سے بے نیاز اپنی دھن میں لگے رہے اور آخر اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس وقت انہیں محسوس ہوا کہ عصماء کے پاس ایک چھوٹا بچہ بھی سو رہا ہے۔ انہوں نے بہت احتیاط سے بچے کو علیحدہ کیا تاکہ اس معصوم کو کوئی گزند نہ پہنچے، پھر عصماء کے سینے پر تلوار کی نوک رکھی اور یکلخت اتنے زور سے دبائی کہ عصماء کو چیخنے کا موقع بھی نہ مل سکا اور تلوار جگر سے پار ہوگئی۔ اس فتنۂ خوابیدہ کو موت کی نیند سلا کر حضرت عمیرؓ جلدی سے باہر نکلے اور مسجد کو چلے آئے۔

نماز فجر کے بعد انہوں نے اپنا کارنامہ جانِ دو عالم ﷺ کے گوش گزار کیا اور پوچھا کہ کیا اس کے قصاص میں مجھے قتل کیا جائے گا؟

آپ نے فرمایا --- ''نہیں، اس کا خون رائگاں ہے، کوئی اس کے قصاص کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔''

پھر آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا --- ''جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھنا چاہے، جو اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کے لئے تیار رہتا ہو تو اسے چاہئے کہ عمیر کو دیکھ لے۔''

حضرت عمرؓ نے کہا --- ''دیکھو تو سہی، ہے تو یہ اندھا، مگر اللہ رسول کی اطاعت میں اس نے کیا خوب رات گزاری ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا --- ''اسے اندھا نہ کہو عمر! یہ تو بصیر ہے'' (یعنی اس کا دل روشن ہے)

یہ حوصلہ افزا جملے سن کر حضرت عمیرؓ کی جرأت مزید بڑھ گئی اور دوبارہ عصماء کے گھر کی طرف چل دیئے۔ وہاں عصماء کے پانچ بیٹے اس کی تدفین میں مصروف تھے۔ حضرت عمیرؓ بے دھڑک ان کے پاس جا کھڑے ہوئے اور کہنے لگے---''سنو! تمہاری ماں کو میں نے قتل کیا ہے اور میں تم کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم میں سے بھی کسی نے ایسی بکواس کی جس طرح تمہاری ماں کیا کرتی تھی تو میں اس کا بھی یہی حشر کروں گا---تم میرے خلاف جو کچھ کر سکتے ہو کر لو!''

اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ایسا رعب ڈالا کہ وہ ایک نابینا شخص سے سہم گئے اور کوئی کاروائی کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔(۱) رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

غزوہ ذی امر

ذی امر ایک چشمے کا نام ہے۔ جانِ دو عالم ﷺ کو اطلاع ملی کہ وہاں قبیلہ غطفان کا ایک گروہ قیام پذیر ہے اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ چنانچہ جانِ دو عالم ﷺ بتاریخ ۱۲ ربیع الاول ۳ ھ، ۴۵۰ جاں نثاروں کی معیت میں ان کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے۔ غطفان پر آپ کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ لڑے بغیر ہی بھاگ اٹھے اور پہاڑی دروں میں روپوش ہو گئے۔ آپ نے اسی چشمے پر پڑاؤ کیا اور کچھ دن تک وہاں مقیم رہے۔ ایک دن سخت بارش ہوئی جس سے آپ سمیت سب کے کپڑے بھیگ گئے۔ آپ نے گیلے کپڑے اتار کر ایک درخت پر پھیلا دیئے اور خود سائے میں آرام فرمانے لگے۔ صحابہ کرام آپ کو محو استراحت دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔

پہاڑوں میں چھپے دشمن نے دیکھا کہ جانِ دو عالم ﷺ اکیلے ہیں تو اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنے سردار غورث سے کہا---''بہترین موقع ہے، محمد تنہا لیٹا ہے، چپکے سے جاؤ اور اس کا کام تمام کر دو۔''

غورث آزمودہ کار سپاہی تھا۔ جانتا تھا کہ ایسے سنہری مواقع کبھی کبھی آتے ہیں،

---

(۱) تاریخ الخمیس، ج ۱، ص ۴۰۷۔ زرقانی ج ۱، ص ۵۴۶، ۵۴۷۔

چنانچہ اسی وقت روانہ ہوا اور نہایت سرعت سے جانِ دو عالم ﷺ کے بالکل قریب جا پہنچا۔ تلوار سونتی اور کڑک کر کہا

''یَامُحَمَّدُ! مَنْ یَّمْنَعُکَ مِنِّی الْیَوْمَ؟'' (اے محمد! آج تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟)

آپ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا---''اَللّٰہُ''

اسی وقت جبریل نمودار ہوئے اور غورث کے سینے پر ہاتھ مارا، اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور زمین پر گر پڑی۔ جانِ دو عالم ﷺ نے وہی تلوار اٹھائی اور فرمایا

''مَنْ یَّمْنَعُکَ مِنِّی الْیَوْمَ؟'' (تجھے آج میرے ہاتھوں سے کون بچائے گا؟)

''کوئی نہیں، مجھے بچانے والا کوئی نہیں۔'' اس نے جواب دیا ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور آپ اس کے سچے رسول ہیں۔ آئندہ میں کبھی آپ کے مخالفین کا ساتھ نہیں دوں گا۔''

آپ نے اسی وقت اس کو تلوار واپس کر دی اور جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھیوں نے یہ سارا منظر دور سے چھپ کر دیکھا تھا اور انہیں سخت حیرت تھی کہ غورث جیسا جری اور بہادر سردار ناکام کیسے رہ گیا۔ چنانچہ جب وہ اپنے ساتھیوں میں پہنچا تو انہوں نے پہلا سوال یہی کیا---''مَالَکَ؟'' (تجھے کیا ہو گیا تھا؟)

غورث نے کہا---''ایک اچانک نمودار ہو جانے والے طویل قامت آدمی نے مجھے اس زور کا دھکا دیا کہ میں دہل گیا۔ میں اسی وقت سمجھ گیا کہ یہ کوئی فرشتہ ہے۔ چنانچہ میں ایمان لے آیا اور رسول اللہ سے وعدہ کیا کہ آئندہ ان کی مخالفت نہیں کروں گا۔''

اس کے بعد غورثؓ اسلام کے داعی بن گئے اور اپنی قوم میں دین کی تبلیغ کرنے لگے۔(۱)

سریہ زید ابن حارثہ

جمادی اولیٰ کے آغاز میں جانِ دو عالم ﷺ کو خبر ملی کہ مشرکین مکہ کا ایک قافلہ

---

(۱) زرقانی ج ۲، ص ۱۸.

صفوان کی قیادت میں شام جا رہا ہے، مگر پہلے راستے کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے ایک اور راستے سے سفر کر رہا ہے۔ آپ نے اسی وقت ایک مہم ترتیب دی اور اسے حضرت زیدؓ کی قیادت میں قافلے کا راستہ کاٹنے کے لئے بھیج دیا۔ قردہ نامی ایک چشمے پر مشرکین نے قیام کیا ہوا تھا، کہ اچانک حضرت زیدؓ نے ان کو جا لیا۔ وہ لوگ مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسلمانوں کے ہاتھ خاصا مال غنیمت لگا اور مظفر و منصور واپس ہوئے۔

قتلِ کعب ابن اشرف

کعب کا باپ اشرف مشرکین عرب میں سے تھا۔ ایک دفعہ اس سے قتل ہو گیا تو بھاگ کر مدینہ چلا آیا۔ یہاں ایک یہودی نے اپنی بیٹی اس کو بیاہ دی اور وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ شرک و یہودیت کے اجتماع سے کعب پیدا ہوا۔ باپ کی طرف سے فصاحت و بلاغت اور ماں کی طرف سے ذہانت و ذکاوت ورثے میں ملی تھی۔ پھر قد کاٹھ بھی خوب نکلا تھا اور شکل و صورت بھی مثالی پائی تھی۔ ان سب عوامل نے مل کر اس کے لئے ترقی کی راہیں کھول دیں اور بہت مختصر عرصے میں اس کا شمار مدینے کے بااثر رؤساء میں ہونے لگا۔ پدری نسبت کی وجہ سے اس کی ہمدردیاں مشرکین کے ساتھ تھیں اور مادری تعلق کی بناء پر اس کو یہودیوں سے پیار تھا، اس لئے دونوں فریقوں کے مذہبی پیشواؤں کو خوب نوازتا تھا اور دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ اکثر مذہبی رہنما اس کے وظیفہ خوار تھے اور باقاعدہ تنخواہ لیتے تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ کی مدینہ طیبہ میں آمد کے بعد ایک دن یہودی علماء حسبِ معمول اپنے وظائف وصول کرنے کعب کے پاس گئے تو اس نے پوچھا --- ''تمہاری اس شخص (یعنی جانِ دو عالم ﷺ) کے بارے میں کیا رائے ہے؟''

سب نے یک زبان ہو کر کہا --- ''هُوَ الَّذِيْ كُنَّا نَنْتَظِرُ........'' یہی تو ہیں جن کے ہم منتظر تھے۔ ہماری کتابوں میں نبی منتظر کی جو علامات مذکور ہیں، وہ سب ان میں موجود ہیں۔''

''اگر تمہاری رائے یہی ہے'' کعب سرد لہجے میں گویا ہوا ''تو میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ تم جا سکتے ہو۔''

افسوس کہ پیشوایانِ یہودیت نے چند ٹکوں کی خاطر اپنا دین بیچ ڈالا اور صداقت کا گلا گھونٹ دیا۔ چنانچہ اس وقت تو سب اٹھ کر چلے آئے، مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر حاضر ہو گئے اور کہنے لگے۔

''ہم نے پہلے جو رائے دی تھی، اس میں غیر ضروری عجلت سے کام لیا تھا، بعد میں ہم نے تحقیق کی اور کتابِ مقدس کا بغور مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ یہ شخص نبی منتظر ہو ہی نہیں سکتا۔''

کعب خوش ہو گیا اور ان کے وظائف میں مزید اضافہ کر دیا۔

اس واقعہ سے یہودیوں کے خود ساختہ مذہب کے ساتھ کعب کی لگن کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے۔ رہے مشرکین تو ان سے کعب کی ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ جب انہیں بدر میں ذلت آمیز شکست ہوئی تو کعب کو بے حد افسوس ہوا اور تعزیت کے لئے طویل سفر کر کے مکے گیا۔ وہاں جا کر پرسوز مرثیے کہے اور خود بھی رویا، ان کو بھی رلایا۔ ساتھ ہی انتقام کی ترغیب بھی دیتا رہا۔ اس کے دردناک اشعار نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مشرکین کے سینوں میں انتقام کے الاؤ بھڑک اٹھے۔ یہ تمام حرکتیں اس معاہدہ امن کی کھلی خلاف ورزیاں تھیں، جو جانِ دو عالم ﷺ اور یہودیوں کے درمیان طے ہوا تھا، کیونکہ اس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ کوئی فریق دوسرے فریق کے دشمن کے ساتھ ساز باز نہیں کرے گا، مگر یہودی عہد کی پاسداری کیا جانیں!

دولت کی فراوانی نے کعب کو اس قدر مغرور کر رکھا تھا کہ وہ اپنے اشعار میں مکہ اور مدینہ کی خوبصورت عورتوں کا نام لے لے کر ذکر کرتا تھا اور ان پر عشقیہ غزلیں کہتا تھا، مگر اس کے اثر و رسوخ کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ حد یہ ہے کہ حضرت عباسؓ جیسے معزز شخص کی اہلیہ ام فضل کو بھی اس نے نہیں بخشا اور مکہ سے واپسی کے وقت اپنے آپ سے مخاطب ہو کر گویا ہوا

اَرَاحِلٌ اَنْتَ؟ لَمْ تَرْحَلْ بِمَنْقَبَةٍ   وَتَارِکٌ اُمَّ الْفَضْلِ بِالْحَرَمِ

(کیا تم جا رہے ہو؟ یہ تو کوئی خوشگوار روانگی نہیں ہے کہ اُمّ فضل کو حرم میں چھوڑے جا رہے ہو۔)

اسی طرح جانِ دو عالم ﷺ اور صحابہ کرام کے بارے میں بھی خرافات بکتا رہتا تھا۔
غرضیکہ یہ تھا وہ آفت پرکالہ جس کو قتل کرنے کا بیڑا حضرت محمد ابن مسلمہؓ(۱) نے اٹھایا۔
جانِ دو عالم ﷺ پہلے تو اس کی زبان درازیوں سے درگزر کرتے رہے، مگر جب

---

(۱) حضرت محمد ابن مسلمہ انصاریؓ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ حضرت مصعبؓ کی تبلیغ سے اسلام لائے تھے۔ تبوک کے علاوہ جملہ غزوات میں جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ شامل رہے اور مشکل گھڑیوں میں ثابت قدم رہے۔

تبوک میں اس لئے شریک نہ ہو سکے تھے کہ جانِ دو عالم ﷺ تبوک کو روانہ ہوتے وقت ان کو مدینہ کا امیر مقرر فرما گئے تھے۔

غزوات کے علاوہ متعدد حربی مہمات کی قیادت کی اور ہمیشہ کامران لوٹے۔ غزوات و سرایا کے بارے میں ان کا علم بہت وسیع تھا۔ ایک دفعہ اپنے بیٹوں سے کہا۔

''اے میرے بیٹو! مجھ سے رسول اللہ ﷺ کے غزوات و سرایا کے بارے میں پوچھا کرو، کیونکہ تبوک کے علاوہ کوئی ایسا غزوہ نہیں ہے جس میں مَیں نے شرکت نہ کی ہو اور کوئی ایسا سریہ نہیں ہے جس کی تفصیلات مجھے معلوم نہ ہوں، کیونکہ ان سرایا میں یا تو میں خود شامل ہوتا تھا، یا ان کے بارے میں مجھے مکمل علم ہوتا تھا۔''

ان کو جانِ دو عالم ﷺ نے ایک تلوار عنایت کی تھی اور فرمایا تھا

''ابن مسلمہ! اس کے ساتھ خوب جہاد کرنا، مگر جب تو دیکھے کہ مسلمان آپس میں لڑ پڑے ہیں تو اس شمشیر کو توڑ دینا اور گوشہ نشین ہو جانا، یہاں تک کہ تیری اجل آ جائے۔''

چنانچہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب مسلمانوں کی باہم لڑائیاں شروع ہوئیں تو حضرت محمد ابن مسلمہؓ نے حسب ارشادِ رسالت اس تلوار کو ایک چٹان پر مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ایک ویرانے میں خیمہ لگا کر مصروفِ عبادت ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۴۳ھ میں آپ اپنے رب سے جا ملے۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

(یہ واقعات مستدرک اور طبقات ابن سعد ذکر محمد ابن مسلمہ سے ماخوذ ہیں۔)

اس نے مشرکین مکہ کو انتقام کی ترغیب دی اور انہیں جنگ پر ابھارا تو آپ نے اس مفسدہ پرداز شخص کو جہنم رسید کرنا ضروری سمجھا اور صحابہ کرام سے کہا---''ہے کوئی شخص جو کعب کو ختم کرنے کی ذمہ داری اٹھا سکے---؟اس نے اللہ اور اس کے رسول کو بہت دکھ دیئے ہیں اور کھلی عداوت پر اتر آیا ہے۔ مکہ میں جا کر یہ جو کچھ کرتا رہا ہے، اس کی تفصیلات سے اللہ تعالیٰ نے مجھ کو آگاہ کر دیا ہے۔ یہ مشرکین کو ہمارے خلاف بھڑکا کر آیا ہے اور اب اس انتظار میں بیٹھا ہے کہ کب مشرکین ہم پر حملہ کریں اور یہ ان کا ساتھ دے۔''

یہ بہت سنگین صورت حال تھی، کیونکہ کعب گھر کا بھیدی تھا اور اس سے مدینہ کی کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ اگر ایسا شخص دشمن سے مل جاتا اور اس کو اندرونی حالات سے آگاہ کر دیتا تو مسلمانوں کے لئے خاصی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں، چنانچہ حضرت محمد ابن مسلمہؓ نے فی الفور کہا

''یا رسول اللہ! میں ذمہ لیتا ہوں اس کام کا۔ میں کعب کا خاتمہ کر دوں گا۔''

''اگر ایسا کر سکتے ہو تو ضرور کرو!'' جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔

حضرت محمد ابن سلمہؓ نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ اس سلسلے میں گفتگو کی تو انہوں نے کہا کہ ہم بھی تمہارا ساتھ دیں گے اور سب مل کر اس کو قتل کریں گے۔

لیکن کعب کو قتل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، کیونکہ وہ دن بھر تو اپنے حامیوں اور دوستوں کے جھرمٹ میں گھرا رہتا تھا اور رات کو اپنے ذاتی قلعے میں محصور ہو جاتا تھا اور صرف اس صورت میں برآمد ہوتا تھا، جب کوئی انتہائی قابلِ اعتبار شخص اس سے ملنے کے لئے جاتا تھا۔

ان حالات میں ضروری تھا کہ پہلے اس کا اعتماد حاصل کیا جائے اور اس غرض کے لئے اس کی من پسند باتیں کرنا لازمی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتیں خلاف واقعہ ہوتیں، اس لئے حضرت محمد ابن مسلمہؓ نے عرض کی

''یا رسول اللہ! اس کو اعتماد میں لینے کے لئے اگر ہمیں کچھ غلط بیانی کرنی پڑ جائے تو......؟''

''تو کر لینا، تمہیں اس کی اجازت ہے۔'' جانِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا۔

چنانچہ حضرت محمد ابن مسلمہؓ کعب کے گھر گئے اور کہا---''کعب! میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ میں اور میرے چند ساتھی اس شخص (یعنی جانِ دو عالم ﷺ) کی وجہ سے مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ ہم سے صدقات کا مطالبہ کیا جارہا ہے، حالانکہ ہمارے پاس مال ہی نہیں ہے۔ سخت پریشانی کے عالم میں تمہارے پاس کچھ قرض لینے آیا ہوں۔''

''ابھی کیا ہے'' کعب خوش ہو کر بولا ''عنقریب تم اس سے مکمل طور پر بیزار ہو جاؤ گے۔''

''بہر حال اب تو ہم اس کی پیروی کر ہی چکے ہیں۔'' ابن مسلمہؓ نے کہا ''اس لئے فوری طور پر دستکش نہیں ہو سکتے۔ تم اس طرح کرو کہ ہمیں کچھ غلہ بطور قرض دے دو!''

''تمہارے پاس تو غلے کی فراوانی ہوا کرتی تھی، وہ سب کیا ہوا---؟''

''وہ سب ہم اس شخص پر اور اس کے ساتھیوں پر خرچ کر چکے ہیں۔''

''کیا اب بھی تم لوگوں پر حق واضح نہیں ہوا---؟ بہر حال میں تمہیں قرض دینے کے لئے تیار ہوں مگر تمہیں اپنی کوئی چیز ضمانت کے طور پر میرے پاس رہن رکھنا پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے، ہم رہن رکھ دیں گے۔ تم کیا چیز رکھنا چاہتے ہو؟''

''تمہاری عورتیں۔'' کعب نے نہایت بے باکی سے کہا۔

اس بیہودہ اور شرمناک مطالبے پر حضرت محمد ابن مسلمہؓ کو غصہ تو بہت آیا ہوگا، مگر ضبط کر گئے اور کہا---''یہ تو مشکل ہے، کیونکہ تم سارے عرب میں خوبصورت انسان ہو، اگر ہم نے عورتیں تمہارے پاس رہن رکھ دیں تو پھر وہ تمہیں چھوڑ کر ہمارے پاس واپس جانے کے لئے کب تیار ہوں گی!'' حضرت محمد ابن مسلمہؓ نے مزید مکھن لگایا۔

''اگر یہ نہیں کر سکتے ہو تو پھر اپنے بچوں کو رہن رکھو۔'' کعب نے دوسری صورت بتائی۔

''یہ بھی مشکل ہے، اس طرح ہماری اولاد کا مستقبل برباد ہو جائے گا اور عمر بھر ان کو طعنے ملتے رہیں گے کہ یہ تھوڑے سے غلے کے عوض رہن رکھ دیئے گئے تھے۔ ہاں؛ البتہ ہم تمہارے پاس اپنا اسلحہ رہن رکھیں گے حالانکہ تم جانتے ہی ہو کہ ہمیں آج کل اس کی کس قدر شدید ضرورت ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے، اسلحہ ہی لا کر رہن رکھ دو۔''

محمد ابن مسلمہؓ کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ چاہتے ہی یہ تھے کہ کوئی ایسی صورت بن جائے کہ ہمارا اسلحہ کے ساتھ کعب کے پاس جانا اس کو چونکا نہ دے۔ کعب نے اجازت دے کر گویا خود ہی اپنی موت پر دستخط کر دیئے۔

روانگی

رات خاصی بیت چکی تھی کہ غدار کعب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے تین افراد کا قافلہ جس کے امیر محمد ابن مسلمہؓ تھے روانہ ہوا۔ میدان بقیع تک خود جانِ دو عالم ﷺ انہیں رخصت کرنے آئے اور فرمایا---"اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو! اے اللہ! ان کی امداد فرمانا۔"

کعب کا قلعہ قریب آیا تو محمد ابن مسلمہؓ نے ساتھیوں کو بتایا کہ جب وہ باہر آئے گا تو میں اس کو بالوں سے پکڑ لوں گا اور تم لوگ اس کا کام تمام کر دینا۔ دروازے پر پہنچ کر محمد ابن مسلمہؓ نے کعب کو آواز دی۔ کعب اٹھنے لگا تو بیوی نے کہا---"کہاں چلے ہو؟"

"میرے دوست نیچے بلا رہے ہیں، ان سے ملنے جا رہا ہوں۔"

"اس وقت نہ جاؤ، مجھے اس آواز سے خطرے کی بو آ رہی ہے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں" کعب نے بیوی کو اطمینان دلایا "یہ تو محمد ابن مسلمہ اور میرا بھائی ابو نائلہ ہیں۔"(۱)

دراصل کعب کی آنکھوں میں وہ اسلحہ گھوم رہا تھا جسے رہن رکھنے کا محمد ابن مسلمہؓ نے وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ بیوی کے منع کرنے کے باوجود اس نے دروازہ کھول دیا۔ کعب عطریات بہت استعمال کرتا تھا، اس لئے جونہی اس نے دروازہ کھولا، خوشبو سے فضا مہک اٹھی۔ محمد ابن مسلمہؓ نے کہا---"واہ، کیا عمدہ خوشبو ہے! میں نے زندگی بھر ایسی خوشبو نہیں سونگھی۔"

کعب عیاش آدمی تھا، لوفروں والے لہجہ میں گویا ہوا

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں---میرے پاس عرب کی سب سے حسین اور مہکتی ہوئی عورت ہے، اسی کے پاس سے اٹھ کر آ رہا ہوں۔"

---

(۱) ابو نائلہ کعب کے رضاعی بھائی تھے۔

محمد ابن مسلمہؓ نے کہا---''اگر اجازت ہو تو میں تمہارے بال سونگھ لوں۔''

کعب کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا، وہ تو خوش ہو رہا تھا کہ میرے معطر بالوں سے یہ لوگ اس قدر متاثر ہو رہے ہیں، چنانچہ محمد ابن مسلمہ نے اس کے بال سونگھے اور تعریف کی۔ پھر اپنے ساتھیوں سے کہا

''لو، تم لوگ بھی سونگھ لو۔''

ساتھیوں نے بھی سونگھنا شروع کر دیا۔ اسی دوران محمد ابن مسلمہؓ نے اس کے بالوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اسی لمحے کئی تلواریں کعب کے جسم سے آر پار ہو گئیں۔ اس طرح اس دشمنِ رسول کا خاتمہ ہو گیا جس کی زبان درازیوں سے ہر شریف انسان خوف زدہ و ترساں رہتا تھا۔

کعب کو واصلِ جہنم کرنے کے بعد جب مجاہدین تکبیریں کہتے ہوئے واپس آئے اور جانِ دو عالم ﷺ کو خوشخبری سنائی تو آپ بہت مسرور ہوئے اور انہیں داد دیتے ہوئے کہا

''اَفْلَحَتِ الْوُجُوْہُ''

(یہ چہرے ہمیشہ کامیاب رہیں۔)

مجاہدین نے عرض کی۔

''وَوَجْھُکَ یَارَسُوْلَ اللہ''

(اور آپ کا روئے انور بھی یا رسول اللہ!)

صَلَّی اللّٰہِ عَلَیہِ وَ سَلَّمْ

مولوی اقبال احمد خان سہیلؔ مرحوم

قبلہ نُمائے سجدہ گزاراں، شعلہ سینا، جلوۂ فاراں
صُبح بہاراں جس کا مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

شرح اَلَمْ نَشْرَحْ وہ سینہ، برقِ تجلّی کا گنجینہ
جگمگ جگمگ، چم چم، چم چم صلی اللہ علیہ وسلم

نوری تن کملی میں چھپائے، بادل میں بجلی لہرائے
نور کا مینہ برسائے رِم جھم صلی اللہ علیہ وسلم

جس نے بسائی دل کی بستی، جس کا ظہور شباب ہستی
نُزہتِ گیتی جس کا مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

مہرِ رسالت، قہرِ جلالت، عینِ عدالت، خضرِ دلالت
اے بکمالت ناطقہ اُبکم! صلی اللہ علیہ وسلم

سروِ سیادت قامتِ رعنا، صُبحِ سعادت جلوۂ سیما
طاقِ عبادت ابروئے پُرخم صلی اللہ علیہ وسلم

خلقِ خدا کا راعی آخر، دینِ ہدیٰ کا داعی آخر
جس کی دعوت اَسْلِم، تُسْلَم صلی اللہ علیہ وسلم

آئینۂ الطافِ الٰہی، رحمت جس کی لامتناہی
جس کی ہدایت اِرْحَم تُرحَم صلی اللہ علیہ وسلم